بسم اللہ الرحمن الرحیم

ولقد یسرنا القرآن للذکر فھل من مدکر

اکرم التفاسیر

سَیَقُولُ

الشیخ مولانا امیر محمد اکرم اعوان مدظلہ العالی

2

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ

اکرم التفاسیر

سَیَقُوْلُ

الشیخ مولانا امیر محمد اکرم اعوان مدظلہ العالی

2

اکرمُ التفاسیر

الشیخ مولانا **امیر محمد اکرم اعوان** مدظلہ العالی

پارہ 2

باردوم .... جولائی 2014ء

تعداد .... دوہزار

قیمت 470روپے

ناشر .... **ملک عبدالقدیر اعوان**

ناظم اعلیٰ سلسلہ نقشبندیہ اویسیہ

دارالعرفان منارہ، ضلع چکوال

نے انتخاب جدید پریس لاہور سے طبع کروایا

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

اویسیہ کتب خانہ

اویسیہ سوسائٹی۔ کالج روڈ۔ لاہور

بے شمار لوگوں کی اصلاح کا سبب بننے والی حضرت مولانا اکرم اعوان مدظلہ العالی کی سمجھنے میں انتہائی آسان، فرقہ پرستی سے پاک اور موجودہ زمانہ کے مطابق لکھی ہوئی قرآن اردو تفسیر وٹس ایپ پر فری حاصل کریں۔

یاد رکھیں گناہ جہالت کا پھل ہوتا ہے اور یہ بڑی شرم اور بدبختی کی بات ہے اگر ہم ساری زندگی میں اتنا بھی نہ جان سکیں کہ قرآن میں لکھا کیا ہے۔ لیکن اب آپ کے پاس آسان طریقہ موجود ہے۔ قرآن کی تفسیر ہر وقت آپ کی جیب میں ہوگی اور آپ کو جب بھی دن میں فارغ وقت جہاں بھی حاصل ہو آپ کچھ صفحے روزانہ پڑھتے رہیں اس طرح کچھ ہی وقت میں آپ پورے قرآن کی تفسیر سمجھ سکتے ہیں جس سے آپ کے ہزاروں عقائد و اعمال کی اصلاح ہو کر شریعت کے مطابق ہو جائیں گے اور آپ کی دنیا اور آخرت دونوں جہاں بہترین ہو جائیں گے۔ ہر پارہ کی علیحدہ علیحدہ تفسیر موجود ہے۔

www.QuranTafseer.net

0092 323 520 5255

اپنے وٹس ایپ سے اوپر دیئے گے نمبر پر میسج کریں کہ آپ کو لکھی ہوئی تفسیر چاہیے۔ جبکہ ویب سائیٹ سے بھی آپ یہی تفسیر آڈیو، وڈیو اور تحریر کردہ حاصل کرسکتے ہیں۔

اپنے دوستوں رشتہ داروں سے یہ پوسٹ شئیر کرکے ڈھیروں ثواب حاصل کریں

از دل خیزد بر دل ریزد

اکثر احباب سوچتے ہوں گے اسرار التنزیل کے ہوتے ہوئے اکرم التفاسیر کے لکھنے کی کیا ضرورت تھی؟ تو اس بارے میں عرض کردوں کہ نہ تو خود نمائی کی پہلے کوئی تمنا تھی نہ اب ہے اور نہ ان شاء اللہ آئندہ ہوگی نہ ہی یہ خیال دل میں آیا کہ مجھے کوئی بڑا عالم یا مفتی یا مفسرِ قرآن کہے نہ ان چھوٹی چھوٹی باتوں پر کبھی اپنا وقت قربان کیا۔ ہاں! یہ خواہش ضرور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم اور استاد المکرم حضرت مولانا اللہ یار خان رحمۃ اللہ علیہ صاحب کی خصوصی توجہ سے جو علوم و معارف عطا فرمائے انہیں اللہ تعالیٰ کی مخلوق تک پہنچاؤں اور اپنا فریضہ ادا کروں۔

ایک اور بات جو میں کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ قرآن کریم اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جو اپنے وقتِ نزول سے تا حال اور آئندہ تا قیامت بلکہ اس سے بھی آگے حساب و کتاب' جنت و دوزخ کی بات کرتا ہے اور تمام انسانیت کو راہنمائی اور ہدایت فراہم کرتا آیا ہے اور ان شاء اللہ کرتا رہے گا۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں' قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ہے۔ اب اس کے بعد نہ کوئی نبی آئے گا اور نہ رسول اور نہ ہی کوئی کتاب یا صحیفہ اس لیے کہ تمام مخلوق کے مسائل کا حل اس میں موجود ہے۔ ہر زمانے کے لوگ اپنے اپنے حالات کے مطابق استفادہ کرتے آئے ہیں' آئندہ بھی کرتے رہیں گے اور یہ خصوصیت صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے کلام ہی کی ہو سکتی ہے۔ پہلے وقتوں میں آج کی طرح نقل و حمل و رسل و رسائل کے مواقع اتنے نہیں تھے۔ اس لیے ایک سے دوسری جگہ علوم و ایجادات پہنچنے میں سالہا سال لگ جاتے تھے۔

زمانہ حال کی جدید ایجادات اور خصوصاً الیکٹرانک ایجادات نے تو پوری دنیا کو ایک گھر کی صورت میں یکجا کر دیا یعنی Global Village اور سالوں کی مسافت سمٹ کر سیکنڈ کے ہزارویں حصہ تک آ گئی ہے۔ اس لیے زمانے اور وقت کی رفتار بھی اتنی ہی تیزی سے تبدیل

ہو رہی ہے۔ آنے والے وقتوں میں کیا کیا تبدیلیاں رونما ہوں گی، ان کو دیکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی عظمت و کبریائی پر ایمان لانے والوں میں بڑی تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ خصوصاً جدید علوم کے ماہرین اور سائنسدانوں کی کثیر تعداد اسلام کی حقانیت کا اعتراف کرتے ہوئے دائرہ اسلام میں داخل ہو رہی ہے اور یورپ میں تو بہت ہی اضافہ دیکھنے میں آیا ہے۔

بات کہاں سے کہاں تک چلی گئی! بات تو ہو رہی تھی اسرار التنزیل کے ہوتے ہوئے اکرم التفاسیر کے منظر عام پر آنے کی۔ لہٰذا اسرار التنزیل کی اپنی ایک افادیت ہے۔ یہ 1971ء کی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا اللہ یار خان رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی معیت میں اپنے گھر کی حاضری کا شرف بخشا جس میں ساتھیوں کی کثیر تعداد بھی مقام ملتزم پر حاضر تھی۔ جس دربار سے کوئی خالی ہاتھ نہیں لوٹا' عطا و کرم کی اس بارش میں اہل بصیرت نے دیکھا کہ فہمِ قرآن کا پیغام قلب پر وجدان کی صورت میں نازل ہوا۔ اسی پیغام کو اہل دل کی امانت سمجھتے ہوئے سپردِ قلم کر دیا کہ شاید اپنے اہل تک پہنچ جائے۔

اسرار التنزیل کا انداز عام فہم اور اجمالی ہے جبکہ اکرم التفاسیر میں حالاتِ حاضرہ کے مطابق بحث کو ذرا وسیع کیا گیا ہے۔ یہ بات اہل علم پر عیاں ہے اور پڑھنے والوں کے لیے رشد و ہدایت کا موجب بنے گی۔ اللہ تعالیٰ عمل کی توفیق عطا فرمائے، نجاتِ اخروی کا سبب بنائے اور رضائے الٰہی نصیب فرمائے (آمین)

تیرے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزول کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحب کشاف

امیر محمد اکرم

مولانا محمد اکرم اعوان

شیخ سلسلہ نقشبندیہ اویسیہ

دارلعرفان منارہ ضلع چکوال

امیر المکرم بحیثیت مفکرِ قرآن

یہ اعجازِ قرآن ہے کہ بدلتے ہوئے حالات و واقعات اور علوم میں ارتقاء کے باعث مفسرینِ کرام قرآنی علوم کی وہ جہتیں بھی آشکار کر رہے ہیں جو پہلے مفسرین کی نگاہوں سے اوجھل رہیں۔ اگر یہ قرآن و حدیث کی معین کردہ حدود کے اندر اور اللہ کے دین اور شریعت کے مزاج سے ہم آہنگ ہیں تو یہ بھی آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم کے علوم کا ہی پرتو ہے جو بطور علم لدُنّی ان علمائے ربانی کو عطا ہوئے۔ امیر المکرم کے خطابات سے ماخوذ اکرم التفاسیر بھی فی زمانہ حالات و واقعات اور علوم جدیدہ کا احاطہ کرتے ہوئے علم لدُنّی کی ایسی روشن مثال ہے جس میں نہ صرف علوم مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم کی ضیاء نظر آتی ہے بلکہ برکاتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم قلوب کو تحریک بخشتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔

قرآن کے مضامین میں اس قدر وسعت اور تنوع ہے کہ ان کی کسی فہرست کو حتمی قرار دینا ممکن ہی نہیں لیکن قرآن حکیم کا ہر مضمون ایک نظریہ اور فکر کی بات کرتا ہے۔ امیر المکرم سے یہ سوال کیا گیا کہ کیا وجہ ہے کہ قران میں کثرت سے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا تذکرہ نظر آتا ہے۔ آپ نے جواب دیا کہ موسیٰ اور فرعون ہر زمانہ، ہر دور اور ہر معاشرے کے دو مرکزی کردار بھی ہیں جن کے مابین حق و باطل کا معرکہ مسلسل بپا ہے اور قرآن میں جا بجا حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے حوالے سے حق و باطل کے اسی معرکے کا تذکرہ ہے۔ حق و باطل کا یہی معرکہ قرآن کا مرکزی مضمون ہے۔ گرانقدر علمی مباحث قرآن کی معروف تفاسیر کی زینت تو نظر آتے ہیں لیکن قرآن کے اس مرکزی مضمون یا بالفاظ دیگر ''فکرِ قرآنی'' پر بہت کم بات کی گئی۔

دشمنان اسلام آج کھل کر قرآن کی مخالفت پر تل گئے اور اس کے پیغام کو دبانے کے

لیے اوچھے ہتھکنڈوں پر اتر آئے ہیں' لیکن کیا وہ قرآن کے عائلی قوانین سے خائف ہیں' قانون وراثت سے پریشان ہیں' جنت ودوزخ یا ثواب وعذاب سے گھبرا رہے ہیں؟ نہیں' ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ کفار کا تو ان پر ایمان ہی نہیں۔ آج ساری کی ساری طاغوتی قوتیں اس قرآنی فکر سے لرزہ براندام ہیں جو دائمی غلبہ حق کی نوید دیتی ہے اور امیر المکرم اسی قرآنی فکر کے نقیب ہیں۔ اکرم التفاسیر میں آپ نے اسی فکرِ قرآنی کو اجاگر کیا ہے' جو اس تفسیر کا طرہ امتیاز ہے۔

امیر المکرم کفار کے لیے اللہ تعالیٰ کے اٹل قانون قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ کی روشنی میں طاغوتی قوتوں کو آگاہ کرتے ہیں کہ تمہارے لیے دائمی شکست کا فیصلہ فرما دیا گیا ہے اور ذلت ورسوائی تمہارا مقدر ہے۔ غلبۂ حق کو روکنا اب تمہارے بس کی بات نہیں۔ اپنے خطابات میں آپ بکھری ہوئی ملت کو دعوت دیتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ آؤ پھر سے یکتائی سے عہد غلامی کرلو۔ تمہاری ذمہ داری کوئی ایک معاشرہ، قوم یا ملک نہیں بلکہ پوری انسانیت ہے۔ قرآن نے انقلاب دشمن سازشوں سے آگاہ کرتے ہوئے یہود کی طویل فردِ جرم بیان کی ہے جس میں انبیاء علیہم السلام سمیت اہل حق کے قتل کے جرائم بھی ہیں۔ امیر المکرم نے قرآنی فرمودات کی روشنی میں عالمی حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے عصرِ حاضر میں یہود کے سازشی کردار کو اس طرح بے نقاب کیا ہے کہ صیہونیت صرف عالمِ اسلام ہی کی نہیں بلکہ پوری انسانیت کی دشمن نظر آتی ہے۔

یہ دور اسی فکرِ قرآنی کی پہچان کا دور ہے اور امیر المکرم نے بھرپور انداز میں اسے اجاگر کیا ہے۔ کفر اپنے لیے اس خطرے کو اس حد تک پہچان چکا ہے کہ عملی اقدام پر اتر آیا ہے لیکن حضرت امیر المکرم قرآن کی روشنی میں حالات وواقعات کا تجزیہ کرتے ہوئے غزوۃ الہند کی نوید دے رہے ہیں۔ آپ سورۃ آل عمران کی آیت نمبر 12 کے ضمن میں فرماتے ہیں:

''کفار کے لیے یہ آیۂ کریمہ قیامت تک کے لیے نوید شکست ہے اور میں بڑی بے باکی سے کہتا ہوں، پورے یقین، پورے ایمان سے منبر رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر بیٹھ کر کہہ رہا ہوں کہ دنیا کی کافر سپر طاقتیں پھر شکست سے دوچار ہوں گی اور ان شاء اللہ پھر غلبۂ اسلام ہوگا۔''

چونکہ تفسیر کا انداز بیانیہ ہے، تو امیر المکرم کے زوردار اندازِ بیان میں فکرِ قرآنی جب قاری تک پہنچتی ہے تو اس کے دل میں ایک تحریک بپا کر دیتی ہے، یہاں تک کہ اسے آنے والے انقلاب کی چاپ سنائی دینے لگتی ہے۔

امیر المکرم نے فکرِ قرآنی کی بات کرتے ہوئے امت میں ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت پھیلائی گئی اس غلط فہمی کو بھی دور کرنے کی کوشش کی ہے کہ حالات کو بدلنے کے لیے کسی امام مہدی کا انتظار کیا جائے۔ یہ موہوم امید افیون سے کم نہیں جس نے امت کو سلا دیا کہ اب کفر سے نبٹنا ہمارے بس کی بات نہیں اور یہ کام امام مہدی ہی کریں گے۔ حضرت کے خطبات بے عملی کی اس کیفیت سے بیداری کا پیغام ہیں کہ اُمت پہ ابھی بے بسی کا دور نہیں آیا۔ ہر فرد ملت کے مقدر کا ستارہ ہے اور ہر فرد کو امام مہدی کا کردار ادا کرنا ہوگا۔ امیر المکرم امام مہدی کی آمد کی بجائے غلبۂ حق کو بہت قریب دیکھ رہے ہیں۔ یہی قرآنی فکر ہے جو ہر عہد میں حق و باطل کے معرکے کو مہمیز کرتی ہے، جو ہر دور میں خونِ مسلم کو گرم اور اُمتِ مسلمہ کو متحرک رکھتی ہے۔

امیر المکرم نے اکرم التفاسیر میں یہ فکر اس قدر نمایاں طور پر پیش کی ہے کہ وہ مفسرِ قرآن سے آگے مفکرِ قران نظر آتے ہیں اور یاد رہے! ہر انقلاب کے پیچھے کوئی مفکر ہوتا ہے۔

چھ جلدوں پر محیط تفسیر ''اسرار التنزیل'' کے حوالے سے امیر المکرم کی پہچان بطور مفسرِ قرآن تو مسلمہ ہے لیکن اب ''اکرم التفاسیر'' کی صورت آپ نے جس طرح قرآنی فکر کو اجاگر کیا ہے، آپ کا تعارف بطور ''مفکرِ قرآن'' حاوی نظر آتا ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مفکرِ قرآن امیر المکرم کو صحت اور عمر دراز عطا فرمائے کہ یہ بیانیہ تفسیر نہ صرف مکمل ہو بلکہ آپ انقلاب بپا ہوتا ہوا بھی دیکھیں۔

ابوالاحمدین

ابوالاحمدین

حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ۔ (القمر:17)

اور بلاشبہ ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لیے آسان کر دیا ہے تو کوئی ہے جو نصیحت حاصل کرے؟

تفہیم قرآن کی راہ میں مختلف حجابات بندے کو قرآن سے دور رکھنے کی شیطانی چالیں ہیں۔ جو شخص بھی خلوصِ دل کے ساتھ ہدایت کا طلب گار ہوگا، وہ فہم قرآن سے محروم نہیں رہ سکتا۔ قرآن اور حکمت کی تعلیم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا منصبِ عالی ہے۔ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ اور خوش نصیب ہیں وہ نفوسِ قدسیہ جنہیں اللہ تعالیٰ نے اس کارِ نبوت میں خدام کی صورت قبول فرمایا۔

یوں تو اس شعبہ میں جس قدر کام ہوا، اس کا احاطہ ممکن نہیں لیکن وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ برصغیر کے مفسرینِ کرام کو تفسیر کے میدان میں نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ علمی مرتبت کو دیکھا جائے تو ان کی تحریر کردہ اکثر تفاسیر عام قاری کی ذہنی سطح سے بہت بلند ہیں۔ یہ علماء کے استفادہ کے لیے لکھی گئیں اور صدیاں گزرنے کے باوجود ان کی افادیت آج بھی مسلمہ ہے۔ ماضی قریب میں بعض تفاسیر کا مخاطب عام قاری بھی تھا اور اپنے وقت میں یہ بہت مقبول ہوئیں لیکن آج کے قاری اور ان کے درمیان ایک زمانہ حائل ہو چکا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ اسلوبِ تحریر بدلتا رہتا ہے اور کم و بیش نصف صدی کا دورانیہ اس قدر تبدیلیاں لاتا ہے کہ یہ کتب خانوں کی زینت بن کر رہ جاتا ہے۔

قدیم و جدید تفاسیر میں ایسی کوئی تفسیر سامنے نہیں آئی جو تحریر کی بجائے خطاب پر مبنی ہو، جو دورِ اوّل کے مفسرین کا انداز ہوا کرتا تھا۔ بطورِ مفسر آج جن صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین، تابعین اور تبع تابعین رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہم کی آراء سند کا درجہ رکھتی ہیں، لیکن کتابی صورت میں ان سے کوئی تفسیر منسوب نہیں۔ انہوں نے عام فہم بیان کی صورت وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ کی سنت اس طرح ادا کی کہ بلاتخصیص خاص و عام، ہر شخص اپنی ذہنی سطح کے مطابق مستفید ہوا۔ یہی بیانیہ تفسیر کا اعزاز ہے جو حاضرین کی ذہنی سطح کے مطابق ہوتی ہے جبکہ مسندِ علم پر بیٹھ کر لکھی ہوئی تفسیر اس کی مکلف نہیں ہوتی۔

صدیوں کے توقف کے بعد اب اکرم التفاسیر کی صورت یہ پہلی بیانیہ تفسیر منظر عام پر آئی ہے۔ صاحبِ تفسیر کی محافل میں ایک طرف علماء واساتذہ استفادہ کررہے ہوتے ہیں تو اسی محفل میں ہر طبقہ اور مکتبِ فکر سے تعلق رکھنے والے مختلف ذہنی سطح کے افراد بھی شریک نظر آتے ہیں لیکن ان میں سے کوئی خالی ہاتھ نہیں اٹھتا۔ نہ صرف انہیں تفہیمِ قرآن نصیب ہوتی ہے بلکہ وہ دل کے دروازے پر قرآن کی دستک بھی محسوس کرتے ہیں اور کیفیات کا یہ ادراک کسی صوفیٔ کامل کی محفل میں ہی نصیب ہوسکتا ہے۔ خوش نصیب ہیں وہ لوگ جنہیں ان محافل میں شرکت کی توفیق ملتی ہے لیکن اس تفسیر کا یہ بھی اعجاز ہے کہ اسے پڑھتے ہوئے قاری خود محسوس کرتا ہے کہ روئے سخن گویا اسی کی جانب ہے۔ چونکہ قرآن حکیم بندے سے اللہ تعالیٰ کا براہ راست خطاب ہے، لازم ہے کہ مطالعہ کے دوران قاری کو اس حقیقت کا ادراک نصیب ہو۔ یہی اس تفسیر کا امتیاز ہے جس کی وجہ سے بجا طور پر اسے اکرم التفاسیر کا نام ملا۔ دورِ حاضر میں اکرم التفاسیر نے قرآن فہمی کو آسان کر دیا ہے۔ اس کا مخاطب ہر طبقہ، ہر گھرانہ اور بلا امتیاز عمر و مرتبہ ہر فرد ہے۔

اب چند الفاظ صاحبِ تفسیر حضرت امیر المکرّم مولانا محمد اکرم اعوان مدظلہ العالی کے متعلق، علمِ لدُنّی پر بات کرتے ہوئے آپ فرماتے ہیں: ''علم اللہ کی طرف سے آتا ہے، اس کے لیے کوئی وقت درکار نہیں ہوتا، کوئی عرصہ نہیں لگتا۔ اس نے دے دیا اور لینے والے کو وصول ہوتا گیا، اس کو علم لدُنّی کہتے ہیں''۔ علم انعکاسی طور پر بھی عطا ہوتا ہے جس کی اکمل ترین مثال صحبتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے جہاں ایک نظر سے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے سینے جملہ علوم وفنون سے اس طرح لبریز ہوئے کہ ان کی رائے آنے والے علماء، فقہاء، محدثین اور مفسرین کے لیے سند ٹھہری۔ اس سنتِ نبوی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اتباع میں بطورِ کرامت کسی ولی کامل کی صحبت سے بھی قلوب میں علم کے سوتے پھوٹ پڑتے ہیں۔

حصولِ علم کے یہ دونوں ذریعے صاحبِ تفسیر حضرت امیر المکرم مولانا محمد اکرم اعوان مدظلہ العالی کا تعارف بھی ہیں۔ ایک ربع صدی انہیں اپنے شیخ، قلزمِ فیوضات حضرت العلام مولانا اللہ یار خان رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی صحبت نصیب ہوئی جو اپنی ذات میں علومِ ظاہری و باطنی کی ایک فقید المثال یونیورسٹی تھے۔ 1974ء میں یہ ہونہار شاگرد اپنے شیخ کی معیت میں ملتزم پر حاضر، دنیائے باطن کی ایک کمیاب جنس کا طلبگار ہوا تو جواب ملا کہ تمہیں جو کچھ عطا کر دیا ہے وہ اس سے کہیں افضل ہے جو تم مانگ رہے ہو۔ یہ فہمِ قرآن تھا جس کے بعد آپ کی زبان سے قرآن کی تفسیر بیان کرتے ہوئے وہ مضامین جاری ہونے لگے کہ شریکِ محفل علماء کو بے ساختہ اعتراف کرتے ہوئے دیکھا، اس آیت کا اصل مفہوم تو آج سمجھ میں

آیا۔ علمی حلقوں میں حضرت امیر المکرم چھ جلدوں اور کم وبیش ڈھائی ہزار صفحات پر مشتمل قرآن حکیم کی تفسیر ''اسرار التنزیل'' کے حوالے سے بطور مفسر ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔ کسی حد تک اکرم التفاسیر کو اسرار التنزیل کی شرح بھی کہا جا سکتا ہے۔ اس کا ہر مضمون دل میں اترنے والے پرزور اور عام فہم خطاب کی صورت اس صلائے عام کا پرتو نظر آتا ہے، کوئی ہے جو قرآن حکیم سے ہدایت کا طلبگار ہو!

اللہ کریم صاحبِ تفسیر کو عمر دراز عطا فرمائے، ان کے دم سے محافلِ تفسیر اسی طرح جاری رہیں اور جس عظیم کام کا آغاز ہو چکا ہے وہ پایہ تکمیل کو پہنچے۔ (آمین)

ابوالاحمدین

جولائی 2007ء

فہرست مندرجات

نمبر شمار	مندرجات	صفحہ نمبر
1	حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ	8
2	سورۃ البقرہ آیات 142 تا 147	20
3	تفسیر ومعارف	22
4	بیت المقدس:	22
5	قبلہ اور اجتماعیت:	23
6	بیت اللہ کرۂ ارض کا مرکز ہے:	23
7	حرمتِ تصویر:	25
8	شرق وغرب تمام سمتیں اللہ ہی کی ہیں :	25
9	ہدایت کا مدار انابت پر ہے:	26
10	اسلام میں انتہا پسندی نہیں:	27
11	دنیا کا امن اعتدال میں ہے:	28
12	اقوام عالم پہ گواہی:	29
13	محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بطور گواہ:	30
14	اتباع رسول صلی اللہ علیہ وسلم:	31
15	تحویل کعبہ اتباع رسالتصلی اللہ علیہ وسلم کا امتحان بھی تھا:	32
16	درود پاک کو اذان کا حصّہ نہ بنائیں:	33
17	آدابِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم:	34
18	پورا حرم قبلہ قرار دیا گیا:	36
19	گناہ کے اثرات	38
20	اہل کتاب کی ہٹ دھرمی:	38
21	اللہ کے فیصلے کے برعکس خیر سگالی ظلم ہے:	39
22	شک قاطع ایمان ہے:	40
23	دنیا آخرت کا سایہ ہے:	41
24	دین سراپا اطاعت:	42
25	نظم وضبط کی عظیم مثال:	42
26	مرکزیت اور خلافت:	44
27	بیت اللہ مرکزیت کی علامت ہے:	45
28	رہ گئی رسمِ اذاں روحِ بلالی نہ رہی:	46
29	سورۃ البقرہ آیات 148 تا 152	47
30	تفسیر ومعارف	48
31	اصل کامیابی نیکیوں میں سبقت لے جانا ہے:	48
32	قبلہ مسلمانوں کا نقطۂ اتحاد ہے:	49
33	بعثتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اتمامِ نعمت ہے:	49
34	فرائضِ نبوت:	51
35	خیر القرون:	53
36	ذکر الٰہی:	55
37	ذکر پہ عطائے الٰہی:	56

نمبر شمار	مندرجات	صفحہ نمبر
38	اللہ کی نعمتوں پر شکر بجالاؤ:	56
39	سورۃ البقرہ آیات 153 تا 163	57
40	تفسیر ومعارف	58
41	زندگی گزارنے کا خوبصورت نسخہ، صبر وشکر:	58
42	صبر کا مفہوم:	59
43	صلوٰۃ:	60
44	مفلسی بھی نعمت ہے:	60
45	معیت باری:	61
46	معیتِ ذاتی صرف دو ہستیوں کا خاصہ ہے:	62
47	شہید کو مردہ کہنا حرام ہے:	63
48	امتحان زندگی کا خاصہ ہیں:	65
49	صفا ومروہ:	67
50	آبِ زم زم:	67
51	کتمان حق:	69
52	لعنت سے مراد رحمت سے دوری ہے:	70
53	توبہ کا مفہوم:	70
54	عبادت کا مفہوم:	72
55	نظام کائنات الوہیت اور توحید کی دلیل ہے:	72
56	سورۃ البقرہ آیات 164 تا 167	73
57	تفسیر ومعارف	74
58	رحمٰن دنیا کے لیے، رحیم دنیا اور آخرت دونوں کے لیے:	76
59	مقصدِ رسالت:	76
60	آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت عالمی اور ابدی ہے:	77
61	ترویج اسلام:	79
62	انسانی اختیار کی حد:	80
63	دنیوی زندگی محدود ہے لیکن سزا وجزا لامحدود:	81
64	تنبیہات عذاب نہیں، عطائے الٰہی ہیں:	81
65	حیاتِ مستعار:	82
66	خواجہ عبیداللہ احرارؒ جیسی تیاری:	82
67	اللہ کی محبت سب محبتوں پر غالب ہو:	84
68	انجام کار:	85
69	دنیوی منفعت کے لیے دار الکفر میں سکونت:	87
70	یہ زندگی اللہ کی دی ہوئی نعمت ہے:	89
71	سورۃ البقرہ آیات 168 تا 176	90
72	تفسیر ومعارف	92
73	حلال اور طیب رزق:	92
74	جنات اور ذریتِ ابلیس:	93
75	دور حاضر میں تابعیت:	93
76	شیاطینِ انس:	94
77	رزق سے برکت کیوں اٹھ گئی؟	95
78	حلال اور طیب رزق شیطان سے ڈھال ہے:	96
79	مومن ہو یا کافر شیطان سب کا دشمن ہے:	97

نمبر شمار	مندرجات	صفحہ نمبر
80	شیطان کا طریقہ واردات:	97
81	آباؤ اجداد کی اندھی تقلید اور رسومات:	98
82	مباح اور بدعت میں فرق:	99
83	تمیز بینی کا اتباع کسی جانور کے اتباع کی مانند ہے:	100
84	حقیقی شعور اللہ کی پہچان ہے:	101
85	حقیقی خالق صرف اللہ ہے:	102
86	رزق کے اثرات:	102
87	جو دم غافل سو دم کافر:	103
88	خنزیر اور شراب میں حرمتِ حقیقی ہے:	104
89	غیر اللہ کے نام پر ذبیحہ:	105
90	حالت اضطرار:	105
91	اللہ کے ساتھ کلام سے محرومی بدترین عذاب ہے:	106
92	رزقِ حلال ہدایت کی بنیاد ہے:	108
93	سورۃ البقرہ آیات 177 تا 182	109
94	تفسیر و معارف	111
95	نیکی کے لیے ایمان شرط ہے:	111
96	اہل تقویٰ کے اوصاف:	112
97	فرضیت قصاص:	113
98	قصاص، بقائے معاشرہ کی ضمانت ہے:	115
99	دہشتگردی کا علاج بروقت انصاف ہے:	116
100	وراثت کے متعلق ابتدائی حکم:	117
101	سورۃ البقرہ آیات 183 تا 188	119
102	تفسیر و معارف	121
103	فرضیت صیام:	121
104	روزے کا حاصل:	122
105	قرب الٰہی کا احساس:	122
106	شیطان کی مسلسل پیروی سے انسان شیطان بن جاتا ہے:	122
107	گناہوں کی معافی کی پہچان:	124
108	روزہ کے احکامات:	125
109	قرآن اور ماہ رمضان کی فضیلت:	128
110	قرآن کی عالمگیریت:	130
111	اسلام ہی الھدیٰ ہے:	131
112	اجتہاد اور دور جدید کے مسائل:	132
113	ہوائی جہاز میں ادائیگی نماز:	133
114	معرفت باری تعالیٰ:	138
115	جنات میں نبوت نہیں:	139
116	گلوبل ویلیج عالمی نظام کا متقاضی ہے:	141
117	ہمیں معرفت باری کیوں حاصل نہیں:	143
118	جب دین ذریعہ معاش بن جائے:	144
119	اللہ اور بندے کے درمیان کوئی پردہ حائل نہ ہو:	145
120	مومن کی دعا کبھی رد نہیں جاتی:	146

نمبر شمار	مندرجات	صفحہ نمبر
121	اللہ کا بندے سے کلام:	146
122	رشتہ زوجین:	149
123	حقوقِ نسواں:	150
124	صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا عمل آسانی کا موجب بنا:	152
125	صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم معیارِ حق ہیں:	154
126	امت کے تین گروہ جن سے اللہ راضی ہوا:	154
127	اوقات سحر و افطار:	154
128	اللہ کے احکام واضح اور ان پر عمل آسان ترین ہے:	157
129	مالی معاملات:	157
130	حرام رزق کھانے والے کی دعا قبول نہیں ہوتی:	158
131	سورۃ البقرہ آیات 189 تا 196	161
132	تفسیر و معارف	163
133	قمری ماہ و سال میں حکمت الٰہی:	163
134	خود ساختہ رسومات کو نیکی نہیں کہا جا سکتا:	165
135	تقویٰ اللہ تعالیٰ سے تعلق کا نام ہے:	165
136	عبادت کی روح جمالِ باری کا ادراک ہے:	167
137	اللہ سے دوستی کا تقاضا:	169
138	جہاد فی سبیل اللہ:	170
139	جہاد اور جنگ میں فرق:	172
140	جہاد کی حدود:	174

نمبر شمار	مندرجات	صفحہ نمبر
141	جہاد کب تک رہے گا؟	175
142	جہاد کا حکم کون دے گا؟	176
143	معیتِ باری تقویٰ سے نصیب ہوتی ہے:	179
144	اسراف، انفاق اور بخل:	179
145	جہاد سے رک جانا خودکشی ہے:	180
146	کس کام میں حسن ہے:	180
147	احسان کیا ہے:	181
148	اللہ کے محبوب کون!	181
149	حج میدان حشر کا منظر ہے:	183
150	حج درس خلافت دیتا ہے:	185
151	حد حرم اور احرام باندھنے کے متعلق ایک وضاحت:	187
152	حج کے چند احکام :	188
153	احکامِ حج:	189
154	اللہ کے ساتھ اپنا معاملہ درست رکھو:	190
155	ارکانِ حج سُنّتِ ابراہیمی کا پرتو ہیں:	191
156	قربانی کی حقیقت :	196
157	سورۃ البقرہ آیات 197 تا 210	198
158	تفسیر و معارف	201
159	حج کے اخراجات کا اہتمام لازم ہے:	201
160	حج کے دوران دنیوی منفعت:	203
161	لسانی، عملی اور قلبی ذکر :	203

نمبر شمار	مندرجات	صفحہ نمبر
162	ذکرِ الٰہی:	204
163	اللہ سے دنیا وآخرت دونوں طلب کرو:	206
164	[illegible] کا مزا دنیا اور آخرت دونوں میں ہے:	206
165	دین کا مدار کیفیت قلبی پر ہے:	208
166	حج آخری درجۂ علاج ہے:	208
167	حقیقتِ موت:	209
168	قول وفعل میں تضاد:	210
169	دو طرح کے لوگ:	215
170	اتباعِ کامل:	217
171	کوئی نافرمانی چھوٹی نہیں:	217
172	قرآن کی روشنی میں دوسروں کی بجائے خود کو پرکھو:	217
173	ہر گناہ کچھ نہ کچھ بگاڑ پیدا کرتا ہے:	219
174	اپنی اصلاح کے لیے انتظار کس بات کا!	222
175	آج بھی بارگاہ عالی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم میں حضوری ممکن ہے:	221
176	سورۃ البقرہ آیات 211 تا 216	222
177	تفسیر ومعارف	224
178	دین اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے :	224
179	کفرانِ نعمت پر عذاب کا آخری درجہ احساسِ گناہ کا مٹ جانا:	226
180	اخروی کامیابی ہی اصل کامیابی ہے:	227
181	فراوانیٔ رزق کامیابی کی دلیل نہیں:	228

نمبر شمار	مندرجات	صفحہ نمبر
182	انذار اور ڈرانے میں فرق :	229
183	اختلافات کا حل :	230
184	بنیادی وجہِ اختلاف :	231
185	ہدایت کے لیے انابت ضروری ہے:	231
186	اخروی نجات کے لیے آزمائش کی گھاٹی سے گزرنا ہے:	233
187	جنت رضائے باری کی سند:	233
188	تلخیٔ حالات میں استقامت مقصود ہے:	234
189	معرفتِ باری کی استعداد صرف انسان میں ہے:	235
190	اسلام کا معاشی نظام:	237
191	ٹیکس کس صورت میں؟	239
192	انفاق کے مصارف:	240
193	فرضیتِ قتال:	241
194	سورۃ البقرہ آیات 217 تا 221	243
195	تفسیر ومعارف	245
196	اشہرِ حرام میں قتال:	245
197	تعبیرِ قرآن صرف حضور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم ہی کا منصب ہے:	247
198	جُوا، تجارت اور سود میں فرق:	248
199	انفاق فی سبیل اللہ:	249
200	شریعت کے احکام انسانی مزاج کے عین مطابق ہیں:	249

نمبر شمار	مندرجات	صفحہ نمبر
201	یتیموں کی دیکھ بھال:	250
202	کیا اہلِ کتاب عورتوں سے نکاح جائز ہے:	251
203	اسلام کے عہدِ رفتہ میں غلامی کا تصور:	253
204	صالحین اور بدکاروں کی صحبت:	255
205	شانِ رسالت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم میں گستاخی کا جواب کیسے دیا جائے:	257
206	سورۃ البقرہ آیات 222 تا228	259
207	تفسیر ومعارف	260
208	ایامِ ماہواری میں اختلاط :	260
209	متطہرین:	261
210	معینہ مدت کے لیے نکاح) متعہ (حرام ہے:	263
211	اللہ کے سوا کسی کی قسم کھانا جائز نہیں:	264
212	قسموں پر مواخذہ ہوگا:	265
213	طلاق کے بارے میں ایک انتباہ:	266
214	طلاق سے متعلقہ ایک اہم اصول:	266
215	طلاق کی ایک اور صورت:	267
216	طلاق اور عدت:	267
217	مرد کو سربراہ مقرر فرمایا:	268
218	عورت کی امامت:	268
219	سورۃ البقرہ آیات 229 تا231	270
220	تفسیر ومعارف	271
221	طلاق کی صورت میں بھی حسنِ سلوک کی تلقین	271

نمبر شمار	مندرجات	صفحہ نمبر
222	کیا تین طلاق کے بعد رجوع ممکن ہے؟	272
223	اسلامی اور غیر اسلامی معاشرے میں فرق:	273
224	سورۃ البقرہ آیت 232 تا235	275
225	تفسیر ومعارف	277
226	عبادات کو معاملاتِ دنیا سے جوڑنا:	278
227	دنیا میں بے سکونی عذابِ آخرت کا پرتو ہے:	278
228	اللہ کی سب سے بڑی نعمت، بعثتِ نبوی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم:	279
229	مومن کی تکالیف تلافیٔ مافات اور ترقیٔ درجات کا ذریعہ ہیں:	279
230	دوسری شادی:	280
231	ایک مسئلہ اور اس کا حل:	282
232	ہماری عزت اتباعِ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم اور اسلام سے ہے:	282
233	اسلام کی عالمگیریت آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کا معجزہ:	285
234	اسلام آسان ترین طرزِ حیات ہے:	286
235	مذہب اور دین میں فرق:	286
236	مسائلِ رضاعت:	287
237	رضاعی بہن بھائی:	290
238	شاباش کی امید صرف اللہ سے رکھو:	290
239	تقویٰ، محبت کے رشتے کی معراج:	291
240	بیوہ کے حقوق:	294

نمبر شمار	مندرجات	صفحہ نمبر
241	ہر آن اللہ کے روبرو ہونے کا احساس:	297
242	محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی غلامی:	298
243	سورۃ البقرہ آیات 236 تا242	301
244	تفسیر و معارف	302
245	طلاق کی ایک اور صورت:	302
246	خلوت صحیحہ سے قبل طلاق جبکہ مہر مقرر نہ ہو:	303
247	خلوت صحیحہ سے قبل طلاق جب مہر طے ہو:	304
248	نکاح وطلاق میں جبر نہیں:	306
249	ایمان لانے کو بندے کے اختیار پر چھوڑا :	307
250	جسے وصالِ الٰہی نصیب ہو:	309
251	نماز کی حفاظت سے مراد اراکینِ نماز کی حفاظت ہے:	309
252	عبادات کا طریقہ بھی اللہ کا مقرر کردہ ہے:	310
253	عبادات موت کی تیاری ہے:	312
254	عبادت کا حقیقی لطف حضورِ حق میں ہے:	312
255	تفرقہ بازی کا علاج اطاعتِ الٰہی میں ہے:	314
256	اہمیت صلوٰۃ العصر:	314
257	حالتِ خوف واضطرار میں نماز کی ادائیگی:	315
258	ذکر اللہ کی تاکید:	316
259	اہلِ دانش کون ہیں؟	318
260	سورۃ البقرہ آیات 243 تا248	319
261	تفسیر و معارف	321

نمبر شمار	مندرجات	صفحہ نمبر
262	حیات بعد الموت کا ثبوت:	321
263	قضائے مبرم، قضائے معلّق:	322
264	اللہ کا فضل ادائیگی شکر سے مشروط ہے:	323
265	حصولِ رحمت ایمان واطاعت سے مشروط ہے:	323
266	قتال صرف رضائے الٰہی کے لیے ہو:	324
267	اللہ کی راہ میں خرچ اللہ کو قرض دینا ہے:	326
268	قصص قرآنی حالاتِ حاضرہ کو سمجھنے کا ذریعہ ہیں:	329
269	قتال فی سبیل اللہ اور جنگ میں بنیادی فرق:	330
270	اصحابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی ایک کرامت:	331
271	آج کا مسلمان محکوم کیوں ہے؟	332
272	حکومت صرف امراء کا حق نہیں:	333
273	ہمارا معیارِ انتخاب یہود سے مختلف نہیں:	333
274	قرآن کی روشنی میں حکمرانی کا معیار:	334
275	تبرکات باعثِ نزولِ رحمت ہیں:	335
276	سورۃ البقرہ آیات 249 تا252	337
277	تفسیر و معارف	338
278	ایمان کی دلیل عمل ہے:۔	339
279	دعویٰ ایمان کرنے والوں کی تین اقسام:	339
280	صبر کا مفہوم:	341
281	حضرت داؤد علیہ السلام کے ذکر اللہ کے احوال:	342
282	بقائے کائنات اور نیکی اور بدی میں توازن :	342
283	عبادت سے توفیقِ عمل ملتی ہے:	344

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى حَبِيْبِهٖ

مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ط

اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ (البقرہ:32)

مَوْلَایَ صَلِّ وَسَلِّمْ دَائِمًا اَبَدًا

عَلٰی حَبِیْبِكَ مَنْ زَانَتْ بِهِ الْعُصُرُوْا

پارہ 2 سیقول

سورۃ البقرہ رکوع 17 آیات 142 تا 147

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

سَیَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِیْ كَانُوْا
عَلَیْهَا ؕ قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ؕ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ
مُّسْتَقِیْمٍ ﴿۱۴۲﴾ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى
النَّاسِ وَیَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَیْكُمْ شَهِیْدًا ؕ وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِیْ
كُنْتَ عَلَیْهَاۤ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ یَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ یَّنْقَلِبُ عَلٰى
عَقِبَیْهِ ؕ وَاِنْ كَانَتْ لَكَبِیْرَةً اِلَّا عَلَى الَّذِیْنَ هَدَى اللّٰهُ ؕ وَمَا كَانَ اللّٰهُ
لِیُضِیْعَ اِیْمَانَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۴۳﴾ قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ
وَجْهِكَ فِی السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّیَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا ۪ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ
الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَحَیْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ؕ وَاِنَّ
الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَیَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ
عَمَّا یَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۴﴾ وَلَئِنْ اَتَیْتَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ بِكُلِّ اٰیَةٍ مَّا تَبِعُوْا
قِبْلَتَكَ ۚ وَمَاۤ اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ ۚ وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ

بَعْضٍ ط وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ لا
اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿١٤٥﴾ اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا
يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ط وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ
يَعْلَمُوْنَ ﴿١٤٦﴾ اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴿١٤٧﴾

جلد ہی احمق لوگ کہیں گے کہ یہ (مسلمان) جس قبلہ پر (چلے آرہے) تھے
اس سے ان کو کس چیز نے بدل دیا؟ کہیے مشرق و مغرب (سب) اللہ کے
لیے ہے وہ جسے چاہیں سیدھی راہ دکھا دیتے ہیں ﴿۱۴۲﴾ اور اسی طرح تم
لوگوں کو ہم نے ہر لحاظ سے معتدل جماعت بنا دیا ہے تا کہ تم (مخالف)
لوگوں پر گواہ رہو اور پیغمبر تم پر گواہ ہوں۔ اور جس قبلہ پر تم تھے اس کا
(معاملہ) ہم نے اس لیے کیا ہے تا کہ ہمیں پتہ چل جائے کون پیغمبر کا اتباع
کرتا ہے (اور) کون الٹے قدموں پھر جاتا ہے۔ اور یہ بہت بڑی بات تھی
سوائے ان لوگوں کے لیے جن کی اللہ نے راہنمائی فرمائی۔ اور اللہ ایسے نہیں
کہ تمہارے ایمان ضائع کر دیں یقیناً اللہ لوگوں کے ساتھ شفقت کرنے
والے مہربان ہیں ﴿۱۴۳﴾ بے شک آپ کا چہرہ بار بار آسمان کی طرف اٹھنا
ہم دیکھ رہے ہیں۔ سو ہم ضرور آپ کو اس قبلہ کی طرف پھیر دیں گے جدھر کی
آپ کو خواہش ہے (آپ پسند فرماتے ہیں) لہٰذا اپنا رخ مسجد حرام کی طرف
پھیر دیں اور جہاں کہیں تم ہو اپنا رخ اس طرف پھیر لو۔ اور جن کو (پہلے)
کتاب دی گئی وہ یقیناً جانتے ہیں کہ یہ حق ہے ان کے پروردگار کی طرف
سے۔ اور جو یہ کرتے ہیں اس سے اللہ بے خبر نہیں ﴿۱۴۴﴾ اور جن کو
(پہلے) کتاب دی گئی اگر ان کو آپ دنیا بھر کی دلیلیں بھی پیش کریں یہ آپ
کے قبلے کی پیروی کرنے والے نہیں اور نہ آپ ان کے قبلے کی پیروی کر سکتے
ہیں اور بعض ان کے بعض فریقوں کے قبلے کی پیروی کرنے والے نہیں۔ اور

جب آپ کے پاس علم (وحی) آچکا تو اگر آپ ان کی خواہشات کی پیروی کریں گے تو پھر آپ (معاذ اللہ) غلط کرنے والوں میں شمار ہو جائیں گے ﴿۱۴۵﴾ جن لوگوں کو ہم نے (پہلے) کتاب دی وہ ان (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کو اس طرح پہچانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں اور یقیناً ان میں سے ایک طبقہ جاننے کے بعد حق کو چھپاتا ہے ﴿۱۴۶﴾ یہ امر واقعی آپ کے پروردگار کی طرف سے ہے لہٰذا (اس میں) شبہ کرنے والوں میں شمار نہ ہونا ﴿۱۴۷﴾

تفسیر و معارف

سَيَقُولُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِي كَانُوا عَلَيْهَا

علمائے یہود و نصاریٰ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام پر اعتراض کیا کرتے تھے اور من جملہ دیگر اعتراضات کے ایک اعتراض یہ بھی تھا کہ قبلہ تو بیت المقدس تھا اور شروع میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کا بھی وہی قبلہ رہا، اب تبدیل کیوں کر لیا؟ یہ کیسا دین ہے کہ کبھی کوئی قبلہ ہے اور کبھی کوئی۔ اللہ کریم ان کے اس قول کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں: سَيَقُولُ السُّفَهَآءُ...... یہ قول ہی جہلاء کا ہے۔

بنیادی طور پر سوال جہالت ہوتا ہے اور جواب علم ہوتا ہے۔ سوال اس لیے پوچھا جاتا ہے کہ بندہ نہیں جانتا اور جاننا چاہتا ہے۔ جس کے پاس علم ہے وہ اس کے ذریعے جواب دیتا ہے۔ ان لوگوں کا یہ قول طالب علمانہ نہیں بلکہ معترضانہ تھا، مبنی بر جہالت تھا اس لیے فرمایا گیا کہ یہ قول ہی جہلاء کا ہے۔ جواب علم ہوتا ہے اور سوال جہالت ہوتا ہے لیکن اعتراض تو بہت بڑی جہالت ہے۔ سوال ہوتا ہے کہ آدمی کو بات سمجھائی جائے تو اس کی سمجھ میں آجائے لیکن اعتراض نہ ماننے کے لیے اور جھگڑا کھڑا کرنے کے لیے ہوتا ہے۔

بیت المقدس:

عرصہ قدیم سے بنی اسرائیل کا قبلہ بیت المقدس چلا آرہا تھا اور قبلہ کے معنی ہیں سمت، نہ تو مسجد اقصیٰ معبود تھی اور نہ بیت اللہ شریف معبود ہے۔ مسلمان اللہ وحدہٗ لاشریک کی عبادت کرتے ہیں۔ بیت المقدس کی اپنی عظمت

تھی۔ یہ مسجد سیدنا سلیمان علیہ السلام نے تعمیر کرائی، اللہ کی تجلیات و برکات کا مرکز تھی۔ جب اس کی تعمیر ہوئی تو انبیاء علیہم السلام بنی اسرائیل میں سے آئے اور ان کی ریاستیں بھی وہاں تھیں۔ وہ نبی علیہ السلام بھی تھے، بادشاہ بھی تھے اور ان کے دارالخلافے بھی وہاں تھے۔ ان لوگوں کی اکثریت شاید بیت اللہ سے واقف بھی نہیں تھی۔ رب جلیل نے ان کے لیے مسجد اقصیٰ کو قبلہ مقرر کر دیا یعنی اسے عبادت کی سمت مقرر کر دیا۔ اُس وقت جہاں بھی کوئی کلمہ گو ہوتا، وہ بیت المقدس کی سمت منہ کر کے عبادت کرتا کہ ایک یک رنگی، یکجہتی اور نظم پیدا ہو جائے۔ اللہ تو ہر جگہ موجود ہے لیکن لوگوں میں اخوت، اسلامی بھائی چارہ اور یک رنگی پیدا کرنے کے لیے بیت المقدس کو قبلہ مقرر فرما دیا گیا۔ جب نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام مبعوث ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلّم نے بھی اسی قبلہ کی پیروی اختیار فرمائی کہ وہ قبلہ پہلے سے مقرر تھا۔ یہ اس مسجد کا بہت بڑا مرتبہ تھا جو اللہ نے اسے بخشا۔

قبلہ اور اجتماعیت:

اسلام جوڑنے کا مذہب ہے۔ انسانوں کو انسانوں سے، انسانوں کو اپنے مالک سے، اپنے اللہ سے، اپنے معبود سے جوڑتا ہے۔ اسلام دنیا کے تمام مسلمانوں کو بھائی قرار دیتا ہے۔ اسلام دنیا کے تمام غیر مسلموں کو بھی حقوق عطا کرتا ہے، ان کی جان کی حفاظت کرتا ہے، ان کے مال اور ان کی آبرو کی حفاظت کرتا ہے۔ یعنی اسلام دنیا بھر کے لیے بھائی چارے کا مذہب ہے کہ ساری مخلوق اللہ کی ہے۔ اگر ایک غیر مسلم حقوق اللہ کا خیال نہیں کرتا تو اس کا جواب وہ خود اللہ کریم کے سامنے دے گا لیکن مسلمان اس کے حقوق کی حفاظت کریں گے، اس کو تحفظ دیں گے، اس کے بچوں کو تعلیم دیں گے، اسے روزگار کے مواقع فراہم کریں گے اور اسے پورے پورے انسانی حقوق بھی حاصل ہوں گے۔

اسلام جب عالمگیر بھائی چارے کی بات کرتا ہے تو سب سے پہلے اور سب سے اعلیٰ تو اللہ کی عبادت ہے، ان میں فرائض ہیں اور اگر فرائض میں ہی یک رنگی نہ ہو تو اخوت اور بھائی چارے کی بنیاد کہاں ہوگی! کوئی مشرق کو منہ کر کے نماز پڑھ رہا ہے، کوئی مغرب کو منہ کر کے نماز پڑھ رہا ہے، کوئی شمال کو، غرض جس سمت کسی کو خیال آیا، اس طرف منہ کر لیا تو عبادت میں یک رنگی کہاں ہوگی! سو رب جلیل نے ایک مقام کو مرکز قرار دے دیا کہ روئے زمین کے مسلمان اس کی سمت منہ کر کے نماز ادا کریں گے اب یہ فیصلہ رب العالمین کا تھا کہ بیت اللہ شریف قبلہ مقرر ہوا۔

بیت اللہ کرۂ ارض کا مرکز ہے:

یہ اللہ کی عطا ہے کہ دنیا کا نقشہ سب سے پہلے مسلمانوں نے بنایا اور زمین کی پیمائش بھی مسلمانوں نے کی۔

مسلمانوں نے دنیا کا جو نقشہ بنایا اس میں سمتوں کا تصور موجودہ سمتوں کے تصور سے متضاد تھا یعنی زمین کو انہوں نے اس طرح تقسیم کیا تھا کہ جسے آج ہم قطب جنوبی سمجھتے ہیں، مسلمانوں کے نقشے میں یہ شمال تھا اور قطب شمالی جنوب تھا۔ یورپ والوں نے اسے جنوب اور اس کو شمال کر دیا لیکن اگر شمال ادھر تھا، جنوب ادھر تھا تو بھی بیت اللہ ہی مرکز تھا اور اگر سمتوں کے نام تبدیل کر دیے گئے، شمال کو جنوب اور جنوب کو شمال کہنے لگے تو بھی بیت اللہ کی حیثیت نہیں بدلی۔ آج بھی وہ مرکز ہے اور روئے زمین کی پیمائش جس طرف سے کریں، مرکز بیت اللہ شریف ہی بنتا ہے۔

کعبۃ اللہ وہ نقطہ ہے جسے اللہ کریم نے سب سے پہلے تخلیق فرمایا جبکہ باقی سارا پانی ہی پانی تھا۔ حطیم سمیت جتنا بیت اللہ ہے، یہاں سے زمین پھیلائی گئی اور یہ مستقل مرکز رہا، تجلیات الٰہی کا مہبط رہا، روز اول سے ہے اور ہمیشہ رہے گا، جب تک زمین و آسمان قائم ہیں۔ بیت اللہ شریف کی عظمت یہ ہے کہ جہاں بیت اللہ کی چار دیواری ہے، تحت الثریٰ تک بیت اللہ ہے، عرش علیٰ تک بیت اللہ ہے۔ اس چار دیواری کے اوپر دوسری کوئی عمارت نہیں بن سکتی، اس کے نیچے کوئی دوسری عمارت نہیں بن سکتی۔ تحت الثریٰ سے لے کر عرش علیٰ تک بیت اللہ ہے، قبلہ ہے، مرکز ہے اور اللہ کی ذاتی تجلیات کا مہبط ہے۔

اہلِ نظر فرماتے ہیں کہ نویں عرش سے لے کر زمین کو چیرتا ہوا دوسری طرف نویں عرش تک انوارات و تجلیات کا ایک سمندر چلا جاتا ہے جو سارا بیت اللہ سے گزرتا ہے۔ جہاں بیت اللہ شریف ہے، زیر زمین بھی جہاں تک چلے جائیں تو بیت اللہ ہی ہے اور بالائے آسمان بھی چلے جائیں تو بیت اللہ ہے۔ اس کے انوارات اور اس کی برکات موجود ہیں۔

بیت اللہ کے انوارات کا عالم یہ ہے کہ مجھے دورہ امریکہ کے دوران اردن کے ایک شخص نے جو مصر کی فوج میں فائٹر پائلٹ تھا بتایا کہ اسرائیل اور مصر کی جنگ کے دوران انہیں حکم تھا کہ کبھی بھی بیت اللہ کے عین اوپر جہاز مت لے جائیں۔ جب بھی کوئی جہاز خواہ وہ ہزاروں، لاکھوں فٹ اونچا ہو، غلطی سے بیت اللہ کے عین اوپر آجاتا تو اس کے سارے سسٹم (Navigational System) میٹر گڑبڑ ہو جاتے تھے۔ کوئی سمجھ نہیں آتی تھی کہ کیا کرنا ہے اور کہاں جانا ہے اس قدر انوارات ہوتے ہیں کہ ماڈی چیزوں کو بھی متاثر کرتے ہیں جیسے وہ جہاز کسی بجلی میں گھس گیا ہو۔ آج بھی کوئی جہاز بیت اللہ شریف کے عین اوپر سے نہیں گزرتا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلبِ اطہر میں بیت اللہ کی محبت تھی۔ بیت اللہ شریف میں تین سو ساٹھ بت رکھے گئے تھے لیکن اس کے باوجود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے جاتے اور وہیں آرام فرماتے دوپہر گزارتے، عبادت کرتے۔ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا مفہوم ہے کہ جہاں تصویر ہو وہاں رحمت کے فرشتے نہیں آتے۔ پھر

جہاں (Three dimension) تھری ڈائمنشن تصاویر یعنی پتھر اور مٹی کے بت ہوں! کیا بیت اللہ پر ان بتوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا تھا؟ بالکل نہیں ہوتا تھا۔ اسی طرح جیسے سمندر میں آپ تین سو بت ڈال دیں تو سمندر کا کیا بگڑے گا۔ یہ تو تجلیاتِ باری کا ایک بحرِ زخار ہے، اس میں بتوں کی نحوست کا کیا اثر! وہاں تو تجلیاتِ باری ہمہ وقت جلوہ افروز رہتی تھیں، رہتی ہیں اور ہمیشہ رہیں گی۔

حرمتِ تصویر:

تصویر میں بھی لوگوں کو بہت غلطی لگتی ہے۔ ایک بات جو بہت عام ہے نوٹ فرمالیجیے کہ جس تصویر میں زندگی کا تصور نہ ہو، وہ تصویر شمار نہیں ہوتی مثلاً سینہ تک ہر شناختی کارڈ پر تصویر لگی ہوئی ہے یا نوٹ پہ بنی ہوئی ہے تو اتنے حصے کا کوئی بندہ زندہ نہیں رہ سکتا ہے اس لیے شرعاً یہ تصویر ہی شمار نہیں ہوتی۔

جب قسطنطنیہ فتح ہوا تو اس وقت مسجد ایا صوفیاء ایک بہت بڑا گرجا تھی جس کے ستونوں، محرابوں، دیواروں اور چھتوں پر فرشتوں، عیسیٰ علیہ السلام اور مریم علیہا السلام کی بے شمار تخیلاتی تصویریں بنی ہوئی تھیں جو بڑی خوبصورت تھیں۔ یہ سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا زمانہ تھا۔ مرکز کو لکھا گیا کہ اگر یہ ساری تصویریں اکھیڑی جائیں تو اس کا مطلب ہے کہ اس بنی بنائی عمارت کا سارا حلیہ بگڑ جائے گا، اس کے سارے پلستر اکھڑ جائیں گے اور پھر اس طرح کے شاید دوبارہ نہ بن سکیں۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ ان کے چہرے کے نقوش مٹا دو۔ پلستر اکھیڑنے کی بجائے انہیں رگڑ کر صاف کر دو تو یہ تصویر کے حکم سے خارج ہو جائیں گی۔ اسی طرح کیا گیا اور مسجد میں تب سے اب تک نماز ہو رہی ہے لہٰذا جو تصویر نامکمل ہو وہ تصویر کے حکم میں نہیں آتی۔

تصویر کے ضمن میں علماء کے مابین دوسری بحث یہ ہے کہ شرعاً جو تصویر حرام قرار دی گئی ہے وہ تھری ڈائمنشن (Three dimension) ہے یعنی کسی مسالے، لکڑی، مٹی یا پتھر کی بنی ہوئی کوئی مورت ہو، جس کے تین پہلو ہوں، تھری ڈائمنشن (Three dimension) ہو تو اس کی حرمت ہے لیکن جو کاغذ پہ بنتی ہے وہ اس میں شامل نہیں ہے۔ علماء کی یہ دو آراء ہیں۔

شرق و غرب تمام سمتیں اللہ ہی کی ہیں:

فرمایا: سَيَقُولُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِي كَانُوا عَلَيْهَا۔۔۔
یہ جاہل اور بے وقوف کہیں گے کہ انہیں قبلہ سے کس نے پھیر دیا؟ بیت المقدس کو قبلہ مانتے تھے، اب کعبہ شریف کو ماننے لگے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم انہیں فرما دیجیے: قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَ الْمَغْرِبُ۔۔۔ ساری سمتیں اللہ کی

ہیں۔ مشرق بھی اس کا ہے، مغرب بھی اس کا ہے، شمال بھی اس کا ہے، جنوب بھی اس کا ہے۔ ان بے وقوفوں کو، ان جاہلوں کو کہہ دیجیے کہ ساری سمتیں اللہ کی ہیں وہ قادر ہے، جس جگہ کو اس نے مرکز مقرر کر دیا وہی حقیقی مرکز ہے۔ یہ دنیا تو ایک بہت چھوٹا سا کُرّہ ہے۔ اسی دنیا میں اس نے کتنی دنیائیں پیدا کی ہیں اور کائنات بسیط میں آج تک سائنس نے کتنی دریافت کی ہیں! سائنس کے ایک پروگرام میں امریکہ کا ایک بہت بڑا سائنس دان اعتراف کر رہا تھا کہ اگر ہم یہ دعویٰ کریں کہ ہم نے بہت کچھ دریافت کرلیا ہے اور چاند، سورج اور مختلف سیاروں پر بڑی دنیائیں تلاش کر لی ہیں، اگر ہم بہت بڑی بڑھ بھی ماریں تو شاید ہم نے سو میں سے دس حصے دریافت کر لیے ہوں گے لیکن نوے حصوں کے بارے میں تو ہم کچھ نہیں جانتے کہ باقی کیا ہے۔ نوے فیصد کے بارے میں تو وہ خود اپنی لاعلمی کا اعتراف کر رہا تھا حالانکہ میں سمجھتا ہوں کہ یہ دس فیصد بھی اس کا اندازہ ہے، دس فیصد بھی غلط ہے۔ سائنس ابھی تک کچھ بھی نہیں جان سکی کہ اللہ کی کائنات کتنی وسیع ہے اور ایک ایک ذرے کے اندر کتنا کچھ موجود ہے۔ ابھی تو سائنس اسی منفی مثبت بجلی تک پہنچی ہے کہ ہر چھوٹے چھوٹے ذرے میں ایک منفی اور مثبت بجلی ہوتی ہے، پتہ نہیں اس میں اور کیا کیا موجود ہے؟ یہ اللہ کریم ہی جانتے ہیں۔

ہدایت کا مدار انابت پر ہے:

يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿١٤٢﴾ انہیں فرما دیجیے کہ بیت اللہ کو اس نے قبلہ مقرر کیا ہے جس کی ساری ہی سمتیں ہیں۔ اس بات کی سمجھ نورِ ہدایت سے تعلق رکھتی ہے اور وہ ہدایت اسے دیتا ہے جسے وہ چاہتا ہے لیکن ہدایت کے لیے اس نے ایک معیار مقرر کر دیا ہے۔ اس آیہ کریمہ سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ جب اللہ ہی کسی کو گمراہ رکھنا چاہتا ہے تو وہ بے چارہ کیا کرے؟ ایسی بات نہیں ہے، یہ اللہ کا قانون ہے: وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ (الشوری 13) جو دل کی گہرائی سے یہ فیصلہ کر لے کہ مجھے اللہ کو پانا ہے، اسے وہ ہدایت عطا کر دیتا ہے۔ ہدایت یا گمراہی اللہ کی طرف سے انسان کے اس فیصلے پر چھوڑ دی گئی ہے جو وہ اپنے دل کی گہرائی سے کرتا ہے۔ اس کے پاس یہی فیصلہ کرنے کا اختیار ہے کہ وہ اللہ کی اطاعت کرنا چاہتا ہے یا نافرمانی، فرمایا: اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا (الدھر 3) اللہ تعالیٰ نے راستہ واضح کر دیا ہے کہ انسان شکرگزار بندہ بننا چاہتا ہے یا ناشکری اختیار کرتا ہے۔ اگر ایک شخص جرم کرنا چاہتا ہے اور اللہ اس کا ہاتھ شل کر دے تو وہ کیا کر سکے گا؟ اللہ ایسا نہیں کرتا، وہ کہتا ہے کہ میں نے تمہیں، تمہارے فیصلے پر چھوڑ دیا ہے۔ تمہیں میں نے قوت دی، ناجائز استعمال کرو گے تو میں ایک دن تمہارے ساتھ حساب کروں گا، ظلم کا بدلہ دیا جائے گا، سزا دی جائے گی اور اطاعت کا انعام دیا جائے گا ورنہ: لَا تَتَحَرَّكُ ذَرَّةٌ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ اللہ کی اجازت کے بغیر تو کوئی ذرہ بھی حرکت نہیں کر سکتا۔

فرمایا: وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا سابقہ آیت میں تحویل قبلہ کے حوالے سے یہود ونصاریٰ اور مشرکین کے اعتراض کا جواب دیا گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اور مسلمانوں کا شروع میں تو قبلہ بیت المقدس ہی تھا جیسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلی امتوں کا تھا لیکن جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیت المقدس سے بیت اللہ شریف کی طرف رخِ انور کر لیا تو یہ لوگ معترض ہوئے۔ پہلا جواب تو حاکمانہ تھا کہ مشرق ومغرب سب اللہ کے لیے ہیں اور جسے وہ چاہے قبلہ مقرر فرما دے قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَ الْمَغْرِبُ اب یہاں خطاب اہل ایمان سے ہے اور تحویلِ قبلہ ہی کے حوالے سے ایک اور پہلو پر بات کی جارہی ہے۔

اسلام میں انتہا پسندی نہیں:

فرمایا: وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا۔۔۔۔ اے مسلمانو! اس طرح سے ہم نے تم کو ایک ایسی جماعت بنایا ہے جو ہر لحاظ سے اعتدال پر ہے۔ اسلام میں انتہا پسندی نہیں ہے اور نہ پارسائی کے لیے عمر بھر مجرّد رہنا شرط ہے۔ شادی نہ کی جائے، یہ ایک انتہا ہے۔ کہیں یہ شرط ہے کہ بھوکا پیاسا رہا جائے، یہ بھی انتہا ہے۔ کہیں یہ شرط ہے کہ انسانوں سے میل جول چھوڑ کر گوشہ نشین ہو جائے، یہ انتہا پسندی ہے۔ کہیں نیکی کے لیے یہ شرط ہے کہ آبادیاں چھوڑ کر جنگلوں میں نکل جائے، یہ بھی انتہا پسندی ہے۔ اسلام میں کہیں کوئی انتہا پسندی نہیں بلکہ ہر شعبہ زندگی میں اعتدال ہے، حتیٰ کہ عبادات میں بھی اعتدال ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایک صحابیؓ کا ذکر کیا گیا کہ وہ دن بھر روزہ رکھتے ہیں اور شب بھر عبادت کرتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بلا کر حکم دیا کہ تمہارے وجود کا بھی تم پر حق ہے، عبادت بھی کرو، آرام بھی کرو۔ روزہ رکھنا اچھی بات ہے، روزہ بھی رکھو۔ نفلی روزے اگر رکھتے ہو تو ضرور رکھو لیکن ایسا نہیں کہ ہمیشہ روزہ ہی رکھو۔ روزہ بھی رکھو، افطار بھی کرو کہ تمہارے بدن کا بھی تم پر حق ہے۔ تمہاری صحت درست رہے، تمہارے قویٰ مضبوط رہیں، تمہاری سوچ ٹھیک رہے کیونکہ عمل کا مدار بڑی حد تک جسمانی صحت پر بھی ہے۔

وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا۔۔۔۔ تمہیں معتدل امت بنایا ہے۔ تمہیں اپنی پسند سے کسی انتہا کو اختیار نہیں کرنا بلکہ اللہ کے حکم کی اطاعت کرنی ہے۔ اس کے حکم کے تحت قبلہ بیت المقدس تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ادھر رخِ انور کر کے عبادت کرتے تھے۔ اب اللہ نے بیت اللہ کو قبلہ مقرر کر دیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے رخِ انور اس سمت کر لیا۔ بیت اللہ کی اپنی ایک عظمت بھی ہے بلکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی جو نشانیاں پہلی کتابوں میں دی گئیں ان میں سے ایک نشانی یہ بھی تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا قبلہ بیت اللہ شریف ہوگا۔

اللہ کریم کا یہ احسان ہے کہ اس نے تمہیں کسی انتہا پہ پابند نہیں کیا بلکہ تم ہر معاملے میں، لین دین میں، کاروبار میں، معاملات میں، تعلقات میں، اخلاقیات میں اعتدال پر ہو۔ شریعتِ مطہرہ کے احکام اور حیاتِ طیبہ صلی اللہ علیہ وسلّم جو قرآن کریم کا مجسم مفہوم ہے، ہر طرح سے اعتدال ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم نے شادیاں بھی کیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلّم نے رشتہ داروں کا بھی خیال رکھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلّم نے بچوں کی بھی پرورش کی، آپ صلی اللہ علیہ وسلّم نے بزرگوں کا لحاظ رکھا۔ دنیوی معاملات میں، ہر شعبہ زندگی میں نقوشِ کفِ پائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم موجود ہیں اور ہر کام کو آپ صلی اللہ علیہ وسلّم نے اعتدال سے کیا۔ کہیں کمزوری نہیں پائی جاتی اور کہیں شدت نہیں پائی جاتی۔ دینِ اسلام سارے کا سارا اعتدال پر ہے۔

اسلام میں کسی بھی شعبۂ زندگی میں، حتیٰ کہ جہاد میں بھی انتہا پسندی نہیں ہے یعنی جہاد کا بھی ایک سبب ہے کہ کہیں ظلم ہو رہا ہے تو اسے روکنے کے لیے کیا جاتا ہے۔ اگر ظالم ظلم سے رک جائے تو محض لوگوں کو قتل کرنا مقصد نہیں ہے۔ اس میں ایک اعتدال ہے کہ اگر وہ توبہ کر لیتا ہے یا اس ظلم سے رک جاتا ہے تو جہاد ختم ہو جائے گا، تلوار میان میں رکھ دی جائے گی۔

دنیا کا امن اعتدال میں ہے:

یاد رکھیں! جس طرح وجود کی زندگی اعتدال پر ہی قائم رہتی ہے، کوئی خلیہ یا کوئی چیز بڑھ جائے یا کوئی چیز کم ہو جائے تو بدن بیمار ہو جاتا ہے۔ انسانی وجود کی حیات اور صحت و سلامتی اعتدال پر ہے کہ ہر چیز اپنی اپنی حد میں رہے، اسی طرح قوموں کی زندگی بھی اعتدال پر منحصر ہے۔ اسی طرح نوعِ انسانی کی زندگی کا انحصار بھی اعتدال پر ہے۔ جہاں بھی زیادتی یا کمی ہوگی، معاشرے میں استحصال ہوگا۔ کچھ لوگ غریب سے غریب تر اور کچھ امیر سے امیر تر ہوتے چلے جائیں گے تو یہ غیر معتدل معاشرہ ہوگا، جس کا نتیجہ فساد ہوگا۔ اگر اعتدال ہوگا، معاشرے میں ہر ایک کو مساوی حقوق حاصل ہوں گے، جتنی کوئی محنت کرتا ہے اتنی اجرت پالے گا اور انصاف سے پالے گا، دوسرے کا حق نہیں مارا جائے گا خواہ ایک شخص زیادہ محنت کر کے زیادہ کما لے اور دوسرا تھوڑا کام کرتا ہے اور تھوڑا کماتا ہے لیکن اس میں فساد نہیں ہوگا۔ جسے کم ملتا ہے وہ جانتا ہے کہ میں نے کام تھوڑا کیا ہے۔ جسے زیادہ ملتا ہے وہ جانتا ہے کہ میں نے محنت زیادہ کی ہے۔ ان میں اعتدال ہوگا، ان میں رقابت نہیں، رفاقت ہوگی۔ جب معاشرے میں یہ صورت ہو کہ کچھ لوگ محنت کرتے رہیں لیکن انہیں کچھ نہ ملے اور کچھ لوگ کچھ نہ کریں لیکن دوسروں کے حصے کا بھی لوٹ کر لے جائیں تو یہ غیر معتدل معاشرہ ہوگا۔ اس میں خرابیاں پیدا ہوں گی، قتل و غارت ہوگی، چوری ہوگی، حصول زر کے ناجائز طریقے اپنائے جائیں گے۔

اسی طرح اقوامِ عالم میں بھی دنیا کی آبادی اور دنیا کی صحت کا راز، انسانی برادری کی صحت مندی کا راز اعتدال میں ہے۔ کوئی بھی قوم اگر اپنی حد سے تجاوز کرے گی تو دنیا میں فساد پھیل جائے گا۔ کوئی اپنے آپ کو دوسروں پر مسلط کرنا چاہے گا تو ہولناک تباہی لائے گا۔ کسی کو اتنا دبا دیا جائے گا کہ اسے حد سے گرا دیا جائے تو نتیجہ ہمیشہ الٹ نکلے گا۔ کبھی طاقت اور زور سے انصاف قائم نہیں ہوتا، انصاف ہمیشہ عدل سے قائم ہوتا ہے کہ ظلم کی ضد عدل ہے، ظلم کی ضد طاقت نہیں ہے۔ جس طرح اندھیرے کی ضد روشنی ہے، اندھیرا روشنی لانے سے جائے گا، آپ اس پر توپیں داغتے رہیں یا اس سے لڑائی کرتے رہیں تو اس سے اندھیرے کی صحت پر کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ ہاں! روشنی ہوگی تو ظلمت چلی جائے گی۔ اسی طرح عدل ہوگا تو معاشرے سے ظلم رخصت ہو جائے گا۔ اعتدال یہ ہے کہ ہر شخص کو اس کی ضرورت کی چیز، اس کی حیثیت، اس کی ضرورت اور اس کی محنت کے مطابق مل جائے۔

فرمایا، تم امتِ اوسط ہو، معتدل امت، وہ قوم جس کا ہر کام اعتدال پر ہے۔ کہیں کمزوری بھی نہیں ہے، کہیں شدت بھی نہیں ہے، زیادتی بھی نہیں ہے۔ اگر کوئی کمزوری دکھاتا ہے تو وہ بھی شریعت کے خلاف کر رہا ہے۔ اگر کوئی شدت دکھاتا ہے تو وہ بھی شریعت کی حدود سے نکل رہا ہے اعتدال صرف شریعت اسلامی میں ہے۔

اقوام عالم پہ گواہی:

وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ۔۔۔۔ تمہارے ہاں اعتدال کیوں نہ ہو جبکہ تمہیں تو ایک گواہ کی حیثیت سے بھی اللہ کے روبرو کھڑے ہو کر شہادت دینی ہے کہ تیری دنیا میں فساد بپا کرنے والے کون تھے۔ کون ایسے لوگ تھے جن کی کمزوریاں خرابی لائیں یا کون ایسے لوگ تھے جن کی شدت پسندی خرابی لانے کا سبب بنی۔

لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ۔ النَّاس سے آدم علیہ السلام کی اولاد مراد ہے کہ روئے زمین کی ساری آدمیت پر، اقوام عالم پر تم گواہ ہو گے۔ جس زمانے میں یہ بات ارشاد فرمائی جا رہی ہے اس وقت روئے زمین پر انسانیت کی اجتماعیت کا تصور موجود نہیں تھا۔ حکومتیں تھیں، الگ الگ ممالک تھے، الگ الگ عوام تھے، ہر ایک کی الگ الگ اپنی دنیا تھی۔ سب سے پہلے اسلام نے پوری انسانیت کے ایک جان ہونے کی بات ارشاد فرمائی اور سب سے پہلے آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم نے ساری انسانیت کو مخاطب فرمایا: یا ایھا الناس اے اولادِ آدم (علیہ السلام!) تم جہاں بھی ہو، تم جیسے بھی ہو، اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا (الاعراف: 158) میں سب کے لیے اللہ کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہوں۔ یہ اجتماعی تصور آقائے نامدار حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا۔

یہاں پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی گواہی کا ذکر ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت سے امت کے

راہِ اعتدال پر چلنے کا بیان ہے لہٰذا یہ یقینی بات ہے کہ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کی رسالت قبول کرتا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلّم پر ایمان لاتا ہے اسے آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کے اسوۂ حسنہ کو بھی قبول کرنا پڑے گا اور اسوۂ حسنہ میں سراسر اعتدال ہے، کمزوری ہے نہ شدت ہے، تو تم ایک ایسی قوم ہو جسے اللہ نے معتدل بنایا ہے اور تم وہ لوگ ہو جو میدانِ حشر میں گواہی دو گے کہ یا اللہ تیری مخلوق کو تباہ کرنے کے ذمہ دار کون لوگ تھے، تیرے بندوں کو مصائب میں مبتلا کرنے والے کون لوگ تھے، کون لوگ تھے جن کے اعمال میں کمزوری یا شدت کی وجہ سے لوگ تکلیف میں مبتلا ہوئے۔

جب یہ ارشاد فرمایا جا رہا ہے، تب روئے زمین پر ساری انسانیت کے ساتھ رابطے کا کوئی تصور موجود نہیں تھا لیکن دیکھیں آج اللہ نے روئے زمین کو ایک گاؤں میں بدل دیا ہے اور ہر قوم دوسری قوم کے کردار سے آگاہ ہے بلکہ ہر فرد دوسرے فرد کے کردار سے آگاہ ہے۔ دنیا میں کون کیا کر رہا ہے، کم و بیش ہر فرد کی نظر میں ہے اور روزانہ ساری بات سامنے آتی ہے تو فرمایا کہ تمہیں اس پر گواہی دینی ہوگی۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم بطور گواہ:

وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا ۔۔۔۔اور تم پر محمد رسول صلی اللہ علیہ وسلّم گواہ ہوں گے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی گواہی کیا ہوگی؟ مسلمان تو لوگوں کا مشاہدہ کر رہے ہیں اور ان پر گواہی دیں گے کہ فلاں کا کردار یہ تھا، فلاں کا کردار ایسا تھا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کیا گواہی دیں گے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم یہ گواہی دیں گے کہ یا اللہ! مومنین کا، مسلمانوں کا، میری امت کا کردار وہ ہے جو میں نے انہیں تعلیم فرمایا، یا اللہ! یہ کسی قوم سے ذاتی عداوت، حسد یا بغض نہیں رکھتے اس لیے کہ یہ میری سنت پر عمل پیرا ہیں۔ یا اللہ! ان کی سوچیں کسی کے حق میں خراب نہیں ہیں، اس لیے کہ یہ میری سنت کے مطابق سوچتے ہیں۔

اگر مقام و مرتبہ دیکھا جائے تو میدانِ حشر میں اس سے بڑے کسی مرتبے کا تصور تک نہیں کیا جا سکتا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کسی کے راست باز ہونے کی تصدیق فرمائیں اور دوسری طرف دیکھا جائے تو زندگی کے جتنے دن نصیب ہوئے ہیں، ان میں سب سے اہم ذمہ داری یہ ہے کہ کہیں ہم ایسے نہ ہو جائیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم انکار فرما دیں کہ یا اللہ اس بندے کا ذمہ دار میں نہیں ہوں، اس کی گواہی میں نہیں دوں گا۔ ہر مسلمان کو اپنی انفرادی اور ذاتی زندگی میں یہ دیکھنا چاہیے کہ کیا اس کا کردار ایسا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم اس کے سر پہ دستِ شفقت رکھ کے فرمائیں گے، اس نے جو کیا ٹھیک کیا۔ یہ تو قربِ الٰہی کی بہت عظیم منزل ہے کہ اپنے ایک امتی کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم خود تصدیق فرمائیں کہ میرا یہ امتی کسی شخص کے بارے، کچھ افراد کے بارے، کسی قوم کے

بارے، اقوامِ عالم کے بارے میں جو اطلاع دے رہا ہے، یہ اس لیے ٹھیک ہے کہ اس بندے نے ساری عمر میری اطاعت کی، میرے نقشِ قدم پر چلا، میری سنت پہ چلا، لہٰذا یہ کسی ذاتی رنجش سے یا کسی دشمنی سے یا کسی غم و غصے سے یا کسی حسد اور بغض سے نہیں کہہ رہا بلکہ یہ جو کچھ کہہ رہا ہے، سچ کہہ رہا ہے، حق کہہ رہا ہے چونکہ ساری زندگی حق کا پیروکار رہا۔ بحیثیت مسلمان اللہ کریم نے ہمیں یہ منزل عطا کر دی اور یہ منصب عطا کر دیا اور بہت ہی بلند اور اعلیٰ منصب عطا کر دیا۔ اب بحیثیت مسلمان ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ کیا واقعی ہم ایسے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم ہمارے حق میں گواہی دیں گے!

وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ۔۔۔۔ہم نے تمہیں امتِ اوسط بنایا ہے تمہارا سارا کردار اوسط ہے، معتدل ہے۔ اس میں نہ کمی ہے نہ بیشی ہے اور اس لیے بنایا ہے کہ روزِ محشر تم اقوامِ عالم پر گواہی دو کہ یا اللہ انہوں نے یہاں یہاں زیادتیاں کیں۔

وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ۔۔۔۔اور تم پر آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلّم گواہی دیں۔ یہ نہ ہو کہ کفار تو کہہ دیں، یا اللہ! یہ تو دنیا میں بھی ہمارے ساتھ دشمنی کرتا تھا، اب بھی ہماری دشمنی میں گواہی دے رہا ہے۔ یہ دنیا میں بھی ہمیں اچھا نہیں سمجھتا تھا، اب میدان حشر میں بھی ہمارے خلاف کھڑا ہے۔ اس صورت میں تمہارا ثبوت کیا ہوگا کہ تم سچ کہہ رہے ہو؟ تمہارا ثبوت یہ ہوگا کہ تمہارے نبیؐ، تمہارے رسول، آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلّم فرمائیں گے اے اللہ! یہ ایسا نہیں ہے۔ یہ میرا متبع ہے، کیوں جھوٹ بولے گا! ہمیں اپنے کردار میں یہ تلاش کرنا پڑے گا، کیا اس پر شہادتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلّم کی امید کی جاسکتی ہے۔ اللہ ہمیں اس کی توفیق دے اور جہاں جہاں کمی ہے، اس کی اصلاح کی توفیق بھی عطا فرمائے کہ ابھی وقت ہے۔ جب تک سانس باقی ہے تب تک آس ہے کہ مثبت تبدیلی اختیار کی جائے۔

اتباعِ رسول صلی اللہ علیہ وسلّم :

اگر قرآن حکیم کی اس ایک بات کو سمجھ لیا جائے، اپنا لیا جائے تو کوئی مصیبت، مصیبت نہیں رہتی، کوئی دکھ دکھ نہیں رہتا، کوئی تکلیف تکلیف نہیں رہتی اور کوئی پریشانی پریشانی نہیں رہتی۔ اہل اللہ اس کردار کو فنا فی الرسول صلی اللہ علیہ وسلّم کہتے ہیں۔ فنا فی الرسول صلی اللہ علیہ وسلّم اہل اللہ میں ایک مقام و مرتبہ ہے اور اس کے مشاہدے یا کشف کی بات الگ ہے کہ اس میں کشفاً یا مشاہدے میں کیا نظر آتا ہے یا کیا ہوتا ہے۔ میں اس موضوع کی طرف نہیں آرہا لیکن یہ بات ضروری ہے کہ جسے یہ مقام نصیب ہو جائے اس کی حرکات و سکنات اپنی نہ ہوں، وہ ہوں جن کا حکم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے دیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کے ارشادات کے سامنے

اس شخص کی اپنی رائے فنا ہو جائے، اسے فنافی الرسول صلی اللہ علیہ وسلّم کہتے ہیں۔ اگر کسی کو فنافی الرسول صلی اللہ علیہ وسلّم نصیب ہو جائے تو اس سے بڑی کیا بات ہو سکتی ہے۔

تحویل کعبہ اتباع رسالت صلی اللہ علیہ وسلّم کا امتحان بھی تھا:

فرمایا، جہاں تک تحویلِ قبلہ کا تعلق ہے تو اس میں بہت سی حکمتیں تھیں اور ایک حکمت یہ بھی تھی: وَ مَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِیْ كُنْتَ عَلَیْهَاۤ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ یَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ یَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَیْهِ ---- کہ یہ بات ظاہر ہو جائے کہ کون محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا اتباع کرتا ہے اور کون الٹے پاؤں واپس ہو جاتا ہے۔ لوگ مدتوں سے بیت المقدس کو قبلہ مانے ہوئے تھے۔ اب اسی عادتِ گزشتہ کے مطابق جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم نے بھی ادھر رخِ انور کر کے نمازیں ادا کیں تو ساتھ شامل ہو گئے۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ لوگ اپنی عادت پر اصرار کرتے ہیں یا محمد رسول صلی اللہ علیہ وسلّم کی غلامی میں رہتے ہیں؟ بیت المقدس تو مدتوں سے قبلہ چلا آ رہا تھا اور لوگ عادی تھے وہی قبلہ یہودیوں کا بھی تھا، وہی عیسائیوں کا بھی تھا، اوّل مسلمانوں کا بھی وہی قبلہ تھا۔ جب حکم آیا کہ بیت اللہ کو، حرم کو اپنا قبلہ مقرر کیجیے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلّم نے رخِ انور ادھر پھیرا تو اتباعِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلّم جن میں رچ بس چکی تھی، انہوں نے بغیر پوچھے رخ ادھر پھیر لیا لیکن جن میں ابھی اپنی عادت پکی تھی کہ پہلے بھی قبلہ یہی تھا، اب بھی ٹھیک ہے، وہ متذبذب ہو گئے۔

زندگی کیا ہے؟ یہی ایک امتحان ہے۔ ساری زندگی اسی بات کی پرکھ ہوتی ہے کہ ہم کہاں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا اتباع کتنا کرتے ہیں اور کہاں سے اتباعِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلّم چھوڑ کر ہوائے نفس کے پیچھے چلے جاتے ہیں، اپنے غم و غصے کے پیچھے چلے جاتے ہیں، اپنے ذاتی افکار کے پیچھے چلے جاتے ہیں۔ یاد رکھیں! ہمارے رواجات اور رسومات میں بے شمار ایسی چیزیں ہیں جو شرعاً ممنوع نہیں ہیں۔ جو چیز شرعاً منع نہیں ہے اسے مباح سمجھنا یا ایسا کرنا ایک اور بات ہے لیکن اس کو عبادت سمجھ کر کرنا بدعت ہے۔ عبادت وہی کام ہے جسے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم نے عبادت قرار دیا ہے۔ اگر وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم سے، خلفائے راشدینؓ سے، صحابہ کرامؓ سے، متقدمین سے ثابت نہیں ہے اور اسے ہم ثواب سمجھ کر کرتے ہیں تو وہ بدعت ہے اور یاد رکھیں! ہر بدعت ایک سنت کو گرا کر اپنی جگہ بناتی ہے۔ سنت وہاں سے اٹھ جاتی ہے جہاں بدعت رکھی جاتی ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا، ہر بدعت گمراہی ہے، ہر گمراہی جہنم میں ہو گی۔ كُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ وَ كُلُّ ضَلَالَةٍ فِي النَّارِ (متفق علیہ) اوکما قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم ہر بدعت ایک گمراہی ہے اور ہر گمراہی جہنم میں جائے گی۔

ایک شخص نماز عید کے لیے نکلا۔ نماز میں کچھ وقفہ تھا تو اس نے اشراق کے نفل پڑھنے شروع کر دیے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم تشریف لائے اور دیکھا کہ وہ نوافل پڑھ رہا ہے۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پوچھا، یہ کون سی نماز شروع کر رکھی ہے؟ حضرت! ابھی عید کی نماز میں کچھ وقت باقی تھا اور اشراق کا وقت تھا تو میں نے کہا چلو اشراق پڑھ لوں۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا، تمہارے جہنم جانے کے لیے یہی کافی ہے۔ حیران ہو گیا، آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایسا کیوں فرما رہے ہیں، میں تو نوافل ادا کر رہا ہوں؟ فرمایا، عید کے روز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عید کی نماز سے پہلے کوئی نوافل نہیں پڑھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں ہے کہ نمازِ عید سے پہلے اشراق پڑھے جائیں اور تم خلافِ سنت پڑھ رہے ہو۔ خلافِ سنت کوئی بھی عمل جہنم میں لے جانے کے لیے کافی ہے۔ یہ اس دور کی بات ہے جو صحابہ کرامؓ کا دور تھا۔ اس نے استغفار کیا، اللہ مجھے معاف کر دے مجھے پتہ نہیں تھا۔ اس نے بحث نہیں کی، اس نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ نہیں کہا کہ آپ وہابی ہیں، آپ مجھے عبادت کرنے سے روک رہے ہیں۔ اب آپ اندازہ کیجیے کہ جو اضافے اور رواج ہم بناتے ہیں، ان کی کیا حیثیت ہے!

درود پاک کو اذان کا حصہ نہ بنائیں:

درود پڑھو، ساری رات پڑھو۔ درود شریف کا پڑھنا ایک ایسا وظیفہ ہے، ایک ایسی دعا ہے جو دو عالم کی سختیوں کی ڈھال ہے لیکن درود شریف کو اذان کا حصہ بنانا درست نہیں ہے، اذان الگ ہے، جتنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تلقین فرمائی اور جو حضرت بلال حبشی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دی، وہی اذان ہے۔ اب اس کے آگے پیچھے کوئی درود لگائے یا اس کے پیچھے قرآن لگا لے، جو بھی لگا لے، اگر اس میں کمی کرے گا تو خطا کار ہو گا، زیادتی کرے گا تو بھی خطا کار ہو گا، اور مجرم بھی ہو گا۔

اگر کوئی عبادت میں، اذان کہنے میں، مساجد میں بھی اعتدال سے ہٹ گیا تو عام زندگی میں وہ معتدل مسلمان کہاں ثابت ہو گا، امتحان یہ ہے فرمایا: مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ۔۔۔ کون بلا تردُّد اتباعِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کرتا ہے۔ اور اگر کسی کے دل میں اعتراض پیدا ہوتا ہے تو وہ اس سے محروم ہو جاتا ہے۔ ایک شخص نے مجھ سے کہا، میں دو کپ چائے پیتا ہوں، اگر تین پی لوں تو کیا حرج ہے! چائے ہی پی رہا ہوں۔ میں اذان تو کہتا رہوں لیکن اس پر دو دفعہ درود شریف بھی پڑھ لوں تو درود شریف ہی ہے، اس میں کیا حرج ہے؟ میں نے کہا آپ فجر کی دو ہی رکعتیں کیوں پڑھتے ہیں؟ کبھی تین، کبھی چار، کبھی پانچ پڑھ لیا کریں۔ آپ بزرگ آدمی ہیں کام کاج ہوتا نہیں، فارغ ہیں تو آپ دو رکعت پہ کیوں رک جاتے ہیں؟ ''نہیں نہیں، وہ تو ہیں ہی دو!'' میں

نے کہا اذان بھی اسی طرح اتنی ہی ہے۔ یہ چائے کا پیالہ نہیں ہے، یہ اللہ کی عبادت ہے۔ اس کی حدود و قیود ہیں اور جو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے تعلیم فرمائی، وہی حق ہے۔ اب اگر اس میں کمی کریں گے یا اضافہ کریں گے تو آپ امتِ اوسط نہیں رہیں گے، آپ اعتدال پر نہیں رہیں گے۔

یہ تو میں نے ایک بات کہہ دی جو بہت عام ہوگئی ہے اور جسے کہنے سے سب ڈرتے ہیں۔ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ بات بتانی چاہیے۔ مجھے ایسا کرنے والوں سے امید نہیں ہے کہ وہ سنبھلیں گے۔ دعا ضرور کرتا ہوں اللہ کرے سنبھل جائیں۔ اللہ سب مسلمانوں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کا اتباع نصیب فرمائے۔ علمائے حق فرماتے ہیں کہ بدعت سے توبہ بہت مشکل ہوتی ہے، اس لیے کہ بدعتی بدعت کو ثواب سمجھتا ہے۔ جب وہ سمجھتا ہی ثواب ہے تو توبہ کیوں کرے گا؟ گناہ سے توبہ آسان ہوتی ہے کہ گناہ کرنے والا بھی اپنے دل میں اسے جرم سمجھتا ہے اور کسی وقت اسے جرم سمجھ کر چھوڑ بھی سکتا ہے، توبہ کر سکتا ہے لیکن جس بات کو وہ عبادت یا ثواب سمجھتا ہے، وہ بدعت ہے اور اسے توبہ بھی کم ہی نصیب ہوتی ہے، اللہ ہی کسی کو توفیق دے تو دے۔ اس لیے مجھے امید نہیں کہ جو اس میں گرفتار ہیں وہ میرے کہنے سے باز آجائیں گے۔

آدابِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلّم:

ایک دن مجھ سے کسی نے پوچھا کہ ہم سپیکر پر اذان سے پہلے سلام ہی پڑھتے ہیں، اس پہ کیا اعتراض ہے؟ میں نے پوچھا آپ کا گھر کہیں مسجد کے قریب ہے، سپیکر کی آواز پہنچتی ہے؟ جی پہنچتی ہے۔ میں نے کہا کسی دن سپیکر آن کر کے مسجد میں چار پانچ بار اباجی کو السلام علیکم کہنا۔ اباجی السلام علیکم، اباجی السلام علیکم، بلند آواز سے سُر لگا کے کہنا۔ امید ہے، اباجی ان شاء اللہ مسجد میں آکر تمہیں مسئلہ سمجھا دیں گے۔ میں دیکھوں گا تم پر کتنے راضی ہوتے ہیں۔ اگر تم بھائی کو، والد کو وہاں سے سلام کہنا مناسب نہیں سمجھتے تو تمہیں عظمت رسالت صلی اللہ علیہ وسلّم کا کوئی احساس نہیں ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلّم حجرہ مبارک کے اندر تشریف فرما تھے اور ایک صحابیؓ کو دینی مسئلہ پوچھنا تھا۔ وہ صحرائی تھا، اپنا ریوڑ، اپنے جانور چھوڑ کر آیا اور اسے جلدی تھی۔ اس نے حجرہ مبارک کے باہر سے آواز دی کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم میری گزارش سنیے، باہر تشریف لائیے۔ اللہ نے اس پہ کرم فرمایا، چونکہ مخلص تھا اسے اسلام سے نکالا تو نہیں لیکن ارشاد ہوا: اِنَّ الَّذِيْنَ يُنَادُوْنَكَ مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرٰتِ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ (الحجرات: 4) کہ دیوار کے باہر سے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کو پکار رہے ہیں، ایسے لوگ بہت جاہل ہیں بے وقوف ہیں۔ اس پہ تنبیہ ہوئی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم اندر جلوہ افروز ہیں، تم نے باہر سے آواز کیوں دی،

انتظار کرتے۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلّم اپنی مرضی سے باہر تشریف لاتے اور تمہاری طرف متوجہ ہوتے تو دریافت کرتے۔ اگر باہر تشریف لاتے اور کسی دوسری طرف متوجہ ہوتے، تو بھی تمہاری جرأت نہیں ہونی چاہیے تھی کہ آواز لگاتے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم میری بات سنیے۔ ہاں جب تمہاری طرف متوجہ ہوتے تو پھر اپنی گزارش پیش کرتے، یہ تقاضائے ادب ہے۔ درِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلّم سے باہر کھڑے ہو کر آواز لگانے والا تو جاہل ہے، یہاں سے سپیکر پر سلام کہنے والا کیا ہوگا؟

مجھے کسی سے نہ کوئی رنجش ہے نہ دشمنی، نہ مجھے اس سے غرض ہے کون دیو بندی ہے، کون بریلوی ہے۔ دیو بند کو بنے ایک سو سال ہوا ہے اور بریلی کو بھی ایک صدی سے کوئی دو چار سال کم ہوں گے یا ممکن ہے صدی پوری ہوگئی ہو، تو یہ چودہ سو سال پہلے والا اسلام کیا تھا! جب دیو بند میں مدرسہ ہی نہیں تھا، بریلی میں مدرسہ ہی نہیں تھا، یہ تیرہ صدیاں پہلے کون تھے، دیو بندی تھے، بریلوی تھے، میں ان مسلمانوں میں سے ہوں جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا اتباع کرتے ہیں۔ میں نہ دیو بندی ہوں، نہ بریلوی ہوں، مسلمان ہوں لیکن حق حق ہے اور یہ چھوٹی چھوٹی باتیں ہمیں حق سے ہٹا دیتی ہیں۔

وَاِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً اِلَّا عَلَى الَّذِيْنَ هَدَى اللهُ ۔۔۔۔ بہت مشکل کام ہے۔ بے چون و چرا، بغیر سوچے سمجھے، بغیر اس بات کی وجہ جانے اتباع کرنا اور غلامی کرنا بہت مشکل ہے۔ ہاں، ان کے لیے مشکل نہیں ہے جنہیں اللہ نے ہدایت دے دی اور جن کا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی رسالت پر یقین ہے۔ جنہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کی رسالت پر ایمان نصیب ہے، وہ صرف وہی کریں گے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلّم نے کیا، انہیں کوئی مشکل نہیں اور جنہیں یہ یقین حاصل نہیں، وہ اپنے اعتراضات، اپنے مشورے اور اپنی رائے کے پیچھے بھاگنا شروع کر دیں گے۔

وَمَا كَانَ اللهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ ؕ اِنَّ اللهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۴۳﴾ یاد رکھو! اللہ تمہارے ایمان کو ضائع نہیں کرتا۔ اکثر علمائے کرام فرماتے ہیں، یہاں ایمان سے مراد اعمال اور کردار ہے۔ ایمان تو ایک دعویٰ ہے اور ہر دعویٰ ثبوت چاہتا ہے۔ دعوے کے گواہ ہوتے ہیں۔ ایمان دعویٰ ہے اور اس کا گواہ ہمارا کردار اور ہمارے اعمال ہیں۔ بندہ کہتا ہے میں مسلمان ہوں اس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ اب وہ محمد رسول صلی اللہ علیہ وسلّم کا اتباع کرے۔ اگر وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کا اتباع نہیں کرتا، کام اپنی مرضی سے کرتا ہے، غلط کام کرتا ہے تو اس کی گواہی جھوٹی ہے۔ کہتا ہے میں مسلمان ہوں تو اس کے دعوے کا کوئی اعتبار نہیں۔

وَمَا كَانَ اللهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ ۔۔۔۔ اللہ کو یہ سزاوار نہیں ہے کہ تم اتباع کرو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا اور وہ اسے ضائع کر دیں۔ اس لیے کہ یقیناً اللہ عالمِ انسانیت کے ساتھ شفیق بھی ہے، مہربان بھی ہے، بہت کرم کرتا

ہے۔ انسان سوچ نہیں سکتا کہ وہ اس کے کتنے عیبوں کو چھپاتا ہے، اس کے کتنے گناہوں کو معاف کرتا ہے۔ جو نہیں معاف کرتا وہ بھی دوسرے پہ ظاہر نہیں کرتا۔ اس کے گناہوں، اس کے عیوب، اس کی گستاخیوں کے باوجود اس پر نعمتوں کی بارش مسلسل جاری رکھتا ہے۔ اسے روزی دیتا ہے، صحت دیتا ہے، غور و فکر کا موقع دیتا ہے، دنیا کی کتنی نعمتیں دیے جا رہا ہے، اس لیے کہ وہ لوگوں کے ساتھ بہت شفقت کا برتاؤ کرتا ہے، بہت مہربان ہے لیکن یاد رکھو! اس کی مہربانیوں کو رد کرنا سب سے بڑی گستاخی ہے۔ اللہ کریم ہمیں اس سے توبہ کی توفیق دیں، اتباعِ رسالت پناہی صلی اللہ علیہ وسلّم کی توفیق عطا فرمائیں، آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلّم کی محبت نصیب فرمائیں اور متبعین کے ساتھ زندہ رکھیں، متبعین کے ساتھ موت نصیب فرمائیں اور اتباع کرنیوالوں کے ساتھ یوم حشر کھڑا ہونا نصیب فرمائیں۔ آمین

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو بیت اللہ شریف سے خاص الفت تھی اور جب بھی وقت ملتا حضور صلی اللہ علیہ وسلّم بیت اللہ تشریف لے جاتے اور اکثر دوپہر بھی بیت اللہ شریف کے سائے میں، جہاں آجکل حطیم ہے، گزارا کرتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کے دل میں یہ تمنا بھی تھی کہ ہمارا قبلہ بیت اللہ شریف ہو جائے اور اس آرزو کے ساتھ بار بار رخِ انور اور نگاہیں آسمان کی طرف اٹھ جاتیں کہ شاید کوئی حکم آجائے، وحی الٰہی آجائے۔ ارشاد ہوتا ہے: قَدۡ نَرٰی تَقَلُّبَ وَجۡهِكَ فِي السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبۡلَةً تَرۡضٰهَا ۪ فَوَلِّ وَجۡهَكَ شَطۡرَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ ؕ وَحَيۡثُ مَا كُنۡتُمۡ فَوَلُّوۡا وُجُوۡهَكُمۡ شَطۡرَهٗ۔۔۔ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کا بار بار آسمان کی طرف رخ کرنا دیکھ رہے ہیں اور چونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کو اس کی آرزو ہے، ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کو اس قبلہ کی طرف متوجہ کر دیں گے جس کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی مرضی ہے تو اپنا منہ مسجد حرام کی طرف پھیر لو۔

پورا حرم قبلہ قرار دیا گیا:

یہاں بیت اللہ کو نہیں بلکہ سارے حرم کو قبلہ قرار دیا گیا۔ فَوَلِّ وَجۡهَكَ شَطۡرَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ۔۔۔۔۔ بیت اللہ شریف کا پورا حرم یا مکہ مکرمہ کا جو حرم ہے اور یہ حرم بہت وسیع ہے۔ اس کے چاروں اطراف میں نشان ہیں جدہ سے تھوڑا سا آگے نکلیں تو حرم شروع ہو جاتا ہے اور سب سے نزدیک وہ گوشہ ہے جہاں مسجد عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ہے۔ مدینہ منورہ سے آتے ہوئے یمن کی طرف بہت دور تک ہے۔ اسی طرح چوتھی سمت بھی کافی دور تک ہے۔ کسی طرف بیس پچیس کلومیٹر فاصلہ بھی ہے اور ان چاروں حدود کے اندر حرم ہے۔ بعض حجاج کرام یا عمرے پر جانے والوں کو یہ خیال ہوتا ہے کہ عین بیت اللہ کی مسجد میں نماز ادا کی جائے تو یہ حرم کی نماز ہے۔ جہاں تک حدودِ حرم ہیں ان کے اندر جہاں بھی آپ نماز ادا کریں گے وہ حرم میں ہوگی۔ اسی طرح مدینہ منورہ کی بھی حدودِ حرم ہیں جو شہر کے باہر کئی میل تک

ہیں جن کی نشان دہی کی گئی ہے۔ مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں نماز ادا کریں یا حدودِ حرم کے اندر کسی بھی جگہ نماز ادا کریں تو وہ نماز حرم میں ہوگی۔ اس طرح اللہ نے مسلمانوں کے لیے ایک بہت بڑی سہولت پیدا فرمادی۔ اگر بیت اللہ شریف کو قبلہ مقرر کیا جاتا تو یہ ایک چھوٹا سا مکان ہے اور روئے زمین سے عین سمت قبلہ تلاش کر کے مسجدیں بنانا آسان نہ ہوتا بلکہ ممکن نہ ہوتا۔ میلوں وسیع خطہ کو حرم قرار دیا لیکن اس کی طرف رخ کرنے میں بھی کچھ فرق رہ جاتا ہے۔ پیمائش کرنے کے ماہرین یہ کہتے ہیں کہ اگر چوبیس ڈگری کا بھی فرق ہو تو کہیں نہ کہیں رخ حرم کے سامنے ہوتا ہے۔ ہر کوئی یہ کوشش کرتا ہے کہ مسجد کا رخ بالکل صحیح ہو لیکن چوبیس درجے دائیں یا چوبیس درجے بائیں بھی ہو جائے تو اتنی وسعت ہے کہ رخ حرم شریف کی طرف ہو جاتا ہے۔

فرمایا، ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا رخ انور بار بار آسمانوں کی طرف اٹھنا دیکھ رہے ہیں۔ دنیا عالمِ اسباب ہے اور اللہ کریم ہر چیز کا کوئی نہ کوئی سبب پیدا فرماتے ہیں۔ جس طرح بعثت نبوی علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام طے تھی لیکن دعائے ابراہیمی کو ایک سبب بنا دیا، اسی طرح بیت اللہ کو امت مرحومہ کا قبلہ قرار دیا جانا طے تھا جس کا تذکرہ پہلی کتابوں میں بھی موجود تھا۔ پہلی آسمانی کتابوں میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جو نشانیاں دی گئیں، ان میں یہ نشانی بھی موجود تھی کہ اس امت کا قبلہ بیت اللہ ہوگا لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب اطہر میں اٹھنے والی آرزو کو تبدیلی کا سبب بنا دیا۔ وہ آرزو بھی خود پیدا فرمائی، اس کو سبب بھی خود بنایا اور اس کو قبول بھی خود فرمایا، وہ قادر مطلق ہے، سبحان اللہ!

فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۔۔۔ تو اپنا رخ انور، اپنا چہرہ مبارک وقت عبادت مسجد الحرام کی طرف پھیر دیجیے۔ اب مسجد حرام میں یہ وسعت آگئی کہ حرم کا پورا علاقہ مرکز قرار پایا۔ بیت اللہ کی عظمت اپنی جگہ لیکن روئے زمین پر دور دراز، جہاں بھی کوئی مسجد بنتا ہے یا عبادت کے لیے کھڑا ہوتا ہے، اس کا رخ حرم شریف کی طرف ہونا چاہیے اور حرم ایک وسیع علاقہ ہے اگر اس کی تھوڑی بہت سمت قبلہ سے ہٹ بھی جائے تو حد حرم کے اندر رہتی ہے۔

وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ ۔۔۔ اے مسلمانو! تم جہاں کہیں بھی ہو، نور ایمان جہاں تک پھیلے، دنیا کے دوسرے سرے تک چلا جائے، تم جہاں کہیں بھی ہو، عبادت کے وقت اپنا رخ مسجد الحرام کی طرف کر لو۔ علماء یہود اور علماء نصاریٰ کا یہ اعتراض کہ پہلے اس قبلے کی طرف تھے اب ادھر پھر گئے، تو یہ اعتراض وہ جان بوجھ کر کرتے ہیں۔ فرمایا: وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۔۔۔ انہیں خوب اچھی طرح پتہ ہے کہ اللہ کی طرف سے یہ حق ہے اور ان کی کتابوں میں یہ پیش گوئی موجود ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوں گے تو ان کی امت کا قبلہ حرم شریف ہوگا۔ یہ ان کی

کتابوں میں موجود بھی ہے۔ یہ اچھی طرح جانتے بھی ہیں۔

وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۴﴾ اور اللہ ان کے کرتوتوں سے بے خبر نہیں ہے۔ اللہ ان کے کرتوتوں کو خوب سمجھتا ہے۔ یہ اس کا نتیجہ بھگتیں گے، اس لیے کہ یہ نہ صرف خود اعتراض کر کے گمراہ ہو رہے ہیں، خود تو پہلے ہی گمراہ تھے، اب اللہ کی مخلوق کو گمراہ کرنے کا بھی سبب بن رہے ہیں۔

گناہ کے اثرات

گناہ بھی دو طرح کے ہوتے ہیں، ایک وہ جو صرف انسان کی اپنی ذات کو متاثر کرتا ہے۔ یہ بظاہر تو ذات ہی کو متاثر کرتا ہے لیکن بالواسطہ پوری مخلوق کو متاثر کرتا ہے جو فعل بھی ہم سے صادر ہوتا ہے، جو کلمہ ہماری زبان سے نکلتا ہے، جو سوچ ہم سوچتے ہیں، یہ سب چیزیں نور پیدا کرتی ہیں یا ظلمت۔ ہر قول، ہر فعل، ہر سوچ سے اگر وہ مثبت ہے، اتباع رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق ہے، اللہ کے حکم کے مطابق ہے تو نور پیدا ہوتا ہے اور وہ نور اس شخص کی ذات کو تو براہ راست متاثر کرتا ہی ہے ساتھ کائنات کو بھی متاثر کرتا ہے اس کے برعکس اگر کوئی شخص برا سوچتا ہے، برا بولتا ہے یا برا کرتا ہے تو ظلمت پیدا ہوتی ہے جو خود اس شخص کو بھی لپیٹ لیتی ہے اور کائنات بھر میں اس کا اثر پھیل جاتا ہے۔ ایک گناہ وہ ہے جس میں بندہ ذاتی نقصان کرتا ہے لیکن ایک گناہ وہ بھی ہے جس میں دوسروں کا اجتماعی نقصان ہوتا ہے۔ مثلاً یہود و نصاریٰ تحویل کعبہ پر جو فضول اعتراض کر رہے تھے، اس کا اثر عام لوگوں پر بھی ہو رہا تھا کہ یہ مذہب ٹھیک نہیں ہے۔ اللہ کی مخلوق کو گمراہ کرنے کا سبب بننا، یہ بہت بڑا جرم ہے۔ اگر کوئی ذاتی گناہ کرتا ہے اور اس کی نحوست اطراف میں پھیلتی ہے تو یہ بھی جرم ہے لیکن براہ راست ایسی بات کرنا یا ایسا کام کرنا جس سے اللہ کی مخلوق گمراہی پہ جمی رہے اور ہدایت نہ پا سکے تو یہ بہت بڑا جرم ہے۔

اس لیے فرمایا گیا: وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۴﴾

یاد رکھو! تم لوگ جو کر رہے ہو، اللہ اس سے غافل نہیں ہے، اللہ دیکھ رہا ہے، اللہ سن رہا ہے، اللہ جانتا ہے۔ تم بہت بڑا جرم کر رہے ہو اور اس کا تمہیں حساب دینا ہوگا۔

اہلِ کتاب کی ہٹ دھرمی:

وَلَئِنْ اَتَيْتَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ بِكُلِّ اٰيَةٍ مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ ۔۔۔۔۔ اب ان یہود و نصاریٰ اور اہلِ کتاب کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم جتنی دلیلیں چاہیں دے لیں، یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قبلہ کا اتباع نہیں کریں گے۔ دلیل وہاں موثر ہوتی ہے جہاں مقابل کے پاس دلیل نہ ہو یا وہ کسی غلط دلیل پر قائم ہو لیکن جو جانتا ہو کہ حق کیا

ہے اور اس کا انکار کر رہا ہو، پہلے سے جانتا ہو کہ یہ حق ہے اور جان بوجھ کر حق کی مخالفت کر رہا ہو، تو اسے جتنی بھی دلیلیں دیتے رہیں وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی بات نہیں مانے گا۔

وَ مَآ اَنۡتَ بِتَابِعٍ قِبۡلَتَهُمۡ ۔۔۔۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کو ان کے قبلے کا اتباع کرنے کی ضرورت نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کا قبلہ تو رب جلیل نے خود مقرر فرما دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کو کیا ضرورت ہے کہ ان کے قبلے کا اتباع کریں۔ وہ یہ کہتے تھے کہ ہم میں ایک بات مشترک تھی کہ بیت المقدس ہمارا بھی قبلہ تھا اور مسلمانوں کا بھی تھا۔ ہم میں کوئی ایک بات تو ایسی تھی جس پہ ہم متحد تھے، دیکھو انہوں نے تو یہ بھی تبدیل کر دیا اور وہ ایک بات جو سب میں مشترک تھی، وہ بھی جاتی رہی۔ اللہ کریم فرماتے ہیں کہ یہ جھوٹ بولتے ہیں، ان کی کتابوں میں موجود ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی جو نشانیاں اللہ نے دی ہیں، ان میں یہ بات بھی موجود ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی امت کا قبلہ مسجد الحرام ہوگا۔ یہ جان بوجھ کر انکار کر رہے ہیں جو جان بوجھ کر انکار کرتا ہے، اسے آپ صلی اللہ علیہ وسلّم دلائل دیتے رہیں تو وہ بات نہیں مانے گا، اسی طرح یہ بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کے قبلے کو نہیں مانیں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کو بھی ان کے قبلے کو اپنانے کی ضرورت نہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کو تو اللہ کریم نے براہ راست حکم دے دیا۔

دوسری بات یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ خود بھی ایک قبلہ پر متفق نہیں ہیں وَمَا بَعۡضُهُمۡ بِتَابِعٍ قِبۡلَةَ بَعۡضٍ ۔۔۔۔ بیت المقدس میں بھی انہوں نے الگ الگ سمتیں بنائی ہوئی تھیں۔ یہود کہتے تھے کہ جدھر اسحٰق علیہ السلام کی اور ابراہیم علیہ السلام کی قبر ہے، ادھر منہ ہونا چاہیے لیکن نصاریٰ کچھ اور کہتے تھے۔ گویا یہ بیت المقدس کو بھی قبلہ نہیں مانتے تھے بلکہ یہود جن بزرگوں کی عظمت کے قائل تھے، ان کے مزارات کی طرف کھنچتے تھے، نصاریٰ دوسری طرف کھنچتے تھے۔ فرمایا، ان کا تو یہ عالم ہے کہ یہ تو آپس میں بھی ایک دوسرے کے قبلہ کو قبلہ نہیں مانتے۔

اللہ کے فیصلے کے برعکس خیر سگالی ظلم ہے:

چنانچہ اے مسلمان، مسجد الحرام کو قبلہ ماننے والے! وَلَئِنِ اتَّبَعۡتَ اَهۡوَآءَهُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الۡعِلۡمِ ۔۔۔۔ اس کے بعد کہ تمہارے پاس اللہ کی طرف سے واضح علم آ چکا، اگر پھر بھی تم نے ان کے قبلہ کو قبلہ ماننا چاہا، اس لیے کہ یہ بڑا خیر سگالی کا کام ہے تو یاد رکھو! اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيۡنَ ۝ تو پھر تم بھی ظالموں میں شمار کیے جاؤ گے۔

ظلم کا لغوی معنی ہے وَضۡعُ الشَّیۡءِ غَیۡرَ مَحَلِّهٖ کسی چیز کو ایسی جگہ رکھنا جو اس کی جگہ نہ ہو یعنی غلط کام کرنا، وہ کام کرنا، اس طریقے سے کرنا جس طریقے سے کرنا مناسب نہ ہو وہ کام کرنا جس کا کرنا صحیح نہ ہو۔ فرمایا،

اے مسلمانو! اگر تم یہ سوچنے لگے کہ دنیا میں اتنے یہود و نصاریٰ ہیں اور ہم ان سے قبلہ مشترک کر لیں، قبلہ ہی تو ہے، بیت المقدس کی طرف منہ کر لیں تو ہم میں سمجھوتے کی کوئی صورت بن جائے گی۔ فرمایا جب اللہ کا واضح اور کھلا کھلا حکم تمہارے پاس آ چکا جس میں کوئی شک نہیں ہے تو اگر اب ایسا کرو گے تو پھر تم بھی ظلم کرنے والوں میں شمار کیے جاؤ گے۔ اس لیے کہ اَلَّذِیۡنَ اٰتَیۡنٰہُمُ الۡکِتٰبَ۔۔۔۔۔ یہ جو اہل کتاب ہیں، جنہیں آپ سے پہلے ہم نے کتابیں دی ہیں یَعۡرِفُوۡنَہٗ کَمَا یَعۡرِفُوۡنَ اَبۡنَآءَہُمۡ ۔۔۔۔۔ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کو اور اس تبدیلی کو، حرم کو قبلہ مقرر کیے جانے کو اتنے یقین سے جانتے ہیں جس یقین کے ساتھ باپ بیٹے کو جانتا ہے کہ یہ میرا بیٹا ہے، ساری دنیا کو بھول سکتا ہے لیکن کون ایسا باپ ہے جسے اپنے بیٹے کا پتا نہیں ہوتا اور اسے نہیں پہچانتا۔ جس طرح باپ بیٹے کو پہچانتا ہے، اسی طرح یہ اہل کتاب اس بات کو جانتے ہیں۔

وَاِنَّ فَرِیۡقًا مِّنۡہُمۡ لَیَکۡتُمُوۡنَ الۡحَقَّ وَہُمۡ یَعۡلَمُوۡنَ﴿۱۴۶﴾ اور ان میں ایک جماعت ایسی ہے جو یہ جانتی ہے کہ حق کیا ہے لیکن اپنی دنیوی اغراض کے لیے حق کو چھپاتی ہے۔ یہ یہود و نصاریٰ کی اور گمراہ لوگوں کی خصلت تھی کہ وہ بظاہر حیلہ بہانہ کر کے اصل کے خلاف فتویٰ حاصل کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے یا حق کے خلاف فیصلے دیا کرتے تھے اور حق کو چھپا لیتے تھے۔ اسی طرح آج ہم میں بھی یہ مرض عام ہے۔ یہ جانتے ہوئے کہ یہ کام حلال نہیں ہے، یہ کام جائز نہیں ہے، ہم جان بوجھ کر الفاظ بدل کر اپنی مرضی کے فیصلے لیتے ہیں۔ خصوصاً نکاح و طلاق کے معاملات میں یہ عام ہے۔ فوراً طلاق دے دیتے ہیں اور اس کے بعد سوچنا شروع کر دیتے ہیں کہ یوں نہیں کہا تھا، یوں کہا تھا اور یہ نہیں کہا تھا، وہ کہا تھا میں نے ایسے علماء کو بھی دیکھا ہے کہ جن کے سامنے حقیقت بیان کی گئی تو وہ کہنے لگے کہ اس طرح تو طلاق ہو جائے گی، مجھے تو آپ نے بتا دیا ہے لیکن آپ کسی دوسرے مفتی کو اس طرح لکھ کر بھیج دیں، ان الفاظ کے مطابق طلاق نہیں ہوتی بلکہ اپنی طرف سے عبارت بھی لکھوا دیتے ہیں۔ کیا ایسا فتویٰ روز حشر کام دے گا، اللہ کی بارگاہ میں بچا لے گا؟ اللہ تو دیکھ رہا ہے کہ آپ بات کو بدل کر، غلط بات کہہ کر، حقیقت کو چھپا کر فیصلہ لے رہے ہیں یا فیصلہ کر رہے ہیں۔ یہی عادت یہود و نصاریٰ کی تھی۔ فرمایا، ان میں ایک طبقہ ایسا ہے جو کتاب جاننے والا ہے۔ سارے لوگ تو کسی امت میں بھی کتاب کو جاننے والے نہیں ہوتے۔ ماننے والے تو سارے ہوتے ہیں لیکن جاننے والے لوگ تھوڑے ہوتے ہیں جو دوسروں کو احکام بتاتے رہتے ہیں۔ فرمایا یہ جو جاننے والے ہیں یا ان کے جو علماء ہیں وہ سب جانتے ہیں کہ حقیقت کیا ہے لیکن وہ حق کو چھپا کر لوگوں کو گمراہ کرنے کے لیے باتیں بناتے ہیں۔

شک قاطع ایمان ہے:

اَلۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّکَ فَلَا تَکُوۡنَنَّ مِنَ الۡمُمۡتَرِیۡنَ﴿۱۴۷﴾ مومن کو جب یقین ہے کہ اللہ نے جو فرمایا وہ حق ہے

تو اس کے بعد اسے ادنیٰ ترین شبہ کرنے کا بھی کوئی اختیار نہیں، کوئی گنجائش نہیں کہ احکامِ الٰہی میں کوئی ادنیٰ ترین شبہ بھی کیا جائے۔ ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ احکام شرعی کے لیے جان لڑا دی جائے اور ان پر عمل کیا جائے۔ اس میں مختلف رکاوٹیں بھی آتی ہیں جو کسی جسمانی تکلیف یا کسی ادنیٰ تکلیف کا سبب بنتی ہیں۔ تعمیلِ حکم کے لیے اہتمام کرنا پڑتا ہے، وقت لگتا ہے اور کبھی پیسے کا نقصان درمیان میں آجاتا ہے۔ کبھی کسی انسان کی، حکمران کی، اپنے سے طاقتور کی یا قبیلے کے سردار کی ناراضگی کا خوف درمیان میں آجاتا ہے۔ بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ انسانی مزاج ہے، بات تو سن لیتا ہے لیکن اسے یقین کا وہ درجہ حاصل نہیں ہوتا جو ہونا چاہیے۔ اس میں تذبذب پیدا ہوجاتا ہے کہ پتا نہیں ایسا ہوگا یا نہیں ہوگا اس کے دل میں ایک وسوسہ پیدا ہوجاتا ہے کہ بھئی کہتے تو ہیں ایسا ہوگا لیکن ہوگا یا نہیں ہوگا۔ جیسے لوگ کہہ دیتے ہیں کہ یہ دنیا تو دیکھی ہے، آخرت کی کیا خبر؟ بظاہر یہ چھوٹی سی بات ہے کہ جانے آخرت میں کیا ہوگا لیکن اثر کے لحاظ سے یہ سارے ایمان کو ضائع کر دیتی ہے۔ جب آخرت پر ہی یقین نہ رہا تو اعمال کی اصلاح کی ضرورت کب پیش آئے گی، نیکی کی حیثیت کیا رہ گئی اور نیکی اور برائی میں کیا فرق رہ گیا؟ فرق تو یہی ہے کہ برائی سے عاقبت تباہ ہوتی ہے اور نیکی سے دائمی زندگی بنتی ہے۔

دنیا آخرت کا سایہ ہے:

دنیا آخرت کا پرتو ہے، سایہ ہے، عکس ہے۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ جسے اللہ کی اطاعت کی توفیق نصیب ہوتی ہے اور جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی پیروی کرتا ہے، اس کے لیے محنت کرتا ہے اور یقین کے ساتھ کرتا ہے، اس کی آخرت سنورتی ہے اور جس کی آخرت سنورتی ہے تو دنیا چونکہ اس کا پرتو ہے، اس کے لیے دنیا میں بھی آسانیاں پیدا ہوجاتی ہیں، اس کی دنیوی زندگی بھی پرسکون ہوجاتی ہے، اسے دنیا میں بھی اطمینان نصیب ہوجاتا ہے۔ بے شمار مصیبتوں سے اللہ اس کی حفاظت فرماتا ہے اور اسے بے شمار لغزشوں سے بچا لیتا ہے اس کے دل میں ایک سکون ہوتا ہے۔ آپ ایسے لوگوں کو دیکھیں کہ پتھر پہ بھی سر رکھیں تو سو جاتے ہیں، آرام کرتے ہیں لیکن جنہیں یقین کی دولت نصیب نہیں ہوتی، اگر وہ کھربوں کے مالک بھی بن جائیں اور اونچے شاندار محلوں میں بھی ہوں تو چند لمحوں کی نیند کے لیے خواب آور گولیاں کھانی پڑتی ہیں لیکن پھر بھی اطمینان نہیں ہوتا، سکون نہیں ملتا۔

اللہ کریم کا ارشاد ہے تَطَّلِعُ عَلَى الْأَفْئِدَةِ ۝ (الھمزۃ 7:) دوزخ کی آگ ایسی ہے کہ دل کے نہاں خانے کو جا چھوتی ہے۔ آگ میں آپ کوئی چیز ڈالتے ہیں تو وہ باہر سے جلانا شروع کرتی ہے لیکن دوزخ کی آگ کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ صرف باہر سے نہیں جلاتی، نہاں خانۂ دل کے اندر جا کر آتش برپا

کر دیتی ہے۔تو جولوگ اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلّم کی نافرمانی پہ کمر باندھ لیتے ہیں یا جنہیں حق پہ یقین نہیں رہتا اور شک میں مبتلا ہو جاتے ہیں، ان کی زندگی سے سکون اٹھ جاتا ہے کیونکہ ان کے دل کی گہرائیوں میں دوزخ کا دھواں اور اس کی تپش پہنچ رہی ہوتی ہے۔

دین سراپا اطاعت:

تحویلِ کعبہ کا حکم عین دوران نماز آیا اور اطاعتِ الٰہی کی ایک لازوال اور بے مثال تصویر رقم کر گیا جو مسجد قبلتین کی صورت میں آج بھی دیکھی جا سکتی ہے۔انسان کو اطاعتِ الٰہی سے غرض ہونی چاہیے، مثلاً سفر میں اللہ کریم نے نماز قصر فرما دی اور چار فرض کی بجائے دو فرض پڑھتے ہیں لیکن کچھ لوگ کمر باندھ لیتے ہیں کہ میرے پاس فرصت ہے، میں چار ہی پڑھوں گا۔جس طرح اللہ کے احکام عزیمت کے لیے ہیں اسی طرح رخصت کے احکام بھی اس کے ہیں جہاں اس نے عزیمت کا حکم دیا وہاں عزیمت اطاعت ہوگی اور جہاں اس نے رخصت کا حکم دیا وہاں رخصت بھی اطاعتِ الٰہی ہوگی۔تم کون ہوتے ہو فیصلہ کرنے والے! یہ فیصلہ تو اس کا ہے۔جہاں اس نے سر کٹانے کا حکم دیا ہے وہاں سر کٹانا اطاعت ہوگی۔جہاں جان بچانے کا حکم دیا وہاں جان بچانا اطاعت ہوگی۔یہ فیصلہ ہم نہیں کر سکتے کہ ہم نے تلوار ہی چلانی ہے، ہم نے قتل ہی کرنا ہے، جان بچانے کا حکم ہے تو وہاں جان بچانا اطاعت ہوگی۔جہاں چار فرض پڑھنے کا حکم ہے وہاں چار پڑھنا ہی اطاعت ہوگی۔جہاں دو کا حکم ہے وہاں دو پڑھنا اطاعت ہوگی۔جس طرح عزیمت پر عمل اطاعتِ الٰہی ہے، اسی طرح اللہ کریم کی دی ہوئی رخصتوں پر عمل بھی اطاعتِ الٰہی ہے۔بندہ اپنی طرف سے فیصلے نہ کرے۔ہم نے رسومات کو عبادات کا درجہ دے دیا ہے۔ہم جو رسم بنا لیتے ہیں، اس کی کوئی اصل نہ بھی ہو تو اس پہ ڈٹ جاتے ہیں کہ بزرگوں کی نشانی ہے۔محض بزرگوں کی نشانی ہونا دین نہیں۔دین اللہ کا حکم، اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کا حکم، اللہ کی کتاب اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی اطاعت اور سنت ہے اور کوئی بات جو اس کے خلاف ہو، جب بھی پتہ چلے فوراً ترک کر دینی چاہیے۔

نظم وضبط کی عظیم مثال:

قبلہ معبود تو نہیں تھا کہ پہلے اس کی پوجا ہوتی تھی یا اب اس کی پوجا کرتے ہیں۔آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کے دل میں بیت اللہ کی محبت تھی، حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کو بیت اللہ سے عشق تھا اور کیوں نہ ہوتا! جمال یار کا آئینہ تھا جو رخِ جمال یار کو دکھاتا تھا۔تجلیات باری کا مہبط تھا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کے دل میں تحویل کعبہ کی آرزو کیوں نہ ہوتی! اللہ کریم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی اس آرزو کو تحویلِ کعبہ کا سبب قرار دیتے ہوئے حرم کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رکوع وسجود کی سمت

مقرر فرما دیا لیکن دنیا بھر کے مسلمان کسی عمارت، کسی پتھر کو نہیں پوجتے۔

ایک دفعہ میرے سامنے بھی یہ سوال کیا گیا کہ دنیا بھر کو تو مسلمان بت پوجنے سے منع کرتے ہیں لیکن بیت اللہ بھی آخر پتھروں کی بنی ہوئی ایک عمارت ہے، اسے بھی تو بت قرار دیا جاسکتا ہے لیکن سارے مسلمان اس کی پوجا کر رہے ہیں۔ میں نے کہا مسلمان اس کی پوجا نہیں کرتے۔ آپ وہی پتھر وہاں سے اکھاڑ لیں اور کسی دوسری جگہ انہی پتھروں کی ویسی ہی عمارت بنا دیں تو اسے کوئی مسلمان سجدہ نہیں کرے گا۔ سمتِ سجدہ وہی رہے گی جہاں زمین پر بیت اللہ موجود ہے۔ یہ دیواریں، یہ چھت تو اس زمین کی نشاندہی کر رہے ہیں۔ جب مکہ مکرمہ فتح ہوا تو حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بیت اللہ کی چھت پر کھڑے ہو کر اذان دی۔ کوئی بت پوجنے والا، جس بت کی پوجا کرتا ہے، کبھی اس کے سر پر کھڑا ہوتا ہے! کسی بھی بت کا پجاری جس بت کی پوجا کرتا ہے، کیا وہ اس کے سر پر کھڑا ہو جائے گا! مسلمان اگر بیت اللہ کی پوجا کرتے تو اس کی چھت پر کھڑے ہو کر اذانیں دیتے! انہوں نے اس کی چھت پر کھڑے ہو کر کہا ''اللہ اکبر'' بڑائی اور عظمت صرف اللہ کے لیے ہے۔ ہم بیت اللہ کی پوجا نہیں کرتے، بیت اللہ سمتِ عبادت ہے جس کے نتیجے میں روئے زمین کے مسلمان یک رو ہو جاتے ہیں۔ جو بیت اللہ سے مغرب میں ہے وہ مشرق کو منہ کر لیتا ہے، جو مشرق میں ہے وہ مغرب کو، جو جنوب میں ہے وہ شمال کو منہ کرتا ہے، جو شمال میں ہے وہ جنوب کو۔ تمام دنیا کے مسلمان وقتِ رکوع و سجود ایک مرکز کی طرف رخ کر کے عبادت کرتے ہیں۔ ایک یک رنگی، یکجہتی اور بھائی چارہ وجود میں آجاتا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ساری کائنات، سارے انسانوں اور سارے جنوں کے لیے مبعوث ہوئے۔ ساری مخلوق کے لیے مبعوث ہوئے اور اب ایک ایسا مرکز چاہیے تھا جو ساری مخلوق کا ایک ہی مرکز ہو۔ اللہ کریم نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی آرزو پوری کر کے بیت اللہ کو مرکز مقرر کر دیا۔ اب یہ اللہ کی مرضی، لیکن ایک سمت متعین کر دی، ایک مرکز بنا دیا اور آج بھی ایسا نظم وضبط، ایسی یک رنگی عطا فرمائی کہ جو دوست احباب حج پہ تشریف لے گئے ہیں انہوں نے دیکھا ہوگا کہ پینتیس پینتیس لاکھ لوگ مکہ مکرمہ میں جمع ہو جاتے ہیں۔ کم از کم آٹھ ذی الحج کو تو سارے حاجی وہاں ہوتے ہیں چونکہ انہیں نماز فجر حرم شریف میں ادا کر کے منیٰ کو جانا ہوتا ہے۔ تیس پینتیس لاکھ لوگ تو وہ ہوتے ہیں جو باہر سے جاتے ہیں اور جو مقامی لوگ حج کے لیے آتے ہیں وہ اس میں شامل نہیں۔ کیسی عجیب بات ہے کہ ایک امام ہے، پینتیس چھتیس لاکھ لوگ اس ایک امام کے حکم کے منتظر ہیں۔ اب کوئی سنتیں ادا کر رہا ہے، کوئی بیٹھا تلاوت کر رہا ہے، کوئی تسبیح پڑھ رہا ہے، کوئی کس حال میں ہے، کوئی کس حال میں ہے اور تکبیر شروع ہو جاتی ہے۔ بیت اللہ شریف میں تکبیر دہرا کر نہیں کہتے، اللہ اکبر، اللہ اکبر، اشھد ان لا الہ الا

اللہ اشھد ان محمد رسول اللہ، اسی طرح پڑھتے چلے جاتے ہیں جس میں چند سیکنڈ لگتے ہیں لیکن چند سیکنڈ میں چھتیس لاکھ لوگوں کی صفیں بن جاتی ہیں۔ دنیا کی بڑی بڑی حکومتیں، سلطنتیں، ریاستیں اور بڑی بڑی تربیت یافتہ فوجیں موجود ہیں لیکن دنیا کی کوئی فوج ایسی مثال پیش نہیں کرسکتی کہ چند سیکنڈ میں ساری فوج صف بستہ ہو جائے۔ یہ صرف اللہ کا مسلمانوں پر احسان ہے۔ ایسی تنظیم ہے کہ چند سیکنڈ تکبیر کہتے ہوئے اللہ کے حضور کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ایک بندہ رکوع میں جاتا ہے، چھتیس لاکھ لوگ ساتھ رکوع میں جاتے ہیں۔ ایک بندہ سجدے میں جاتا ہے چھتیس لاکھ لوگ ساتھ ہی سجدے میں چلے جاتے ہیں۔ کیا یہی عالم عرفات میں نہیں ہوتا؟ سڑکیں، خیمے اور خیموں سے باہر کہاں تک مخلوق بھری ہوتی ہے لیکن ایک آواز پہ سارے نظم وضبط کے ساتھ صف بستہ ہو جاتے ہیں۔ کیا پوری دنیا میں مرکزیت کی اس جیسی کوئی ایک بھی مثال ملتی ہے!

مرکزیت اور خلافت:

اسلام نے تو اخوت اسلامی اور عالمگیر مرکزیت کا درس دیا لیکن آج ہم کیوں منتشر ہیں، کیا ہمارے پاس مرکزیت نہیں ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمادیا تھا کہ میرے بعد خلافت ہوگی۔

خلافت کے بعد شہنشاہتیں بھی آئیں لیکن مسلمانوں نے خلافت برقرار رکھی۔ الحمد اللہ، جب تک خلافت کسی نہ کسی صورت برقرار رہی، تب تک مسلمانوں پر روئے زمین میں کبھی زوال نہیں آیا۔ اگر پریشانی آتی تو اللہ کریم اس کا حل فرما دیتے۔ ان خلفاء میں وہ بات تو نہ تھی جو خلیفہ میں ہونی چاہیے اگرچہ ہمارا آخری خلیفہ، ترکی کا سلطان عبد الحمید رحمۃ اللہ تعالیٰ واقعی بہت نیک آدمی تھا۔ وہ ایک سچا اور پکا صوفی تھا، ذاکر تھا، صاحبِ کمال تھا، صاحبِ مشاہدہ تھا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد یورپین اقوام نے سازش کی کہ مسلمانوں کی یہ برائے نام مرکزیت بھی نہ رہے۔ انگریزوں نے مکہ مکرمہ میں شریفِ مکہ سے بغاوت کروادی جو ترکوں کا گورنر تھا۔ اس کے بدلے میں اسے مکہ کی ریاست دی گئی اور اس کے بیٹوں کو عراق اور اردن کی حکومتیں بنا کر دیں۔ بعد میں عالمی سیاست کی بساط پر تبدیلیاں آتی رہیں۔ یہود کے لیے ریت پر انگلیوں سے لکیریں لگا کر اسرائیل کی ریاست بنادی اور پورا زور اس پر صرف کر دیا کہ مسلمانوں سے خلافت چھین لی جائے۔ مصطفیٰ کمال اور نوجوان طبقے کو ابھار کر بغاوت کرائی اور سلطان عبدالحمید رحمۃ اللہ علیہ سے خلافت چھینی، ریاست چھینی اور حکومت چھین لی۔ یہ لگ بھگ 1926,1925 کی بات ہے کہ مسلمانوں کے ہاتھ سے خلافت جاتی رہی۔ جنگ عظیم 1914ء سے لے کر 1919ء تک رہی لیکن خلافت اس کے کئی سال بعد بھی باقی رہی جو اگرچہ برائے نام تھی لیکن ایک مرکز تھا اور دنیا کی مسلم آبادی میں جہاں کوئی

حکومت بنتی اس کے لیے ضروری ہوتا کہ وہ خلیفۃ المسلمین سے اپنی تصدیق کروائے۔ تمام مسلمان حکمرانوں کا مرکز سے رابطہ تھا اور آپس کے مسائل وہاں حل ہوجاتے تھے۔

اب اہل مغرب نے UNO کے نام سے اور سلامتی کونسل کے نام سے اقوامِ عالم کے لیے اپنی مرکزیت بنا رکھی ہے لیکن اس کے باوجود اپنے ملکوں کو الگ بھی یکجا کیا جا رہا ہے۔ یورپی یونین بنائی گئی، ایک ایسی کولیشن (Coalition) جس میں ویزا ختم، پورے یورپ کا سکہ ایک کر دیا۔ صرف برطانیہ اس سے الگ ہے باقی سب کا یورو (Euro) ہے۔ اپنے اتحاد پہ تو وہ زور لگا رہے ہیں لیکن مسلمانوں کو، جہاں ہیں، تقسیم در تقسیم کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ وہ خلافت اگرچہ برائے نام تھی لیکن ایک ریاست تھی، ایک مٹھی تھی جس میں سارے حکمران اور حکومتیں، نیک تھے یا نہیں تھے، ایک جگہ متحد تو تھے۔ عالمی طاقتوں کے سامنے ایک دفاعی قوت تھی۔ افغانستان کو کیوں تباہ کیا گیا؟ یہاں پھر خلافت کے زندہ ہونے کا خطرہ پیدا ہوگیا تھا جس کے نام سے یورپ کانپتا ہے۔ اگر مسلمانوں کے پاس ایک مرکز بن گیا تو پھر مشکل ہوجائے گی!

بیت اللہ مرکزیت کی علامت ہے:

بیت اللہ مسلمانوں کا سب سے بڑا مرکز ہے جہاں روئے زمین کے مسلمان جمع ہوتے ہیں اور آپ دیکھ سکتے ہیں کہ یہ چھتیس لاکھ کی فوج اگر اپنی دنیا کی بنیاد اپنے دین پہ رکھیں اور جس طرح یک رنگی کے ساتھ دو ان سلے کپڑوں میں ایک امام کی آواز پہ لبیک کہتے ہیں، اگر یہ چھتیس لاکھ کا سمندر وہاں سے دنیا کی کسی طرف منہ کر کے چل پڑے اور بغیر اسلحے کے بھی ہوں تو کوئی روکنے والا نہیں۔ چھتیس لاکھ لوگوں کو روکنا یا قتل کرنا اتنا آسان نہیں ہے۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ ہمارے نفس نے، شیطان نے اور غیر اسلامی طاقتوں نے ہمیں دین سے دور کر دیا ہے۔ ہم کہتے ہیں دنیا کا ایک الگ نظام ہے۔ دین آپ کا ذاتی معاملہ ہے۔ کوئی عبادت کرتا ہے یا نہیں کرتا، یہ اس کا ذاتی معاملہ ہے۔ لوگوں سے معاملات میں اپنی مرضی کرنا اس کا ذاتی معاملہ ہے۔ اس طرح ہم جب دین سے الگ ہوئے تو ہم تباہ ہوگئے۔

جدا ہو دین سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے دنیا میں بادشاہ بھرے پڑے تھے۔ کون عام آدمی کی رائے کو پوچھتا تھا؟ عام آدمی کا تصور اور عام آدمی کو حقوق کس نے دیے؟ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عام آدمی کو حق دیا کہ وقت کے حکمران کو بھی روک کر پوچھ سکے کہ میرا یہ حق ہے اور مجھے کیوں نہیں مل رہا۔ انسانی بہتری کے سارے تصور

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلّم ، اللہ کے حبیب صلی اللہ علیہ وسلّم نے عطا فرمائے اور اسلام نے عطا فرمائے۔ پوری دنیا میں تمام مسلمانوں کو ایک مرکز پہ اللہ نے جمع کر دیا اور ایک ایسی تنظیم بنائی کہ چھتیس لاکھ نہیں بہتر لاکھ آ جائیں، ایک ارب مسلمان حج پہ آ جائیں، ایک بندے کے زیر کمان سارے بترتیب ایک ہی نظام میں منسلک ہو جائیں گے۔ افسوس اسی بات کا ہے کہ ہماری عملی زندگی اپنے مرکز سے ہٹ گئی۔ ہمارا مرکز ہے اللہ کی کتاب، ہمارا مرکز ہے اللہ کا رسول صلی اللہ علیہ وسلّم لیکن ہم طبقوں میں، فرقوں میں بٹ گئے۔ ہمارے نفس نے، ہماری خواہشات نفس نے، ہوائے نفس نے کہیں دنیا کو قبلہ بنالیا، کہیں اقتدار کو قبلہ بنالیا، کہیں دولت کو قبلہ بنالیا، کہیں شہرت کو قبلہ بنالیا اور ہم تقسیم در تقسیم ہوتے چلے گئے۔

رہ گئی رسمِ اذاں روح بلالی نہ رہی:

عبادت کو ہم نے رسم کے طور پر اپنالیا۔ اللہ کی عبادت کا مقصد تھا، اللہ کی رضا کے لیے ایک جان ہو جانا، جس طرح وجود ایک ہوتا ہے کہ پاؤں پہ چوٹ لگے یا ہاتھ پر لیکن سارا وجود بے قرار ہو جاتا ہے۔ اسی طرح مسلمان روئے زمین میں جہاں ہیں، ایک جسم ہیں، ایک جاں ہیں۔ کہیں ایک جگہ چوٹ لگے تو سارے وجود کو تڑپنا ہوگا لیکن ہم تقسیم ہو گئے، ہم سے خلافت چھن گئی لیکن الحمد اللہ! اللہ کا احسان ہے کہ ہماری بیت اللہ شریف کی مرکزیت ابھی باقی ہے اگرچہ کفار نے اور غیر مسلم طاقتوں نے ہمیں اس کی حقیقت سے دور کر دیا۔ حق تو یہ تھا کہ جس طرح وہاں ہم میں یک رنگی ہوتی ہے، اسی طرح روئے زمین میں یک رنگی ہوتی۔ ایک دوسرے کا دکھ بانٹتے، ایک دوسرے کے شریکِ کار ہوتے، ایک دوسرے کے معاون ہوتے، ایک دوسرے کے جان اور آبرو کے محافظ ہوتے۔ اگر ہم ایک دوسرے کے لیے برائی نہ سوچتے بلکہ بھلائی سوچتے تو اللہ کی کائنات آج بھی مسلمانوں کے زیرنگیں ہوتی۔ اللہ کریم اس عہدِ رفتہ کو پھر سے لائے، مسلمانوں کو اتحاد و اتفاق اور اللہ اور اللہ کے حبیب صلی اللہ علیہ وسلّم کی اطاعت نصیب فرمائے۔ آمین!

سورۃ البقرہ رکوع 18 آیات 148 تا 152

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ؕ اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يَاْتِ بِكُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۴۸﴾ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَاِنَّهٗ لَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۹﴾ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ۙ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ ۙ اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ ۚ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِيْ ۚ وَلِاُتِمَّ نِعْمَتِيْ عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۵۰﴾ كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۵۱﴾ فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ ﴿۱۵۲﴾

اور ہر ایک (ذی مذہب) کے واسطے ایک قبلہ رہا ہے جس کی طرف وہ رُخ کرتا رہا پس نیکیوں میں بڑھ چڑھ کر کوشش کرو تم جہاں کہیں ہو گے اللہ تم سب کو حاضر کریں گے بے شک اللہ ہر چیز پہ قادر ہیں ﴿۱۴۸﴾ اور آپ جس طرف سے سفر پر نکلیں تو اپنا رخ (عبادت میں) مسجد حرام کی طرف پھیریں اور یہ یقیناً آپ کے پروردگار کی طرف سے حق ہے اور جو عمل تم کرتے ہو اللہ اس سے بے خبر نہیں ہیں ﴿۱۴۹﴾ اور آپ جس طرف سے بھی (سفر پر) نکلیں تو اپنا رخ (عبادت میں) مسجد حرام کی طرف رکھیں اور جہاں کہیں تم ہو سو اپنا رخ اس کی

طرف پھیر لو تا کہ لوگ تم سے جھگڑ نہ سکیں سوائے ان کے جو ان میں غلط کار ہیں پس ان سے مت ڈرو اور صرف مجھ سے ڈرو اور اس لیے کہ میں تم پر اپنی نعمت پوری کروں اور تا کہ تم سیدھی راہ پاؤ ﴿۱۵۰﴾ جیسا کہ ہم نے تم میں سے تمہارے پاس پیغمبر بھیجا جو ہماری آیات تم کو پڑھ کر سناتے ہیں اور تم کو پاک کرتے ہیں اور تمہیں کتاب اور دانائی کی باتیں سکھاتے ہیں اور تم کو وہ (علوم) سکھاتے ہیں جو تم نہیں جانتے تھے ﴿۱۵۱﴾ پس تم مجھ کو یاد کرو میں تمہیں یاد کروں گا اور میرا شکر ادا کرو اور ناشکری نہ کرو ﴿۱۵۲﴾

تفسیر و معارف

وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يَاْتِ بِكُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۴۸﴾ ہر گروہ، ہر طبقے، ہر قوم اور ہر مذہب میں کوئی نہ کوئی نقطۂ اتحاد ہے۔ عبادات و اعمال ہوں، افکار و خیال ہو، رنگ و نسل کی حد بندی ہو، وطنیت کا بت ہو، ہر کسی نے کسی ایک بنیاد کو نقطۂ اتحاد بنا رکھا ہے۔ یہ سب ایک دوسرے سے مختلف اور ایک دوسرے سے متصادم ہیں۔ ان کے برعکس دینِ حق نے ہر زمانے میں توحید و رسالت کو ہی اتحاد کی بنیاد قرار دیا اور اب اس امت کے لیے اللہ تعالیٰ نے حرم کو ظاہری نقطۂ اتحاد مقرر فرما دیا۔ اب اگر وقتِ نماز رخ کے لیے بیت اللہ کی سمت مقرر کر دی گئی ہے تو یہ کوئی انوکھی بات نہیں جبکہ ہر مکتبِ فکر نے اتحاد اور مرکزیت کی کوئی نہ کوئی بنیاد مقرر کر رکھی ہے۔

اصل کامیابی نیکیوں میں سبقت لے جانا ہے:

تم نیکیوں میں سبقت حاصل کرو۔ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ۔۔۔ اطاعت الٰہی اور عبادتِ الٰہی میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر محنت کرو۔ اپنا زور اللہ کی اطاعت پر صرف کرو اور اس میں دوسروں پر سبقت لے جاؤ کہ بالآخر تم سب نے اللہ کے حضور پیش ہونا ہے۔ تم جہاں بھی ہو گے، جس حال میں ہو گے، مرنے کے بعد اجزاء منتشر ہو گئے، جہاں کہیں بھی ہوں گے، وہ اس بات پر قادر ہے کہ سب کو یکجا فرما کر اپنی بارگاہ میں حاضر کرے۔ لہٰذا دنیا کے وسائل میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی بجائے اللہ کے حضور پیش ہونے کی تیاری کرو اور اس محنت میں سبقت لے جاؤ۔ اصل کامیابی یہ ہے کہ نیکیوں میں سبقت کون لے جاتا ہے!

وَ مِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۔ جہاں تک نمازوں کے لیے رخ کرنے کا تعلق ہے تو اس بات کا خیال رکھیں کہ آپ کہیں بھی ہوں، سفر پر بھی نکلیں تو وقتِ صلوٰۃ اپنا رخ مسجد الحرام کی طرف ہی رکھا کریں، یہی مسلمانوں کا قبلہ ہے۔ وَ اِنَّهٗ لَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ دین اسلام اور اس کے جملہ احکام آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے رب کی طرف سے حق ہیں۔تحویل کعبہ بھی دینِ حق کا ایک حکم ہے اور اللہ کی طرف سے ہے۔

وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۹﴾ جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ تعالیٰ اس سے باخبر ہے، وہ ہر حال میں تمہارا نگران ہے اور ذاتی طور پر تمہاری کارکردگی کو ملاحظہ فرما رہا ہے۔ وہ خوب جانتا ہے کون اس کی اطاعت کر رہا ہے اور کون حکم عدولی کرتا ہے۔تم لوگ جو کچھ بھی کرتے ہو، اللہ تعالیٰ اس سے بے خبر نہیں۔

قبلہ مسلمانوں کا نقطہء اتحاد ہے:

وَ مِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَ حَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ ۔۔۔ مسلمان جہاں بھی ہوں، جس ملک میں ہوں، جس حال میں ہوں، اکیلے ہوں یا زیادہ ہوں، وقت صلوٰۃ تمہارا رخ مسجد الحرام ہی کی طرف ہو۔ تمہارے اندر ایک وحدت نظر آئے، یکسوئی نظر آئے، تم اتفاق و اتحاد کی عملی تصویر بن جاؤ، یہاں تک کہ کوئی تمہیں کسی طرح کا الزام نہ دے سکے۔ اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ ۔۔۔ اگرچہ وہ لوگ جو ظالم ہیں، وہ تو الزام دینے سے باز نہ آئیں گے لیکن تم کسی شخص کی پروا نہ کرو، کسی سے نہ ڈرو۔ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِيْ ۔۔۔ کسی کا خوف تمہیں دامنگیر نہ ہو، تمہیں غیر کا کیا اندیشہ، تمہیں صرف میری فکر ہو کہ کہیں کوئی ایسا فعل سرزد نہ ہو جائے جو میری ناراضگی کا سبب بن جائے۔ جب تمہاری دلی کیفیت یہ ہو کہ اپنے ہر کام میں میری رضا کو مقدم سمجھو، ہر ایسے کام سے رک جاؤ، جو میری رضا کے خلاف ہو، وَلِاُتِمَّ نِعْمَتِيْ عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۵۰﴾ تو میں تم پر اپنی نعمت تمام کردوں کہ تم راہِ راست پر چلو، ہدایت یافتہ ہو جاؤ۔

بعثتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اتمامِ نعمت ہے:

سابقہ آیت کے اختتام پر نعمت تمام کرنے کی بات آئی تو فرمایا: كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۵۱﴾ یہ اتمامِ نعمت کیا ہے، ہم نے تمہارے اندر ایک عظیم الشان رسول صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث فرمایا جو تمہیں ہماری آیات و احکام پڑھ کر سناتا ہے اور تمہیں پاک کرتا ہے، تمہاری صفائی کرتا ہے اور تمہیں کتاب، کتاب کی سمجھ اور کتاب کے مفاہیم بتاتا

ہے۔ تمہیں ایسی عظیم اور مفید باتیں بتاتا ہے جس سے تم بے خبر تھے۔ گویا بعثت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے اللہ کی نعمت تمام ہوئی۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم رحمت مجسم ہیں اور اللہ کی رحمت تمام کائنات سے وسیع ہے۔

وَرَحْمَتِیْ وَسِعَتْ کُلَّ شَیْءٍ (الاعراف: 156) رحمتِ الٰہی ہر چیز سے وسیع تر ہے اور جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم ہم میں مبعوث ہوئے، وہ مجسم رحمت الٰہی ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی تعلیمات اور آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی برکات، ہمیں یہ دونوں چیزیں کس طرح پہنچتی ہیں؟ پہلی بات تو یہ ہے کہ یَتْلُوْا عَلَیْکُمْ اٰیٰتِنَا۔۔۔۔ کہاں تم اور کہاں اللہ کریم کی ذات! یہ اللہ کا رسول صلی اللہ علیہ وسلّم ہے جو تمہیں اللہ کی باتیں سناتا ہے اللہ کے احکام سناتا ہے اللہ کی مرضیات سے آگاہ کرتا ہے، بتاتا ہے کہ اللہ کریم کس بات سے راضی ہوگا اور کس بات سے خفا ہوگا۔ یوں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کے بندوں کو اللہ کے روبرو کر دیا۔

بعثت عالی صلی اللہ علیہ وسلّم سے پہلے ایسے لوگ بھی ہوئے ہیں جو ہدایت کے متلاشی تھے۔ مکہ مکرمہ کا ایک شخص زید بن عمرو بن نفیل تھا۔ اسے بتوں سے نفرت تھی اور وہ سمجھتا تھا کہ جن بتوں کا وجود خود انسان گھڑ کر بناتا ہے وہ انسان کے لیے کیا کریں گے! وہ اپنے وجود میں محتاج ہیں، ایک پتھر ہے اسے چاہیں تو دیوار میں لگا دیں، چاہیں تو کسی فرش میں لگا دیں اور چاہیں تو تراش کر بت بنا لیں۔ وہ بت انسان کی حاجت روائی کیا کرے گا جو خود اپنے وجود میں انسان کا محتاج ہے۔ عہد فترت تھا اور حق ملتا نہیں تھا۔ اس شخص نے دنیا کے مختلف ممالک کے سفر کیے۔ گرجوں اور کلیساؤں میں گیا، یہودیوں کے علماء کے پاس گیا، زندگی بھر حق کی تلاش میں لگا رہا۔ جہاں جاتا کچھ کھرے لوگ بھی مل جاتے۔ وہ بتاتے کے ہمارے پاس رواجات ہیں، رسومات ہیں لیکن ہمیں خود بھی حق کی خبر نہیں۔ کچھ رواجات اور رسومات دین کے طور پر بتاتے لیکن وہ اسے پسند نہ آتے۔ آخری عمر میں تھک ہار کر مکہ مکرمہ میں ہی مقیم ہو گیا۔ بیت اللہ شریف میں حاضری دیتا اور دعا کیا کرتا تھا کہ اے اللہ! تو ہے لیکن میں نہیں جانتا تو کہاں ہے، تو کیسا ہے؟ بلاشبہ صرف تو ہی عبادت کے لائق ہے لیکن تیری عبادت کیسے کی جائے؟ مجھے نہیں پتا کہ تو کس بات پہ خفا ہوگا، نہ مجھے یہ خبر ہے کہ تو راضی کس بات پہ ہوگا۔ پھر بیت اللہ شریف کے سامنے سے مٹی اٹھاتا اور اس پر پیشانی ٹیکتے ہوئے کہتا کہ میری یہی عبادت قبول کر لے۔ اس کے کچھ اشعار بھی ملتے ہیں۔

أَرَبًّا وَاحِدًا أَمْ أَلْفُ رَبٍّ
أَدِیْنُ إِذَا تُقُسِّمَتِ الْأُمُوْر

کہ رب کوئی ایک ہے جو ساری مخلوق کو بلا تفریق پال رہا ہے۔ ہر ایک کو اس کا حصہ دے رہا ہے، ہر ایک کے لیے دھوپ، روشنی اور ہوا کا اہتمام کر رہا ہے۔ یہ کوئی ایک ہستی ہے۔ جس طرح تم نے ہزاروں معبود بنائے ہوئے ہیں، ہزاروں ہوتے تو اس نظام میں کئی خرابیاں پیدا ہوتیں۔ کوئی کہتا دھوپ ہونی چاہیے، دوسرا کہتا بادل ہونا چاہیے۔ کوئی کہتا ہوا ہونی چاہیے، دوسرا کہتا گرمی ہونی چاہیے۔ اگر یہ ہزاروں معبود ہوتے اور ہزاروں پالنے والے ہوتے تو اس طرح کا نظام بے عیب نہیں چل سکتا تھا۔ ایک ہی ہستی ہے جو یہ نظام چلا رہی ہے، جسے کوئی روکنے والا نہیں، جس کی اپنی قدرت کاملہ سے سب چل رہا ہے۔ یہ کونسا دین ہے جس میں کام بانٹ دیے جائیں کہ یہ بت اولاد دیتا ہے، یہ بت صحت دیتا ہے، یہ بارش برساتا ہے۔ اگر اس طرح سے کام بانٹ دیے جائیں تو اسے دین نہیں کہا جا سکتا، یہ تو خرافات ہیں۔

تَرَكْتُ لَّاتَ وَلْعُزّٰى جَمِيعاً
كَذَالِكَ يَفْعَلُ رَجُلٌ بَصِيرٌ

میں لات و عزیٰ سب سے بیزاری کا اعلان کرتا ہوں اور جسے اللہ کریم بصیرت دیں گے وہ ایسا ہی کرے گا۔

تو اس وقت یہ عالم تھا کہ اللہ کریم کے ماننے والے کو بھی کہیں سے راہنمائی نہ مل سکتی تھی۔ اللہ کریم فرماتے ہیں: كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴿١٥١﴾ میں نے تم پر اپنا انعام اس طرح مکمل کیا کہ میں نے وہ ہستی (صلی اللہ علیہ وسلم) مبعوث کر دی جس نے تمہیں اللہ سے ہم کلام کر دیا۔ جب کوئی جانتا نہیں تھا، اللہ کی ذات سے واقف نہیں تھا، اس کی صفات سے واقف نہیں تھا، اس کی رضا کا پتا نہ تھا کہ وہ کس بات سے خفا ہوگا، اس وقت میں نے تم میں وہ عظیم الشان رسول صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث فرمایا۔

فرائضِ نبوت:

يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا ـــــ میرا رسول صلی اللہ علیہ وسلم تمہیں میری باتیں سناتا ہے۔ گویا تمہیں میرے روبرو کر دیا، میرے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے تم میری بات سننے کے قابل ہو گئے۔ وَيُزَكِّيْكُمْ اور اس نے تمہیں پاک کر دیا۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ان دو فرائض کا ذکر ہوا۔ یعنی تعلیماتِ نبوت، اللہ کریم کی باتیں پہنچائے، وہ علوم پہنچائے جو معرفت کا ذریعہ ہیں، ان امور سے مطلع فرمائے جو رضائے الٰہی کا

ذریعہ ہیں، ان باتوں سے آگاہ فرمائے جو اللہ کریم کی ناراضگی کا سبب ہیں ۔ یہ سب تعلیماتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم ہیں ۔ ان میں قرآنِ حکیم بھی ہے، ان میں حدیثِ پاک ہے، ان میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کے افعالِ مبارکہ بھی ہیں ۔ جو کچھ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم نے کیا، جو کچھ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا، یہ سب تعلیماتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم ہیں ۔

دوسرا شعبہ برکات نبوت صلی اللہ علیہ وسلّم ہے، فرمایا: وَ يُزَكِّيكُمْ ۔۔۔۔۔اور تمہیں پاک کر دیا۔ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کیسے تزکیہ فرمایا؟ اس کے لیے چلہ کشی کی گئی، نہ نوافل یا وظیفوں کی تعداد مقرر کی گئی، اس کے لیے کوئی لمبا عرصہ بھی مقرر نہیں کیا گیا جو ایمان لایا، جس کے دل میں نور ایمان تھا اور ایک نظر اس نے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو دیکھ لیا یا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کی نگاہ پاک اس پر پڑ گئی، یہ تزکیہ اس ایک نظر کی بات تھی!

انسان جب مومن بنتا ہے تو ایک درجہ پاکیزگی حاصل کر لیتا ہے ۔ عالم ہو جاتا ہے، قرآن کریم سمجھتا ہے، حدیث سمجھتا ہے تو پاکیزگی مزید بڑھ جاتی ہے ۔ ولی اللہ ہو جائے تو کیفیات حاصل کر لیتا ہے اور یاد رکھیں ہر ولی اللہ عالم ہوتا ہے ۔ اگر کسی کے پاس ذاتی علم نہ ہو تو وہ کسی عالم کے ساتھ ہوتا ہے ۔ اس کا شیخ تو بہت بڑا عالم ہوتا ہے ۔ علم کے بغیر تصوف نہیں رہتا ۔ ہر صوفی عالم ہوتا ہے لیکن ہر عالم صوفی نہیں ہوتا ۔ علم کے الگ درجات ہیں لیکن اگر کسی کو صفائے قلب نصیب ہو جائے اور عالم بھی ہو تو وہ بہت آگے نکل گیا ۔ اگر روئے زمین کے سارے علماء اور اولیاء کی عظمت جمع کی جائے تو ایک صحابیؓ کی خاکِ پا کو نہیں پہنچتی ۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کیسے تزکیہ فرماتے تھے کہ ایک نگاہ میں بندہ صحابیتؓ سے سرفراز ہو جاتا تھا ۔ صحابیؓ کا لغوی مطلب تو ہے صحبت یافتہ لیکن یہاں اصطلاحی مفہوم یہ ہے کہ نوعِ انسانی میں جو سب سے زیادہ اللہ کے قریب ہو جائے، نبیؑ کے بعد جس کی عظمت مُسلّم ہو جائے، جس کی امانت، دیانت، ورع تقویٰ شکوک وشبہات سے بالاتر ہو جائے ۔ شرفِ صحابیت اتنی بڑی عظمت ہے کہ جس کا احاطہ اس دنیا میں نہیں کیا جا سکتا ۔ اس کی عظمت کا اظہار میدان حشر میں، آخرت میں ہوگا ۔ انسانی عقل، انسانی علوم اس کا احاطہ نہیں کر سکتے ۔ لوگ اسے سمجھتے نہیں ہیں اور بڑی بے تکلفی سے عظمتِ صحابہؓ پہ زبان درازی کرتے ہیں ۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے لوگ جہالت کی وجہ سے اللہ پہ طعن کرتے ہیں، انبیاءؑ پہ طعن کرتے ہیں ۔ اپنی جہالت کی وجہ سے صحابہؓ پہ بھی طعن کرتے ہیں ۔ صحابیؓ ہونا بجائے خود ایک اتنی بڑی عظمت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا: أَصْحَابِيْ كَالنُّجُوْمِ میرے صحابہؓ ہدایت کے ستارے ہیں ۔ ستارے جس طرح سورج سے روشنی حاصل کرتے ہیں، اسی طرح صحابہ کرام رضی اللہ عنہم برکات نبوت صلی اللہ علیہ وسلّم سے روشن ہیں اور راہنمائی فرماتے ہیں ۔ بِأَيِّهِمْ إِقْتَدَيْتُمْ اِهْتَدَيْتُمْ (حدیث مرفوع) ان میں سے جس کسی کا دامن تھام لو گے ہدایت پا جاؤ گے ۔ صحابہؓ میں سے جس کے پیچھے چل

پڑو گے وہ تمہیں بارگاہ الٰہی میں پہنچا دے گا۔

وَ یُزَکِّیۡکُمۡ یہ برکات نبوت کیا ہیں؟ کسی نے صدا لگائی تھی:

من سی پارہ دل می فروشم

میں دل کے ٹکڑے بیچنا چاہتا ہوں۔ بگفتہ قیمتش، کسی نے مجھ سے پوچھا کہ قیمت کیا لو گے۔ گفتم نگاہے، میں نے کہا ایک نظر۔ بگفتہ کمترش، اس نے کہا کچھ تو کم کرو کبھی زندگی میں ایک نظر سہی، کبھی زندگی میں ایک نگاہ سہی۔ تو صحبتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلّم میں ایک نگاہ جسے نصیب ہوگئی اس کا تزکیہ ہوگیا، اس کا دل نورِ الٰہی سے لبریز ہوگیا، اس کا دل محبتِ الٰہی سے چھلک پڑا، اس کا دل مصفّٰی ہوگیا۔ جمالِ الٰہی کا آئینہ بن گیا۔ تو اللہ کا رسول صلی اللہ علیہ وسلّم تمہیں میری بات پہنچاتا ہے، میری ذات سے میری صفات سے آشنا کرتا ہے، پھر تمہارا تزکیہ فرما دیتا ہے۔

خیر القرون:

صحابہ کرامؓ کی جماعت میں آپ کو عالم ملتے ہیں، ان پڑھ بھی ملتے ہیں، عابدوزاہد بھی ملتے ہیں اور ایسے بھی ملتے ہیں جو معذور ہیں، جہاد پہ نہیں جا سکے لیکن صحابیؓ ہونے میں کسی میں کمی اور شک نہیں۔ مرد بھی ملتے ہیں، خواتین بھی ملتی ہیں۔ جو بھی نگاہِ کرم کے سامنے آیا شرفِ صحابیت پا گیا۔ وہ قوت صحابہؓ میں بھی ایسی رہی کہ جو بھی کسی صحابیؓ کی صحبت میں آیا وہ تابعی قرار پایا اور تابعین کا طبقہ الگ ہے۔ تابعین میں بھی وہ قوت اس درجہ تھی کہ تابعی کا صحبت یافتہ تابعی تو نہ بن سکا لیکن تبع تابعین کا الگ طبقہ بن گیا۔ یہ خیر القرون کے لوگ ہیں، بہترین زمانوں کے لوگ ہیں، یہ ایسے لوگ ہیں جن کی وجہ سے وہ زمانہ ہی بہتر قرار پایا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا: خَیۡرُ الۡقُرُوۡنِ قَرۡنِیۡ ثُمَّ الَّذِیۡنَ یَلُوۡنَهُمۡ ثُمَّ الَّذِیۡنَ یَلُوۡنَهُمۡ (البخاری) یہ تین زمانے بے مثال ہیں جو گزر گئے۔ جو آنے والے زمانے ہیں ان میں اِن تین کا ثانی کوئی نہیں۔ پہلا زمانہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جس زمانے میں وارد دنیا میں جلوہ افروز تھے پھر اس کے بعد آنے والا زمانہ اور اس کے بعد کا آنے والا۔

یہ جو امت میں پیری مریدی کا تصور آ رہا ہے اس کی اصل یہ ہے کہ تبع تابعین کے بعد تزکیہ حاصل کرنے کے لیے تھوڑی سی محنت کرنا پڑی کہ کوئی شخص ان کی صحبت میں بیٹھ کر ذکرِ الٰہی سے اپنے دل کو صاف کرتا، دل کو ان کی طرف متوجہ کرتا اور وہ اپنے قلب سے انوارات اس کے دل میں القا فرماتے۔ اس طرح ایک طبقہ وجود میں آیا جسے اولیاء اللہ کہتے ہیں۔ جب یہ بات عام مسلمان کی اپنی محنت اور ہمت پر آئی تو پھر گنتی کے لوگ رہ گئے۔ پہلے تو ایک سیلاب تھا کہ جو نگاہِ پاک کے سامنے آیا صحابیؓ ہوگیا، جو صحابہؓ کی صحبت میں پہنچا تابعی ہوگیا اور جو تابعین کی صحبت میں پہنچا تبع تابعی ہوگیا لیکن اس کے بعد یہ دولت صاحبِ ہمت لوگوں کے حصے میں آئی جنہوں نے اپنی زندگیاں وقف

کیں، جنہوں نے اپنے قلوب کو پالش کیا، چمکایا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے۔
لِكُلِّ شيءٍ صِقَالَةٌ وصِقَالَةُ الْقُلُوْبِ ذِكْرُ اللّٰهِ (بیہقی) ہر چیز کے لیے پالش ہوتی ہے، صیقل ہوتی ہے جو اسے چمکاتی ہے او کما قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم اور دلوں کی پالش اللہ کا ذکر ہے۔ جنہوں نے دل پالش کیے، صاف کیے پھر جن کے دلوں میں نورِ الٰہی جلوہ گر تھا اور فیضانِ نبوت جلوہ گر تھا انہوں نے اسے ان کے دل کے برتن میں انڈیلا، ان پر القا کیا اور انوارات ان کے دل میں جگہ پا گئے تو اس طبقے کو اولیاء اللہ کہا گیا۔ پیری مریدی کا یہ سلسلہ اس طرح سے بنا۔ پھر جب تبع تابعین کا دور گیا تو ولی اللہ رہ گئے۔ اب جن لوگوں کو یہ طلب ہوئی وہ ان کی خدمت میں پہنچے، اپنے قلوب کو روشن کیا اور وہاں سے انوارات و برکات سے اپنا دل لبریز کرلیا۔ یہ پیری مریدی کی اصل ہے۔

اسلام میں اولاد کے لیے جائیداد کے لیے، کاروبار کے لیے، بیماری سے شفا کیلیے، کوئی پیری مریدی نہیں ہے۔ یہ سارے کام اللہ خود کرتا ہے۔ دارِ دنیا میں جو لوگ اس کی عظمت کا انکار کیے بیٹھے ہیں، اس نے دنیوی اسباب و علل ان پر بھی بند نہیں کیے۔ وہ دنیوی محنت کرتے ہیں، دنیوی اجر پاتے ہیں۔ ان کی قسمت میں جو روزی لکھی ہے وہ بھی انہیں دیتا ہے، جو اولاد لکھی ہے وہ بھی انہیں دیتا ہے اور جو دنیوی حالات ان کے لیے مقرر فرمائے وہ سارے عطا کرتا ہے۔ اب اگر خفا ہو کر کسی کی روزی بند کردے، کسی سے ہوا روک دے، کسی سے روشنی روک دے تو لوگ میدانِ حشر میں کہہ سکیں گے کہ بار الٰہا! اگر ہم نے تجھے نہیں مانا تو تو نے ہم پر کونسا احسان کیا، تو نے بھی تو اپنی نعمتیں روک لیں اور ہمیں بے موت مار دیا۔ ایسا کوئی نہیں کہہ سکے گا، سب تک اس کی نعمتیں پہنچ رہی ہیں، انسان ہی جھوٹا پڑے گا۔ قصور انسان کا ہی نکلے گا کہ اللہ نے تو اپنے کرم کے دروازے بند نہ کیے تھے۔

اگر کوئی ساری زندگی کفر و شرک میں گزار دیتا ہے اور ایک دفعہ خلوصِ دل سے کہتا ہے کہ اے اللہ! میں واپس آتا ہوں تو وہ فرماتا ہے کہ اس سارے کو چھوڑ دو اور آجاؤ۔ اب اگر اس پر بھی کوئی توبہ نہیں کرتا تو میدانِ حشر میں اس کے پاس کیا جواب ہو گا، کیا اعتراض ہو گا؟ وہ چاہتا تو فرماتا کہ خود ہی دور نکل گئے ہو اب واپسی کا سفر شروع کرو۔ اگر اتنی زندگی ملی کہ واپس پہنچ گئے تو ٹھیک ہے۔ جتنے گناہ کیے ہیں اتنی عبادتیں کرو۔ یہ اس کا کرم ہے کہ وہ کہتا ہے، جب بھی خلوصِ نیت سے کہہ دو کہ میں نے جو غلط کیا، اسے چھوڑتا ہوں اور تیری اطاعت کا عہد کرتا ہوں تو میں تیری توبہ قبول کرلوں گا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا: اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَّا ذَنْبَ لَهٗ (ابن ماجہ)
او کما قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم گناہ سے توبہ کرنیوالا ایسا ہوتا ہے جیسے اس نے گناہ کیا ہی نہ ہو۔ یہ ہم نے آج پیری مریدی بنالی ہے کہ وہاں دیگ پکائیں گے تو یہ ہو گا اور وہاں سلام کرنے جائیں گے تو یہ کام ہو جائے

جائے گا۔ یہ سب جہالت کی رسمیں ہیں اور برصغیر میں تو ہم نے بہت سی رسمیں ہندوؤں سے لے لی ہیں، جس طرح ہندو بتوں سے امیدیں وابستہ رکھتے ہیں اور مختلف امور کے لیے مختلف آستانوں پر جاتے ہیں، اسی طرح ہم نے بھی بنالیا ہے کہ اس بیماری کے لیے فلاں قبر پہ جانا چاہیے، اس بیماری کے لیے فلاں قبر پہ جانا چاہیے اور اولاد کے لیے فلاں قبر پہ جانا چاہیے، ہم نے بھی یہ شعبے بانٹ دیے ہیں۔ اس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں، یہ رسومات ہیں۔ اسلام میں پیری مریدی کا تصور یہ ہے کہ جس کے سینے میں انوارات وتجلیات اور برکاتِ نبوت صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اس کے پاس جاکر، وہاں بیٹھ کر اپنے دل کو صاف کیا جائے، اس کی توجہ حاصل کی جائے اور اپنے دل میں بھی وہ انوارات و برکات داخل کیے جائیں۔

وَ يُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ۔۔۔۔ پھر اس تزکیے کے بعد تمہیں اللہ کی باتیں سنائے، تمہیں اللہ کی کتاب کی تعلیم دے، تمہیں اس کا عالم بنادے اور اس میں چھپے ہوئے اسرار ورموز تم پر عیاں کردے۔

وَ الْحِكْمَةَ حکمت کیا ہے؟ قرآن کی تفہیم، قرآن کو سمجھنے کی بات۔ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حیاتِ مبارکہ، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اعمال، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا کردار، یہ سارے کیا ہیں! حکمت ہے، قرآن کریم کی تفسیر ہے اللہ کی باتوں کا عملی اظہار ہے۔

وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۵۱﴾ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمہیں ایسے رازوں سے آگاہ کیا جن سے تم بے خبر تھے۔ لوگ تو اس کی ذات کو ترستے تھے کہ وہ کون ہے، کیسا ہے، کہاں ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمہیں اس کی ذات سے آگاہ کیا، اس کی صفات سے آگاہ کیا۔ تمہیں آخرت تک کی خبر کردی، تمہیں اول وآخر کی خبر کردی۔ تخلیق آدم علیہ السلام سے لے کر آسمانوں کی بناوٹ، زمینوں کی بناوٹ انسان کی ابتدا اور اس کی انتہا پھر قیامِ قیامت، جنت و دوزخ، وہ باتیں جن سے تم بالکل بے خبر تھے، دنیا میں کوئی جاننے والا نہیں تھا، وہ ساری اطلاعات تم تک پہنچادیں۔

ذکر الٰہی:

اب تمہارا کام یہ ہے کہ فَاذْكُرُوْنِیْٓ تم میرا ذکر کرتے رہو، کبھی نہ چھوڑو۔ اتنے بڑے احسان کا جواب یہ ہے کہ ہر آن مجھے یاد رکھو، کوئی کام کرنے لگو تو یہ سوچو کہ یہ کام اللہ کو پسند ہے تو کرو، نہیں تو چھوڑ دو۔ یہ کیا ہوگا؟ عمل ہوگا اور اللہ کی یاد اس کے ساتھ ہوگی، یہ عملی ذکر ہوگیا۔ بات کرنے لگو تو یہ سوچو کہ اللہ کریم خفا تو نہیں ہوں گے، یہ لسانی ذکر

ہو گا۔ تسبیحات پڑھتے ہو، تلاوت کرتے ہو، اللہ اللہ کرتے ہو تو یہ ذکر تمہیں یاد کراتا رہے گا کہ کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا۔ فَاذْكُرُوْنِیْٓ ۔۔۔۔۔تم میرا ذکر کرو مجھے یاد کرتے رہو۔

ذکر پہ عطائے الٰہی:

اَذْكُرْكُمْ ۔۔۔۔۔میں تمہیں یاد کروں گا۔ جب اس قسم کا کوئی فعل اللہ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے تو اس کا معنی بعید مراد ہوتا ہے۔ معنی بعید اسے کہتے ہیں جو عمل ہو یعنی ایک تو ہم نے کہہ دیا کہ ایسا کریں گے لیکن جب کرتے ہیں تو وہ عمل معنی بعید قرار پاتا ہے۔ اب ذکر کا معنی بعید کیا ہوگا کہ اللہ کریم ہر لحہ تم پر اپنی رحمت نچھاور کرتے رہیں گے۔ مجھے یاد رکھو میں تمہیں کسی لمحے اپنی رحمت سے محروم نہیں رکھوں گا۔ فَاذْكُرُوْنِیْٓ اَذْكُرْكُمْ ۔۔۔۔۔میرا ذکر کرو، میں تمہارا ذکر کروں گا۔ ہمارا ذکر یہ ہے کہ ہم اس کو یاد رکھیں، زبان کو اس کے نام سے تر رکھیں، دل کو اس کی یاد سے آباد رکھیں اور اس کا ذکر یہ ہے کہ ہر آن وہ ہم پہ اپنا کرم برساتا رہے، اپنی رحمت نازل فرماتا رہے۔

اللہ کی نعمتوں پر شکر بجالاؤ:

وَاشْكُرُوْا لِیْ ۔۔۔۔۔اور میرا شکر ادا کرو وَلَا تَكْفُرُوْنِ﴿۱۵۲﴾ اور کبھی بھول کر بھی میری شکر گزاری سے انکار نہ کرو۔ کسی بھی لمحے ایسے غافل نہ ہو جانا کہ تمہیں میرے انعامات ہی بھول جائیں، میری یاد ہی بھول جائے، میرا کرم بھول جائے۔ غفلت سب سے بڑا جرم ہے، سب سے بڑا گناہ ہے اور سارے گناہ غفلت ہی کرواتی ہے۔ جب اللہ کی یاد بھول جائے، اس کی عظمت دل میں نہ رہے، اس کا خیال نہ رہے تو جرائم ہوتے ہیں۔ تم مجھے یاد رکھو میں تمہیں یاد رکھوں گا۔ تمہارا یاد رکھنا میری یاد کو دل میں بسانا ہے۔ میرا یاد رکھنا تم پر ابر رحمت برسانا ہے وَلَا تَكْفُرُوْنِ﴿۱۵۲﴾ اور میری ناشکری نہ کرو۔

اللہ کی نعمتوں میں سب سے بڑی نعمت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات والا صفات ہے۔ اس ارشاد کے بعد کہ تم میرا ذکر کرو، تم مجھے یاد رکھو، میں تمہیں یاد رکھوں گا، فرمایا، ہمیشہ میرا شکر ادا کرتے رہو اور ناشکری کی طرف مت جاؤ۔ شکر کا اولین مقام یہ نعمت عظمیٰ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا امتی بنایا۔ اتباع نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اس شکر کا تقاضا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر کثرت درود اس شکر کا اظہار ہے۔

سورۃ البقرہ رکوع 19 آیات 153 تا 163

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۱۵۳
وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا
تَشْعُرُوْنَ ۱۵۴ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ
الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ؕ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ۱۵۵ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ
مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۱۵۶ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ
رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۫ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ۱۵۷ اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ
شَعَآئِرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا ؕ
وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيْمٌ ۱۵۸ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ
اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالْهُدٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا بَيَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِی الْكِتٰبِ ۙ
اُولٰٓئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ ۱۵۹ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا
وَبَيَّنُوْا فَاُولٰٓئِكَ اَتُوْبُ عَلَيْهِمْ ۚ وَاَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۱۶۰ اِنَّ الَّذِيْنَ
كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ
اَجْمَعِيْنَ ۱۶۱ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ۱۶۲
وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ۱۶۳

اے ایمان والو! صبر اور نماز سے مدد حاصل کرو یقیناً اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ
ہیں ﴿۱۵۳﴾ اور جو اللہ کی راہ میں قتل ہو جائیں انہیں مردہ نہ کہو بلکہ وہ زندہ ہیں اور

لیکن تم سمجھ نہیں سکتے ﴿۱۵۴﴾ اور ہم تمہیں کسی قدر خوف اور بھوک اور مالوں اور جانوں اور پھلوں کی کمی سے آزمائیں گے اور آپ صبر کرنے والوں کو خوش خبری دیں ﴿۱۵۵﴾ وہ لوگ کہ جب ان پر کوئی مصیبت آتی ہے تو کہتے ہیں یقیناً ہم اللہ کے لیے ہیں اور یقیناً ہم پھر کر اس کے پاس جانے والے ہیں ﴿۱۵۶﴾ یہی لوگ ہیں جن پر ان کے پروردگار کی طرف سے خاص مہربانیاں ہیں اور رحمت اور یہی لوگ سیدھی راہ پانے والے ہیں ﴿۱۵۷﴾ یقیناً صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں سو جو کوئی (اللہ کے) گھر کا حج کرے یا عمرہ کرے (اور) ان دونوں کے درمیان طواف کرے تو اس پر گناہ نہیں ہے اور جو کوئی خوش دلی سے بھلائی کرے یقیناً اللہ قدر کرنے والے (اور) جاننے والے ہیں ﴿۱۵۸﴾ ہم نے جو دلائل اور راہنمائی نازل فرمائی ہے بے شک جو لوگ اسے اس کے بعد بھی کہ ہم نے کتاب میں لوگوں کے لیے واضح کر دی ہے چھپاتے ہیں ایسے لوگوں پر اللہ لعنت کرتے ہیں اور (دوسرے) لعنت کرنے والے لعنت کرتے ہیں ﴿۱۵۹﴾ سوائے ان لوگوں کے جو توبہ کریں اور اپنی اصلاح کریں اور (وہ باتیں) بیان کریں تو میں انہی کی طرف توجہ فرماتا ہوں اور میں توجہ فرمانے والا مہربان ہوں۔ ﴿۱۶۰﴾ یقیناً جو لوگ کافر ہوئے اور کفر پر ہی مر گئے ایسے لوگوں پر اللہ کی اور فرشتوں کی اور تمام انسانوں کی لعنت ہے ﴿۱۶۱﴾ وہ اسی میں ہمیشہ رہیں گے نہ ان پر عذاب کم ہوگا اور نہ ان کو مہلت دی جائے گی ﴿۱۶۲﴾ اور تمہارا معبود اکیلا معبود ہے جس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں وہ بڑا مہربان بہت رحم کرنے والا ہے ﴿۱۶۳﴾

تفسیر و معارف

زندگی گزارنے کا خوبصورت نسخہ، صبر و شکر:

پھر مومنین کو مخاطب فرماتے ہوئے زندگی گزارنے کا بہت ہی خوبصورت نسخہ تجویز فرمایا۔ دنیا عالم اسباب

ہے۔اس میں خیر بھی اور شر بھی، آرام بھی ہے اور مصیبتیں بھی، زندگی بھی ہے اور موت بھی، اس میں فراخی بھی ہے اور اس کے ساتھ تنگی بھی ہے، بالکل ایسے ہی جس طرح اس میں دن روشن ہے تو رات تاریک ہے۔اس ہمہ ہمی کی زندگی میں انسان اپنے بارے میں نہیں جانتا کہ اگلے لمحے کیا ہونے والا ہے، کوئی ایسا کام جو اسے پسند ہے یا کوئی ناپسندیدہ بات ہو جائے، کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ہم کچھ سوچ رہے ہوتے ہیں، ہماری توقعات کچھ ہوتی ہیں، امید کسی اور چیز کی ہوتی ہے لیکن معاملہ کچھ اور وقوع پذیر ہو جاتا ہے۔اس عالم میں اللہ کریم نے بندہ مومن کے لیے بہت خوبصورت نسخہ تجویز فرمایا کہ اے وہ لوگو! جنہیں نور ایمان نصیب ہے۔ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ۔۔۔۔۔یہ دو چیزیں ایسی ہیں جو ہر حال میں اختیار کیے رہو۔اگر تم پر فراخی ہے، تمہارے پاس قوت ہے، تمہارے پاس دولت ہے، تم بڑے خوشحال ہو، تو یہ دونوں چیزیں تمہیں اپنی حد میں رکھیں گی، اور تمہیں خراب ہونے سے بچائیں گی۔اور اگر مصیبت آگئی ہے، تنگی آگئی ہے یا کچھ ایسے حالات بن گئے ہیں جو مشکل نظر آتے ہیں تو یہ دونوں باتیں تمہیں اس میں سے بڑے آرام سے نکلنے کا راستہ دیں گی اور تم بہت آسانی سے سب کچھ جھیل جاؤ گے۔سب سے پہلی بنیادی بات ہے صبر سے مدد حاصل کرو۔عرف عام میں تو ہم سمجھتے ہیں کہ کوئی ناپسندیدہ بات ہو جائے، کسی عزیز کی موت ہو جائے یا کوئی مالی نقصان ہو جائے تو شور مچانا، جزع فزع کرنا بے صبری ہے اور خاموش رہنا، برداشت کرنا صبر ہے۔یہ صبر کی ایک صورت ہے، صبر کا مفہوم یہ نہیں ہے۔

صبر کا مفہوم:

صبر کا مفہوم ہے، جس طرح سوار گھوڑے کو باگ کھینچ کر روک لیتا ہے، اسی طرح رک جانا۔صبر سے مدد لینے سے مراد یہ ہے کہ اللہ کی نافرمانی کی طرف جانے سے خود کو روکے رکھو۔صبر یہ ہے کہ دولت آجائے، فراخی آجائے، حکومت آجائے، اقتدار و اختیار آجائے تو اللہ کو یاد رکھو اور اس کی نافرمانی کی طرف مت جاؤ، اپنے آپ کو روک لو۔اگر تم کمزور ہو گئے ہو، مجبور و بے بس ہو گئے ہو، مصیبت آگئی ہے تو اس مصیبت میں گھبرا کر بھی کسی غیر اللہ کا دامن مت پکڑو اور دامانِ رحمت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے وابستہ رہو۔اطاعتِ الٰہی کو اختیار کرو اور جیسے بھی حالات ہوں، ہر حال میں اپنے آپ کو اللہ کی نافرمانی سے روکو۔چونکہ کوئی مصیبت اتنی بڑی نہیں ہے جتنی بڑی مصیبت اللہ کریم کی نافرمانی ہے۔کوئی بھی مصیبت اتنی خطرناک نہیں ہے جتنی خطرناک اللہ کریم کی نافرمانی ہے۔تو سب سے پہلی اور بنیادی بات اور تقاضائے ایمان یہ ہے کہ صبر سے خود کو اللہ کی اطاعت پہ کاربند رکھو اور اللہ کی نافرمانی سے بچو۔وہ مسبب الاسباب ہے، مشکلیں حل فرما دے گا، آسان فرما دے گا، تکالیف دور فرما دے گا، تنگی ہے تو فراخی دے دے گا،

مشکل ہے تو آسان کر دے گا لیکن تمہیں یہ ثابت کرنا ہوگا کہ تم اللہ ہی کے بندے ہو اور اسی کو معبود مانتے ہو۔

صلوٰۃ:

دوسری بڑی بات اللہ کی عبادت ہے۔ فرمایا، صلوٰۃ پہ کاربند رہو، صلوٰۃ تمام عبادتوں کو محیط ہے۔ فرائض کا وقت ہے تو فرائض پوری کوشش اور محنت سے ادا کرو۔ فارغ ہو کر دنیا کا کام کر رہے ہو تو ہاتھوں سے کام کرو لیکن دل سے، زبان سے اللہ کو یاد کرتے رہو، اللہ کا ذکر کرتے رہو۔ عبادت تمہیں یہ قوت دے گی کہ اللہ کی نافرمانی سے بچ سکو اور صبر کرنا ہے تو صبر کے لیے بھی قوت و ہمت دے گی۔ ہر حال میں ان دو چیزوں، صبر اور صلوٰۃ سے مدد حاصل کرو۔

مفلسی بھی نعمت ہے:

ہم بظاہر غریبی اور مفلسی کو سب سے بڑی مصیبت سمجھتے ہیں لیکن بنظر حقیقت دیکھا جائے تو مفلسی بھی اللہ کا بہت بڑا انعام ہے۔ لاکھوں گناہ ایسے ہیں جو دولت ہو تو بندہ کرتا ہے اور دولت نہ ہو تو ان سے بچ جاتا ہے۔ کتنے جرائم ایسے ہیں کہ وہ کرنا چاہے تو بھی مفلسی اسے کرنے کی ہمت نہیں دیتی۔ تو یہ ایک طرح سے اللہ کریم کا انعام ہے اور دولت خود ایک بڑی مصیبت ہے۔ وہ اپنے ساتھ اختیارات لاتی ہے، اپنی پسند کے کام کرنے کی فرصت لاتی ہے۔ دولت ہو، اقتدار ہو، اختیار ہو تو زیادہ صبر کی ضرورت ہے، زیادہ عبادت کی ضرورت ہے۔ اللہ کی یاد تازہ رہے، حضورِ حق ہمہ وقت پیش نظر رہے، معیتِ باری دھیان میں رہے اور آدمی جو فیصلے کرے وہ اللہ کی اطاعت کی حدود کے اندر ہوں۔

دنیا کا نظام ایسا ہے کہ ہر آدمی کا فیصلہ کچھ لوگوں کو متاثر کرتا ہے۔ ارشادِ نبوی علیہ الصلوٰۃ والسلام ہے: كُلُّكُمْ رَاعٍ وَ كُلُّكم مَسْؤُلٌ عَنْ رَّعِيَّتِهِ (مسلم) اوکما قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تم میں سے ہر ایک حکمران ہے۔ کم از کم اپنے گھر پہ تو اس کی حکومت ہے۔ کسی کی محلے میں سنی جاتی ہے، کسی کی شہر میں سنی جاتی ہے، کوئی ملک کا حکمران ہے تو ہر ایک کا ایک دائرہ کار ہے۔ اب جو ملک کا حکمران ہے، اس کا ہر فیصلہ ملک کے ہر شہری پر لاگو ہوتا ہے۔ اسے دوسروں کی نسبت زیادہ صبر کی ضرورت ہے کہ معاملہ فہمی سے کام لے، حوصلے سے کام لے اور بات سن کر فیصلے نہ کرے بلکہ بات کی تحقیق کرے۔ وہ کام کرے جس میں ان لوگوں کی بہتری شامل ہو جو اس کے احکام کے پابند ہیں اور جو اس کے زیرِ نگیں ہیں۔ اسی طرح ہر بندے کا ایک دائرہ کار ہے تو وہ اس جگہ اپنی ذمہ داری نبھائے اور کسی بھی کام میں جلد بازی نہ کرے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ارشاد کا مفہوم ہے کہ کسی کے جھوٹا ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ جو بات بھی سنے وہی بلا تحقیق آگے کہہ دے۔ اگر جھوٹی بات سنے گا تو آگے جھوٹ پہنچائے گا۔ یہ جو آج کل ہمارے ہاں پراپیگنڈہ چلتا ہے، اس کی کوئی بنیاد نہیں ہوتی، کوئی اس کا source نہیں ہوتا۔ آپ سے کس نے کہا؟ آپ کو کس نے

بتایا؟ اس کا کوئی اتا پتانہیں اور لوگوں کو پریشان کر دیا۔ اسے جھوٹ کہا گیا ہے۔

فرمایا، صبر سے مدد لو، صبر کو اپنا معاون بناؤ۔ اگر تم صبر کرو گے، اگر تم سوچ سمجھ کر فیصلے کرو گے، اگر تم اللہ کی رضا کے مطابق فیصلے کرو گے اور اللہ کی نافرمانی سے خود کو روکو گے تو تمہارا بھلا تو ہوگا ہی لیکن تم نوع انسانی کے بھلے کا بھی سبب بن جاؤ گے۔ دنیا کا بھلا بھی ہوگا، آخرت کا بھلا بھی ہوگا اور دوسری چیز جس سے مدد حاصل کرو، وہ اللہ کی عبادت ہے۔ جتنا اللہ کریم کو یاد کرو گے، جس قدر رکوع و سجود کرو گے اتنی راحت پاؤ گے۔ فرائض تو مجبوری ہے پورے کرنے ہی ہیں، نوافل ادا کرو، تلاوت کرو، تسبیحات پڑھو، اللہ کا ذکر کرو، اللہ کو ہمہ وقت یاد رکھو اور کوئی لمحہ غفلت کا نہ آئے۔ اگر آنکھ سو بھی جائے تو دل اللہ اللہ کرتا رہے۔ اللہ کی یاد، اللہ کی عبادت، اللہ کی بارگاہ میں حضوری، صلوٰۃ اور صبر، یہ دو ایسی طاقتیں ہیں جن سے تم مدد حاصل کر سکتے ہو اس لیے کہ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ﴿۱۵۳﴾ یہ بات یاد رکھو! یہ پکی بات ہے، یقیناً اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ صبر کرنے والوں کو معیتِ باری نصیب ہوتی ہے۔ معیتِ باری بہت بڑی بات ہے۔ کسی بندے کو ہر وقت اللہ کا ساتھ نصیب ہو تو پھر اسے کس قسم کی پریشانی ہے! اللہ ہر جگہ موجود ہے اور ہر وقت ہمارے ساتھ ہے لیکن مصیبت یہ ہے کہ ہم اس کا ساتھ بھول جاتے ہیں۔

میں تو تیرے خیال کو سو بار چھوڑ دوں
لیکن تیرا خیال نہیں چھوڑتا مجھے

معیت باری:

ہم اس کی معیت کو بار بار بھول جاتے ہیں لیکن یہ بھی اس کی عطا ہے کہ وہ اپنی معیت سے ہمیں محروم کبھی نہیں کرتا۔ وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ (الحدید: 4) تم کہیں بھی ہو وہ تمہارے ساتھ ہے۔ اب بات اس ادراک کی ہے۔ ہمیں یہ ادراک بھی ہو کہ اللہ میرے ساتھ ہے۔ دنیا میں جو لوگ اس کا ادراک حاصل کر لیتے ہیں، ان کے سارے مسائل آسان ہو جاتے ہیں اور وہ زندگی میں کبھی پریشان نہیں ہوتے۔ حتیٰ کہ موت بھی آتی ہے تو مسکرا کر گلے لگا لیتے ہیں:

نشان مرد مومن باتو گویم
چوں مرگ آید تبسم برلب اوست

تجھے مردِ مومن کی نشانی بتاؤں کہ جب موت بھی آتی ہے تو اس کے لبوں پہ مسکراہٹ ہوتی ہے۔ یہ کیفیت معیتِ باری میں نصیب ہوتی ہے۔

ہر شخص کو اس کی حیثیت کے مطابق اس معیت کا ادراک ہوتا ہے۔ جتنا اس کا اللہ پر اعتماد ہے، جتنی اس کے دل میں اللہ کی یاد ہے، جتنی اس کے دل میں اللہ کی محبت ہے، جتنی اس کے دل میں آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ہے، عقیدت ہے جتنا اتباع کرتا ہے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا، اتنا ہی معیتِ باری کا ادراک ہوتا جاتا ہے۔ اللہ کریم کی ذات اور اس کی صفات میں تبدیلی نہیں آتی، بندے میں تبدیلی آتی جاتی ہے۔

یہ چھوٹی سی مثال لیں، آپ پنکھا چلاتے ہیں۔ ایک ہی بٹن ہے، آن کرتے ہیں تو وہ آہستہ آہستہ رینگنے لگ جاتا ہے۔ اسی بٹن کو مزید گھماتے ہیں تو اس میں بجلی زیادہ آجاتی ہے۔ بجلی بھی وہی ہے، پنکھا بھی وہی ہے لیکن اسے اگلے نمبر پر لے جاتے ہیں تو اور تیز ہو جاتا ہے۔ اسی طرح انسان میں تبدیلی آتی ہے۔ وہ ایک مقام پہ تھوڑی سی معیت محسوس کرتا ہے، دوسرے پہ اس سے زیادہ، بالآخر اسے وہ کیفیت نصیب ہو جاتی ہے کہ زندگی بھر معیت باری کا احساس رہتا ہے اور یاد رہے کہ بندوں کو جو معیت نصیب ہوتی ہے وہ بندے کی صفات پر منحصر ہے۔

ارشادِ باری ہے: اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ﴿۱۵۳﴾ یقیناً اللہ صبر کرنیوالوں کے ساتھ ہے۔ جب تک کوئی صبر کر رہا ہے اللہ اس کے ساتھ ہے، اسے معیتِ باری نصیب ہے۔ اگر وہ صبر چھوڑے گا تو اللہ تو ہر جگہ موجود ہے لیکن اس کے کرم سے وہ شخص محروم ہو جائے گا، معیت سے محروم ہو جائے گا کیونکہ معیتِ باری کا انحصار صفات انسانی پر ہے۔

معیتِ ذاتی صرف دو ہستیوں کا خاصہ ہے:

انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام وہ ہستیاں ہیں جنہیں دائمی معیتِ باری نصیب ہوتی ہے لیکن یاد رہے کہ جہاں اللہ تعالیٰ کی معیتِ ذاتی انسان کی صفات کے ساتھ مشروط ہے، وہاں انبیاء علیہم السلام کی ذات کو اللہ تعالیٰ کی معیتِ صفاتی نصیب ہوتی ہے۔ مثلاً حضرت موسیٰ علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام جب مصر چھوڑ کر نکلے اور ساحل سمندر تک پہنچے تو پیچھے سے فرعون اپنا لاؤ لشکر لے کر پہنچ گیا۔ بنی اسرائیل نے گھبرا کر موسیٰ علیہ السلام سے کہا، آپ نے تو ہمیں مروا دیا۔ ہم تو پہلے ہی مصیبت میں تھے، آپ علیہ السلام مبعوث ہوئے تو مصیبتیں اور بڑھ گئیں، ہمارا کوئی بھلا نہیں ہوا۔ اب سامنے سمندر ہے اور پیچھے فرعون کا لشکر ہے۔ سمندر میں چھلانگ لگائیں گے تو مارے جائیں گے، فرعون کا لشکر پہنچ جائے گا تو قتل ہو جائیں گے جب وہ گھبرائے تو موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: اِنَّ مَعِيَ رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ (الشعراء: 62) یہاں اللہ کا ذاتی نام نہیں لیا۔ اللہ نہیں فرمایا، رب فرمایا، میرے ساتھ میرا رب ہے، وہ میرے لیے راستہ پیدا کرے گا یعنی معیتِ باری تو ہے لیکن اللہ کی طرف سے صفاتی ہے۔

جتنی مخلوق اللہ نے پیدا فرمائی ہے، آدم علیہ السلام کی اولاد میں جو گزر چکی ہے یا جو قیامت تک آئے گی اس

میں دو ہستیاں ایسی ہیں جنہیں معیتِ ذاتی حاصل ہے۔غیر مشروط، نہ اللہ کی طرف سے صفات ہیں، نہ بندے کی طرف سے صفات ہیں۔ انبیاء علیہم السلام میں آقائے نامدار حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم اور غیر نبی میں سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ، ایک ہستی امام الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلّم اور دوسری ہستی امام الصدیقین حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ قرآن کریم اس پر گواہ ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم غار میں تشریف فرما تھے اور حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زانو پہ سر مبارک رکھے آرام فرما رہے تھے، تو مشرکین مکہ تلاش کرتے ہوئے غار کے سامنے پہنچ گئے۔ سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ پریشان ہو گئے کہ یہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کو نقصان نہ پہنچائیں، کوئی تکلیف نہ پہنچائیں، ایذا نہ پہنچائیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا: لَا تَحْزَنْ۔۔ حزن نہ کریں۔ حزن وہ دکھ ہوتا ہے، وہ غم ہوتا ہے جو محبوب کے بارے میں ہو۔ جیسے حضرت یعقوب علیہ السلام کو حضرت یوسف علیہ السلام کی جدائی کا غم تھا۔ قرآن کریم فرماتا ہے وَ ابْيَضَّتْ عَيْنٰهُ مِنَ الْحُزْنِ (یوسف: 84) یوسف علیہ السلام کے دکھ سے ان کی آنکھیں روتے روتے سفید ہو گئیں۔ اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ میرا غم نہ کر اس لیے کہ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا۔۔۔ (التوبہ: 40) یقیناً اللہ ہم دونوں کے ساتھ ہے۔ ادھر بندے کی صفت بھی نہیں ہے، ادھر رب کی صفت بھی نہیں ہے۔ اللہ کی ذات ہے اور ادھر بھی دو ذاتیں ہیں، فرمایا: اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا۔۔۔۔ ہم دونوں کے ساتھ اللہ ہے۔ پوری اولاد آدم علیہ السلام میں، جو گزر چکی یا آنے والی ہے، صرف دو ہستیوں کو معیتِ ذاتی نصیب ہے، امام الانبیاء حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم اور امام الصدیقین ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ یاد رہے کہ امام الصدیقین صرف ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا لقب ہے، اسے کسی دوسری جگہ استعمال نہ کیا جائے۔ جب حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا وصال ہوا اور سیدنا فاروق اعظم سربراہ خلافت ہوئے تو عرض کیا گیا، یا خلیفہء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم! فرمایا، نہیں، خلیفہ رسول صلی اللہ علیہ وسلّم صرف ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو سجتا ہے۔ عرض کیا گیا، ہم آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو کیا کہیں؟ فرمایا، مجھے امیر المومنین کہو، خلافت کا لقب صرف ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خصوصیت ہے۔ اسی طرح امام الصدیقین کسی دوسرے پہ نہیں سجتا، صرف ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا لقب ہے۔ کائنات میں یہ دو ہستیاں ہیں جنہیں معیتِ ذاتی حاصل ہے، ان کی بھی ذات ہے، ادھر اللہ کی بھی ذات ہے۔

شہید کو مردہ کہنا حرام ہے:

فرمایا: وَ لَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ اس دنیا میں انسان سمجھتا ہے کہ موت سب سے بڑی مصیبت ہے، جس سے وہ بہت ڈرتا ہے۔ موت کی بھی مختلف اقسام ہوتی ہیں، کسی کا دل کام کرنا چھوڑ گیا تو مر

گیا، کوئی بیمار رہا تو مر گیا لیکن قتل ہونا موت کی انتہائی بھیانک صورت ہے۔ فرمایا، اگر قتل بھی ہو جائے لیکن اللہ کی راہ میں مارا جائے تو اسے مردہ مت کہو وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَمْوَات ۔۔۔۔۔ جو اللہ کی راہ میں قتل ہو جاتا ہے، وہ مرتا نہیں۔ سینہ چاک تھا، سر کٹ گیا اس کے جسم کے پرخچے اڑ گئے، آپ نے اس کا جنازہ پڑھا، خود اپنے ہاتھوں دفن کیا لیکن اسے مردہ نہ کہو۔ یعنی معیتِ باری کا حاصل یہ ہے کہ موت بھی اس شخص سے شکست کھا گئی جو اللہ کی راہ میں مارا گیا۔ لڑتا ہوا مارا گیا یا اللہ کی اطاعت کرتا ہوا مارا گیا یا ظلماً کسی نے قتل کر دیا، جس حال میں بھی وہ تھا، صبر اور صلوٰۃ سے مدد لیتا ہوا، معیتِ باری پہ قائم رہا، اگر کوئی قتل بھی ہو گیا ہے تو اسے مردہ نہ کہو۔ اسے مردہ کہنا حرام ہے شرعاً منع ہے، قرآن کی اس آیت کی رو سے حرام ہے۔

اب یہ بھی عجیب بات کہ قتل کا لفظ بدن پہ صادر ہوتا ہے، روح پہ صادر نہیں ہوتا کہ فلاں کی روح قتل ہوگئی۔ قتل کا فعل بدن پہ وارد ہوتا ہے۔ گردن کٹ جاتی ہے، سینہ چھلنی ہو جاتا ہے، جسم کے ٹکڑے ہو جاتے ہیں لیکن اللہ کریم فرماتے ہیں: بَلْ اَحْيَآءٌ ۔۔۔۔۔ وہ تو زندہ ہیں۔ شہید کا مطلب ہوتا ہے گواہ۔ اللہ کی راہ میں قتل ہونیوالے کو شہید اسی لیے کہا جاتا ہے کہ وہ جان دے کر یہ گواہی دیتا ہے کہ اللہ واحد ولاشریک ہے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے برحق رسول ہیں۔ وہ جان دے کر گواہی دیتا ہے کہ دینِ اسلام، دینِ حق ہے۔ وہ جان دے کر گواہی دیتا ہے کہ قرآن اللہ کی آخری اور برحق کتاب ہے۔ وہ اس فلسفہ حیات کا گواہ ہوتا ہے جس پہ وہ زندگی گزار رہا ہوتا ہے اور جان دے کر ورقِ دہر پر اپنی گواہی ثبت کر دیتا ہے۔

لوگ تو لکھیں کاغذ پر ہم ورقِ دہر پر لکھیں گے
قلم سروں کے خون سیاہی شاعر بن کر لکھیں گے

حق پر استقامت رکھتے ہوئے جو سر کٹا دیتا ہے، اسے مردہ نہ کہو۔ تمہیں کیا پتہ زندگی کیا ہے؟ کتنے لوگ ایسے ہیں جو زندہ پھرتے ہیں لیکن وہ زندہ نہیں، زندگی سے محروم ہیں۔ جسے اللہ اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر یقین نصیب نہیں ہوا وہ ایک چلتی پھرتی قبر ہے، اسی میں اس کی مردہ روح ہے۔ اس کا وجود ایک قبر ہے۔

ایک عرب شاعر نے کہا تھا وَاَجسَامُهُم قَبْلَ الْقُبُور قُبُورُهُمْ کہ جنہیں نور ایمان نصیب نہیں ہوتا، قبروں میں جانے سے پہلے ان کے وجود ان کی ارواح کی قبریں بن جاتے ہیں۔ یہ تو چلتی پھرتی قبریں ہیں۔ جنہیں آپ زندہ سمجھتے ہیں لیکن وہ نور ایمان سے محروم ہیں تو عند اللہ وہ چلتی پھرتی قبریں ہیں اور جو اللہ کی راہ میں قتل ہو کر قبر میں دفن بھی ہو جاتا ہے، وہ زندہ ہے، اسے مردہ نہ کہو۔ عجیب بات ہے کہ جسم کے پرخچے اڑ گئے، روح پرواز کر گئی، ہم نے جنازہ پڑھا، ہم نے لحد میں اتارا، بعض ایسے ہیں جن کے وجودوں کی گٹھڑیاں بنا کر اتار دیں، بعض ایسے

ہیں جو ملے ہی نہیں، آگ میں جل گئے یا کسی توپ کے گولے سے اڑ گئے یا مکان کے نیچے دفن ہو گئے۔ اب اللہ اللہ کرنے والے کتنے لوگ زلزلے میں پہاڑوں کے نیچے دفن ہو گئے۔ پتہ نہیں کن گہرائیوں میں دفن ہو گئے۔ نہ انہیں کوئی جانتا ہے، نہ کسی کو یاد ہیں، نہ کسی کو پتہ چلے گا۔ کتنے ایسے ہیں لیکن ان کو اگر معیتِ باری نصیب تھی تو وہ سب شہید ہیں، انہیں مردہ نہ کہو۔ معیت باری ایسی نعمت ہے! موت مخلوق ہے، ذاتِ باری خالق ہے۔ خالق جس کے ساتھ ہے اس پر مخلوق کب غلبہ پائے گی! وہ موت کو بھی شکست دے دیتا ہے۔

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ﴿۱۵۴﴾ وہ زندہ ہیں، ان کے وجود زندہ ہیں۔ اللہ انہیں روزی دیتا ہے، ان پر رحم فرماتا ہے اور انہیں اپنی نوازشوں سے نوازتا رہتا ہے۔ زندگی کا جو پہلو تمہارے سامنے ہے اسے تم جانتے ہو لیکن زندگی کا یہ رخ کہ بندہ بظاہر قتل ہو کر زیرِ زمین دفن بھی ہو جائے تو وہ زندہ ہے، یہ تمہارے شعور اور علم کی رسائی سے بالاتر ہے۔ یہ بات تمہارے فہم وادراک سے بالاتر ہے لیکن اسے تم صرف اللہ کی بات سمجھ کر مان سکتے ہو۔ تمہیں اللہ کی طرف سے جو خبر آئی ہے، اللہ نے جو بات ارشاد فرمائی ہے، اسے اللہ کریم کا ارشاد سمجھ کر مان سکتے ہو۔ اگر تم دلائل سے، اپنے علم سے اور اپنی سائنس سے ماننا چاہو تو یہ چیزیں اتنی کمزور اور اتنی پست ہیں کہ ان کے ذریعے اس زندگی کا ادراک ممکن نہیں۔ یہ ایسی باتیں ہیں جنہیں انسانی علوم اپنے احاطے میں نہیں لا سکتے۔ ہاں، کسی کو سمجھ آئے گی تو عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے سمجھ آئے گی، اللہ کی محبت سے سمجھ آئے گی، معیت باری سے سمجھ آئے گی، ایمان باللہ سے سمجھ آئے گی۔ یہ ایک ہی کسوٹی ہے کہ اللہ نے کہہ دیا تو یہ حق ہے۔

امتحان زندگی کا خاصہ ہیں:

زندگی کے حقائق کے بارے ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ مختلف قسم کے امتحان اس زندگی کا خاصہ ہیں۔ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ ۔۔۔ تم پر آزمائشیں بھی اللہ کی طرف سے آئیں گی۔ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ ۔۔۔ کسی لمحے کوئی خطرہ پیدا ہو جائے گا، خوف طاری ہو جائے گا۔ وَالْجُوْعِ ۔۔۔ اور کبھی بھوک کاٹنا پڑ جائے گی۔ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ ۔۔۔ اور کبھی مال و دولت میں کمی آ جائے گی۔ وَالْاَنْفُسِ ۔۔۔ اور کبھی جانوں کا ضیاع ہو گا۔ وَالثَّمَرٰتِ ۔۔۔ اور کبھی پھلوں میں کمی آ جائے۔ یعنی زندگی کا ایک خاصہ ہے، اس کی ایک روش ہے، اس میں آسانیاں بھی ہیں اور مشکلات بھی ہیں۔ آسانیاں بھی اللہ کریم کی آزمائش ہوتی ہیں کہ ایک آدمی خوشحال ہو کر، فارغ البال ہو کر، دولت مند ہو کر اللہ کو یاد کرتا ہے اور اس کی اطاعت کرتا ہے یا اپنی بڑائی کے گھمنڈ میں آ جاتا ہے۔ کبھی خوف مسلط ہو جائے گا، خطرات پیدا ہو جائیں گے اور یہ دیکھا جائے گا کہ ان خطرات میں بھی وہ اللہ کی معیت حاصل کرتا ہے، اللہ کو یاد کرتا ہے یا غیر اللہ کی طرف بھاگتا ہے۔ کبھی بھوک پریشان کرے گی یا کسی سودے میں خسارہ

ہو جائے گا، مال میں کمی ہو جائے گی، چوری ہو جائے گی، کوئی چھین لے گا، کبھی جانوں کا ضیاع ہو گا اور کبھی فصلوں کا، پھلوں کا نقصان ہو گا۔ ژالہ باری ہو گی، فصلیں جل جائیں گی یا کسی اور طرح سے ان میں کمی ہو جائے گی۔ یہ سارے واقعات اللہ کی طرف سے آزمائش ہوتے ہیں کہ انسان کا ردعمل کیا ہوتا ہے اور وہ کیا کرتا ہے۔ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۵۵﴾ اور آپ صبر کرنے والوں کو خوشخبری دیں۔

بات یہ نہیں ہے کہ اللہ کریم جاننا چاہتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ وہ ہمیں منوانا چاہتے ہیں۔ کل عرصہ محشر میں پیش ہوں گے تو ہر کوئی اپنی صفائی پیش کرنے کی کوشش کرے گا۔ اس وقت فرمایا جائے گا کہ جب وہاں تم پر مصیبت آئی یا تم ان حالات سے گزرے جو وقتاً فوقتاً ظہور پذیر ہوتے رہے تھے۔ تو تمہارا کیا کردار تھا اور تم نے کون سا رویہ اختیار کیا۔ جیسے پاکستان میں زلزلہ آیا اور لاکھوں لوگوں کو موت کی نیند سلا گیا۔ لاکھوں بے گھر ہو گئے، کتنے لوگ زخمی اور اپاہج ہو گئے تو دیکھا یہ جائے گا کہ اس میں جو لوگ سلامت رہے، وہ کیا کرتے ہیں۔ کیا وہ اللہ کا آسرا ڈھونڈتے ہیں یا اللہ کو بھول کر ادھر ادھر ہاتھ پاؤں مارتے ہیں۔ جو لوگ بچ گئے، کیا وہ اللہ کی رضا کے لیے ان مجبور و بے بس لوگوں کو جو اس کی زد میں آ گئے۔ بچانے کی کوشش کرتے ہیں اور ان کی مدد کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ گویا انسانی رویے دیکھے جائیں گے، ہر ایک کا اپنا اپنا ایک ردعمل ہے، اس کو جانچا جائے گا اور اس کے مطابق عرصہ محشر میں بات ہو گی۔

اس کے ساتھ ہی یہ بھی فرمایا: وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۵۵﴾ آپ بشارت دیجیے ان لوگوں کو جو ان مشکلات میں بھی صبر کرتے ہیں، نیکی کا دامن تھامتے ہیں اور دوسروں کے کام آنے کی کوشش کرتے ہیں۔ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۔۔۔۔۔ ایسے لوگ جن پر مصیبت آ جائے تو کہتے ہیں: قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿۱۵۶﴾ ان کے عمل سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کہہ رہے ہیں، ہم تو اللہ ہی کے لیے تھے، اللہ نے ہمیں پیدا فرمایا، اس نے زندگی دی، اس نے مہلت دی اور اسی کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔ جو گزر گئے انہیں بھی اپنی منزل مل گئی، انہیں وہیں جانا تھا اور جو باقی ہیں ان کو بھی اللہ کے حضور جانا ہے، آج نہ سہی کل باری آ جائے گی۔ ان کا رویہ مثبت ہوتا ہے، صبر کرتے ہیں، دوسروں کے کام آنے کی کوشش کرتے ہیں اور حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ سب کچھ اللہ کا ہے۔ ہم بھی اللہ کے ہیں، اس کی مخلوق ہیں، جس حال میں وہ چاہے رکھے، بالآخر ہمیں لوٹ کر اس کی بارگاہ میں حاضر ہونا ہے اور اس کے سامنے اپنے اعمال کی جوابدہی کرنا ہے۔ جو لوگ اس پر قائم رہتے ہیں، فرمایا، انہیں خوشخبری دے دیجیے اور کامیابی کی نوید دیجیے کہ یہ ایسے لوگ ہیں جو مشکلات میں بھی، مصائب میں بھی، موت میں بھی اور تکالیف میں بھی اللہ ہی کو یاد رکھتے ہیں۔

اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۗ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ﴿۱۵۷﴾ یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ کی طرف سے خاص خاص رحمتیں نازل ہوتی ہیں۔ چونکہ ہر آدمی کا حال مختلف ہوتا ہے، ہر آدمی کی سوچ مختلف

ہوتی ہے، ہر آدمی کا اپنا ردِعمل ہوتا ہے تو جس کا ردِعمل مثبت ہوگا اور جتنی گہرائی، خلوص اور جس درددل سے وہ عمل کر رہا ہے، اسی طرح کی رحمت نازل ہوگی۔ گویا ہر ایسے بشر پر خاص رحمتیں نازل ہوتی ہیں اور اللہ کا خصوصی کرم نازل ہوتا ہے۔ ہدایت پر ہونے کے لیے یقین کے ساتھ انسان کے اس کے عمل کی پرکھ بھی ضروری ہے کہ اعمال کیا ہیں، کردار کیا ہے، رویہ کیا اختیار کرتا ہے اور کس طرف بڑھتا ہے۔

صفا و مروہ:

اسی طرح مشرکین مکہ کا یہ بھی اعتراض تھا کہ بیت اللہ کا طواف تو صدیوں سے آرہا ہے اور ہم بھی کرتے ہیں۔ حج کے نام پر انہوں نے بھی کچھ رسومات اپنا رکھی تھیں، سیٹیاں بجاتے، کپڑے اتار دیتے اور ننگے طواف کرتے، بہر حال اپنے خیال کے مطابق انہوں نے بھی کچھ نہ کچھ رسمیں ایجاد کر رکھیں تھیں۔ اسلام نے حج کو تو قائم رکھا لیکن اس کے خاص طریقے ارشاد فرمائے اور ہر طواف کے ساتھ صفا اور مروہ کی سعی لازم قرار دے دی۔ اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ۔۔۔۔ صفا اور مروہ دو چھوٹی پہاڑیاں ہیں۔ آج کل درمیانی جگہ تقریباً بھر چکی ہے اور بالکل چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں رہ گئی ہیں۔ لیکن ایک زمانے میں یہ جگہ سطح زمین تک گہری تھی۔ درمیان میں ایک ٹیکری سی تھی جس پر بیت اللہ شریف تھا۔ اس کے گرداگرد بھی گھاٹی تھی اور صفا اور مروہ کے درمیان بھی گھاٹی تھی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام جب حضرت اسمٰعیل علیہ السلام اور حضرت حاجرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو وہاں چھوڑ کو واپس آئے تو پانی کا جو مشکیزہ انہیں دے کر آئے تھے، وہ ختم ہوگیا۔ ننھے اسمٰعیل علیہ السلام جب پیاس سے بہت بے تاب ہوئے تو مائی صاحبہ انہیں زمین پر لٹا کر ان پہاڑیوں پر چڑھیں کہ کہیں کوئی پرندہ اڑتا نظر آئے، کہیں کوئی انسان نظر آئے، کوئی جانور نظر آئے۔ صحرا میں کسی پرندے کا یا جانور کا نظر آنا اس بات کی دلیل ہوتا ہے کہ یہاں کہیں پانی ہے۔ جہاں تک اسمٰعیل علیہ السلام نظر آتے، وہ مڑ کر دیکھتی جاتی تھیں۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہو جاتے تو دوڑ لگا کر اوپر پہنچتیں اور واپسی پر بھی اسی طرح اترتیں حتیٰ کہ پھر اسمٰعیل علیہ السلام نظروں کے سامنے آجاتے۔ صفا پر کچھ نظر نہیں آیا تو وادی میں اتر کر دوسری پہاڑی پر چڑھنا شروع کیا۔ اس میں بھی جہاں تک حضرت پر نظر پڑتی، آرام سے چلتیں اور جب بچہ نگاہوں سے اوجھل ہوتا تو بھاگ کر اوپر پہنچتیں۔ اس طرح ان کے سات چکر لگے لیکن کہیں پانی کے کوئی آثار نظر نہ آئے۔

آبِ زم زم:

ساتویں دفعہ جب اتر رہی تھیں تو انہوں نے دیکھا کہ جہاں اسمٰعیل علیہ السلام ایڑیاں رگڑ رہے تھے، وہاں سے پانی کا چشمہ ابل رہا تھا۔ آپ بھاگ کر وہاں پہنچیں۔ پانی چونکہ زور سے ابل رہا تھا اور اس نے بہنا شروع کر دیا تھا۔ اس کے گرداگرد ریت کی دیوار بنانے کی کوشش کی لیکن پانی جب ریت کے اوپر سے نکل کر بہنے لگا تو سختی سے حکم دیا: زم زم! ٹھہر جا، رک جا تو تب سے اس مقدس پانی کا نام زم زم ہے، آب زم زم کہا جاتا ہے۔

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشادِ گرامی ہے کہ زم زم پیو تو اتنا پیو جتنی پیاس ہے بلکہ پیٹ بھر کے پیو، جتنا پی سکتے ہو، اتنا پیو اس لیے کہ اس میں ہر مرض کی شفا ہے۔ جیسا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا وہ حق ہے کہ اس میں ہر مرض کی دوا موجود ہے، نرا پانی بھی ہو، اس میں کچھ بھی نہ ہو تو بھی وہ ہر مرض کی شفا ہے لیکن اللہ کی شان ہے کہ آبِ زم زم میں یہ شفا پہلے سے تھی یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمانے سے اس میں آ گئی، اس میں ہر مرض کی دوا واقعی موجود ہے۔

اللہ کریم کو حضرت حاجرہ کی یہ دوڑ، ان کی پہاڑوں پر بے تابی سے چڑھنا اور اس میں بھروسہ اللہ ہی پہ رکھنا بہت پسند آیا۔ دنیا عالمِ اسباب ہے۔ انہوں نے بھاگ دوڑ تو شروع کی، اسباب تو اختیار کیے لیکن اعتماد اسباب پہ نہیں تھا، اللہ ہی پر تھا کہ کہیں کوئی سبب پیدا فرما دیں۔

انہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام ایک ایسے لق ودق صحرا میں چھوڑ گئے جہاں آبادی کے کوئی آثار نہیں تھے اور کوئی چیز وہاں سے اگتی بھی نہیں تھی۔ ابراہیم علیہ السلام نے جاتے ہوئے واپسی پہ جو دعا کی تھی وہ قرآن کریم میں موجود ہے جس میں انہوں نے عرض کیا تھا: اِنِّیۡۤ اَسۡکَنۡتُ مِنۡ ذُرِّیَّتِیۡ بِوَادٍ غَیۡرِ ذِیۡ زَرۡعٍ (ابراہیم:37) اے اللہ میں اپنے بیوی بچے کو ایسی وادی میں چھوڑے جا رہا ہوں جہاں زراعت نام کی کوئی چیز نہیں ہے جس میں کوئی زراعت نہیں ہوتی، جس میں زندگی کے اسباب موجود نہیں ہیں، بظاہر کوئی ایسا سبب نہیں جو زندہ انسان کی ضرورت پورا کرے۔ نہ کوئی درخت، نہ پھل، نہ کھیتی ہے، نہ سبزہ ہے، نہ پانی ہے، کچھ بھی نہیں، وہاں کوئی چیز نہیں اگتی۔ آدمی اس صورت حال کا قیاس کرے کہ ایک خاتون ہو، عمر رسیدہ ہو، چاند سا بیٹا پاس ہو اور ویرانہ ہی ویرانہ ہو۔ خود بیت اللہ شریف بھی تو اس وقت نہیں تھا۔ طوفانِ نوح میں بیت اللہ شریف بھی ختم ہو گیا تھا۔ جب اسمٰعیل علیہ السلام بڑے ہوئے تو جبرائیل علیہ السلام نے اس کی بنیادوں کی نشان دہی کی اور حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام نے مل کر تعمیر فرمایا۔ بے قراری کی حالت میں حضرت حاجرہ کا دوڑنا اللہ کریم کو اتنا پسند آیا کہ حج میں وہ دوڑ بھی ارکانِ حج میں شامل فرما دی، عمرے میں بھی شامل فرما دی۔ کوئی نفلی عمرہ بھی کرتا ہے تو اسے سعی کرنا پڑتی ہے، ان پہاڑوں پہ بھی دوڑنا، چڑھنا اور چلنا پڑتا ہے۔ جہاں سے چل کر جاتا ہے وہاں سے بیت اللہ کی طرف نظر تھی اور جس جگہ مائی صاحبہ دوڑ کر گزریں، وہاں ہر سعی کرنے والے کے لیے دوڑنے کا حکم ہے۔ یہ ادا اللہ کریم کو ایسی پسند آئی کہ تب سے لے کر قیامت تک آنے والے مسلمانوں کے لیے اللہ کریم نے اسے ضروری قرار دے دیا اور خود آقائے نامدار حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی سعی فرمائی۔

مشرکین کو یہ بھی اعتراض ہوتا تھا کہ ہم بھی حج کرتے ہیں، حج تو بیت اللہ کا ہے، یہ پہاڑوں پر دوڑنے کی کیا ضرورت ہے؟ فرمایا: اِنَّ الصَّفَا وَ الْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ ۔۔۔۔۔ یہ صفا و مروہ اللہ کے دین کی یادگاریں ہیں۔ یہ پہاڑ گواہ ہیں کہ کسی نے بے قرار ہو کر اپنے اللہ کو پکارا۔ یہ یادگار ہیں اس بات کی کہ اللہ کے بندے کو اس قدر اسباب دنیا اختیار کرنا ضروری ہے جتنے وسائل مہیا ہو سکیں۔ اب وہ عمر رسیدہ خاتون تھیں، پھول سا بچہ پاس تھا، زیادہ دور جا نہیں سکتی تھیں، اٹھا کر بھی نہیں جا سکتی تھیں، چھوڑ کر بھی نہیں جا سکتی تھیں تو انہوں نے مناسب سمجھا کہ یہ تو میری رسائی میں ہے کہ میں پہاڑ پر چڑھ کر اندازہ لگاؤں کہ کہیں کوئی پانی یا زندگی کے آثار موجود ہیں یا نہیں۔ اس بے تابی اور بے قراری میں ان کا وہ دوڑنا اللہ کریم کو اتنا پسند آیا کہ ان کے صدقے، ان کے طفیل آبِ زم زم بھی عطا کر دیا جو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آبِ شفا کے طور پر جاری و ساری ہے۔ وہی دوڑ بیت اللہ میں ہر آنے والے کے لیے اللہ نے پسند فرمائی کہ وہاں بے قرار ہو کر دوڑے، خانہ پری نہ کرے۔ قربِ الٰہی کی تلاش میں، رحمتِ الٰہی کی تلاش میں اسی طرح دوڑے۔ فرمایا: اِنَّ الصَّفَا وَ الْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ ۔۔۔۔۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں جس پر کفار اعتراض کریں، یہ تو اللہ کی نشانیاں ہیں، اللہ کے شعائر ہیں، یادگار ہیں کسی کی بے قراریوں کی جو اللہ کے لیے تھیں۔ انتہائی مشکل حالات میں بھی جنہیں اللہ ہی پر بھروسہ تھا یہ ان کی یادگار ہیں، لہٰذا فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا ۔۔۔۔ آئندہ جو بھی بیت اللہ کا حج کرے گا یا عمرہ کرے گا، وہ ان پہاڑیوں پر بھی دوڑے۔ ایسا کرنا بھی حج کا حصہ ہے، رکن ہے اور اسے ان پہاڑیوں پر بھی دوڑنا ہے۔

وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۵۸﴾ اور جو کوئی بھی نیکی میں زیادہ کوشش کرتا ہے، جو کوئی بھی دین پر عمل کرنے میں خلوصِ دل سے، اپنی ساری قوت کے ساتھ محنت کرتا ہے تو اللہ شکر گزار بندوں کے شکر کو قبول کرنے والا بھی ہے اور وہ علیم بھی ہے۔ وہ جانتا ہے کہ کون کس درد کے ساتھ بھاگ رہا ہے، کون رسم پوری کر رہا ہے، کون دکھاوے کے لیے، حاجی کہلانے کے لیے بھاگ رہا ہے اور کون درد دل کے ساتھ، دل کی گہرائیوں کے ساتھ میری رضا کی طلب میں سرگرداں ہے، وہ علیم بھی ہے اور شکر گزار بندوں کے شکر کو قبول کرنے والا بھی ہے۔

کتمانِ حق:

یہ جانتے ہیں، ان کی کتابوں میں موجود ہے کہ اللہ کا آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوگا، وہ مکہ مکرمہ میں پیدا ہوگا، اس کا قبلہ بیت اللہ ہوگا۔ ان کے پاس بہت دلائل ہیں لیکن دوسروں سے چھپا لیتے ہیں۔ فرمایا: اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالْهُدٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا بَيَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتٰبِ ۔۔۔

ایسے لوگ جو حق کو چھپا لیتے ہیں، اپنی کتاب میں جو چیز پڑھتے ہیں وہ اس ڈر سے دوسروں پہ ظاہر نہیں کرتے کہ ہماری سرداری جاتی رہے گی یا لوگ ہم سے الگ ہو جائیں گے اور ہمیں جو دنیوی مقام و مرتبہ حاصل ہے وہ نہ رہے گا۔ حق کو چھپاتے ہیں حالانکہ ہم نے تو یہ واضح دلیلیں لوگوں کی ہدایت کے لیے نازل کی تھیں۔

لعنت سے مراد رحمت سے دوری ہے:

أُولَٰٓئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُونَ ﴿١٥٩﴾ اللہ کی کتاب ہر بنی نوع انسان کے لیے، ہر فرد و بشر کے لیے باعثِ ہدایت ہے۔ اس کے دلائل اس کی ہدایت کا سبب ہیں۔ اس کا حق ہے کہ جہاں تک ممکن ہو اس کو پہنچایا جائے۔ لوگوں کو بتایا جائے، لوگوں کو سمجھایا جائے۔ آگے ان کے نصیب ہیں کہ کسے ہدایت نصیب ہوتی ہے، کون ہدایت کا راستہ اختیار کرتا ہے اور کون بدنصیب اس سے محروم رہ جاتا ہے لیکن کتاب کا حق یہ ہے کہ وہ لوگوں پر واضح کی جائے اور اگر کوئی اللہ کے حکم کے بعد، کتاب کے نزول کے بعد اسے چھپانے کی کوشش کرتا ہے تو پھر اس پر اللہ کی طرف سے لعنت ہے اور ہر لعنت کرنے والے کی اس پر لعنت ہے۔ لعنت سے مراد رحمت سے دوری، محرومی اور اللہ کا غضب ہے۔

کسی نہ کسی صورت میں یہ برائیاں چلتی رہتی ہیں جیسے اب بھی ایسے بدنصیب ہیں جو سمجھتے ہیں کہ حق کچھ اور ہے لیکن اس کے خلاف فتویٰ لکھ دیتے ہیں یا اس کے خلاف بتاتے ہیں حالانکہ جانتے ہیں کہ اللہ کی کتاب میں تو یہ چیز حرام ہے اور اس کے حلال ہونے کا، جائز ہونے کا فتویٰ دے دیں گے تو یہ ساری باتیں اللہ کے دین کو چھپانے یا بدلنے کی ہیں۔ فرمایا، ان اعمال پر اللہ کی لعنت ہوتی ہے، اللہ کی طرف سے بیزاری کا اظہار ہوتا ہے، رحمت سے محرومی کا اعلان ہوتا ہے اور ہر وہ انسان، فرشتہ، ہر وہ مخلوق جو اللہ کی مقرب ہے، جو بھی لعنت کرنے کی استعداد رکھتا ہے، یعنی جو خود ان کاموں سے بری ہے، وہ سب ان پر لعنت کرتے ہیں۔

توبہ کا مفہوم:

اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَبَيَّنُوْا فَاُولٰٓئِكَ اَتُوْبُ عَلَيْهِمْ ۚ وَاَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿١٦٠﴾

اس کے بعد بھی اپنی بخشش کا دروازہ کھلا رکھا۔ یہ جرائم کرنے کے بعد بھی اگر کوئی توبہ کرتا ہے، اگر کوئی خلوصِ دل کے ساتھ رجوع الی اللہ کرتا ہے اور اقرار کرتا ہے کہ جو میں نے کیا، وہ غلط تھا اور میں وعدہ کرتا ہوں، پوری کوشش کروں گا کہ آئندہ ایسا نہ کروں، توبہ کرتا ہے۔ توبہ سے مراد یہ ہے کہ وہ جس برائی سے توبہ کرتا ہے، اس کو چھوڑ دیتا ہے، اپنی

اصلاح کرتا ہے۔توبہ محض لفظ نہیں ہے، یہ دردِ دل کے ساتھ غلطی کا اقرار اور آئندہ اس غلطی سے بچنے کا بھرپور عزم ہے۔اپنی پوری کوشش کرکے اس سے بچنے کی سعی کرتا ہے تو یہ توبہ ہے۔

اِلَّا الَّذِيۡنَ تَابُوۡا وَ اَصۡلَحُوۡا ۔۔۔۔جن لوگوں نے توبہ کی خواہ کتنا ہی بڑا جرم تھا۔اتنا بڑا جرم تھا کہ اس پر اللہ نے لعنت کی، ہر لعنت کرنے والے نے لعنت کی لیکن پھر بھی مجرم اگر تائب ہوجاتا ہے، اللہ کی بارگاہ میں رجوع کرتا ہے اور اپنی اصلاح کرتا ہے۔فَاُولٰٓٮِٕكَ اَتُوۡبُ عَلَيۡهِمۡ ۔۔۔۔تو ایسے لوگوں کی توبہ اللہ کریم قبول فرما لیتے ہیں۔توبہ قبول ہونے کا نتیجہ یہ ہے کہ اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَا ذَنْبَ لَهُ(ابن ماجہ) جو گناہ سے تائب ہوتا ہے وہ ایسے ہوجاتا ہے جیسے اس نے کوئی گناہ کیا ہی نہ ہو۔اللہ کریم اسے پھر پاک وصاف کردیتے ہیں۔

وَاَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيۡمُ ۔۔۔۔اور میں توبہ قبول کرنے والا اور رحم کرنے والا ہوں۔اللہ کی ذات بہت کریم ہے، اس کے کرم کی کوئی حد نہیں ہے۔وہ بڑے سے بڑے گناہ گار کی توبہ قبول فرماتا ہے لیکن شرط ایک ہے کہ خلوص سے توبہ کرے اور ایسی توبہ جو آئندہ اس کی اصلاح کردے، اس برائی سے بچ جائے، اسے چھوڑ دے۔ ہمارے ہاں ایک رواج ہے کہ جب کوئی تکلیف ہوتی ہے تو ہم زبانی توبہ توبہ کرتے ہیں لیکن عملاً ہم ویسے کے ویسے رہتے ہیں تو یہ توبہ نہیں ہے۔توبہ سے مراد یہ ہے کہ صرف زبان سے نہ کہے بلکہ دل سے یقین بھی کرے، برائی کو برا سمجھے اور عملی زندگی میں اپنی اصلاح بھی کرے، اس برائی کو چھوڑ دے۔جو ایسی توبہ کرتا ہے اس کی توبہ قبول کی جاتی ہے۔وَاَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيۡمُ ﴿۱۶۰﴾ اور میں توبہ کو قبول کرنے والا اور رحم کرنے والا ہوں۔

اِنَّ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا وَمَاتُوۡا وَهُمۡ كُفَّارٌ اُولٰٓٮِٕكَ عَلَيۡهِمۡ لَعۡنَةُ اللّٰهِ وَالۡمَلٰٓٮِٕكَةِ وَالنَّاسِ اَجۡمَعِيۡنَۙ﴿۱۶۱﴾ ایسے لوگوں پر جنہوں نے زندگی میں عظمت الٰہی کو قبول نہ کیا، اس کی ربوبیت کا انکار کیا، اس کی ذات، اس کی صفات کا انکار کیا اور مرتے مرگئے لیکن توبہ نہ کی، واپس نہ آئے، اللہ بھی لعنت فرماتا ہے، سارے فرشتے لعنت فرماتے ہیں اور ساری اولاد آدم لعنت فرماتی ہے۔بہت بڑی لعنت یعنی رحمت سے دوری کے مستحق ہوتے ہیں۔

خٰلِدِيۡنَ فِيۡهَا ۔۔۔۔اور ہمیشہ ہمیشہ کی زندگی میں اسی لعنت میں گرفتار رہیں گے، عذاب الٰہی میں گرفتار رہیں گے۔

لَا يُخَفَّفُ عَنۡهُمُ الۡعَذَابُ وَلَا هُمۡ يُنۡظَرُوۡنَ﴿۱۶۲﴾ نہ ان پر عذاب میں کمی کی جائے گی اور نہ انہیں کوئی مہلت دی جائے گی کہ کبھی سستا لیں، کبھی ایک لمحہ عذاب سے چھٹی ہوجائے، کبھی ایک لمحہ عذاب رک جائے۔عذاب میں کمی نہیں ہوگی بلکہ بڑھتا رہے گا اور کسی لمحہ انہیں دم لینے کے لیے مہلت بھی نہیں دی جائے گی۔ اللہ کریم اپنے عذابوں سے پناہ میں رکھے، خلوصِ دل سے توبہ کی توفیق عطا فرمائے، ہماری اصلاح فرمائے اور ہمیں اپنی اصلاح کرنے کی توفیق عطا فرمائے، دین پر زندہ رکھے، دینِ حق پر موت دے اور دین داروں کے

ساتھ حشر فرمائے۔ آمین!

وَ اِلٰـهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۔۔۔۔۔تمہارا معبود برحق اکیلا ہی عبادت کے لائق ہے۔ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۶۳﴾ اور اس کے علاوہ کوئی دوسرا عبادت کا مستحق نہیں ہے۔ وہ بہت رحم کرنے والا ہے، رحیم ہے، واحد ہے، لاشریک ہے، اس جیسا دوسرا کوئی نہیں اور اس کے سوا کوئی اور عبادت کا مستحق نہیں ہے۔

عبادت کا مفہوم:

عبادت سے مراد یہ نہیں ہے کہ اللہ نے جو عبادات فرض کی ہیں، صرف انہیں عبادت کہا جائے۔ ظاہر ہے کہ کفار و مشرکین یا بت پرست یا دوسرے لوگ اس طرح بتوں کی عبادت نہیں کرتے جس طرح ہم اللہ کی عبادت کرتے ہیں تو پھر ان کے افعال کو کیوں عبادت کہا جاتا ہے۔ کسی ہستی کے ڈر سے کہ اس کی اطاعت نہ کی تو نقصان پہنچائے گا یا نفع کی امید پر کہ اس کی اطاعت کی تو نفع پہنچائے گا، جو اطاعت کی جاتی ہے وہ عبادت کہلاتی ہے۔ یعنی کسی سے بھی امیدیں وابستہ کر لی جائیں اور اس کی خوشنودی کے کام کیے جائیں، اس کو راضی کرنے کے لیے کچھ امور انجام دیے جائیں یا یہ خطرہ ہو کہ اگر یہ ہستی ناراض ہوگئی تو میرا بہت نقصان ہوگا تو یہ اس کی عبادت ہے۔ اللہ کریم نے جو عبادات فرض کی ہیں، فلسفہ ان کا بھی یہی ہے کہ اللہ کی رضامندی حاصل ہو اور اللہ کریم کے انعامات حاصل ہوں اس لیے فرمایا کہ اس طرح کی اطاعت کا مستحق صرف اللہ ہے۔ اللہ کے علاوہ جتنی مخلوق ہے وہ خود محتاج ہے اور جو اپنی ضرورتوں میں محتاج ہو اس سے دوسرے حاجت براری کی امید رکھیں تو یہ فضول ہے۔

نظام کائنات الوہیت اور توحید کی دلیل ہے:

لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۔۔۔۔۔اس کے بغیر کوئی ایسی ہستی نہیں جسے عبادت کا استحقاق ہو اور اس کی عبادت کی جائے۔ بعثت اور نبوت تو ایک ایسا نور ہے جو سورج کی طرح طلوع ہوتا ہے اور چار دانگ عالم کو منور کر دیتا ہے لیکن اگر تعلیمِ نبوت نہ بھی ہو، جیسا کہ دنیا پہ ایسا وقت بھی گزرا جس وقت کوئی نبیؑ تعلیم دینے کے لیے نہیں تھا مثلاً حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام میں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام میں پانچ سو برس کا جو فاصلہ ہے اسے عہدِ فترت کہتے ہیں، کوئی حق بتانے والا نہیں تھا، اگر ایسی صورت بھی ہو تو اللہ کو وحدہ لاشریک ماننا ہر فرد و بشر کے لیے ضروری ہے اگر کوئی طریقہِ عبادت بتانے والا نہیں ہے، اگر کوئی طریقہِ ذکر بتانے والا نہیں ہے، اگر کوئی اللہ کی مرضیات اور ناپسندیدہ احکام سے آگاہ کرنے والا نہیں ہے، کسی طرح سے علم نہیں پہنچتا، تو فرمایا کہ اس کی مخلوق اس وقت بھی اس کے واحد و لاشریک ہونے کی گواہ ہے۔ وَاِلٰـهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۶۳﴾

سورۃ البقرہ رکوع 20 آیات 164 تا 167

أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِيْ
تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ
فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ۪ وَّتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ
وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿۱۶۴﴾
وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ؕ
وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ وَلَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ ۙ
اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعَذَابِ ﴿۱۶۵﴾ اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِيْنَ اتُّبِعُوْا
مِنَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا وَرَاَوُا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ ﴿۱۶۶﴾ وَقَالَ
الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا لَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّاَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوْا مِنَّا ؕ كَذٰلِكَ
يُرِيْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرٰتٍ عَلَيْهِمْ ؕ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ ﴿۱۶۷﴾

یقیناً آسمانوں اور زمین کے بنانے میں اور رات اور دن کے یکے بعد دیگرے آنے میں اور ان جہازوں (کے چلنے) میں جو لوگوں کے نفع کا سامان لے کر سمندروں میں چلتے ہیں اور اللہ نے بلندی (آسمان) سے جو پانی برسایا پھر اس سے زمین کو اس کے خشک ہو جانے کے بعد تر و تازہ کرنے میں اور اس میں مختلف اقسام کے جانور پیدا کرنے اور ہواؤں کو چلانے اور بادلوں کو آسمان اور زمین کے درمیان معلق کرنے میں صاحبِ خرد لوگوں کے لیے (اس کی توحید کی) نشانیاں ہیں ﴿۱۶۴﴾

اور بعض لوگ اللہ کے علاوہ دوسروں کو اللہ کا شریک سمجھ لیتے ہیں (پھر) ان سے
ویسی محبت کرتے ہیں جیسی اللہ سے (ہونی چاہیے) اور جو لوگ ایمان رکھتے ہیں وہ
اللہ سے بہت زیادہ محبت کرتے ہیں اور کاش یہ غلط کار لوگ اس وقت کو دیکھ سکتے
جب عذاب ان کے سامنے ہوگا (تو جانیں گے) کہ سب قوت اللہ کے لیے
ہے اور یہ کہ اللہ سخت عذاب کرنے والے ہیں ﴿۱۶۵﴾ جس وقت کے پیشوا
اپنے پیروکاروں سے بیزار ہو جائیں گے اور عذاب سامنے دیکھیں گے اور ان
کے (بچنے کے) ذرائع ختم ہو جائیں گے ﴿۱۶۶﴾ اور پیروکار کہیں گے کاش
ہمیں دوبارہ موقع ملے تو ہم ان سے بیزاری اختیار کریں جس طرح یہ (آج)
ہم سے بیزار ہو رہے ہیں اس طرح اللہ ان کے اعمال کو حسرت بنا کر انہیں
دکھائیں گے۔ اور انہیں دوزخ سے نکلنا نصیب نہ ہوگا ﴿۱۶۷﴾

تفسیر و معارف

اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ۔۔۔۔ آسمانوں اور زمینوں کا وجود، ان کی پیدائش، ان کا بنایا جانا وَاخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَالنَّهَارِ ۔۔۔۔ رات اور دن کا فرق، سورج کی گردش، شب و روز کی آمد و شد وَالۡفُلۡكِ الَّتِیۡ تَجۡرِیۡ فِی الۡبَحۡرِ بِمَا یَنۡفَعُ النَّاسَ ۔۔۔۔ سمندروں پر انسانوں کا سفر اور ایسی ایجادات کا شعور جو انسانوں کے نفع کے لیے اور انسانوں کی حیاتِ مستعار کے اسباب کے لیے ذریعہ بنتے ہیں۔

وَمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنۡ مَّآءٍ ۔۔۔۔ اور جس طرح وہ آسمانوں سے یا بلندیوں سے بارش کو نازل فرماتا ہے اور اس کے ساتھ فَاَحۡیَا بِهِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِهَا ۔۔۔۔ زمین جو مردہ ہو چکی ہوتی ہے، خشک ہو چکی ہوتی ہے، دھول اڑ رہی ہوتی ہے، اس میں سبزے لہلہانے لگتے ہیں، اس میں حیات دوڑ جاتی ہے، اس میں بے شمار اقسام کی فصلیں، بے شمار پھل، درخت، گھاس اور طرح طرح کی چیزیں اگتی ہیں۔

وَبَثَّ فِیۡهَا مِنۡ کُلِّ دَآبَّةٍ ۔۔۔ اور بے شمار اقسام کے حیوانات جو اس نے پھیلا دیے ہیں وَّتَصۡرِیۡفِ الرِّیٰحِ ۔۔۔۔ اور ہواؤں کا سبک خرام ہونا اور چلنا وَالسَّحَابِ الۡمُسَخَّرِ بَیۡنَ السَّمَآءِ وَالۡاَرۡضِ ۔۔۔۔ اور

بادلوں کا زمین و آسمان کے درمیان معلق رہنا، ان میں پانی کے اتنے دریا اور سمندر رکھتا ہے کہ جب برسیں تو سیلاب آجاتے ہیں ورنہ وہ بخارات کی صورت میں ہوا میں معلق رہتے ہیں، چلتے پھرتے ہیں لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ﴿۱۶۴﴾ جن لوگوں میں عقل ہو، ان کے لیے اس کے وحدہٗ لاشریک ہونے کی بے شمار نشانیاں ہیں۔

آدمی کو اگر تعلیماتِ نبوت نہ بھی پہنچیں تو اس کائنات کا نظام، اس کی صنعت اور تخلیق، بادلوں کا برسنا اور اس سے زمین میں حیات کی لہر کا دوڑ جانا، یہ سارے کام اس کی وحدانیت اور قدرت پہ گواہ ہیں۔ یہ کبھی ممکن نہیں ہو سکتا کہ ایک سے زائد ایسے صاحبِ قوت ہوں جو ایسا کر سکتے ہوں اور پھر اس نظام میں کوئی خلل نہ آئے۔ کسی بھی نظام پہ جب ایک سے زائد لوگ یا ایک سے زائد ہستیاں مقرر ہو جاتی ہیں تو پھر ظاہر ہے ان میں کوئی کمزور ہوتا ہے، کوئی طاقت ور ہوتا ہے، کسی کی مانی جاتی ہے کسی کی نہیں مانی جاتی، تو اس تسلسل کے ساتھ نتائج مرتب نہیں ہو سکتے، جس تسلسل کے ساتھ کائنات میں کروڑوں اربوں کھربوں زندگیاں روزانہ جنم لیتی ہیں اور کھربوں زندگیاں روزانہ اس دنیا میں ختم ہوتی ہیں جنہیں ہم جانتے تک نہیں۔

انسانی علوم نے ترقی کی۔ مادّی وجود کے بارے سائنس نے ہمیں یہ بتایا کہ ہمارے وجود میں لاتعداد جراثیم ہیں جن کے لیے یہ وجود ہی ایک الگ جہان ہے۔ ایک جسم ہی ان کے لیے ایک جہان ہے کہ وہ ایک قلم کی نب پہ کروڑوں کی تعداد میں جمع ہو سکتے ہیں۔ اتنا چھوٹا وجود ہے لیکن وہ روزانہ کتنے مرتے ہیں اور کتنے نئے بنتے ہیں اور کون کون کیا کام کرتا ہے! ہمارے خون کے ایک ایک قطرے میں ایک کارگہہ حیات موجود ہے۔ اب اس نظام حیات میں ایک خاص تعداد میں روئیدگی، ایک خاص تعداد میں زندگی، ایک خاص نپی تلی تعداد میں جانوروں کا ہونا، ان کا معدوم ہو جانا، ایک ایسا نظام ہے جس میں کسی اعتراض کی کہیں گنجائش موجود نہیں اور جس میں کبھی کوئی خلل واقع نہیں ہوا۔ اب شب و روز کو ہی دیکھ لیجیے کہ ایک خاص رفتار سے ایک خاص فاصلے پر سورج کو متعین فرما دیا۔ اس میں اگر تھوڑا سا خلل بھی ہوتا، سورج اگر رائی برابر بھی روزانہ قریب سرکتا رہتا تو آج تک جتنی صدیاں بیت گئیں ہیں، شاید زمین کو بھی جلا کر راکھ کر دیا ہوتا۔ اگر اپنی جگہ سے دور ہٹتا رہتا تو شاید یہاں ہر چیز یخ بستہ ہو چکی ہوتی لیکن روزِ اول سے جس طرح وہ تمازت پہنچا رہا ہے، اس میں کوئی فرق نہیں آتا اور ہر جگہ اس کی ضرورت کے مطابق پہنچا رہا ہے۔ بے شمار تخلیق ایسی ہے جو سورج کی گرمی کی محتاج ہے۔ بے شمار فصلیں، بے شمار نباتات، حیوانات ہیں۔ اسی طرح پرندے ہوا میں اڑتے ہیں، بادل ہوا میں تیرتے ہیں۔ یہ سارے کام اس باقاعدگی سے ہو رہے ہیں کہ صدیوں کا سفر ان میں کوئی فرق نہیں ڈال سکا۔ اگر انسان اپنے اردگرد دیکھے تو اللہ کو وحدہٗ لاشریک اور ہر چیز پہ قادر ماننے میں اسے کوئی دقت نہیں

ہوتی۔ جس تک تعلیماتِ نبوت نہ پہنچی ہوں وہ اگر اللہ کی اس تخلیق کو دیکھ کر اسے وحدہٗ لاشریک مان لیتا ہے تو اس کا وہی اسلام ہے، وہی اس کی عبادت ہے اور وہ نجات کا مستحق ہے۔

رحمٰن دنیا کے لیے، رحیم دنیا اور آخرت دونوں کے لیے:

اللہ رحمٰن ہے رحیم ہے۔ اب یہ دونوں پہلو رحمت کے ہیں۔ رحمٰن میں وسعت ہے جیسے سورت فاتحہ کی تفسیر میں گزر چکا۔ یہ فعلان کے وزن پہ آتا ہے اور اس وزن پہ جتنے الفاظ آتے ہیں، جیسے عطشان ہے پیاسا، اب پیاس ہمیشہ نہیں رہتی، جب پانی میسر ہوتا ہے تو پیاس بجھ جاتی ہے۔ غضبان اسی وزن پر ہے، غصے میں ہو لیکن غصہ دائمی صفت نہیں ہے، وقتی صفت ہے، ختم ہو جاتی ہے۔ اللہ کریم نے اپنی ایک صفت الرحمٰن بتائی اور الرحمٰن کہا جاتا ہے۔ اَلرَّحْمٰنُ لِلدُّنْيَا وَالرَّحِيْمُ لِلْاٰخِرَةِ۔ دنیا میں اس کی رحمانیت کا اظہار ہے کہ ناشکروں کو بھی دنیوی نعمتیں دیتا ہے، کفار و مشرکین کو بھی زندگی دیتا ہے، دولت دیتا ہے، اولاد دیتا ہے، صحت دیتا ہے، غرض بے شمار نعمتیں دیتا ہے۔ یہ الرحمٰن رحمانیت سے ہے لیکن رحیم بھی ہے۔ اَلرَّحِيْمَ، اس دنیا میں بھی رحمت نصیب ہوتی ہے اور دنیا میں سب سے بڑی رحمت ہے ہدایت کا نصیب ہونا، یاد الٰہی کا نصیب ہونا، قرب الٰہی کے لیے محنت کی قوت کا نصیب ہونا، یہ اس کی رحمت ہے۔ اس دنیا میں رحمانیت کافر و مسلم سب کے لیے ہے لیکن آخرت میں کافر رحمت سے بالکل محروم ہوگا چونکہ وہاں رحمانیت کا ظہور نہیں ہوگا، وہاں رحیمیت کا ظہور ہوگا۔ تو اَلرَّحْمٰنِ لِلدُّنْيَا وَالرَّحِيْمَ لِلْاٰخِرَةِ مومن کو اس دنیا میں بھی رحیمیت حاصل ہوتی ہے اور آخرت میں بھی۔ رحیم فعیل کے وزن پر ہے۔ اس وزن پر جتنے الفاظ آتے ہیں جیسے حکیم تو حکیم کوئی وقتی صفت نہیں ہے۔ اگر کوئی حکیم ہے تو ہمیشہ کے لیے ہے۔ علیم، عالم ہے، جاننے والا تو علم ایک دائمی صفت ہے۔ عربی گرائمر میں بھی ان اوزان پہ جو لفظ آتے ہیں ان میں دوام پایا جاتا ہے۔ اَلرَّحِيْمَ سے مراد ہے کہ اس کی رحمت سارے جہانوں کو گھیرے ہوئے ہے اور بندۂ مومن کے لیے ہر جہاں میں اس کی رحیمیت موجود ہے لیکن ناشکروں کے لیے یا کفار کے لیے رحمانیت تو ہے کہ اس دنیا میں دار دنیا کے انعامات انہیں دیتا رہتا ہے مگر وہ آخرت میں کلی طور پر اس سے محروم ہوں گے۔

مقصدِ رسالت:

اللہ کریم نے اپنی مخلوق کو مخاطب کرنا چاہا، اپنے بارے، اپنی مخلوق کے بارے، دار دنیا اور دار آخرت کے بارے، کاموں اور ان کے انجام کے بارے تفصیلی علم دینا چاہا اور ذاتی طور پر عطا فرمانا چاہا تو اس نے اپنے انبیاء علیہم السلام کو اس کا ذریعہ بنایا۔

ظاہر ہے کہ اگر فرشتے یہ علم پہنچانے آتے تو انہیں انسانی صورت میں ڈھالا جاتا یا ہر بندے کو فرشتوں سے بات کرنے کی اور انہیں دیکھنے کی قوت دی جاتی ۔ یہ دونوں باتیں عجیب تھیں ۔ اگر فرشتے کو انسان ہی بنانا ہے تو فرشتے کو بھیجنے کا فائدہ کیا ہوا! پھر انسانوں ہی کی ایسی جماعت بنائی جائے جو روئے زمین کی ہر آبادی میں موجود ہو اور وہ کلامِ الٰہی سنے ۔ اتنے انسانوں کو یہ قدر و منزلت بیک وقت نصیب نہیں ہوسکتی ۔ انسان آخر انسان ہے اور اس کے ساتھ احتیاج اور ساری ضرورتیں لگی ہوئی ہیں، بے شمار چیزوں میں لتھڑا ہوا ہوتا ہے ۔

کلامِ باری کو سننے کے لیے بھی اس درجے کی پاکیزگی اور طہارت درکار ہے جو فرشتوں بلکہ ملاالاعلیٰ سے بھی نازک ترین اور مصفّٰی ترین ہو ۔ ہر شخص کلام باری کو سننے کی استعداد نہیں رکھتا لیکن انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو پاکیزگی اور طہارت کا وہ درجہ عطا ہوتا ہے ۔ خیال و تفکر سے لے کر دل کی گہرائیوں تک، اعمال و کردار، پاکیزہ اور انتہائی صاف ستھرے ہوتے ہیں اور ان کا آئینہ دل اس قدر شفاف ہوتا ہے کہ صرف نبیؑ میں یہ استعداد ہوتی ہے کہ وہ اللہ کا کلام سنے ۔ جتنے انبیاؑء علیہ السلام مبعوث ہوئے، حضرت آدم علیہ السلام اپنی اولاد کی طرف مبعوث ہوئے تھے اور ان کے بعد عیسیٰ علیہ السلام تک جتنے نبیؑ آئے، وہ مختلف قبائل، اقوام، علاقوں اور ممالک کے لیے آئے ۔ ان انبیاؑء علیہم السلام نے عبادت کے جو طریقے عطا فرمائے تھے وہ بھی اس حد کے اندر تھے جس میں وہ مبعوث ہوئے، اس قوم کے لیے تھے، اس کے مزاج کے مطابق تھے اور ان کی قوت برداشت کے مطابق تھے ۔

آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلّم کی رسالت عالمی اور ابدی ہے:

اللہ کریم نے اپنی ساری مخلوق کو بیک وقت مخاطب کرنا چاہا ۔ اب اللہ کریم نے پسند فرمایا کہ ساری انسانیت کو ایک نظام عطا فرمایا جائے اور یہ بجائے خود ایک ایسی بات ہے جو صرف اللہ ہی کو سزاوار ہے ۔ دنیا کے کسی خطے کے انسان اگر سوچیں گے تو یقیناً وہ اپنے ماحول، اپنے معاشرے، اپنے لوگوں کی فکر و استعداد، اپنے موسموں اور اپنی ہر چیز سے متاثر ہو کر اس کے مطابق سوچیں گے ۔ اہل مشرق کی سوچ اہل مغرب کو پسند نہیں ہوگی اور اگر اہل شمال سوچ کر کوئی نظام بنائیں تو اہل جنوب کو پسند نہیں ہوگا ۔ رب العالمین نے چاہا کہ سارے انسانیت کے لیے، خواہ وہ کہیں ہو، ایک ایسا نظام بنایا جائے جس میں ہر بندہ میری ذات کے ساتھ متعلق ہو جائے ۔ وہ میری ہی عبادت کرے اور پھر اس عبادت میں بھی یک رنگی ہو، سب کے لیے حلال حرام ایک ہو، سب کے لیے عدل کا نظام ایک ہو، سب کے لیے اخلاقیات کا نظام ایک ہو، سب کے لیے لین دین کے طریقے ایک ہوں ۔ ساری انسانی ضرورتوں کا ایک معیار بنایا جائے جو حق بھی ہو، خوبصورت بھی ہو اور تمام انسانیت کے لیے ہر قسم کے حالات اور ہر قسم کے موسموں میں قابل

عمل بھی ہو۔لوگوں کے رنگ میں فرق ہے،لوگوں کی زبانوں میں فرق ہے،لوگوں کی غذاؤں میں فرق ہے، مختلف جگہ پر مختلف چیزیں کھائی جاتی ہیں۔ ہمارے ہاں آدمی جب بیمار پڑتا ہے تو اسے چاول ابال کردے دیتے ہیں کہ گندم ہضم نہیں ہوگی۔ بنگال میں کوئی بیمار پڑ جائے تو وہ کہتے ہیں اسے چاول مت کھلاؤ، اس کے لیے گندم کی ہلکی سی روٹی بنا دو، یہ بیمار ہے چاول ہضم نہیں کر پائے گا۔ عادات اور مزاجوں میں تضاد ہے، موسموں میں فرق ہے، شب و روز کے اوقات میں فرق ہے،عبادات میں فرق ہے،قدبت میں فرق ہے،تعلیم میں فرق ہے۔ان ساری باتوں کو سامنے رکھ کر پوری زندگی کا ایک ایسا نصاب بنایا جائے جو ہر ملک میں، ہر موسم میں، ہر حال میں، ہر جگہ قابل عمل ہو۔ایسا جامع اور مکمل نظام بنانا صرف اللہ ہی کو سزاوار ہے،اس کا اندازہ انسان نہیں کرسکتا۔

اس نے اپنی کتاب میں جہاں توحید اور اپنی عظمت بیان کی، جہاں اپنے نبیؐ اور اپنے رسولؐ کے فضائل بیان کیے، جہاں آخرت کی خبر دی، وہاں اس نے ایک پورا نظام، انسانی زندگی کا مکمل اور جامع نظام، بندے کے بندے سے تعلقات، بندے کے رب سے تعلقات، بندے کے معاشرے سے تعلقات، جنگ اور صلح کے اصول، خرید و فروخت اور لین دین کے اصول، کھانے پینے کی حدود و قیود ایک ایک چیز اس میں سمودی۔ یہ صرف اس کو سزاوار تھا۔اب ضرورت یہ تھی کہ اسے بندوں تک پہنچایا جائے تو اس نے جس ہستی کو مقرر فرمایا اس میں دو کمال رکھے۔

ایک کمال تو یہ ہے کہ وہ ہر بات، جو اللہ فرمانا چاہیں، اسے سن بھی لے،ضبط بھی کرلے اور سمجھ بھی لے۔ دوسرا کمال یہ کہ قیامت تک آنے والی انسانیت کو اس کی آواز پہنچتی رہے اور بلا گرد و غبار پہنچتی رہے،صاف ستھری! تو ایک ایسی ہستی جس کو اللہ کریم نے قیامت تک آنے والی انسانیت کو اپنا پیغام پہنچانے کے لیے مقرر فرمایا، اس ہستی سے بڑا قابل اعتبار، سچا اور کھرا کون ہوسکتا ہے!اگر کوئی آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتراض کرے تو اس کا مطلب تو اللہ کے انتخاب پر اعتراض ہے، پھر اس نے اللہ کو اللہ نہیں مانا۔ دوسرا کمال دیکھیں کہ ہم پندرھویں صدی میں بیٹھے ہیں، آدمی آنکھیں بند کرلے تو یہ اس کا اپنا قصور ہے لیکن تعلیماتِ الٰہی کا ایک ایک نقطہ برکاتِ نبوت صلی اللہ علیہ وسلم کی طفیل روئے زمین پر لحہ لحہ پہنچ رہا ہے۔ یہ کیسی عجیب بات ہے کہ پندرہ صدیاں نہ قرآن کے الفاظ کو تبدیل کرسکیں، کوئی ایک زیر، زبر، نقطہ، کوئی ایک سین میم کا شوشا، کوئی ایک نون کا گھیرا، کوئی چیز رائی برابر نہیں بدلی۔ پندرہ صدیاں گزر گئیں اور روئے زمین پر صرف ایک کتاب ہے جس کے کسی لفظ، کسی حرف، کسی زیر زبر کو تبدیل نہیں کیا جاسکا اور نہ قیامت تک کوئی کرسکے گا۔

ترویج اسلام:

عجیب بات ہے کہ جب یہ موجودہ وسائل، اخبار، کتابیں، ٹیلی فون، ٹیلی ویژن اور الیکٹرونک میڈیا نہیں تھے اور بات اس طرح پہنچتی تھی کہ کوئی بندہ ہی بندے تک بات پہنچائے، اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی تعلیمات روئے زمین پر پہنچیں۔ 23 برس قرآن حکیم نازل ہوتا رہا اور جب مکمل ہوا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دار دنیا سے پردہ فرمایا لیکن ایک ایسی مقدس، صالح اور امین جماعت تیار فرمائی جس نے نزولِ قرآن کے بعد ٹھیک 23 برسوں کے اندر گداگر کے جھونپڑے سے لے کر بڑے سے بڑے شہنشاہ کے محل تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام پہنچا دیا۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ 23 تیئس برسوں میں روئے زمین کا اتنا علاقہ اسلامی ریاست میں شامل ہو چکا تھا اور اتنی بڑی بڑی سلطنتیں فتح ہو کر اسلامی ریاست میں شامل ہو چکی تھیں کہ اسلام کی بات روئے زمین پر پہنچنے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔

آپ کیا سمجھتے ہیں کہ جب قیصر و کسریٰ جیسی سلطنتیں جن کا دبدبہ روئے زمین پر تھا، فتح ہو کر اسلام کے زیرنگیں آ گئیں تو کیا اسلام کا پیغام اور اسلام کا تعارف اور مسلمانوں کا تعارف کہیں پوشیدہ رہ گیا ہوگا۔ تب سے لے کر اب تک آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی تعلیمات بغیر کسی رکاوٹ کے پہنچ رہی ہیں۔ بہت سے بدنصیبوں نے انہیں مسخ کرنے کی کوشش کی۔ بہت سے بدنصیب قرآن کو بدلنے کی کوشش میں لگے رہے اور بہت سے بدنصیب ایسے بھی آئے جنہوں نے قرآن کی اصل عبارت تو قائم رہنے دی لیکن اس کے مفاہیم اور معانی کو بدلنے کی کوشش کی۔ بہت سے بدنصیب آج بھی ایسے ہیں جو قرآن کو چھپا لیتے ہیں اور حصول دنیا کے لیے غلط فتوے دیتے ہیں لیکن کسی کی کوئی کوشش آئینۂ حق کو گدلا نہیں کر سکتی۔ حق کے متلاشی کے لیے ہر جگہ، ہر زمین پر اور ہر وقت حق موجود ہے۔ اللہ کریم نے یہ دونوں اوصاف بدرجہ اتم، مکمل اور کامل اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلّم میں پیدا فرمائے۔ اگر یہ نورِ نبوت صلی اللہ علیہ وسلّم کسی تک نہ بھی پہنچے تو کائنات اور نظامِ کائنات، حیات و موت کا ایک ربط، پیدائش و افزائش کا طریقہ، بارشوں کا برسنا، زمین کا خشک ہونے کے بعد پھر زندہ ہو جانا، شب و روز کی آمد و شد، یہ ساری چیزیں اس کی قدرت اور اس کی وحدانیت اور توحید کا اعلان کرنے کے لیے کافی ہیں لیکن جب تعلیمات نبوت پہنچیں تو گویا سورج طلوع ہو گیا۔ روشنی گھر گھر پہنچی، حق و باطل میں فرق واضح ہو گیا۔ پھر صرف اللہ کی ذات نہیں، اس کی صفات اور اس کی پوری پہچان و معرفت مل گئی۔ اس پر اللہ کی مزید عطا یہ ہے کہ بندے کو تمام امور سے آگاہ کر دیا گیا کہ کن باتوں پر اللہ کریم راضی ہوں گے اور کن اعمال پر اللہ کریم ناراض ہوں گے۔ اب یہ ساری بات جب واضح ہو گئی تو اس

پر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی گواہی ہوگئی۔

قرآن حکیم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کو سراج منیر فرمایا۔ سراج منیر وہ چراغ ہوتا ہے جو روشنیاں بانٹتا ہے، روشنیاں پہنچاتا ہے اور واقعی آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی ذاتِ بابرکات سے ہر جگہ، ہر ملک، ہر خطے میں مسلسل روشنیاں پہنچ رہی ہیں۔ اب خود کوئی چمگادڑ کی طرح اپنی آنکھیں بند کر کے نافرمانی پہ کمربستہ ہو یا کفر میں غرق ہو جائے تو یہ اس کا اپنا انتخاب ہے۔

انسانی اختیار کی حد:

انسان کے پاس صرف یہی اختیار ہے کہ وہ اپنے لیے نورِ ہدایت پسند کرتا ہے یا کفر کے اندھیروں کا انتخاب کرتا ہے۔ شاعر نے جو کہا تھا:

ناحق ہم مجبوروں پہ یہ تہمت ہے مختاری کی
چاہیں جو آپ کریں ہم کو عبث بدنام کیا

کہ نہ پیدا ہونے پہ اختیار ہے نہ مرنے پہ اختیار، نہ صحت پہ اختیار ہے نہ بیماری پہ اختیار ہے، نہ ہم کھانے پہ قادر ہیں، نہ چھوڑنے پہ قادر ہیں۔ ہمارے اختیار میں کچھ بھی نہیں اور اللہ کریم نے کہہ دیا کہ انسان خود مختار ہے، اپنی مرضی کا مالک ہے تو ہماری مرضی کہاں ہے! درحقیقت انسان کے پاس صرف فیصلہ کرنے کا اختیار ہے کہ وہ کس راستے پہ چلنا چاہتا ہے۔

اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا (الدہر:3) ہم نے اس کے سامنے راستے کھول کے رکھ دیے ہیں۔ اب وہ شکر کے راستے پہ چلنا چاہتا ہے یا ناشکری کے راستے پر، یہ فیصلہ انسان کرتا ہے کہ مجھے کس راستے پہ جانا ہے۔ ساری قوتیں، ہاتھ پاؤں میں بھی، عقل وخرد میں بھی، دماغ میں بھی، وجود میں بھی، اسی کی دی ہوئی ہیں۔ اس کی دی ہوئی قوتوں سے اس کی نافرمانی کرتا ہے اور اس کی دی ہوئی قوتوں سے اس کی اطاعت کرتا ہے۔ اختیار صرف اس قدر ہے کہ انسان کو فیصلہ کرنا ہے کہ اسے کس راستے پہ چلنا ہے۔ اگر وہ نافرمانی کا راستہ اختیار کرتا ہے تو ظاہر ہے جتنا آگے بڑھتا جائے گا، اتنا ہی روشنیوں سے محروم ہوتا جائے گا اور تاریکیوں میں غرق ہوتا جائے گا۔ جتنا سیدھی سمت چلتا جائے گا، اتنا ہی روشنیوں کے قریب ہوتا جائے گا اور اس پر علوم کھلتے اور واضح ہوتے چلے جائیں گے۔ تو یہ انتخاب انسان کا اپنا ہے۔

دنیوی زندگی محدود ہے لیکن سزا و جزا لامحدود:

بعض لوگوں نے یہ سوال بھی کیے اور آج نہیں، بڑے عرصے سے ہو رہے ہیں کہ انسان نافرمانی تو اپنی دنیوی زندگی میں کرتا ہے، سوسال ہو یا دو ہزار سال، چونکہ انسانی حیات ہزاروں سالوں میں بھی پائی گئی ہے۔ ایسا زمانہ بھی تھا کہ زندگیاں ہزاروں برس تھیں۔ بہرحال انسان کی زندگی ایک محدود مدت ہے جس میں وہ نافرمانی کرتا ہے لیکن اگر وہ کفر پر مرا ہے تو اس کی سزا لامحدود وقت کے لیے ہے، ہمیشہ کے لیے ہے۔ اگر اس نے دو ہزار سال نافرمانی کی، دو سو سال نافرمانی کی تو آپ اسے پانچ سو سال سزا دے دیں۔ قرآن حکیم نے اس بات کا بھی جواب دیا ہے کہ یہ تو اللہ کی مرضی ہے کہ اس نے دنیا کی زندگی مختصر کر دی لیکن یہ ایسے لوگ ہیں کہ انہوں نے جب غلط راستہ اختیار کیا تو اگر انہیں ابدالآباد بھی دنیا میں رہنا نصیب ہوتا تو یہ ابدالآباد اس تاریکی میں غرق ہوتے چلے جاتے، آگے ہی چلتے جاتے۔ آزمائش تو اس بات کی تھی کہ کہیں کوئی رکتا بھی ہے، کہیں کوئی واپس آتا ہے، کہیں کوئی رجوع الی اللہ کرتا ہے اور اس کے لیے اللہ کریم مختلف اسباب پیدا فرماتے رہتے ہیں۔

تنبیہات عذاب نہیں، عطائے الٰہی ہیں:

اب یہی دیکھ لیجیے کہ ہمارے ہاں 2005ء میں جو زلزلہ آیا تو چشم زدن میں لاکھوں آبادیاں خاک میں ملا گیا اور زندگیاں اجل کی نظر ہو گئیں، بڑے بڑے پہاڑ تہہ و بالا ہو گئے اور یہ ساری چیزیں کیا ہیں! انسان کو جھنجھوڑنے اور غفلت سے جگانے کے لیے کہ لوگو! ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ تم جو کر رہے ہو، جس راستے پہ تم چل رہے ہو اس کے آگے یہ چیزیں ہیں، سنبھل جاؤ، واپس آ جاؤ۔

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ (الروم: 41) سمندروں میں طوفان آتے ہیں، زمین پہ لڑائیاں ہوتی ہیں، زلزلے آتے ہیں، تباہیاں آتی ہیں، لوگوں کے کردار کی وجہ سے لِيُذِيقَهُمْ بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوا تاکہ وقتی اور لمحاتی طور پر ان کے کردار کے تھوڑے سے حصہ کا نتیجہ، اس کا تھوڑا سا اثر دکھایا جائے کہ جو کچھ تم کر رہے ہو اس سے تو یہ دنیا آن واحد میں تباہ ہو سکتی ہے۔ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ (الروم: 41) دکھلایا اس لیے جاتا ہے کہ ممکن ہے وہ واپس آ جائیں، توبہ کر لیں، رجوع کر لیں، تو یہ تنبیہات اللہ کی مزید عطا ہیں۔ ان میں جو معصوم، بے گناہ مارے گئے، شہادت پہ فائز ہوئے جو مجرم مارے گئے وہ اپنی سزا کو پہنچے۔ اب یہ اللہ کو معلوم ہے کون مجرم تھا، کون کافر تھا، کون مومن تھا، کون شہید ہوا، کون نہیں ہوا لیکن یہ حادثہ باقی ساری دنیا کے لیے رجوع الی اللہ کا سبب بنا۔ ان ساری تنبیہات کے باوجود، تعلیماتِ نبوت کو چھوڑ کر، اگر کوئی سیدھا کفر ہی میں مسلسل چلا جاتا ہے تو پھر اللہ کریم فرماتے ہیں کہ اسے اگر ہمیشہ دنیا میں رہنا نصیب ہوتا تو یہ ہمیشہ کفر ہی کرتا۔ اب چونکہ آخرت میں زندگی ہمیشہ کی ہے تو ہمیشہ جہنم میں ہی رہے گا۔ اسے یہ دنیا میں بتا دیا گیا تھا، آگاہ کر دیا گیا

تھا کہ کفر پر مرو گے تو انسان کے لیے فنا نہیں ہے، موت کسی فنا کا نام نہیں ہے۔

موت کو سمجھا ہے غافل اختتام زندگی
ہے یہ شام زندگی صبح دوام زندگی

حیاتِ مستعار:

موت زندگی کا خاتمہ نہیں، انسان عالمِ امر میں تھا، پشتِ پدر میں آیا، شکمِ مادر میں گیا اور دارِ دنیا میں پہنچا۔ یہاں سے برزخ میں جائے گا، برزخ سے میدانِ حشر میں جائے گا اور وہاں سے اپنے ابدی ٹھکانے پہ پہنچ جائے گا۔ یہ زندگی کا ایک تسلسل ہے، یہ زندگی کا خاتمہ نہیں ہے بلکہ موت ایک ایسی تبدیلی ہے جو ابدی زندگی کی ابتدا کر دیتی ہے۔

ہے یہ شام زندگی صبح دوام زندگی

اللہ کی عظمت، اس کی نشانیاں نورِ نبوت کے علاوہ بھی اتنی واضح ہیں کہ اس کی مخلوق سے، پتے پتے سے، گھاس کے ایک ایک تنکے سے ہویدا ہیں لیکن جب نورِ نبوت بھی ذریعہ ہدایت ہو، ایک ایسی ہستی بتائے جو اصدق الصادقین ہو، جس پر اللہ نے اعتماد کیا ہو کہ یہ میری بات میرے ہر بندے تک پہنچائے گا اور بغیر لگی لپٹی پہنچائے گا، پھر پندرہ صدیاں اس بات کی گواہی دے رہی ہوں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بات پہنچانے کا حق ادا کر دیا، اب اس پر بھی اگر کوئی سنبھلے، نہ سمجھے! کتنی عجیب بات ہے کہ وہ غفور رحیم بھی منتظر ہو کہ جتنے بھی دور نکل گئے ہو واپس آ جاؤ، ایک لمحے میں پلٹ آؤ، جہاں کہیں تم ہو، وہیں کہہ دو کہ میں نے جو کیا وہ غلط تھا، اللہ میں تیرے حضور حاضر ہونا چاہتا ہوں، تو میں وہ فاصلے ختم کر کے تمہیں حضوری عطا کر دوں گا۔ اب اس پر بھی جو نہ سمجھے وہ کتنا بڑا بدنصیب ہے!

میرے بھائی! زندگی مستعار ہے اور یہ اپنے انجام کی طرف جا رہی ہے۔ اگلی زندگی کی طرف سفر کر رہی ہے اور کسی کے پاس کوئی دلیل نہیں کہ اس کے پاس کتنے لمحے، کتنے گھنٹے، کتنے دن یا کتنے سال باقی ہیں۔ سفرِ آخرت کے لیے ہمہ وقت تیار رہنا چاہیے۔

خواجہ عبیداللہ احرار رح جیسی تیاری:

خواجہ عبیداللہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ، جو سلسلہ نقشبندیہ اویسیہ کے مشائخ میں سے بھی ہیں، بہت بڑے زمیندار تھے۔ ان کی سوانح میں یہ ملتا ہے کہ ان کی زمین پر سو جوڑے ہل چلا کرتے تھے۔ جہاں سو جوڑے تھے، وہاں دو سو بیل ہو گئے، سو ملازم ہل چلانے والے ہو گئے۔ اس کے ساتھ دودھ دینے والے مویشی یا ریوڑ کا اندازہ کریں، ان کی ریاست اور ان کے ملازموں کا اندازہ کریں تو ایک بہت بڑی بادشاہت نظر آتی ہے۔ صوفیاء میں وہ پہلے صوفی تھے

جنہوں نے خوش لباسی میں وقت گزارا:

چوں فقر اندر عبائے شاہی آمد

ز تدبیر عبید الٰہی آمد

صوفی کو اپنے ماحول سے مختلف نہیں ہونا چاہیے کہ خواہ مخواہ ٹوپی، پگڑی پر برقعہ نما چادر لپیٹ لی، رنگ برنگے کپڑے پہن لیے، رنگ برنگے منکے پہن لیے۔ لوگوں سے مختلف نظر آنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے بلکہ اپنے ماحول کے مطابق، جیسا کہ وہ ہے، ویسا ہی رہنا چاہیے۔ یہ کہنا آسان ہے لیکن کرنا مشکل ہے۔ یہ انبیاء علیہم السلام کی خصوصیت ہے کہ وہ بالکل عام زندگی گزارتے اور عام لوگوں میں مل جل کر رہتے۔ جس انسان پہ تھوڑا سا بھی حال وارد ہو، اس کے اختیار میں نہیں رہتا۔ تھوڑا بہت جذب آ جاتا ہے، حواس کام چھوڑ دیتے ہیں اور اس کی حرکات ایسی ہو جاتی ہیں کہ پتہ چلتا ہے کہ اسے کچھ ہے۔ منازل کا ہونا، مقامات کا ہونا اور حالات کو عام انسانی حالات جیسا نارمل رکھنا، ایسے لوگ صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔

حضرت ابو عبید اللہ احرارؒ بھی انہیں میں سے ایک تھے۔ کسی کے دل میں خیال آیا کہ انہیں آزمایا جائے کہ یہ شخص تو اتنا الجھا ہوا ہے، اس قدر اس کا کاروبار پھیلا ہوا ہے، اتنی اس کی زراعت ہے، اتنے اس کے ملازم ہیں، اس کے پاس تو کوئی ایک لمحہ بھی فارغ نہیں ہے۔ آزمایا جائے کہ یہ شخص اس میں کتنا غرق ہے۔ اس نے عرض کیا کہ حضرت لوگ حج کو جا رہے ہیں، اگر آپ پسند فرمائیں تو حج پہ چلے جائیں! آپؒ نے فرمایا، ٹھیک ہے حج پہ چلے جاتے ہیں۔ اگلی صبح جب وہ مسجد میں آیا تو حضرتؒ تیار تھے۔ آپؒ نے پوچھا کہ ہاں بھئی تیاری ہوگئی، حج پر چلیں! کہنے لگا حضرت کیسے چلیں! میری تو دکان ہے، چھوٹا سا کاروبار ہے، بچوں کی روزی کا مسئلہ ہے اور بہت سے کام ایسے ہیں جو ادھورے ہیں، وہ کسی کے ذمے لگائیں گے لیکن آپ اتنی جلدی کیسے فارغ ہوگئے؟ میں نے سمجھا تھا کہ آپ تو کاروبار میں پھنسے ہوئے ہیں۔ انہوں نے فرمایا، یہ کاروبار میرا نہیں اور نہ میں پھنسا ہوا ہوں، میرے پاس تو امانت ہے۔ اللہ نے دی ہے، میں نے اسے سنبھالا ہوا ہے اور اس کا حق ادا کر رہا ہوں۔ کوشش کر رہا ہوں کہ اللہ کی مخلوق کو اس سے فائدہ پہنچے۔ جب تک میں ہوں، جو کچھ ہو سکتا ہے کر رہا ہوں۔ میں نہیں ہوں گا تو یہ کسی دوسرے کی ذمہ داری ہوگی۔ میں کوئی پھنسا ہوا نہیں ہوں، میں تو فارغ ہوں۔ اب چلو، میں ابھی تیار ہوں۔ ابھی موت بھی آ جائے تو چلا جاؤں گا، تم تو حج کی بات کرتے ہو۔

اس ساری بات کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان وقت تو اس دنیا میں گزارے، کام اس دنیا کے کر رہا ہو لیکن زندگی

وہاں بسر کر رہا ہو، جی وہاں رہا ہو، پھر اس کے لیے موت کوئی خاص تبدیلی نہیں ہے۔ اسے تو سفر سے گھر جانا ہے اور اگر پردیس سے کوئی گھر آتا ہے تو اسے کوئی بدمزگی نہیں، خوشی نصیب ہوتی ہے۔ یہ اللہ کریم کا بہت بڑا احسان ہے کہ اپنی عظمت کے دلائل تو ویسے بھی اس نے ہر شے میں رکھ دیے تھے، پھر آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلّم نے مبعوث ہو کر زمین پر روشنی پھیلا دی، پھیلا رہے ہیں اور پھیلاتے رہیں گے۔ خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو اس نورِ نبوت سے مستفید ہو کر اپنی دنیا و آخرت کو سنوار لیں۔ اللہ کریم ہماری خطائیں معاف کر کے ہمیں بھی ان لوگوں میں شامل فرمائے، آمین!

اللہ کی محبت سب محبتوں پر غالب ہو:

اللہ جل شانہ، نے اپنی وحدانیت اور قدرت کاملہ کی نشانیوں کا ذکر فرمایا، نورِ نبوت اور تعلیمات و برکاتِ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کا ذکر فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ اس کے باوجود کچھ لوگ ایسے ہیں جو اللہ جل شانہٗ کے علاوہ دوسروں سے امیدیں وابستہ کر لیتے ہیں۔ یہ عالمگیر حقیقت ہے کہ دنیا میں بالآخر مجبور ہو کر سب لوگوں کو ایک آخری قوت ماننا پڑتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ انہیں اللہ کی معرفت نصیب نہ ہو لیکن عقلِ انسانی مجبور ہے کہ ایک قوت ایسی مانی جائے جو سب سے آخر، سب سے اوپر ہو اور جس سے اوپر کوئی نہ ہو ورنہ تسلسل لازم آتا ہے اور وہ ختم ہونے میں نہیں آتا کہ اس سے اوپر کوئی ہے، پھر اس سے اوپر بھی کوئی ہے، حتیٰ کہ یہ سلسلہ چلتا چلا جائے گا۔ بالآخر ایک ایسی قوت تسلیم کرنا پڑتی ہے جس سے اوپر کوئی نہ ہو۔ یہ تو عقل کی مجبوری ہے لیکن اللہ جل شانہٗ کی پہچان اور اس کی معرفت محض عقل کا کارنامہ نہیں ہے۔ یہ کیفیاتِ قلبی سے متعلق ہے۔ جب تک دل میں نورِ توحید نہ آئے، تب تک عقل محض ایک طاقت کو مانتی ہے جو سب سے اوپر ہے۔ وہ کون ہے، وہ کیسا ہے، اس کی ذات کیسی ہے، اس کی صفات کیسی ہیں، عقل اس سے محروم رہتی ہے۔ پھر لوگ کچھ ان دیکھی طاقتوں کو پوجنے لگتے ہیں یا پھر کچھ محسوس طاقتوں سے، اپنے جیسے انسانوں سے یا بتوں سے امیدیں وابستہ کر لیتے ہیں کہ یہ میری حفاظت کرے گا۔ میری ضرورتیں پوری کرے گا۔ اس کو شرک کہا جاتا ہے۔ اللہ کی ذات میں کسی کو شریک کیا جائے، یہ شرک ہے۔ اس کی صفات میں کسی کو شریک مانا جائے تو یہ بھی شرک ہے۔

اسلام کے علاوہ اس وقت دنیا میں کوئی ایسا مکتبِ فکر نہیں ہے، جو اللہ کو، جیسا وہ ہے، ویسا ہی مانتا ہو۔ ہمارے ہاں جو اہل کتاب ہیں، جن کی طرف پہلی کتابیں نازل ہوئیں، ان میں نصاریٰ ہیں، یہودی ہیں لیکن انہوں نے بھی اپنی کتابوں کے خلاف عقیدے گھڑ لیے۔ عیسائیوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا مانا اور یہودیوں نے عزیر علیہ السلام کو وَقَالَتِ الْیَھُوْدُ عُزَیْرُ ابْنُ اللّٰہِ (التوبہ:30) اللہ کا بیٹا مان لیا۔ اس طرح مختلف قسم کی گمراہیوں

میں مبتلا ہو گئے اور پھر جس سے امید وابستہ کرتے ہیں، اس سے اسی طرح محبت کرنے لگتے ہیں جو صرف اللہ کا حق ہے۔ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ۔۔۔۔ان سے پھر اس طرح کی محبت اور اس طرح کا تعلق بنا لیتے ہیں یا اس طرح کی امیدیں وابستہ کر لیتے ہیں جو صرف اللہ کریم کا حق ہے۔ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ۔۔۔۔۔ جسے نور ایمان نصیب ہوتا ہے، وہ سب سے زیادہ محبوب اللہ کریم کی ذات کو رکھتے ہیں۔اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ مومن دنیا میں کسی اور چیز سے محبت ہی نہیں کرتا۔ محبت ایک فطری عمل ہے۔ انسان ہر چیز میں جس طرح محتاج ہے، اسی طرح اس کی محبت بھی اس کی احتیاج کا ایک رخ ہے۔ جہاں سے وہ سمجھتا ہے کہ میری کچھ مدد ہوگی، میری کچھ ضرورت پوری ہوگی، اس جگہ کو، اس چیز کو، اس سبب کو محبوب رکھتا ہے۔ انسان کو اپنی ذات سے محبت ہوتی ہے، ہر طرح سے اسے بچانے کی کوشش کرتا ہے۔ اپنے مال سے محبت ہوتی ہے، اس کی حفاظت کرتا ہے۔ بیوی بچوں سے محبت ہوتی ہے، ماں باپ سے محبت ہوتی ہے، بہن بھائیوں سے محبت ہوتی ہے۔ یہ ساری محبتیں انسان کے مزاج میں داخل ہیں۔ وہ ان سے محبت کرتا ہے، یہ اس کی ضرورت ہے، اس کی مجبوری ہے لیکن نور ایمان کی خاصیت یہ ہے کہ جب ایمان نصیب ہوتا ہے تو سب پر غالب اور سب سے شدید اللہ کی محبت ہوتی ہے۔ یہ تقاضائے ایمان ہے کہ کوئی بھی کام، خواہ کتنا محبوب ہو لیکن جب اللہ کریم اس سے روک دے تو اللہ کی محبت غالب آ جائے اور اللہ کی نافرمانی نہ کی جا سکے اور دوسری محبتیں ہیچ ہو جائیں۔

والدین کی محبت فطری ہے اور ضروری بھی ہے لیکن اگر والدین بھی اللہ کی راہ میں رکاوٹ بنیں تو فرمایا: فَلَا تُطِعْهُمَا (العنکبوت:8) اور ان کی یہ بات نہ مانو کہ وہ اللہ کے کام سے روکیں یا اللہ کے دین سے روکیں یا ایمان لانے سے روکیں، اگرچہ ان کا احترام پھر بھی رہے گا کہ والدین ہیں جیسا کہ ارشادِ باری ہے: فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا (بنی اسرائیل:23) ان سے کبھی سخت زبانی سے بات نہ کرو اور ان سے نفرت نہ کرو اور ہمیشہ پیار سے بات کرو لیکن اللہ کی نافرمانی کا حکم دیں تو ان کی بات مت مانو۔ ان کی محبت اپنی جگہ لیکن سب محبتوں پر جو محبت غالب ہوگی وہ اللہ کی ہوگی۔ ایمان کا تقاضا ہے کہ: وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ۔۔۔۔ جنہیں نور ایمان نصیب ہوتا ہے، وہ اللہ سے بہت شدید محبت کرتے ہیں اور دوسری کوئی بھی محبت انہیں اللہ کریم کی نافرمانی پہ مجبور نہیں کر سکتی۔

انجام کار:

وَلَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ ﴿۱۶۵﴾ جو لوگ غیر اللہ سے امیدیں وابستہ کر لیتے ہیں اور شرک کرتے ہیں ان کے لیے اللہ سخت عذاب کرنے والے ہیں۔ شرک کے بارے دوسری جگہ ارشاد فرمایا: اِنَّ

الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ (لقمان:13) اور شرک بہت بڑا ظلم ہے۔ فرمایا، ان ظلم کرنے والوں کی حالت دیکھنے والی ہوگی جب وہ عذاب کو دیکھیں گے۔ جب وہ آخرت میں پہنچیں گے اور انہیں اللہ کا عذاب نظر آجائے گا، تب انہیں احساس ہوگا اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا۔۔۔۔ حقیقتاً ساری قوت اللہ کی ہے، ساری طاقت اللہ کے پاس ہے وَّاَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعَذَابِ ﴿۱۶۵﴾ اور اللہ کے عذاب بہت سخت ہیں۔

یہ انسانی تصورات سے اور انسانی سوچوں سے بالاتر ہے کہ شرک کی سزائیں کتنی سخت ہیں۔ اس لیے اللہ کریم نے انسان کو بچانے کے سارے اسباب دنیا میں مہیا فرمائے۔ اپنی قدرت کاملہ کی نشانیاں دکھا دیں اور نورِ نبوت سے، علومِ نبوت سے، برکاتِ نبوت سے جہان کو جگمگا دیا۔ اب اس کے بعد کوئی آنکھیں بند کر کے، روشنی سے دامن چرا کر تاریکیوں کا سفر کرتا ہے، شرک میں مبتلا ہوتا ہے اور اللہ کی نافرمانی کرتا ہے تو یہ اس کا اپنا اختیار کردہ راستہ ہے۔ جب پیدا وہ فرماتا ہے، ساری نعمتیں وہ عطا فرماتا ہے اور بالآخر حساب بھی اسی کو لینا ہے تو دوسروں کو خوش کرنے کے لیے اس کی نافرمانی کیوں کی جائے! فرمایا: اس کی سزائیں بھی بڑی سخت ہیں اور اے مخاطب! کاش تو اس وقت ظلم کرنے والوں کو، کفر و شرک میں مبتلا ہونے والوں کو یا غیر اللہ سے امیدیں وابستہ کرنے والوں کو دیکھے، جب وہ عذاب ان کے سامنے ہوں گے، جہنم سامنے ہوگا، تب انہیں یقین آجائے گا کہ ساری قدرت تو اللہ کی تھی، ساری طاقتیں اس کے پاس ہیں اور یقیناً اس کے عذاب بہت ہی سخت اور بہت ہی شدید ہیں۔

اس وقت وہ لوگ جو پیروی کرتے تھے، جو لوگ پیروکار تھے، وہ ان سے کہیں گے جو انہیں کفر و شرک کے راستوں پر چلاتے تھے کہ ہم ان سے بالکل بیزار ہیں، ہم ان کی بات نہیں مانیں گے۔ انہوں نے ہمیں تباہی کے دہانے پہ لا کھڑا کیا۔

اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِيْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا وَرَاَوُا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ ﴿۱۶۶﴾

پیروکار اپنے پیش رووں سے بیزاری کا اعلان کریں گے اور یہ کہیں گے: لَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً۔۔۔۔ کاش ہمیں ایک دفعہ پھر دنیا میں جانا نصیب ہو جائے۔ ایک دفعہ ہمیں واپسی کی اجازت مل جائے۔ وہی دار دنیا ہو، وہی شب و روز ہوں ہم ہوں اور وہی ہماری ضرورتیں ہوں، پھر ہم ان سب سے بیزار ہو کر صرف اللہ کو پکاریں، اس سے امیدیں رکھیں اور اس سے محبت کریں۔

فَنَتَبَرَّاَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوْا مِنَّا۔۔۔۔ جب وہ کہیں گے کہ ہم ان کی پیروی میں مارے گئے، ہم ان سے بیزار ہیں تو پیش رو کہیں گے کہ تم جس راستے پر چل رہے تھے، تم نے اپنی پسند سے وہ راستہ اختیار کیا، تم اپنا بوجھ ہم پر کیوں ڈالتے ہو؟ یہ دونوں گروہ، پیروکار بھی اور پیش رو بھی ایک دوسرے سے بیزاری کا اعلان کریں گے۔

فرمایا، اس وقت پیچھے چلنے والے یا پیروکار یہ کہیں گے کہ کاش ایک دفعہ پھر دنیا میں جانا ہو جائے، یہ لوگ بھی وہیں ہوں اور ہم بھی وہاں ہوں اور وہاں موقع ملے تو پھر ہم انہیں بتائیں کہ ہم کس طرح ان سے بیزاری کا اعلان کر کے اللہ کے احکام کی پیروی کرتے ہیں۔ جس طرح یہ آج ہم سے بری الذمہ ہو رہے ہیں، ہم اس کا بدلہ انہیں دنیا میں چکا دیں۔ فرمایا: كَذٰلِكَ يُرِيْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرٰتٍ عَلَيْهِمْ ۔۔۔ اسی طرح اللہ ان کے اعمال کو ان کے لیے باعثِ حسرت بنا دے گا۔ انہیں اس وقت دکھ ہو گا اور ان کے دل میں حسرت پیدا ہو گی کہ ہم کیا ظلم کرتے رہے۔ کاش ہمیں اب موقع مل جائے تو ہم اس کی تلافی کر لیں لیکن وہ صرف حسرت ہی ہو گی، کسی کو دوبارہ دنیا میں لوٹنا نہیں ہو گا۔

وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ ﴿۱۶۷﴾ ان کی یہ تمنائیں اور آرزوئیں انہیں دوزخ سے نکال نہیں سکیں گی۔ اگر آخرت عیاں ہو، اگر عذاب و ثواب سامنے ہو، جنت و دوزخ سامنے ہو اور اللہ کے فرشتے نظر آتے ہوں تو کون ایسا ہے جو اللہ کی نافرمانی کرے گا! اصل آزمائش تو ایمان بالغیب کی ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جو حق پہنچایا، اللہ کے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتماد کر کے اسے کوئی قبول کرتا ہے یا نہیں اور اگر اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات قبول نہ کی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات تو اللہ کی بات ہے۔ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝ (النجم: 3,4) دین کے معاملات میں اللہ کا حبیب صلی اللہ علیہ وسلم اپنی پسند سے کوئی بات ارشاد نہیں فرماتا۔ وہی کچھ آگے پہنچاتا ہے جو اللہ کی طرف سے وحی ہوتی ہے تو گویا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاداتِ عالیہ کو ٹھکرانا، اللہ کریم کی بات کو ٹھکرانا ہے۔

اب درمیان میں دنیا ایک حجاب ہے، ایک پردہ ہے۔ اللہ تو ہر جگہ موجود ہے لیکن دنیا کا پردہ ہماری آنکھوں پر ہے، ہمارے علم پر ہے، ہماری استعداد پر ہے۔ جب یہ دنیا کا پردہ ہٹ جائے گا، آدمی دنیا سے آخرت کو سفر کر جائے گا تو اسے موت کے فرشتے بھی نظر آنا شروع ہو جائیں گے۔ مرنے سے پہلے کافر کو بھی نظر آ جاتے ہیں، اس سے بات بھی کرتے ہیں، اسے کہتے ہیں فِيْمَ كُنْتُمْ ۔۔۔ تمہیں اللہ نے اتنی زندگی دی تھی، تم پچاس، ساٹھ، ستر سال، سو سال دنیا میں رہے، تم کیا کرتے رہے، کس شغل میں لگے رہے؟

دنیوی منفعت کے لیے دارالکفر میں سکونت:

قرآن کریم اس وقت کے سوال و جواب بتاتا ہے۔ اس وقت گنہگار کہتا ہے، ہم تو کمزور لوگ تھے كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِى الْاَرْضِ ۔۔۔ ہم کمزور لوگ تھے، ہمارے لیڈر یا حکمران یا ہمارے پیشرو جیسے ہمیں چلاتے

رہے، ویسے مجبوراً ہم ان کے پیچھے چلتے رہے۔ ہم میں انکار کی قوت نہیں تھی۔ تو فرشتے کہتے ہیں اَلَمۡ تَكُنۡ اَرۡضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً ۔۔۔۔۔ کیا اللہ کی زمین وسیع نہیں تھی؟ جہاں آپ حق پر نہیں چل سکتے تھے اور آپ کو زبردستی کفر پر چلایا گیا تو آپ وہ جگہ چھوڑ دیتے۔ فَتُهَاجِرُوۡا فِيۡهَا ۔۔۔۔ (النسآ: 97) تم وہ جگہ چھوڑ کر کہیں اور ہجرت کیوں نہیں کر گئے؟ ایسی جگہ چلے جاتے جہاں اللہ کی اطاعت مشکل نہ ہوتی۔ کوئی روکنے والا نہ ہوتا۔ تم ایسے لوگوں میں کیوں جا بسے جہاں ظلم ہی ظلم تھا، جہاں نفرت ہی نفرت تھی، جہاں شرک ہی شرک تھا، جہاں کفر ہی کفر تھا۔

اس میں ایک اصول یہ بھی بتایا جا رہا ہے کہ دنیوی زندگی میں انسان کو کوشش کرنی چاہیے کہ وہ نیک بندوں کے ساتھ رہے اور بدکاروں سے بچے لیکن یہاں ہمارا معاملہ ہی الٹ ہے۔ ہم چند دنیوی سکوں کے لیے دارالاسلام کو چھوڑ کر دارالکفر میں جانے کی سعی کرتے ہیں۔ لاکھوں روپے دے کر جاتے ہیں، بڑی مشکلوں سے پہنچتے ہیں اور جب وہاں پہنچتے ہیں تو پھر یہ شکوہ ہوتا ہے کہ کھانا بھی حلال نہیں ملتا، بچے آوارہ ہو گئے ہیں، اولاد کنٹرول نہیں ہوتی، ہم کیا کریں۔ بھئی آپ نے خود یہ سودا خریدا پھر اس میں رونے کی کیا بات ہے۔ اصول تو یہ تھا کہ جہاں نیکی آسان تھی، جہاں نیک لوگوں کی محفلیں میسر تھیں، آپ دارالکفر اور مشرکین کے علاقوں سے سفر کر کے وہاں جمع ہوتے اور زندگی کو اللہ کی مرضیات کے مطابق گزارنے کی کوشش کرتے۔ زندگی کا مقصد دولت کے انبار جمع کرنا نہیں ہے۔ کسی نے زر و جواہر اور مال و دولت کو اٹھا کر ساتھ نہیں لے جانا۔ یہ سکہ آخرت کے بازار میں کام آئے گا نہ وہاں اس کی کوئی حیثیت ہوگی۔ آخرت کا زادِ سفر دولتِ دنیا نہیں، اللہ کی اطاعت اور اللہ کے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع ہے۔ حقیقتاً کمانے والی دولت تو یہ ہے۔ بندہ کوشش کرے کہ جہاں یہ ممکن نہیں ہے، دارالکفر سے دارالسلام میں آئے۔ وہاں آئے جہاں اسلام پر عمل آسان ہو، وہاں آئے جہاں اسلامی علوم ملتے ہیں۔ وہاں پہنچے جہاں اللہ کا قرب نصیب ہوتا ہے، جہاں اللہ کے نیک بندے بستے ہیں تاکہ وہاں سے زادِ آخرت کما سکے۔ آج کے ماحول میں ہمارا مزاج ہی بدل گیا ہے، الٹ ہو گیا ہے۔ جہاں رزق حلال میسر ہو سکتا ہے، جہاں نیکی پر عمل کرنے میں کوئی رکاوٹ نہیں، باوجود ہزار خرابیوں کے کوئی کسی کو عبادت سے نہیں روکتا، کوئی کسی کو حلال کمانے اور حلال کھانے سے نہیں روکتا، کوئی کسی کو اذان سے، نماز سے، روزے سے نہیں روکتا، کم از کم یہ رعایت تو ہے، کچھ لوگ جو نہیں کرتے وہ بدنصیب ہیں لیکن جو کرنا چاہیں انہیں کوئی روکتا نہیں، ایسی جگہوں کو چھوڑ کر وہاں جانا جہاں کھانے کو حرام ملے، پینے کو حرام ملے، جہاں حلال دستیاب ہی نہ ہوتا ہو، حلال تلاش کرنا ہی مشکل ہو جائے اور صرف ایک فائدے کے لیے کہ وہاں دولت دنیا یہاں کی نسبت زیادہ ملتی ہے، تو یہ حقیقتاً اپنے آپ سے زیادتی ہے۔

اس کا پتہ تب چلے گا جب آخرت میں حقائق سامنے ہوں گے۔ اس وقت دل میں حسرتیں پیدا ہوں گی کہ

کاش! ایسا نہ کیا ہوتا، کاش! وہ نہ کیا ہوتا لیکن اس وقت کچھ نہیں ہو سکے گا۔ صرف حسرتیں اور وہ بھی ان کا دل دکھانے کو ہوں گی، حسرتیں انہیں دوزخ سے نکال نہیں سکیں گی۔ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ ﴿۱۶۷﴾ ان کی یہ حسرتیں انہیں عذاب سے چھڑا نہیں سکیں گی۔

یہ زندگی اللہ کی دی ہوئی نعمت ہے:

اللہ نے جو زندگی دی ہے، یہ بہت بڑی نعمت ہے اور موت زندگی سے اول ہے۔ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا (الملک: 2) اس نے موت بھی پیدا فرمائی، حیات بھی پیدا فرمائی۔ حیات سے پہلے موت کا ذکر ہے اور عجیب بات ہے کہ آپ انسانوں کی آبادی مین جائیں تو راستے میں سب سے پہلے قبرستان آتے ہیں۔ ہر آبادی میں داخل ہونے سے پہلے عموماً قبرستان ملتے ہیں۔ موت زندگی پر مقدم ہے اور زندوں سے پہلے مردوں کی بستیاں نظر آتی ہیں۔ اس کے باوجود انسان بھول جاتا ہے کہ کل مجھے بھی یہاں زیرِ زمین دفن ہونا ہے اور آخرت میں جانا ہے۔ میں وہ اعمال، وہ دولت، وہ چیزیں جمع کروں جو میرے ساتھ میری قبر میں جائیں، آخرت میں جائیں اور اللہ کی بارگاہ میں مجھے سرخرو کریں۔ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ ﴿۱۶۷﴾ یہ حال تو کافروں کا ہے لیکن نورِ ایمان کی برکت یہ ہے کہ کسی مومن کو بطور سزا جہنم میں جانا بھی پڑا تو اس کے لیے ہمیشگی نہیں ہوگی، اللہ معاف فرما دیں گے۔ بہت سے نیک لوگوں کی، انبیاءؑ، اولیاء، صلحاء کی سفارش سے چھوٹ جائیں گے۔ بہت سے لوگ معصوم بچوں کی سفارش سے چھوٹ جائیں گے لیکن جسے جانا بھی پڑا، وہ بھی اپنی سزا پوری کرے یا اللہ معاف کر دے تو اسے جہنم سے رہائی مل جائے گی۔ ایمان کی برکت یہ ہے کہ مومن ہمیشہ جہنم میں نہیں رہے گا لیکن جہنم کے کچھ لمحات بھی اسے ابدالآباد تک یاد رہیں گے۔ البتہ کفر ایسی مصیبت ہے اور شرک ایسی مصیبت ہے کہ کبھی جہنم سے رہائی نصیب ہی نہ ہوگی۔ نہ کوئی اس کی شفاعت کر سکے گا، نہ کوئی اس کی سفارش کر سکے گا، نہ کسی کی دعا اس کے حق میں قبول ہوگی اور نہ دعا کرنے کی اجازت ہی دی جائے گی بلکہ قرآن نے منع کر دیا ہے کہ اگر کوئی کفر پر مرجاتا ہے تو اس کے لیے دعا کرنا جائز ہی نہیں ہے۔

تو زندگی کے لمحات کو اسی طرح قیمتی سمجھنا چاہیے جیسا کہ وہ قیمتی ہیں۔ کوشش کی جانی چاہیے کہ اکثر وقت ایسے لوگوں میں گزرے جو اللہ کے اطاعت گزار بندے ہوں۔ نیکوں کی صحبت سے نیکی نصیب ہوتی ہے۔

صحبت صالح ترا صالح کند
صحبت طالح ترا طالح کند

نیکوں کی صحبت تجھے نیک بنا دے گی اور بدکاروں کی صحبت تجھے بھی بدکاری کی طرف لے جائے گی۔

اللہ کریم توفیق عطا فرمائے اور اپنے بندوں کا ساتھ نصیب فرمائے، زندگی میں، موت میں اور مابعد الموت بھی۔ آمین!

سورۃ البقرہ رکوع 21 آیات 168 تا 176

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِى الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ
الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَـكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۱۶۸﴾ اِنَّمَا يَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْٓءِ وَالْفَحْشَآءِ وَاَنْ
تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۶۹﴾ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ
قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ
شَيْـًٔا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ ﴿۱۷۰﴾ وَمَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِىْ يَنْعِقُ بِمَا لَا
يَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّنِدَآءً ؕ صُمٌّ ۢ بُكْمٌ عُمْىٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۱۷۱﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَاشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ
تَعْبُدُوْنَ ﴿۱۷۲﴾ اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ
لِغَيْرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَاۤ اِثْمَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ
رَّحِيْمٌ ﴿۱۷۳﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَيَشْتَرُوْنَ بِهٖ
ثَمَنًا قَلِيْلًا ۙ اُولٰٓـئِكَ مَا يَاْكُلُوْنَ فِىْ بُطُوْنِهِمْ اِلَّا النَّارَ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ
يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ ۖۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۷۴﴾ اُولٰٓـئِكَ الَّذِيْنَ
اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى وَالْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ ۚ فَمَآ اَصْبَرَهُمْ عَلَى
النَّارِ ﴿۱۷۵﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ نَزَّلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ ؕ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِى
الْكِتٰبِ لَفِىْ شِقَاقٍۢ بَعِيْدٍ ﴿۱۷۶﴾

اے لوگو! زمین میں موجود حلال اور پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور شیطان کے نقشِ قدم پر مت چلو (پیروی نہ کرو) یقیناً وہ تمہارا کھلا دشمن ہے ﴿۱۶۸﴾ بلاشبہ وہ تمہیں برائی اور بے حیائی کا مشورہ دیتا ہے اور اللہ کے ذمہ ایسی باتیں لگانے کا کہتا ہے جو تم جانتے بھی نہیں ﴿۱۶۹﴾ اور ایسے لوگوں سے جب اللہ کے نازل کردہ (احکام) پر عمل کرنے کا کہا جائے تو کہتے ہیں کہ ہم اپنے آباؤ اجداد کے طریقہ کی پیروی کرتے ہیں خواہ ان کے اجداد نہ کچھ سمجھ ہی رکھتے ہوں اور نہ سیدھی راہ پر ہوں ﴿۱۷۰﴾ اور ان کافروں کی مثال ایسی ہے جسے کوئی شخص ایسے (جانور) کے پیچھے چلّا رہا ہے جو سوائے شور اور آواز کے کچھ نہیں سنتا یہ بہرے، گونگے، اندھے ہیں پس وہ عقل سے محروم ہیں ﴿۱۷۱﴾ اے ایمان والو! ہمارے دیے ہوئے میں سے پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور اللہ کا شکر ادا کرو اگر تم اس (اللہ) کے اطاعت گزار ہو تو ﴿۱۷۲﴾ یقیناً اس نے تم پر مُردار کو حرام کیا ہے اور خون اور خنزیر کا گوشت اور (ایسا جانور) جس پر (بوقتِ ذبح) اللہ کے سوا کسی اور کا نام لیا جائے ہاں اگر کوئی بہت مجبور ہو جائے تو وہ حد سے نہ نکلے اور نہ زیادتی کرے تو اس پر گناہ نہ ہوگا یقیناً اللہ بخشنے والے مہربان ہیں ﴿۱۷۳﴾ بے شک جو لوگ اللہ کی بھیجی ہوئی کتاب (کے مضامین) کو چھپاتے ہیں اور اس کے بدلے حقیری شے (دولتِ دنیا) حاصل کرتے ہیں یہ لوگ اپنے پیٹوں میں آگ ہی بھر رہے ہیں اور قیامت کے دن اللہ ان سے بات نہیں کریں گے اور نہ انہیں پاک کریں گے اور ان کے لیے دردناک عذاب ہوگا ﴿۱۷۴﴾ جن لوگوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی خریدی اور بخشش کے بدلے عذاب۔ سو وہ دوزخ پر کس قدر دلیر ہیں ﴿۱۷۵﴾ یہ اس لیے کہ اللہ نے کتاب کو حق کے ساتھ نازل فرمایا اور یقیناً جن لوگوں نے کتاب میں اختلاف کیا وہ بہت دور کی (بڑی) گمراہی میں جا پڑے (مبتلا ہوگئے) ﴿۱۷۶﴾

تفسیر و معارف

حلال اور طیّب رزق:

خطاب ''الناس'' سے ہے، پوری انسانیت سے ہے یَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ كُلُوا۟ مِمَّا فِى ٱلْأَرْضِ حَلَٰلًا طَيِّبًا

اے لوگو! زمین میں سے اپنی ضرورتیں پوری کرو، کھاؤ، پیو لیکن دو شرطیں ہونی چاہیں: ایک تو وہ چیز حلال ہو۔ حلال روزی کے لیے معروف ذرائع ہیں اور روزی کے حرام ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ ان معروف ذرائع سے حاصل نہ ہو۔ معروف ذرائع چار ہیں۔ کھیتی باڑی حصولِ رزق کا معروف ذریعہ ہے۔ تجارت حصولِ رزق کا ایک معروف ذریعہ ہے۔ کھیتی باڑی اور تجارت کے اپنے اپنے اصول ہیں۔ اسی طرح ملازمت حصولِ رزق کا ایک معروف ذریعہ ہے۔ مزدوری حصول رزق کا ایک اور معروف ذریعہ ہے۔ معروف ذرائع سے رزق حاصل کیا جائے تو وہ حلال ہے۔ غیر معروف ذریعے سے جو رزق حاصل ہوتا ہے وہ حلال نہیں ہے۔ اس میں بہت سی چیزیں آجاتی ہیں، جیسے کوئی عملیات پڑھتا ہے کہ اسے پیسے ملتے رہیں، یہ معروف ذریعہ نہیں ہے۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے ایک عجیب مسئلہ پیش ہوا کہ بعض کیمیکل ملائے جائیں تو چاندی، پارے یا تانبے سے سونا بن جاتا ہے۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ یہ معروف ذریعہ رزق نہیں ہے۔ چونکہ کسی بھی چیز کی ماہیت تبدیل نہیں ہوتی۔ آپ تانبے سے یا چاندی سے سونا بنائیں گے اور بیچ دیں گے لیکن جب اسے تیزاب میں ڈالا جائے گا یا اس کو حل کیا جائے گا تو اپنی ہیئت پہ واپس آجائے گا۔ لہٰذا یہ دھوکا بازی ہے، معروف ذریعہ نہیں ہے۔ تجارت میں بھی حدود و قیود ہیں کہ جو چیز لیتے ہو، دیتے ہو، اس کی حقیقت بتا کردو، دھوکے سے نہ بیچو اور اس کی جائز قیمت طے کرو۔ اب اس میں بھی سود کو شامل کرلیں یا دھوکا بازی کو شامل کرلیں تو یہ غیر معروف ذریعے ہیں۔

اسی طرح ملازمت یا مزدوری میں بھی حدود و قیود ہیں۔ جس کام کی اجرت لیتے ہو، پوری دیانتداری سے اور پورا وقت لگا کر وہ کام کرو۔ دفتری لوگ دفتر میں وقت گزار کے آجاتے ہیں لیکن بے شمار لوگوں کے کام اٹکے رہ جاتے ہیں۔ پابندی صرف یہ ہوتی ہے کہ بروقت پہنچ جائیں اور چھٹی کے وقت چھٹی ہو جائے۔ عدالتوں میں مجسٹریٹ حضرات کا جب جی چاہا آئے، ریٹائرنگ روم میں بیٹھ گئے اور لوگوں کو تاریخیں ڈال دیں۔ حلال ذرائع میں بھی حدود و قیود ہیں کہ جس کام کی اجرت لیتے ہو اسے پوری دیانتداری سے کرو۔ معروف ذرائع سے رزق حاصل کیا جائے تو یہ حلال ہے۔ اب حلال کے اوپر ایک اور قید ہے کہ رزق حلال اور پھر وہ طیب بھی ہو، اس میں کوئی ناپاک چیز نہ ملائی

جائے۔ یہ نہ ہو کہ جس پانی سے آٹا گوندھ رہے ہیں یا ہنڈیا بنا رہے ہیں، وہ پانی ناپاک ہو تو پھر اس حلال کا کیا فائدہ!

جنات اور ذریتِ ابلیس:

وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ خطوت" خطوہ" کی جمع ہے اور خطوہ نقشِ قدم کو کہتے ہیں۔ فرمایا، شیطان کے نقشِ قدم پر مت چلو۔ شیاطین، ابلیس، اس کی ذریت، اور جنات میں سے بھی ہیں۔ ابلیس کو مہلت دی گئی تھی کہ تم قیامِ قیامت تک زندہ رہو گے۔ اس کی طوالتِ حیات اس کی نسل میں بھی آئی ہے۔ طبعی طور پر جنات کی بھی طویل عمریں ہوتی ہیں۔ سیرت طیبہ میں ملتا ہے کہ ایک بوڑھے ضعیف جن نے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زیارت کی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو موسیٰ علیہ السلام کا سلام پہنچایا کہ میں نوجوانی میں ان کے ہاتھ پر مسلمان ہوا تھا اور انہوں نے مجھے فرمایا تھا کہ تمہاری عمریں طویل ہوتی ہیں، اگر تم نبی آخرالزمان صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ پاؤ تو ضرور حاضر ہونا اور میرا سلام بھی عرض کرنا۔

دورِ حاضر میں تابعیت:

جنوں کی طوالتِ عمر کے ضمن میں شاہ ولی اللہؒ کا یہ واقعہ بھی مشہور ہے جس میں انہیں ایک صحابیؓ جن کی زیارت نصیب ہوئی۔ وہ فرماتے ہیں، میں کتاب دیکھ رہا تھا کہ میرے سامنے سفید رنگ کا ایک سانپ آ گیا۔ کوئی اور چیز پاس نہیں تھی، قلم دان اٹھا کر مارا تو وہ مر گیا۔ تھوڑی دیر بعد دو آدمی آئے اور مجھے جنّات کے بادشاہ کے سامنے لے گئے۔ بادشاہ غصہ سے مخاطب ہوا کہ تم نے قتل کیوں کیا؟ میں نے انکار کیا تو کہنے لگا، تم نے سانپ تو مارا ہے، وہ ہمارا جن تھا۔ میں نے جواباً حدیث بیان کی جس کی رو سے اگر کوئی جن کسی موذی جانور کا حلیہ بنا کر سامنے آئے گا اس کو مارنا حلال ہے، اس کا خون ضائع ہے، اس کا کوئی بدلہ نہیں۔ بادشاہ نے تصدیق کے لیے قاضی کو بلا بھیجا۔ وہ ضعیف العمر تھے، انہیں دیکھتے ہی بادشاہ احتراماً تخت سے اٹھ بیٹھا اور اپنی جگہ بٹھایا۔ مجھے کہا کہ وہ حدیث دوبارہ بیان کرو۔ میں نے جب حدیث بیان کی تو قاضی صاحب نے فرمایا، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا تھا، وہ بھی اس وقت وہاں موجود تھے۔ شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں، میں تابعی ہوں، میں نے صحابیؓ کو دیکھا ہے۔

حضرت جیؒ ایک محفل میں شاہ ولی اللہؒ کا یہی واقعہ بیان فرما رہے تھے۔ حدیث شریف بیان کرتے ہوئے جب آپ نے کہا ''نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا'' تو ان الفاظ کے ساتھ ہی آپؒ پر شدید رقت طاری ہو گئی۔ آپؒ کی ریکارڈ شدہ گفتگو میں دیر تک ہچکیوں کی آواز سنائی دیتی ہے۔ طویل سکوت کے بعد حضرت جیؒ فرمانے لگے: ''وہ بات سامنے آ گئی،'' اور پھر آپؒ نے حدیث مبارک بیان کی۔ کیا ہستی تھی کہ دربارِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں چودہ صدیاں قبل پیش آنے والے احوال آشکارا ہو جاتے!

جن مختلف اشکال میں متشکل ہو سکتے ہیں۔ کسی جانور کی شکل اختیار کرلیں اور انہیں پکڑ لیا جائے تو جب تک چھوڑیں نہیں، شکل تبدیل نہیں کر سکتے، مار دیں تو مر جاتے ہیں۔ صحیح مسلم شریف میں روایت ہے کہ عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلّم میں ایک صحابیؓ نے ایک جن کو مار دیا تھا جو ایک بڑا سانپ بن کر کنڈلی مارے ہوئے ان کے گھر میں بچھونے پر بیٹھا تھا۔ اس کے ساتھ ہی وہ صحابیؓ بھی شہید ہو گئے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے بارگاہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلّم میں یہ واقع عرض کیا اور درخواست کی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم دعا فرمائیں یہ زندہ ہو جائے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ اپنے ساتھی کے لیے بخشش کی دعا کرو۔ پھر فرمایا مدینہ شریف میں جن رہتے ہیں جو مسلمان ہو گئے ہیں۔ اگر تم سانپوں کو دیکھو تو تین دن تک ان کو خبردار کرو، اگر تین دن کے بعد بھی نکلیں تو ان کو مار ڈالو، وہ شیطان ہیں۔ یعنی کافر جن ہیں یا شریر سانپ ہیں۔

طوالتِ عمر کی وجہ سے شیاطین کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ حضرت جی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ آزاد کشمیر (باغ) سے ایک معرکۃ الآرا جلسے کے بعد واپس آ رہے تھے اور میں بھی ہم رکاب تھا۔ پہاڑی علاقوں میں جنات بہت زیادہ ہیں۔ زمین پر انسانوں سے پہلے جن آباد تھے جنہیں پہاڑوں کی طرف ہنکا دیا گیا اور زمین خالی کرائی گئی۔ اب بھی جو طاقتور قسم کے جن ہیں، وہ پہاڑی علاقوں میں زیادہ ہیں۔ جنات پر بات چلی تو حضرت رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرمانے لگے کہ اس وقت روئے زمین پر جتنی انسانی آبادی ہے، تقریباً اس سے نو گنا زیادہ آبادی جنات کی ہے۔ وہ سارے زمین پہ بستے ہیں لیکن ان کے جو بہت طاقتور لوگ ہیں، پہاڑوں میں ہی رہتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے ہماری یہ فضا اس مخلوق سے بھری ہوئی ہے اور ایک ایک بندے کو گمراہ کرنے کے لیے ان کے پاس بے شمار افراد ہیں۔ جنوں کی اکثریت بھی گمراہ ہے۔ بنیادی طور پر ان کا مزاج بھی ناری ہے اور بہت کم نور ایمان سے بہرہ ور ہیں۔

شیاطینِ انس:

شیاطین صرف ابلیس کی اولاد یا صرف جنات کی اولاد ہی نہیں ہیں۔ جنوں میں سے جو اس کا ساتھ دیتے ہیں، وہ بھی شیطان بن جاتے ہیں اور انسانوں میں سے جو اس کا ساتھ دیتے ہیں، وہ بھی شیطان بن جاتے ہیں۔ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ انسانوں میں سے جو شیطان بن جاتے ہیں، وہ اس شیطان سے جو ابلیس ہے، زیادہ خطرناک ہیں۔ وہ دل میں خیال ڈال سکتا ہے، اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتا، آپ کا ہاتھ پکڑ کر کہیں نہیں لے جا سکتا لیکن انسان جو شیطان بن جاتا ہے، یہ آپ سے بحث بھی کرتا ہے، آپ کو قائل کرنے کی بھی کوشش کرتا ہے، زبردستی پکڑ کر کہیں لے بھی جاتا ہے، کہیں زبردستی حرام بھی کھلا دیتا ہے۔ تو جو انسان شیطان بن جاتے ہیں وہ ان

شیطانوں سے زیادہ خطرناک ہیں جو جنوں میں سے ہیں۔ شیاطین انس ایک بہت بڑی مصیبت ہیں کہ انسان کو سبز باغ دکھا کر، بہلا پھسلا کر، دنیوی فوائد دکھلا کر دنیوی لذتیں دکھا کر گمراہ کر دیتے ہیں۔

رزق سے برکت کیوں اٹھ گئی؟

اگر آپ غور فرمائیں تو اس عہد میں ایک مسئلہ بہت عام ہے۔ میں نے یورپ اور مغربی ممالک میں دیکھا ہے کہ وہ لوگ سارا دن کھاتے رہتے ہیں۔ ہم ایک ایئر پورٹ پہ بیٹھے تو وہاں کے لوگوں نے جی بھر کے کھانا کھالیا۔ جہاز میں کھانا serve ہوا تو وہاں انہوں نے پھر پیٹ بھر کے کھالیا۔ مختصر فلائٹ تھی، گھنٹے کی ہوگی، اگلے ایئر پورٹ پر اترے تو انہوں نے وہاں پھر کھانا کھالیا۔ حیرت ہوتی تھی کہ ایک بندہ دو تین گھنٹوں میں کس طرح بار بار کھالیتا ہے؟ سارا دن منہ ہلاتے رہیں گے۔ کچھ نہ کچھ چیز منہ میں ڈالتے رہیں گے، کھاتے رہیں گے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بندے تین ہیں اور کھانا دس بندوں کا کھا جاتے ہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ جنّ چونکہ ایک نظر نہ آنے والی مخلوق ہے اور غذا میں جو انرجی ہوتی ہے، وہ ان کی غذا ہوتی ہے تو یہ کھانے میں سے انرجی لے لیتے ہیں۔ اگر کھانا حرام کا ہے تو پھر انہیں کوئی روکنے والا ہی نہیں۔ حلال ہے اور اس میں ناپاک مل گیا تو پھر بھی انہیں کوئی نہیں روک سکتا۔ چونکہ ہم احتیاط نہیں کرتے، کھانا حلال نہیں ہوتا، پھر پاکیزہ نہیں ہوتا، تو اس میں سے انرجی وہ حاصل کر لیتے ہیں۔ اب پیچھے ''پھوگ'' رہ گیا، وہ جس کی مرضی کھاتا رہے۔ ایک بندہ دس بندوں کی خوراک کھائے گا تب جا کر اس کی بھوک مٹے گی یا اس کے بدن کی ضرورت پوری ہوگی۔ جہاں یہ نہیں ہے وہاں اتنا خرچ نہیں ہوتا۔

آپ یہاں دارالعرفان میں دیکھ لیں کہ دس روٹیاں کھانے والے کا پیٹ بھی ایک روٹی سے بھر جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہی ہوتی ہے کہ یہ غذا حلال ہوتی ہے اور پاکیزہ ہوتی ہے۔ جہاں بھی، جس گھر میں بھی اس کا خیال رکھا جائے تو وہاں غذا کا حاصل بھی ہوتا ہے، تعمیر بدن بھی ہوتی ہے، اخراجات بھی کم ہو جاتے ہیں اور ان کی غذا میں سے یہ جنات وغیرہ نہیں کھا سکتے۔

یہ ہم خانقاہوں پہ جتنے چڑھاوے چڑھا کر دیگیں پکاتے ہیں اور وہاں کھانے پینے کی جتنی چیزیں چھوڑ آتے ہیں تو یہ سارا موج میلہ جنات کا ہوتا ہے۔ جہلاء کو اس کا پابند اور عقیدت مند رکھنے کے لیے کبھی کسی کو ڈرا بھی دیں یا کبھی کسی کو خواب میں بھی دکھائی دے جائیں تو ان کے لیے یہی دلیل کافی ہوتی ہے اور وہ اسی میں لگے رہتے ہیں۔ عموماً دیکھا یہ گیا ہے کہ ایسی خانقاہوں پہ ان کی بڑی آبادیاں ہوتی ہیں چونکہ وہاں مفت میں غذا ملتی ہے۔ اللہ کریم نے ان کی غذا دو چیزوں میں منحصر کر دی ہے۔ جانور جو اجناس کھاتے ہیں تو ان کے پیٹ میں اس

سے سو فیصد غذائیت نہیں نکلتی، کم وبیش آدھی یا اس سے کم گوبر میں خارج ہو جاتی ہے۔ ان کے لیے حلال یہ ہے کہ اس سے انرجی حاصل کریں یا مسلمان جو حلال جانور کھاتے ہیں اور اس کی ہڈیاں چھوڑ دیتے ہیں تو ان میں انرجی باقی ہوتی ہے۔ اس لیے حدیث شریف میں ہڈی سے یا گوبر سے پیشاب صاف کرنا منع ہے۔ یہ دو چیزیں ان کی غذا ہیں اس لیے انہیں خراب نہ کیا جائے۔ ایک تو یہ جنات بے شمار مخلوق ہے، پھر جب آدمی کی غذا بھی حلال نہ ہو اور طیب نہ ہو تو اس میں ان سے دفاع کی استعداد نہیں رہتی۔ اسے وہ اپنے پیچھے آسانی سے لگا لیتے ہیں۔

حلال اور طیب رزق شیطان سے ڈھال ہے:

كُلُوْا مِمَّا فِي الْاَرْضِ ۔۔۔۔۔ جو کچھ زمین میں ہے کھاؤ، تمہارے لیے ہے۔ جیسا کہ دوسری جگہ ارشادِ باری ہے: خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا (البقرہ:29) زمین میں جو کچھ پیدا کیا، سب تمہارے لیے ہے لیکن دو باتیں یاد رکھو: ایک تو وہ چیز فی نفسہٖ حلال ہو، دوسرا اس چیز کو حاصل کرنے کا طریقہ بھی حلال ہو۔ اگر ایک چیز ہی حرام ہے تو اسے آپ حلال طریقے سے کیسے حاصل کریں گے۔ مردار جانور ہے یا حرام جانور ہے، آپ اسے جائز پیسوں سے بھی خریدیں گے تو وہ حلال نہیں ہو جائے گا۔ فرمایا، چیز بھی حلال ہو اور اس کے حصول کا طریقہ بھی حلال ہو۔ اس کے بعد اسے طیب طریقہ سے، پاکیزگی سے کھائیں۔ اس میں کوئی ناپاکی شامل نہ کر دیں، کوئی پلیدی شامل نہ کر دیں، ناپاک طریقہ نہ اختیار کریں۔ ایک باورچی پکاتا ہے لیکن اس پہ غسل واجب ہے، اس نے غسل ہی نہیں کیا تو پاکیزگی کہاں سے آئے گی؟ ہاتھ منہ دھو کر کھانا پکانے لگ گیا۔ اس طرح وہ برتن دھونے میں غیر محتاط ہوتے ہیں، پاک پلید کی پروا نہیں کرتے۔ چھوٹے سے گڑھے میں پانی کھڑا ہے جو ناپاک ہے لیکن خواتین اس میں کپڑا دھو کر پاک کر لیتی ہیں۔ یہ کوئی کرامت ہے کہ وہ پانی خود ناپاک ہے، اس میں ہر طرح کا جانور داخل ہو رہا ہے اور تھوڑا سا پانی ہے لیکن اس میں کپڑا دھو کر پاک کر لیتے ہیں، کیسی عجیب بات ہے!

اللہ کریم نے پوری زندگی کے لیے یہ نسخہ بتا دیا ہے کہ رزق حلال کھاؤ اور طیب کھاؤ۔ طیب رزق کے تذکرے میں حضرت جیؒ لنگر مخدوم کے ایک سفر کا ذکر فرمایا کرتے۔ اس وقت ذرائع آمدورفت کا یہ حال نہیں تھا اور بڑی مشکل سے سواری ملتی تھی۔ کہیں بس، کہیں ٹانگہ، کہیں پیدل، اسی طرح لنگر مخدوم پہنچتے تھے۔ ایک مرتبہ لنگر مخدوم جاتے ہوئے راستے میں شام ہو گئی۔ گاؤں کے لوگوں نے کہا، آپ رات یہاں قیام کریں ہم آپ کے کھانے کا انتظام کرتے ہیں۔ آپؒ نے کہا، کھانا تو میں کھاؤں لیکن میری ایک شرط ہے کہ نمازی عورت کے ہاتھ کا پکا ہوا ہو۔ اب جو نماز ادا نہیں کرتی، اس کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا پاکیزہ کہاں ہو گا؟ سارے گاؤں میں تلاش کرنے کے بعد انہوں نے

حضرت کر لی کہ اس گاؤں میں تو کوئی عورت ایسی نہیں ہے جو نماز پڑھتی ہو۔ حضرت جیؒ فرماتے تھے: میں نے کہا پھر ایسا کرو کہ جو نمازی مرد گائے بھینس کا دودھ نکالتے ہیں، ان کے ہاتھ سے نکالا ہوا مجھے تھوڑا سا دودھ دے دو، اس پر گذارہ کرلوں گا۔ تو کھانا فی نفسہ حلال ہو، اس کے حصول کا طریقہ حلال ہو، جائز ہو اور پھر اسے پاکیزہ رکھ کر کھایا جائے، اس میں ناپاکی شامل نہ ہو تو یہ چیز شیطان کی پیروی سے بچانے کا بہترین نسخہ ہے۔ اگر کوئی شیطان کی پیروی میں پھنس گیا تو وہ اسے برائی کا حکم دے گا۔ برائی میں مبتلا ہو گیا تو پھر بے حیائی کا حکم دے گا اور جب بے حیائی میں مبتلا ہو گیا تو پھر اس کے منہ سے اللہ کی ذات کے بارے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے، دین کے بارے ایسے کلمات نکلوائے گا جو جہالت ہوں گے، یعنی اسے کفر تک پہنچائے گا۔

تو یہ دو باتیں ہیں کہ زمین کی ہر چیز استعمال کرو لیکن شرط یہ ہے کہ حلال ہو، فی نفسہ حلال ہو اور اس کے حاصل کرنے کا طریقہ بھی حلال ہو۔ اس پہ شرط ہے کہ وہ طیب ہو، پاکیزہ ہو، پاک صاف ہو۔ اگر آپ یہ محنت کریں گے تو اللہ کریم شیطان کی پیروی سے بچنے کے لیے آپ کی حفاظت فرمائے گا۔

مومن ہو یا کافر شیطان سب کا دشمن ہے:

وَ لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ ۔۔۔۔۔ شیطان کے نقوشِ قدم پر مت چلو لیکن اس سے پہلے یہ ارشاد فرمادیا کہ حلال اور طیب کھاؤ تاکہ تم اس سے بچ سکو، یعنی جو شخص محنت کرتا ہے، حلال طریقے سے روزی کماتا ہے، اس سے حلال رزق خرید کر کھاتا ہے اور اسے طیّب، پاکیزہ کر کے کھاتا ہے تو اللہ کریم اس کی حفاظت فرماتے ہیں اور وہ شیطان کے نقشِ قدم پر چلنے سے بچ جاتا ہے جو انسان کا ازلی دشمن ہے۔ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝۱۶۸ وہ تمہارا کھلا کھلا دشمن ہے۔ مسلمان سے تو دشمنی ہے ہی، دوستی کافر سے بھی نہیں ہے۔ وہ کسی کی بھی بہتری نہیں چاہتا اس لیے یہ حکم یٰۤاَيُّهَا النَّاس ساری اولادِ آدم علیہ السلام کو دیا جارہا ہے کہ اگر کوئی نورِ اسلام سے بہرہ ور نہیں ہے اور شیطان کی گود میں بیٹھا ہے لیکن اگر وہ بھی یہ کوشش کرے کہ جائز وسائل سے حلال روزی حاصل کرے اور اسے پاکیزہ کر کے کھائے تو عین ممکن ہے کہ اللہ کریم اسے شیطان کے چنگل سے نجات دے دیں اور اسے نورِ ایمان نصیب ہو جائے اور جو شخص پہلے سے مومن ہے، جس کے پاس نورِ ایمان ہے، حلال اور پاکیزہ غذا سے اس کے نورِ ایمان میں مزید ترقی ہو گی، اللہ کریم اسے شیطان کی پیروی سے بچالیں گے اور اسے مزید قربِ الٰہی حاصل ہو گا۔

شیطان کا طریقہ واردات:

اب یہ کیسے پتہ چلے کہ ہم شیطان کے پیچھے چل رہے ہیں تو فرمایا: اِنَّمَا يَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْٓءِ وَ الْفَحْشَآءِ

اس کی نشانی یہ ہے کہ شیطان تمہیں پہلے برائی پہ لگاتا ہے، جہاں ملازمت کر رہے ہو وہاں سے چوری کرلو جو چیز خرید رہے ہو اس کے تھوڑے پیسے دو یا نہ دو یا دھوکے سے خرید لو۔ جو بیچ رہے ہو اس پر زیادہ پیسے لے لو اور دھوکے سے بیچ دو۔ پہلے برائی کا حکم دیتا ہے، اگر آدمی برائی میں مبتلا ہو جائے تو پھر فحاشی کی طرف لے جاتا ہے۔ ہر گناہ حیا کو ختم کرتا ہے اور بے حیائی کو جنم دیتا ہے۔ شیطان کا طریقہ واردات یہ ہے کہ وہ پہلے برائی کراتا ہے۔ اللہ کریم نے یہ ایک نشانی بتادی کہ جنہیں حلال اور طیب کھانے کو بتایا ہے وہ یہ بھی دیکھیں کہ کہیں وہ برائی میں مبتلا تو نہیں ہو رہے؟ اگر ایسی بات ہے تو توبہ کرے، رجوع الی اللہ کرے، واپس آجائے۔ اگر برائی میں ملوث ہوگا تو اس کے بعد شیطان اسے بے حیائی میں لے جائے گا، اس کے بعد وہ ایسے امور کا مرتکب ہوگا جو حیا کے خلاف ہیں۔ اگر یہ بھی اس نے برداشت کرلیا، اس میں مبتلا ہو گیا تو پھر وہ کفر کی طرف لے جائے گا۔

وَاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۶۹﴾ پھر اللہ کے بارے میں تم ایسی باتیں کرنے لگو گے جن کا کسی علم سے کوئی تعلق نہیں ہے، جو تم نہیں جانتے۔ پھر تمہیں کہیں قدرت باری میں شک ہوگا، کہیں وجود باری میں شک ہوگا، کہیں آخرت میں شک پڑ جائے گا، کہیں جنت دوزخ پہ سوال پیدا ہونے لگیں گے، پھر وہ بندے کو کفر تک لے جائے گا۔ تو اس سے بچنے کے لیے بنیادی بات یہ ہے کہ آپ شروع سے ہی حصولِ رزق کے معاملات میں محتاط ہو جائیں۔ حلال روزی کمائیں، حلال طریقے سے کمائیں اور پاک صاف، پاکیزہ کھائیں۔

جو لوگ یہ نہیں کرتے اور شیطان کے چنگل میں گرفتار ہو جاتے ہیں، وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ۔۔۔ جب ان سے کہا جائے کہ جو اللہ نے نازل فرمایا ہے، جو دینِ برحق ہے، جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہنچایا ہے، اس کے مطابق کام کرو تو وہ کہتے ہیں قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا۔۔۔ آج تک ہمارے باپ دادا جس طرح کرتے آئے ہیں ہم اس طرح کیسے نہ کریں!

آباؤ اجداد کی اندھی تقلید اور رسومات:

کفار سے بات کرو تو وہ یہی جواب دیتے ہیں کہ جی صدیوں سے ہمارے پاس یہ دین آ رہا ہے، یہ ہمارا دین ہے اور ہم اسی کو حق سمجھتے ہیں، ہماری کتنی نسلیں اس پر عمل کرتے گزر گئیں۔ وہ تو خیر کفر کی مصیبت میں مبتلا ہیں، آپ مسلمانوں میں دیکھ لیجیے۔ موجودہ حالات میں کوئی ایک ایسا کام نظر نہیں آتا جس میں رسمِ دنیا داخل نہ کر دی گئی ہو حتیٰ کہ اذان، نماز اور روزے کی افطاری میں بھی رسومِ دنیا داخل کر دی گئی ہیں۔

''منارہ'' ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ دار العرفان میں ''ہوٹر'' بجتا ہے تو کچھ لوگ اعلان کر دیتے ہیں کہ بھئی!

روزہ افطار ہو گیا، ایک آدھ منٹ بعد ایک اور اعلان ہوتا ہے کہ روزہ افطار ہو گیا پھر دو منٹ بعد ایک اور اعلان ہوتا ہے روزہ افطار ہو گیا۔ اس کے دو منٹ بعد ایک اور اعلان ہوتا ہے روزہ افطار ہو گیا۔ یہ سارے اہل سنت اور سارے حنفی ہیں تو ایک ایک آدھ منٹ کا فرق ان میں کیوں ہے۔ گنتی کے چند سو افراد ہیں لیکن اپنی اپنی انا اس میں داخل ہے کہ انہوں نے ہوٹر بجایا تو ہم روزہ افطار کرلیں! یہ تو ان کی بات بن گئی، وہ پیشوا بن گئے۔ اسی طرح کوئی آدمی فوت ہو جاتا ہے تو امورِ شرعی کا لحاظ کم رکھا جاتا ہے۔ غسل کفن تو مجبوری ہے لیکن رسومات ساری وہ ادا کریں گے جو باپ دادا سے ورثہ میں ملی ہیں، کبھی قل، تیجا کبھی دسواں، چالیسواں وغیرہ اور کہیں گے کہ ہمارے بڑے اسی طرح کرتے تھے حالانکہ ان میں سے کسی چیز کا کوئی شرعی ثبوت نہیں ہے۔ انہیں جاننا چاہیے کہ اگر باپ دادا غلط کرتے تھے تو یہ کسی بات کے حق ہونے کی دلیل نہیں ہے۔

شادی میں کتنی رسومات ہیں جن کی کوئی شرعی دلیل نہیں ملتی۔ اس پر دلیل یہ دی جاتی ہے کہ باپ دادا سے اسی طرح سے ہوتا آ رہا ہے، ہم نہیں کریں گے تو ناک کٹ جائے گی۔ وہ کون سی ناک ہے بھئی جو شریعت پر عمل کرنے سے کٹتی ہے؟ اس کا بچانا صحیح نہیں ہے، اس کا کٹوانا ہی صحیح ہے۔ اگر شریعت پر اور سنت پر عمل کرنے سے ناک کٹتی ہے تو اس کا کٹ جانا ہی بہتر ہے کہ ناک کے بغیر گزارا ہو سکتا ہے لیکن شریعت کے بغیر گزارا ممکن نہیں ہے۔

فرمایا: وَاِذَا قِیۡلَ لَهُمُ اتَّبِعُوۡا مَآ اَنۡزَلَ اللّٰهُ ۔۔۔۔ جو کچھ اللہ نے نازل کیا ہے اس کا اتباع کرو۔ اللہ کریم تو اتباع نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا حکم دے رہے ہیں اور وطنِ عزیز میں حال یہ ہے کہ وہ اذان جس کا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا اور جو پچھلی چودہ صدیوں میں ادا ہوتی رہی، اب پندرہویں صدی میں اس کے ساتھ پتا نہیں کیا کیا شامل ہو گیا؟ مسجد کا مؤذن اپنی مرضی سے اس میں جو چاہے آگے پیچھے لگا لیتا ہے یعنی کوئی چیز اس میں مستقل بھی نہیں ہے۔ دورِ صحابہؓ میں اذان ہوتی رہی، تابعین تبع تابعین کے عہد میں ہوتی رہی، چودہ سو سال مسلمانوں کی اذان ایک ہی رہی، اب اس میں اضافے کیوں شروع کر دیے ہیں؟ یہ چیزیں کیوں آتی ہیں؟ حرام کھانے سے، ناپاک کھانے سے، انسان شیطانوں کے پیچھے چل پڑتا ہے اور شیطان اسے برائی میں مبتلا کرتا ہے۔ پھر دین نہیں رہتا، آباؤ اجداد اور رسومات کی اندھی تقلید بن جاتا ہے۔

مباح اور بدعت میں فرق:

ہدایت تو اللہ کے دین میں ہے، اللہ کی کتاب میں ہے، اللہ کے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع میں ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان میں ہے۔ اب اس سے ہٹ کر کسی کے باپ دادا نے کوئی رواج بنا لیا تو اسے

عبادت سمجھ کر کرنا ظلم ہے۔ بعض اعمال ایسے ہیں جو شرعاً مباح ہیں لیکن اگر انہیں مباح سمجھ کر کیا جائے پھر تو درست ہے لیکن جب عبادت سمجھ کر کیا جائے تو وہ بدعت ہو جائیں گے، پھر مباح نہیں رہیں گے۔ عبادت وہی ہے جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مقرر کر دی۔ ہمارے بعض رواجات جو مباحات بھی ہیں، انہیں اگر عبادت کا درجہ دے دیا جائے تو وہ بدعت بن جائے گی اور یہ ظلم ہوگا۔ ہر بدعت گمراہی ہے اور ہر گمراہی کا انجام جہنم ہے۔ کُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٍ وَكُلُّ ضَلَالَةٍ فِي النَّارِ (مشکوٰۃ) زیادہ حسرت ان لوگوں کو ہوگی جو زندگی بھر محنتیں کرتے رہے، مشقتیں کرتے رہے، خود کو دین دار سمجھا اور عمل رسومات پر کرتے رہے۔ ساری عمر کی محنت اور مجاہدے کے بعد جب قبر میں داخل ہوں گے تو پتا چلے گا کہ ہم تو ظلم کرتے رہے اور جو کچھ ہم کرتے رہے اس پر انعام تو کیا، الٹی سزا ہوگی، وہ تو قابل درگزر بھی نہیں۔ یہ کتنی بڑی حسرت ہوگی!

لوگ جو غلط رواج بھی اپنا لیتے ہیں، یا کفار نے دین کے نام پر جو بے دینی جمع کر رکھی ہے، جب ان سے کہا جائے کہ جو اللہ نے نازل کیا ہے اس کی پیروی کرو تو ان کا جواب یہ ہوتا ہے کہ آج تک باپ دادا جو کرتے رہے، ہم تو وہ کریں گے۔ کیا وہ سارے غلط تھے اور تم صحیح ہو؟ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْئًا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ۝ باپ دادا اگر ہدایت پر ہوں تو ان کی پیروی ہدایت کی پیروی ہوئی۔ یہ باپ دادا کی پیروی تو نہیں ہے، یہ تو اللہ کی ہدایت کی پیروی ہے۔ دین ہے ہی توارث، ہم پہلوں کی پیروی میں سارا کام کرتے ہیں لیکن شرط یہ ہے کہ وہ باعقل ہوں اور ہدایت پر ہوں، بے وقوف یا جاہل اور گمراہ نہ ہوں۔

غیر نبی کا اتباع کسی جانور کے اتباع کی مانند ہے:

وَمَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِيْ يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّنِدَآءً۔۔۔ کفار کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص اپنی جہالت سے کسی ایسے جانور کے پیچھے چلنا شروع کر دے جو صرف آواز تو سنتا ہے لیکن راہنمائی کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ اسے اس سے کوئی غرض ہے نہ اسے اس کی سمجھ ہے اور نہ وہ اس کی راہنمائی کر سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بجز انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے راستہ کے، جو شخص کوئی بھی راستہ اختیار کرتا ہے، وہ سوائے گمراہی کے اور بھٹکنے کے کچھ حاصل نہیں کر پاتا۔ قابلِ اتباع اللہ کے وہ مقبول بندے ہوتے ہیں جو اللہ کی بارگاہ سے آشنا ہوتے ہیں، جنہیں اللہ کریم کی طرف سے راہنمائی ملتی ہے اور امت ان کی پیروی کی مکلف ہوتی ہے۔ اللہ کا نبیؐ، اللہ کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو حکم دیتا ہے یا جو کام کرتا ہے، وہ ہماری سمجھ میں آئے یا نہ آئے، اس کی کوئی تعبیر ہم سمجھ سکیں یا نہ سمجھ سکیں لیکن وہ حق ہوتا ہے۔ اس کے حق میں کوئی شبہ نہیں اور وہ آدمی کو اس کی اصلی اور حقیقی منزل تک لے

جاتا ہے، اس سے قربِ الٰہی نصیب ہوتا ہے۔ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے علاوہ دنیا میں جتنے طریقے اور جتنے مذاہب ہیں، کوئی نہ کوئی ان کا موجد ہے، کوئی نہ کوئی ان کا پیشوا ہے، کوئی نہ کوئی ان کے آگے چلتا ہے لیکن اللہ کریم فرماتے ہیں کہ اس کی مثال ایسے ہے جیسے کسی جانور کے پیچھے آدمی چلنے لگے جو آواز تو سنتا ہے لیکن وہ خود بھی اور وہ جانور بھی اس آواز کے مفہوم سے آشنا نہیں ہے۔ اگر آپ آواز دیں تو اس کے لیے محض شور ہوتا ہے اور اس کا وہ کوئی جواب دے پاتا ہے نہ کوئی بات سمجھا سکتا ہے۔ جس طرح جانور ویرانوں میں بھٹکتے رہتے ہیں، اسی طرح کفر کی طرف لے جانے والے راہنماؤں کے پیچھے ویرانوں میں بھٹکتے رہتے ہیں حتیٰ کہ انسان بھٹکتے بھٹکتے ہلاک ہو جاتا ہے، کافروں کی مثال تو ایسی ہے: صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ﴿۱۷۱﴾ جیسے وہ گونگے، بہرے اور اندھے ہوں۔ نہ تو انہیں کوئی اچھی آواز سنائی دیتی ہے، نہ کوئی اچھی بات کر سکتے ہیں، نہ انہیں کوئی صحیح راستہ دکھائی دیتا ہے۔

حقیقی شعور اللہ کی پہچان ہے:

کافروں کا بھی یہ حال ہے کہ اللہ کی نعمتوں کو استعمال تو کرتے ہیں لیکن اتنے بے وقوف ہیں کہ خود اللہ کو پہچان نہیں پاتے۔ آپ کسی جانور کو عقل مند نہیں کہتے حالانکہ وہ گھاس چرنے والا ہے تو اس میں اتنا شعور ہے کہ وہ گھاس میں سے اچھی بری کی تمیز رکھتا ہے اور اچھی اچھی دیکھ کر چرتا ہے۔ زندگی کے سارے کام ہر جانور انجام دیتا ہے، گھر بناتا ہے، بچے پیدا کرتا ہے، بچے پالتا ہے لیکن آپ کسی جانور کو عقل مند نہیں کہتے، دانشور نہیں کہتے۔ کیوں نہیں کہتے؟ زندگی تو وہ بھی گزار رہا ہے اور بڑے بڑے عجیب کام کرتا ہے۔ اب آپ ایک مکڑی کا جالا ہی دیکھ لیں کہ وہ کس ترتیب سے اور کس انداز سے اسے بنتی ہے، اس پہ کتنی محنت کرتی ہے لیکن اسے عقل مند نہیں کہا جاتا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ چیز اس کی فطرت میں ہے۔ فطرت نے اسے سمجھا دیا لیکن اس کو خود یہ شعور نہیں کہ کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا، سب فطری طور پر کرتے ہیں۔ اسی طرح زندگی گزارنا بھی انسانی فطرت ہے، خوراک تلاش کرنا، گھر بنانا، سواری بنانا یہ انسانی فطرت کے کام ہیں۔ عقل و شعور تو وہاں سے شروع ہوتا ہے جب انسان اسباب کو دیکھ کر مسبب الاسباب کی طرف چل پڑتا ہے۔ شعور کی، دانش کی اور عقل کی بات یہ ہے کہ اسباب کو دیکھ کر وہ غور و فکر کرے۔ آخر انسان ہے، اللہ نے اسے شعور دیا ہے سوچے کہ یہ اسباب از خود تو پیدا نہیں ہو گئے۔ کس نے پیدا کیے ہیں اور وہ پیدا کرنے والا کون ہے؟ پھر اسے اندازہ ہو کہ اس کی کتنی نعمتیں ہیں مجھ پر، اس نے مجھے کتنی آسانیاں دی ہیں اور میرے لیے کتنی چیزیں پیدا فرمائی ہیں۔ وہ اسباب کے خالق کو، پیدا کرنے والے کو جان لے پھر اس کے اپنے وجود میں جتنی صلاحیتیں ہیں، وہ اس کی طرف اشارہ کرتی ہیں جس نے اسے تخلیق فرمایا۔ اب اس کے باوجود بھی وہ اس طرف نہیں چلتا تو فرمایا: فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ﴿۱۷۱﴾ پھر ان میں عقل نہیں ہے، بے وقوف ہیں، ان میں شعور نہیں ہے۔

حقیقی خالق صرف اللہ ہے:

فَهُمْ لَا يَعْقِلُونَ ﴿۱۷۱﴾ وہ عقل سے بے بہرہ ہوتے ہیں۔ دنیا میں بڑی عجیب بات دیکھنے میں آئی ہے کہ کفار نئی نئی چیزیں ایجاد کرتے ہیں، نئے نئے کام کرتے ہیں گویا ان میں بڑی دانش ہے۔ کیسی عجیب وغریب مشینیں ایجاد کرلیں۔ ایجادات کا شعور عمومی طور پر فہم انسانی کو دیا گیا ہے اور کوئی بھی موجد کسی چیز کا خالق نہیں ہوتا، پیدا نہیں کرتا بلکہ تخلیق شدہ اشیاء کو مختلف نسبتوں سے ملاتا ہے، ان کی آمیزش کرتا ہے اور ان سے ایک نئی چیز وجود میں آجاتی ہے۔ وہ کسی چیز کا خالق نہیں ہوتا حالانکہ ہمارے ہاں رواج ہے کہ اگر کوئی ایک مضمون لکھ دے تو اسے مضمون کا خالق کہتے ہیں۔ کوئی ایک غزل یا نظم لکھ دے یا کتاب لکھ دے تو ہمارے اردو ادب میں اسے اس کا خالق کہا جاتا ہے۔ یہ تخلیق نہیں ہے۔ تخلیق ہے کہ عدم سے وجود میں لایا جائے اور اگر وجود پہلے سے ہے، الفاظ پہلے سے تخلیق شدہ ہیں اور ان کو ایک ترتیب سے جوڑ دیا جائے تو یہ تخلیق نہیں ہے۔ ایجاد تو ہوسکتی ہے، تخلیق نہیں ہے اور اللہ کے سوا کسی کو خالق کہنا درست نہیں ہے۔

رزق کے اثرات:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ ۔۔۔۔ پھر وہی بات دہرائی کہ یہ عقل و شعور سے کام لیتے ہوئے اسباب کو دیکھے تو مسبب الاسباب کی تلاش کرے اور تصویر سے اسے مصور کا خیال آئے۔ تخلیق سے اس کی توجہ خالق کی طرف جائے۔ اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ اللہ نے جو رزق دیا ہے، اس میں سے طیب رزق استعمال کرو۔ اس نے ایسی چیزیں پیدا فرمائی ہیں کہ ایک کے کھانے سے بیمار کو صحت نصیب ہوجاتی ہے اور دوسرے کھانے سے صحت مند آدمی کو موت آجاتی ہے۔ انسان کو ان کی خصوصیات سے بھی آگاہ فرمادیا تو اب انسان کو چاہیے کہ وہ زہر نہ کھائے۔ اس کی بجائے وہ چیزیں کھائے جو اس کو صحت عطا کرتی ہیں۔ حرام یا ناپاک رزق ایسے ہی ہے جیسے کوئی زہر کھاتا ہے۔ زہر ایک مادّی چیز ہے اور اس سے مادّی جسم کو موت آتی ہے یا مادّی جسم پہ بیماری آتی ہے اور گناہ یا حرام ایک کیفی چیز ہے۔ وجود تو ایک ہی ہے، گوشت کا ایک ٹکڑا خریدتے ہیں تو حلال ہے، چوری کرتے ہیں تو وہی حرام ہوجاتا ہے۔ گوشت تو گوشت ہی رہتا ہے لیکن اس کے اندر جو کیفیت ہے وہ بدل جاتی ہے۔ آپ نے اسے خریدا ہے، حلال ہے، آپ کو روحانی صحت عطا کرے گا۔ آپ نے چوری کرلیا ہے تو وہ روح کی بیماریاں پید کرے گا، ایسی کیفیات ہوں گی جن سے آپ کی انسانیت کو خطرہ ہوگا۔ انسانیت مرگئی تو باقی محض جانور رہ گیا۔

فرمایا: كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ۔۔۔ جو رزق ہم نے تمہیں دیا ہے، اس میں جو چیزیں حلال بتا دی ہیں، وہ کھاؤ وَ اشْكُرُوْا لِلّٰهِ اور اللہ کا شکر ادا کرو کہ تم نہیں جانتے تھے، اس نے تمہیں بتا دیا۔ اس نے تم پر کتاب نازل فرمائی اس نے تمہیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیسی ہستی سے سرافراز فرمایا، ایک ایسی ہستی جس نے زندگی کے ہر چھوٹے کام سے لے کر ہر بڑے فیصلے تک تمہاری راہنمائی فرمادی، فرمارہے ہیں اور فرماتے رہیں گے۔ تا قیامت نبوت و امامت و قیادت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی ہے۔ آج اگر ہم سجدہ کر رہے ہیں تو سجدہ ریز ہونے کی ادا ہمیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات سے ملی۔ آج اگر ہم اللہ کی بارگاہ میں حاضر ہو کر بیٹھے ہیں تو یہ حضوری کا شرف بطفیل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں حاصل ہے۔ اسی طرح سے غذا میں، کاروبار میں، کمانے میں اور اسے صرف کرنے میں پوری احتیاط کرو۔ اگر یہ حلال ہوگا تو یقیناً روح کو، روحانی کیفیات کو طاقت دے گا جو ہدایت کی طرف بڑھنے کی ایک صورت ہوگی، ہدایت کو قبول کرنے کی ایک صورت ہوگی۔ خدانخواستہ اگر کوئی حرام کھائے گا تو اس کے اندر سے کیفیات مرتی جائیں گی۔ پیٹ تو بھر جائے گا، وقت تو گزر جائے گا، لیکن وہ کیفیات ختم ہوتی جائیں گی، اور خطرہ یہ ہے کہ اگر اس پر قائم رہا تو بالآخر کفر تک جا پہنچے گا۔

وَاشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ﴿۱۷۲﴾ اگر تم اس کے ساتھ اپنی عبادت کا، اپنی غلامی کا تعلق رکھتے ہو اور تمہیں نورِ ایمان نصیب ہوا ہے تو پھر ہر لحظہ اس کا شکر ادا کرتے رہو کہ جس نے تمہیں اتنا عظیم راہنما صلی اللہ علیہ وسلم عطا فرمایا، جس نے زندگی کے ہر شعبے میں تمہارے لیے شمعیں روشن کر دیں اور ہدایت کا راستہ واضح کر دیا۔ حق و باطل میں جو واضح فرق ہے، وہ ہر ایک کو سمجھا دیا۔

اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ ۔۔۔ کوئی چیز جو مردار ہو جاتی ہے وہ تم پر حرام کر دی گئی ہے۔ خواہ وہ ایسی چیز ہو جسے ذبح کیا جاتا ہے تو حلال ہوتی ہے لیکن بغیر اللہ کے نام کے جواز خود مر گئی، وہ تم پر حرام کر دی گئی ہے۔

جو دم غافل سو دم کافر:

پیر مہر علی شاہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے کسی نے ذبیحہ کے متعلق پوچھا تو انہوں نے فرمایا کہ جس پر تکبیر نہ پڑھی گئی ہو اور اس کی جان نکل جائے تو وہ حرام ہے، مردار ہے۔ پھر جو لوگ محفل میں بیٹھے تھے انہیں فرمانے لگے کہ دیکھو ایک جانور اصولاً حلال ہے لیکن اس پر اللہ کا نام نہیں لیا جاتا ہے، تکبیر نہیں پڑھی جاتی اور وہ مر جاتا ہے تو حرام ہو جاتا ہے۔ انسان مکلف ہے، یہ دن بھر سانس لیتا ہے اور ہر جانے والا سانس دوبارہ نہیں آتا، جو سانس لے لیا وہ ختم ہو گیا۔ اب اگر سانس میں اللہ کا نام نہیں لیا تو کیا وہ حرام نہیں ہوگا! جس طرح یہ جانور کا آخری وقت ہے کہ جا رہا ہے اور اس پر

تکبیر نہ پڑھی گئی تو حرام ہوگا۔ فرمایا، ہر سانس جو ہم لیتے ہیں اور اسے چھوڑتے ہیں تو وہ ختم ہو جاتا ہے، پھر دوسرا سانس آتا ہے، وہ پہلا واپس نہیں آتا تو اس جانے والے میں اگر اللہ کا نام نہیں ہے تو وہ بھی حرام ہو گیا۔

خنزیر اور شراب میں حرمتِ حقیقی ہے:

وَ الدَّمَ اور بہتا ہوا خون خواہ وہ کسی حلال جانور کا بھی ہو۔ خون حرام ہے وَ لَحْمَ الْخِنْزِيْرِ ۔۔۔۔ اور خنزیر کا گوشت۔ خنزیر کے سب اجزاء حرام ہیں، خنزیر میں حرمتِ حقیقی ہے۔ بعض جانور ایسے ہیں جن میں کسی وجہ سے حرمت آگئی لیکن خنزیر کا چمڑا دباغت کرنے سے بھی پاک نہیں ہوتا۔ خنزیر کو خریدنا، خنزیر کو بیچنا حرام ہے، خنزیر کو پالنا حرام ہے، اجرت پر خنزیر چرانا حرام ہے، خنزیر کے لیے مزدوری کرنا حرام ہے یا جیسے کرائے پر کوئی ٹرک میں لاد کر لے جائے تو وہ کرایہ حرام ہے یعنی اس کی اصل میں حرمت ہے۔ خنزیر اور شراب، ان دونوں کی اصل میں حرمت ہے۔ شراب پر ملازمت کرنا حرام ہے، شراب کا بیچنا حرام ہے، شراب کا استعمال کرنا حرام ہے، مزدوری پر شراب کو اٹھا کر لے جانا حرام ہے۔

یورپ کے اکثر ممالک میں، امریکہ میں بھی یہ لازم ہے کہ آپ دکان بنائیں تو اس میں ضرورت کی ساری چیزیں ہونی چاہئیں جن میں سرفہرست خنزیر اور شراب ہے اور ہمارے جتنے پاکستانی دکاندار ہیں، یہ سارے وہاں بیچتے ہیں۔ ناروے میں کچھ لوگوں سے ملاقات ہوئی جو دکاندار تھے اور شراب بیچتے تھے۔ وہ کہنے لگے کہ ہمارے حضرت ہر سال تشریف لاتے ہیں اور ہمارے پاس ان کا فتویٰ ہے۔ ہم کھلی شراب نہیں بیچتے، جیسے شراب خانوں میں ہوتا ہے کہ وہ شراب گلاسوں میں ڈال کر دیتے ہیں۔ اس طرح تو شراب بیچنا حرام ہے لیکن ہم تو پیک شدہ بوتلیں بیچتے ہیں۔ ہمارے حضرت فرماتے ہیں کہ اس میں حرمت کوئی نہیں، بند بوتل آئی، تم نے بند بوتل بیچ دی۔ کیا عجیب بات ہے! انسان جب گمراہ ہوتا ہے تو گمراہی کا احساس بھی مر جاتا ہے اور یہ اللہ کی طرف سے بڑی سخت سزا ہے۔ حرام چیزوں کو حیلے بہانے سے حلال کرنے لگتا ہے اور یہ احساس ہی نہیں رہتا کہ حرام حرام ہے، میرے حیلے سے حلال کیسے ہوگا! کہتے ہیں اس ملک کی مجبوری ہے۔ مجبوری ہے تو اس میں ملک میں رہنا کون سا ضروری ہے۔ جہاں اور غریب لوگ بستے ہیں، جہاں شراب بیچنا مجبوری نہیں ہے، وہاں چلے جائیں۔ تھوڑا کھا لیں، غریبوں کی طرح رہ لیں، کچے گھر میں رہ لیں لیکن حرام تو نہ کھائیں۔ یہ پکے گھر، یہ اچھی گاڑیاں، یہ تو وقتی بات ہے۔ آپ چند روز استعمال کریں گے، پھر تو قبر میں ہی جانا ہے اور ان ممالک میں تو قبر بھی نصیب سے ہی ملتی ہے۔

غیراللہ کے نام پر ذبیحہ:

وَ مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ۔۔۔۔ ایسا جانور جو بقصدِ تقرب غیراللہ کے نام پر نامزد کر دیا گیا ہو۔ اور ایسے جانور جو اللہ کے سوا کسی اور کو راضی کرنے کے لیے ذبح کیے جائیں کہ یہ جانور ذبح کرنے سے فلاں بت خوش ہوگا، اس کی قربانی دے رہا ہوں یا فلاں کے نام کی قربانی دے رہا ہوں، یہ قربانی دینے سے وہ راضی ہوگا۔ جو اللہ کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کیا جائے کہ میری یہ قربانی اس کے لیے ہے، تو فرمایا، نہیں! جانور کی جان اللہ کے نام پہ لی جائے گی اور اللہ ہی کے لیے لی جائے گی۔

ہمارے ہاں تشدد ہے، انتہا پسندی ہے۔ ہمارا مزاج انتہا پسند ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ کچھ حضرات ایصالِ ثواب کے لیے جانور ذبح کرنے پر بھی یہ فتویٰ دے دیتے ہیں کہ یہ لوگ بزرگوں کے نام پر جانور ذبح کرتے ہیں، حالانکہ ایصالِ ثواب کرنے والوں میں سے ایسا کوئی نہیں کرتا، نہ کسی بزرگ کے نام پر کوئی تکبیر پڑھتا ہے۔ دوسری انتہا یہ ہے کہ لوگ مزاروں پر جا کر جانور ذبح کرتے ہیں کہ صاحب قبر خوش ہوگا، تو یہ دونوں انتہائیں غلط ہیں۔ درست طریقہ یہ ہے کہ جانور اللہ کے لیے ذبح ہو، اللہ کے نام پر ذبح ہو اور پھر دعا کی جائے کہ یا اللہ! میں نے نفلاً اسے ذبح کیا ہے۔ آپ اسے قبول فرمائیں اور اس کا ثواب میرے پیر، بزرگ یا والدین کو پہنچا دیں۔

حالت اضطرار:

فَمَنِ اضْطُرَّ۔۔۔۔ حرام میں یہ رعائت دی کہ اگر کوئی شخص کسی ایسی جگہ پھنس گیا ہے کہ جہاں کھانے پینے کو نہیں مل رہا اور اس کی جان کو خطرہ ہے، بھوک سے ہلاک ہونے کا اندیشہ ہے تو جو بے تاب ہو جائے، حالت اضطرار ہو کہ کہیں حلال نہیں ملتا اور بھوک سے مر جانے کا اندیشہ ہے تو وہ جان بچانے کے لیے بقدر ضرورت کھالے۔ محض اتنا جتنا کھانے سے جان بچ جائے لیکن شرط یہ لگا دی غَيْرَ بَاغٍ وَّ لَا عَادٍ نہ تو وہ چکھنے کے لیے یا اسے لذیذ سمجھ کر کھانے کے لیے ہو کہ دل سے پسند کرنے لگے اور نہ اتنا کھایا جائے کہ ضرورت سے زائد ہو یا اسے خوراک ہی بنالے۔ حرام بھی اس حد تک جائز ہے جس سے جان بچ جائے فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ۔۔۔۔ تو ایسے بندے پر گناہ نہیں ہوگا۔ لیکن حرام حرام ہی رہے گا، اسے کھانے کی اجازت ہوگی لیکن حلال نہیں ہوگا۔ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۷۳﴾ کہ اللہ کریم بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

اللہ کے ساتھ کلام سے محرومی بدترین عذاب ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ یَكْتُمُوْنَ مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَ یَشْتَرُوْنَ بِهٖ ثَمَنًا قَلِیْلًاۙ اُولٰٓىٕكَ مَا یَاْكُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِهِمْ اِلَّا النَّارَ وَ لَا یُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ وَ لَا یُزَكِّیْهِمْ ۖۚ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ﴿۱۷۴﴾ اب حیلوں بہانوں سے کوئی حرام کو جائز کرلے، جو احکام اللہ کی کتاب میں ہیں انہیں چھپالے اور چند ٹکوں کی خاطر غلط فتوے لکھ کر لوگوں کو حرام کھلائے، لوگوں کو ساری عمر بدکاری میں مبتلا کردے، جس طرح علماء یہود و نصاریٰ کرتے تھے کہ حصولِ زر کے لیے حقائق کو چھپا لیتے تھے اور اس کے خلاف چیزوں کو حلال کر دیتے تھے اور اب تک کرتے چلے آرہے ہیں یعنی کلیسا جو حکم چاہتا ہے بدل دیتا ہے اور ایک نئے حکم کی اجازت دے دیتا ہے حالانکہ اس کے پاس کتاب ہے اور اس میں وہ چیزیں منع ہیں لیکن اس کو وہ چھپا لیتے ہیں۔ اسی طرح اگر کوئی مسلمان بھی حصولِ دنیا کے لیے یا پیسے کے لیے، یہ جانتے ہوئے بھی کہ حقیقت کیا ہے، کتاب میں موجود ہے لیکن اس کے خلاف لوگوں کی راہنمائی کرتا ہے تو فرمایا: مَا یَاْكُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِهِمْ اِلَّا النَّارَ اس طرح سے جو دولت کماتے ہیں وہ اپنے پیٹ میں سوائے آگ کے اور کچھ نہیں بھر رہے۔ انہیں بظاہر تو وہ دولت لذیذ لگتی ہے لیکن نتیجتاً وہ ساری آگ ہے جو وہ اپنے پیٹ میں بھر رہے ہیں۔ حرام کھانے کا سب سے بڑا عذاب یہ ہوگا۔ محرومی یہ ہوگی، وَ لَا یُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ قیامت کو اللہ ان کی کوئی بات نہیں سنے گا، نہ ان سے کلام فرمائے گا۔ اللہ کے کلام میں جو لذت ہوگی وہ اور کسی نعمت میں نہیں ہوسکتی، اللہ کی زیارت، جمالِ الٰہی اور اللہ کا کلام فرمانا، یہ سب سے بڑی نعمت ہوگی۔ اللہ کے عذاب بڑے شدید ہیں لیکن سب سے بڑا عذاب یہ ہوگا کہ اللہ ان سے کلام نہیں فرمائے گا، نہ ان کی بات سنے گا۔

یہی بات قرآن حکیم میں یوں ارشاد ہوئی: وَمَا دُعٰٓؤُا الْكٰفِرِیْنَ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ (المومن:50) میدان حشر میں، جہنم میں وہ اللہ کو پکاریں گے کہ ہم سے غلطیاں ہوئیں، اے اللہ! ہمیں معاف کردے۔ وَ لَا یُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ اللہ ان سے بات نہیں کرے گا اور فرمایا وَمَا دُعٰٓؤُا الْكٰفِرِیْنَ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ O کافروں کی چیخ پکار اور کافروں کی آہ زاری ضائع جائے گی۔ سنی جائے گی نہ ان سے بات کی جائے گی تو سب سے بڑا ثواب، سب سے بڑی لذت کلامِ الٰہی میں ہے اور سب سے بڑا عذاب کلامِ الٰہی سے محروم ہونا ہے۔

فرمایا، جو اللہ کے کلام کو چھپا کر اس کے خلاف فتویٰ دیتے ہیں، جیسے یہود و نصاریٰ کی عادت بن گئی ہے، جو دولتِ دنیا انہیں ملتی ہے، وہ جو کھاتے ہیں، وہ سوائے آگ کے اور کچھ نہیں اور سب سے بڑی محرومی یہ ہوگی کہ قیامت کے روز اللہ ان سے کلام نہیں فرمائیں گے۔ وَ لَا یُزَكِّیْهِمْ اور ان کو ان کے گناہوں سے پاک نہیں کریں گے، ان کا

تزکیہ نہیں فرمائیں گے۔ یہ اپنی گناہ آلود روح کو لے کر جہنم میں وارد ہوں گے۔

وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿١٧٤﴾ اور ان کے لیے دوزخ کا بہت شدید عذاب ہوگا۔ فرمایا: أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَىٰ وَالْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ ۚ فَمَا أَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ ﴿١٧٥﴾ ایسے عجیب لوگ ہیں کہ ہدایت چھوڑ کر گمراہی خریدتے ہیں اور اللہ کی بخشش کو بیچ کر اس کے بدلے اللہ کا عذاب خریدتے ہیں۔ وہ لوگ جو حق کو چھپا کر ناجائز کو جائز اور حرام کو حلال بتاتے ہیں، یہ ایسے بدنصیب لوگ ہیں کہ ہدایت کے بدلے گمراہی خرید رہے ہیں اور بخشش کے بدلے عذاب خرید رہے ہیں۔ اللہ کریم فرماتے ہیں: فَمَا أَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ ﴿١٧٥﴾ یہ دوزخ پر کتنے دلیر ہوگئے، کتنی جرأت سے دوزخ کی طرف بڑھ رہے ہیں، دوزخ کے لیے کتنی محنت کر رہے ہیں! ایک بڑی عجیب بات ہے کہ نیکی کرنے کے لیے اتنا مجاہدہ نہیں کیا جاتا جتنی محنت گناہ کرنے کے لیے کی جاتی ہے۔ وہ چوری ہو یا ڈاکہ ہو، قتل ہو یا فتویٰ فروشی، جو کوئی بھی برا کام ہے اس کے لیے محنت بھی زیادہ لگتی ہے، اس پر دنیوی سزا، احتساب اور دنیوی لعن طعن کا خطرہ بھی ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود یہ بڑی دیدہ دلیری دکھا رہے ہیں۔

اس دیدہ دلیری کی وجہ کیا ہے؟ فرمایا: ذَٰلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ نَزَّلَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ ۔۔۔۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ اللہ نے کتاب میں تو حق کو واضح کر دیا، کتاب حق کے ساتھ نازل فرما دی لیکن ان لوگوں نے اللہ کی کتاب سے اختلاف شروع کر دیا۔ وَإِنَّ الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِي الْكِتَابِ ۔۔۔۔ انہوں نے کتاب میں ہی اختلاف شروع کر دیا اور اس کے مفاہیم کو بدلنے لگے، اس کے معانی تبدیل کرنے لگے۔

جس طرح کتاب اللہ کے الفاظ، کتاب کی عبارت سوائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی نے نہیں سنی، اسی طرح اس کے معانی اور مفہوم مقرر کرنا اور نسل انسانی کو بتانا منصبِ نبوت ہے۔ ارشاد باری ہے: لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ (النحل: 44) جو کچھ نازل ہوا، اس کا مفہوم کیا ہے، یہ بتانا منصبِ نبوت ہے۔ کئی بار آیات جب نازل ہوئیں تو صحابہؓ کرام کا مجمع تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وحی مبارک دہرائی کہ یہ آیت نازل ہوئی ہے اور پوچھا کہ کیا سمجھتے ہو، اس کا مفہوم کیا ہے؟ کسی نے لب کشائی کی جرأت نہیں کی۔ بلکہ عرض کی کہ جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمائیں گے وہ اس کا مفہوم ہے۔ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا وہ قرآن کا مفہوم متعین ہو گیا۔ صحابہ کرامؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس پر عمل کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تصدیق فرمائی وہ معنی متعین ہو گئے اب کوئی اسے کھینچ تان کر، گرائمر کے زور سے اور صرف ونحو کے زور سے مفہوم کو بدلتا ہے تو وہ گمراہ ہے، کفر کرتا ہے۔

لَفِي شِقَاقٍ بَعِيدٍ ﴿١٧٦﴾ وہ حق سے بڑے دور چلے جاتے ہیں اور یہ بہت بڑی گمراہی ہے کہ آدمی گمراہی

میں ہو اور خود کو حق پر سمجھتا ہو۔ اس سے بڑی گمراہی کا کوئی تصور نہیں کیا جا سکتا۔ ایک آدمی گناہ کرتا ہے اور گناہ کو گناہ سمجھتا ہو، ہو سکتا ہے وہ کبھی توبہ کر لے لیکن ایک آدمی گناہ کو عبادت سمجھ کر کرتا ہے تو وہ ایسا بدنصیب ہے کہ اسے توبہ بھی نصیب نہیں ہوتی۔ وہ اسے نیکی سمجھ رہا ہے تو نیکی پر کب توبہ کرے گا! اللہ کریم ہدایت نصیب فرمائے۔

رزقِ حلال ہدایت کی بنیاد ہے:

ان آیات میں اللہ کریم نے ہدایت پر قائم رہنے کا انحصار اپنی بخشش اور اپنے کرم کے ساتھ رزقِ حلال پہ رکھا ہے۔ آدمی زندگی میں اپنا نصیب ہی کھاتا ہے ورنہ جو جمع کر کے چلا جاتا ہے، وہ اس کے لیے تو نہیں ہوتا۔ وہ تو دوسروں کا مال ہوتا ہے جو اس کے بعد آپس میں بانٹ لیتے ہیں۔ چند لقموں سے پیٹ بھر جاتا ہے، اللہ کریم توفیق دے تو اللہ کا بندہ لقمہ حلال کھائے جو ہدایت کی بنیاد ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر کوئی نیک آدمی بھی ہے اور جنت کا مستحق بھی ہے لیکن اس نے کچھ حرام کھایا اور اس کے وجود کا کچھ حصہ، کچھ گوشت، کچھ خون حرام سے بنا ہے تو فرمایا: فَالنَّارُ أَولیٰ بِہٖ (البیہقی) وہ حصہ آگ ہی میں جلے گا، وہ جل جائے گا تو پھر جنت میں جائے گا۔ حرام کا جو گوشت ہے، وہ دوزخ ہی میں جلے گا، وہ جنت میں نہیں جائے گا۔ سب سے بڑی بدبختی یہ ہے کہ حرام، دنیا میں آدمی کو گمراہی کی طرف لے جاتا ہے، حق سے دور لے جاتا ہے اور ابدی زندگی کو تباہ کر دیتا ہے۔ اللہ کریم نیکی کی توفیق عطا فرمائے اور برائی سے، حرام سے اپنی حفاظت میں رکھے۔ (آمین)

سورۃ البقرہ رکوع 22 آیات 177 تا 182

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ
اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ
عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّآئِلِيْنَ
وَفِى الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا
عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِى الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ؕ اُولٰٓئِكَ
الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ﴿۱۷۷﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ
عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِى الْقَتْلٰى ؕ اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰى
بِالْاُنْثٰى ؕ فَمَنْ عُفِىَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَىْءٌ فَاتِّبَاعٌ ۢ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَآءٌ اِلَيْهِ
بِاِحْسَانٍ ؕ ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ ؕ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ
عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۷۸﴾ وَلَكُمْ فِى الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰٓاُولِى الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ
تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۹﴾ كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرَا ۖۚ
الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۸۰﴾ؕ فَمَنْۢ
بَدَّلَهٗ بَعْدَ مَا سَمِعَهٗ فَاِنَّمَآ اِثْمُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يُبَدِّلُوْنَهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ
عَلِيْمٌ ﴿۱۸۱﴾ؕ فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ جَنَفًا اَوْ اِثْمًا فَاَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَآ اِثْمَ
عَلَيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۸۲﴾ؒ

یہ کوئی نیکی نہیں ہے کہ تم اپنا منہ مشرق کی طرف کرو یا مغرب کی طرف اور لیکن نیکی یہ ہے کہ جو کوئی اللہ پر ایمان لائے اور آخرت کے دن پر اور فرشتوں پر اور کتابوں پر اور پیغمبروں پر اور اس کی محبت میں (اپنا) مال قرابت داروں کو اور یتیموں کو اور فقیروں کو اور مسافروں کو اور سوال کرنے والوں کو اور قیدیوں کو چھڑانے میں دے اور وہ نماز کو قائم کرے اور زکوٰۃ ادا کرے اور (یہ لوگ) جب عہد کریں تو اپنے وعدے کو پورا کریں اور تنگی اور بیماری اور حالت جنگ میں صبر کریں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو سچے ہیں۔ اور یہی لوگ پرہیزگار ہیں ﴿۱۷۷﴾ اے ایمان والو! تم پر قتل (عمد) میں قصاص (برابری) فرض کیا گیا ہے آزاد کے بدلے آزاد اور غلام کے بدلے غلام اور عورت کے بدلے عورت ہاں جس کو اس فریق کی طرف سے کچھ معافی ہووے (یعنی خون بہا پر راضی ہو جائے) تو اس پر اچھی طرح عمل کیا جائے اور اس کو اچھے طریقے سے ادا کیا جائے یہ تمہارے پروردگار کی طرف سے آسانی اور رحمت ہے پھر جو کوئی اس کے بعد زیادتی کرے تو اس کے لیے دردناک عذاب ہے ﴿۱۷۸﴾ اے صاحبِ خرد لوگو! اور تمہارے لیے (قانون) قصاص میں حیات ہے تاکہ تم پرہیزگار بن سکو ﴿۱۷۹﴾ تم پر فرض کیا گیا ہے کہ جب تم میں سے کسی کو موت آ جائے (اور) اگر وہ مال چھوڑ رہا ہو تو اس میں والدین اور قرابت داروں کے لیے بہتر طور پر وصیت کرے۔ جو پرہیزگار ہیں ان کے لیے یہ ضروری ہے ﴿۱۸۰﴾ پھر جو کوئی اسے سننے کے بعد اس میں تبدیلی کر دے تو یقیناً اس کا گناہ اس کو تبدیل کرنے والوں پر ہو گا یقیناً اللہ سننے والے (اور) جاننے والے ہیں ﴿۱۸۱﴾ پھر کسی کو وصیت کرنے والے سے یہ ڈر ہو کہ اس نے غلط کیا یا گناہ کیا ہے تو ان (وارثوں) میں اصلاح کر دے تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہے یقیناً اللہ بخشنے والے مہربان ہیں ﴿۱۸۲﴾

تفسیر ومعارف

نیکی کے لیے ایمان شرط ہے:

تحویل کعبہ کا ذکر گزرا، یہی موضوع اب ایک اور پہلو سے زیرِ سخن ہے۔ فرمایا: لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ ۔۔۔۔بات کسی خاص سمت منہ کرنے کی نہیں ہے کہ مشرق کو کرلیا یا مغرب کو کرلیا۔ نیکی یہ نہیں ہے کہ کوئی کس طرف منہ کرتا ہے بلکہ نیکی یہ ہے وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ نیکی اللہ پر ایمان لانا ہے۔ جب اللہ پر ایمان ہو تو جس سمت بھی اللہ کریم حکم دیں، اسی طرف منہ کرنا نیکی ہوجائے گا اور اگر اللہ پر ایمان ہی نہ ہو تو کسی سمت بھی منہ کرتا رہے، کوئی فرق نہیں پڑے گا۔

اللہ نے مسجد الحرام کو قبلہ مقرر کردیا لیکن اگر کسی میں ایمان نہیں ہے تو وہ مسجد الحرام کو منہ کرتا رہے، کوئی نیکی نہیں ہوگی۔ نیکی کی اصل یہ ہے کہ وہ اللہ کا حکم ہو، اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہو، قرآن میں ہو، سنت میں جس کا حکم دیا جائے، وہ حکم بجالانا نیکی ہے۔ تعمیل حکم کی نیت کے بغیر کام بذاتِ خود نیکی نہیں۔ چونکہ حکم ہمیشہ بھلے کاموں کا دیا جاتا ہے، اس لیے بھلے کاموں کو نیکی کہتے ہیں لیکن اگر کوئی ایمان نہیں لاتا اور بھلا کام بھی کرتا ہے تو اس بھلائی کا اجر اسے دنیوی زندگی میں ہی مل جاتا ہے۔ آخرت کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں چونکہ اس نے اللہ کو نہیں مانا، آخرت کو نہیں مانا۔ نیکی کی بنیاد ہے ایمان باللہ، جس نے اللہ کی عظمت کا اقرار کیا، اس کی توحید کا اقرار کیا، اس کی ذات وصفات کو مانا۔

وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۔۔۔۔ اور پھر آخرت کو مانا۔ آخرت کو وہی مانے گا، آخرت کے حساب کتاب کو وہی مانے گا جس کو اللہ کے ساتھ ایمان نصیب ہوگا۔ اصل نیکی یہ ہے کہ اللہ کو مانے، پھر ضروریاتِ دین جن کا ماننا ضروری ہے ان کو مانے۔ ان میں سے کسی ایک کا انکار توحید باری سے بھی انکار ہوجائے گا چونکہ اللہ کریم نے جن باتوں کو ماننے کا حکم دیا ہے وہ ایمان کی بنیاد بن گئیں۔ جو اللہ کے ساتھ ایمان لائے گا، اسے آخرت پر بھی ایمان لانا ہوگا۔ جو اللہ ہی کو نہیں مانتا وہ آخرت اور حساب کتاب کو کہاں مانے گا!

ایک شخص مانتا نہیں لیکن اچھا کام بھی کرتا ہے، جیسے غیر مسلموں نے ہسپتال بنادیے، کنویں بنادیے، تالاب بنادیے اور کسی غریب کی مدد کی، یہ سارے کام بھلائی کے تو ہیں لیکن نیکی نہیں ہے، اس لیے کہ نیکی کی شرط یہ ہے کہ وہ اللہ کا حکم ہو اور اللہ کا حکم سمجھ کر بجالائے۔ ایسے بھلائی کے کام جو کسی غیر مسلم سے صادر ہوتے ہیں، اس کا اجر اسے دنیا

میں لوٹا دیا جاتا ہے۔ ہر کام کے پیچھے کوئی نیت ہوتی ہے۔ اب جو اللہ کو نہیں مانتا وہ کوئی بھلائی کا کام بھی کرتا ہے تو اس کے پیچھے بھی اس کی کوئی نیت ہوتی ہے، مجھے مالی منافع ہو یا شہرت مقصود ہوتی ہے یا کسی بیماری سے تحفظ مقصود ہوتا ہے، کوئی نہ کوئی غرض ہوتی ہے جس کے لیے وہ بھلائی کا کام کرتا ہے۔ اللہ کریم اس کی نیت پوری کر دیتے ہیں، اس کی اس بھلائی کو ضائع نہیں فرماتے لیکن چونکہ اس کا اللہ کے ساتھ، آخرت کے ساتھ ایمان ہی نہیں ہے تو اس کی بھلائی آخرت کے لیے نہیں ہوتی اور نہ آخرت میں اس کے کام آئے گی۔

جیسے آپ کسی دکان پر سکہ دیتے ہیں تو اس کے بدلے جو چیز مانگتے ہیں وہ ملتی ہے۔ اب دکان میں بے شمار چیزیں بھری ہیں لیکن ہر چیز تو اٹھا کر نہیں دے دی جاتی۔ اسی طرح ہر بھلائی کے پیچھے نیت ہوتی ہے۔ جو آخرت کو مانتا ہی نہیں اس کی نیت کسی نہ کسی دنیوی فائدے کے لیے ہوگی۔ لہٰذا بھلائی کافر کی بھی ضائع نہیں جاتی۔ اس کا دنیوی مقصد پورا کرنے میں اللہ کریم اس کی مدد فرماتے ہیں لیکن ایمان ہو اور وہی کام اللہ کی اطاعت میں، اللہ کے حکم سے اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے کیا جائے تو وہ نیکی بن جاتا ہے جس کا فائدہ دنیا میں بھی ہوتا ہے اور آخرت میں بھی اس کا اجر ہوتا ہے۔

فرمایا، بات صرف رخ کرنے کی نہیں ہے جس پر کافر معترض ہیں کہ مسلمان پہلے بیت المقدس کو رخ کرتے تھے اب بیت اللہ کو رخ کرتے ہیں۔ اصل بات اللہ کی اطاعت کی ہے۔ اللہ کا حکم تھا تو ادھر رخ کرتے تھے، اللہ نے بیت الحرام کی طرف رخ کرنے کا حکم دے دیا، ادھر رخ کرتے ہیں۔ بات تو اللہ کی اطاعت کی ہے اور پھر آخرت پر پورا یقین ہو، وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ فرشتوں کے وجود کو مانے، اللہ کی کتاب پر یقین ہو، اللہ کے انبیاء کو برحق مانے۔ جب یہ ساری باتیں تسلیم کرے گا تو پھر اس کا مقصد حصولِ رضائے الٰہی بن جائے گا۔ اسے یہ احساس ہوگا کہ اللہ نے مخلوق کی راہنمائی کے لیے اتنے نبی بھیجے، پھر امام الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا، کتاب برحق نازل فرمائی، اب آخرت میں اس کے روبرو حساب بھی دینا ہے۔ اللہ کے فرشتے مقرر ہیں جو نیکی بدی کا حساب لکھ رہے ہیں تو اسے آخرت سے، اللہ سے، قربِ الٰہی سے محبت ہو جائے گی، مالِ دنیا سے نہیں رہے گی۔

اہلِ تقویٰ کے اوصاف:

وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ۔۔۔

پھر وہ اللہ کی محبت میں اپنا مال جو قریبی ضرورت مند ہیں انہیں دے گا، ان کی مدد کرے گا، یتیموں کی مدد کرے گا، مساکین کی مدد کرے گا، مسافروں کے کام آئے گا اور جو محتاج سوال کرنے والے ہیں، انہیں دے گا۔

وَفِي الرِّقَابِ ۔۔۔ اور قیدیوں کو آزاد کرنے میں یا ان کے کام آنے میں اپنا مال خرچ کرے گا۔

عَلٰی حُبِّهٖ ۔۔۔اللہ کی محبت میں کرے گا۔ جسے ایمان کامل نصیب ہوگا، اسے سب سے زیادہ محبت اللہ سے ہوگی اور مال کی محبت ثانوی حیثیت میں چلی جائے گی۔ وہ اپنا مال مختلف جگہوں پر ایسے کاموں میں خرچ کرے گا جس سے اللہ کی رضا نصیب ہو، اللہ کا قرب نصیب ہو۔ وَ اَقَامَ الصَّلٰوةَ وَ اٰتَى الزَّكٰوةَ ۔۔۔اور مال کو پاک رکھنے کے لیے اللہ نے اس میں جو اپنا حصہ مقرر فرمایا ہے، وہ ادا کرتے ہیں۔ وَ الْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۔۔۔ اور ایسے لوگ جب عہد کرتے ہیں تو اسے وفا کرتے ہیں چونکہ ان کا اللہ پر، آخرت پر ایمان ہے، انہیں یقین ہے کہ اللہ کے روبرو پیش ہونا ہے لہٰذا جو عہد کرتے ہیں اسے وفا کرتے ہیں۔

وَ الصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَ الضَّرَّآءِ ۔۔۔۔اور تنگ دستی آجائے، بیماری آجائے تو وہ اس میں ثابت قدم رہتے ہیں۔ یہ نہیں کہ تنگ دستی آگئی تو اللہ کریم کو چھوڑ کر غیر اللہ کے دروازے پر بھاگنے لگے یا بیماری آگئی تو اللہ کو بھول کر مشرکانہ کام کرنے لگے وَ حِيْنَ الْبَاْسِ ۔۔۔۔اور اللہ کی راہ میں اگر لڑنا پڑے تو ثابت قدم رہتے ہیں۔ کوئی مشکل بھی آئے تو انہیں اعتماد ہوتا ہے کہ ہمارا اللہ ہمارے ساتھ ہے، وہ ہماری حفاظت فرمانے والا بھی ہے۔ جو نفع نقصان یا تنگی ترشی ہے، وہ اس کی طرف سے ہے اور جب وہ چاہے گا فراخی دے دے گا، کوئی اسے روکنے والا نہیں لہٰذا وہ بیماری میں، تکلیف میں، تنگ دستی میں یا پھر اللہ کی راہ میں لڑنا پڑے تو ثابت قدم رہتے ہیں۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ۔۔۔ وہ لوگ جو ایسی صفات سے موصوف ہیں، سچے اور کھرے لوگ ہیں۔ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ﴿۱۷۷﴾ اور وہ لوگ ہیں جنہیں متقی کہا گیا ہے یعنی جن میں یہ اوصاف ہوں، انہیں اللہ کریم سے ایک طرح کی خاص محبت پیدا ہو جاتی ہے جو انہیں اطاعت الٰہی پہ مجبور کرتی ہے۔ جب بھی کوئی کام کرنے لگتے ہیں تو یہ دیکھتے ہیں کہ اس میں اللہ کی نافرمانی نہ ہو، کہیں اللہ کریم خفا نہ ہو جائیں۔ جب اللہ سے یہ محبت ہو جاتی ہے تو اسے تقویٰ کہتے ہیں۔ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ﴿۱۷۷﴾ ایسے لوگ ہیں جنہیں متقی کہا جا سکتا ہے۔

فرضیت قصاص:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى ؕ اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى ؕ فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ ۢ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ ؕ ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ ؕ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ﴿۱۷۸﴾ کسی بھی معاشرے کی صحت کا مدار انصاف پر ہوتا ہے۔ اللہ کریم نے فرمایا کہ اے ایمان والو! تم پر قصاص فرض کر دیا گیا یعنی انصاف کرو، جو زیادتی کرے وہ زیادتی کا بدلے دے اور بغیر کسی رو رعایت کے دے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایک خاتون کا مسئلہ پیش ہوا جس نے چوری کا ارتکاب کیا تھا۔ قبیلہ کے سرداروں نے، جن کی وہ بچی تھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت عالی میں حضرت اسامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ذریعہ درخواست پیش کی کہ جتنا بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کا جرمانہ فرمائیں یا جو بھی معاوضہ فرمائیں یا مدعی کی جتنی بھی منت سماجت کرنی پڑے، ہم سب کچھ کرتے ہیں لیکن اس کا ہاتھ نہ کاٹا جائے۔ ہم بہت اعلیٰ خاندان کے لوگ ہیں اور اگر اس کا ہاتھ کاٹا گیا تو وہ ہمیشہ ہمارے خاندان پر دھبہ رہے گا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو قومیں پہلے غرق ہوئیں ان میں یہ عیب بھی تھا کہ جب کوئی بڑے خاندان کا، مضبوط یا دولت مند آدمی جرم کرتا تو اس سے رعایت کرتے اور جب کوئی غریب جرم کرتا تو اس پر سزا جاری کرتے۔ لہٰذا مجھے قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے، اگر میری بیٹی فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اس جرم کا ارتکاب کرتیں تو میں ان پر بھی حد جاری کرتا اور ان کو بھی سزا دیتا۔ کسی بڑے خاندان کے ہونے سے یا کسی چھوٹے خاندان کے ہونے سے انصاف میں فرق نہیں پڑتا۔ عدل وہی ہوتا ہے جس کے سامنے بڑا چھوٹا، امیر غریب سب برابر ہوں اور ہر ایک کے ساتھ حق کا برتاؤ کیا جائے۔ جس معاشرے سے انصاف اٹھ جائے، اس معاشرے کی دیگر اقدار بھی تباہ ہو جاتی ہیں، آج دنیا میں ہر طرف دہشتگردی ہے، قتل و غارت گری ہے، لوٹ مار ہے۔ اس کی بنیادی وجہ، بہت بڑا سبب ناانصافی ہے۔ جب کسی کو انصاف نہیں ملتا تو ایک کمزور بندہ بھی دہشتگرد بن جاتا ہے۔ اگر کسی کو انصاف نہں ملتا تو ایک کمزور آدمی بھی اپنا بدلہ لینے کے لیے قتل و غارت پہ اتر آتا ہے۔ جب انصاف نہیں ملتا تو لوگوں میں ایک ردعمل پیدا ہوتا ہے جو دہشتگردی کو پیدا کرتا ہے اور اگر بلاتفریق انصاف ملے تو یہ چیزیں ختم ہو جاتی ہیں۔

قصاص ضروری ہے لیکن اتنا ہی، ایسا ہی قصاص لیا جائے جیسا کسی نے جرم کیا ہے۔ اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَ الْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَ الْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى ۔۔۔۔ اگر کسی آزاد نے کسی آزاد کو قتل کیا ہے تو اس کے بدلے وہی آزاد قتل ہوگا۔ غلام نے غلام کو قتل کیا ہے یا عورت نے عورت کو تو جو بھی قاتل ہے وہ بدلے میں قتل ہوگا۔ فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ ہاں، اگر مدعی اپنے بھائی کو کچھ معافی دینا چاہے تو وہ قتل کے بدلے قصاص کی رقم لینے پہ راضی ہو جائے۔

فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ وَ اَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ ۔۔۔۔ تو پھر اس کی بات معروف طریقے سے، نہایت احترام سے مانی جائے اور جس چیز کا وعدہ کیا گیا ہے وہ اچھے طریقے سے بدلے میں ادا کر دی جائے۔ ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ رَحْمَةٌ ۔۔۔۔ یہ اللہ نے تمہیں تخفیف دی ہے اور اللہ نے تم پر رحمت فرمائی ہے۔ ہوسکتا ہے کوئی جذباتی انداز میں وقتی طور پر حواس مختل ہو جانے کی وجہ سے ایسا جرم کر گزرے۔ اگر مدعی اسے معاف کرنا چاہے اور

اس سے قصاص کے بدلے کوئی رقم لینا چاہے یا کسی بات پہ راضی ہوجائے یا فی سبیل اللہ معاف کر دے تو اسے معاف کیا جاسکتا ہے اور یہ اللہ کی طرف سے تخفیف اور اس کی رحمت ہے۔

فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۷۸﴾ اگر اس رعایت کے بعد بھی کوئی زیادتی پہ مصر ہے، وہ ظلم بھی کرتا ہے اور پھر حق بھی ادا نہیں کرتا، انصاف کے تقاضے پورے نہیں کرتا تو ایسے لوگوں کے لیے اللہ کا دردناک عذاب ہوگا۔

قصاص، بقائے معاشرہ کی ضمانت ہے:

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۹﴾ اور لوگو یاد رکھو! قصاص میں یا بدلے میں یا انصاف میں معاشرے کی حیات ہے۔ جس معاشرے سے انصاف اٹھ جاتا ہے، وہ معاشرہ مرجاتا ہے، اس میں انسانی قدریں مرجاتی ہیں، وہ معاشرہ جانوروں کا معاشرہ بن جاتا ہے۔ دونوں باتیں لازم وملزوم ہیں۔ اللہ کے ساتھ ایمان نہ ہو تو بھی معاشرہ انسانی معاشرہ نہیں بنتا۔ اگر اس میں انصاف کیا بھی جائے تو انصاف کی وہ اقدار نہیں ہوتیں جو اللہ نے مقرر کی ہیں۔ وہ انصاف انسانوں کا بنایا ہوا ہوتا ہے اور ہوسکتا ہے کہ انصاف کے نام پر ظلم ہو۔ جو انصاف اللہ کریم نے مقرر فرمایا ہے اگر وہ نہیں ہوگا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ پر ایمان کمزور ہے یا اللہ پر ایمان نہیں ہے اور جہاں یہ چیزیں نہیں ہوں گی وہ معاشرہ انسانی معاشرہ نہیں رہتا۔ وہ معاشرہ مرجاتا ہے یعنی اس میں انسانی اقدار مرجاتی ہیں اور لوگ جانوروں کی طرح زندہ رہتے ہیں کہ پیٹ بھر لیا، جنسی تسکین ہوگئی، زندہ رہے اور مر گئے۔

آج کی دنیا ایک گلوبل ویلج بن چکی ہے، جیسے ایک گاؤں میں ہر بات کی فوراً خبر ہوجاتی ہے۔ اب روئے زمین پر جہاں بھی جو واقعہ ہو اس کی فوراً خبر ہوجاتی ہے۔ آپ دیکھ لیجیے کہ وہ معاشرے، وہ ممالک جو خود کو مسلمان کہلاتے ہیں لیکن وہاں انصاف نہیں ہے یا ان معاشروں کی حالت دیکھ لیجیے جو کافر بھی ہیں اور انصاف بھی نہیں ہے۔ کیا انہیں انسانی معاشرے کہا جاسکتا ہے! قرآن کریم نے یہ اصول فرمادیا کہ قصاص میں زندگی ہے۔ بحیثیت انسان اگر زندہ رہنا ہے تو یہ صرف انصاف قائم رکھتے ہوئے ممکن ہے۔ موت صرف یہ نہیں ہے کہ سانسیں ختم ہوگئیں اور بندہ دنیا سے چلا گیا۔ اگر انسان کے اندر اس کی روح مر گئی، اس کی انسانیت مرگئی تو بھی بحیثیت انسان مرگیا ہے۔ ایک جانور کی طرح زندہ ہے جو کھاتا پیتا، پیٹ بھرتا اور دندناتا پھرتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ روح مرجاتی ہے، انسانیت مرجاتی ہے، انسانی اوصاف مر

جاتے ہیں، انسانی خصوصیات مر جاتی ہیں، انسانی عظمتیں مر جاتی ہیں اور محض افراد اپنی مردہ روحوں کو اٹھائے ہوئے چل پھر رہے ہوتے ہیں وَأَجْسَامُهُمْ قَبْلَ الْقُبُوْرُ قُبُوْرُهُمْ ان کے بدن قبر میں جانے سے پہلے روح کی قبر بن جاتے ہیں۔

دہشتگردی کا علاج بروقت انصاف ہے:

اس دور میں دہشتگردی پر بہت کام ہو رہا ہے لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ دہشتگردی کے جواب میں یہ سرکاری طور پر دہشتگردی ہے جو بظاہر حکومت کے قانون میں جرم نہیں کہلاتی۔ اللہ کریم کے نزدیک تو یہ جرم ہے کسی ایک شخص نے جرم کیا تو اس کی جگہ دس اور پکڑ لیے، ان کو مارا پیٹا، کس کو سزا دی اور جان چھوٹ گئی، محض خانہ پری ہوتی ہے۔ جرم کسی نے کیا، وہ بھاگ گیا اور پورا گاؤں تباہ کر دیا گیا جس میں بے شمار معصوم بچے، غریب عورتیں، غریب لوگ، جرم نہ کرنے والے لوگ مارے گئے۔ دنیا میں انصاف اس طرح ہو رہا ہے، دہشتگردی کے خلاف جنگ اس طرح ہو رہی ہے کہ جرم کسی ایک بندے کا ہے اور آپ نے ایک ملک تباہ کر دیا تو کیا اس پورے ملک نے دہشتگردی کی تھی! جسے آپ انصاف کہہ رہے ہیں یہ بھی دہشتگردی ہے جو آپ اپنی طاقت کے مطابق کر رہے ہیں۔ انصاف تو یہ ہے کہ جس نے جرم کیا ہے وہ اس جرم کی سزا پائے لیکن اس کے ساتھ بے گناہوں اور معصوموں کو تہہ تیغ کر دینا انصاف نہیں ہے، یہ سرکاری پیمانے پہ ایک بڑی دہشتگردی ہے۔ ظلم کے مقابلے میں اگر ظلم کیا جائے تو ظلم ہی بڑھے گا۔ ظلم کے مقابلے میں عدل کیا جائے تو ظلم ختم ہو جائے گا لیکن ظلم کے مقابلے میں ظلم کیا جائے!

نئے دستور ہیں نئے زمانے کے لیے
آگ ہی لائی گئی آگ بجھانے کے لیے

آگ لگی ہے اور آپ اس پر مزید آگ پھینک رہے ہیں تو اس سے آگ بجھے گی نہیں، بڑھے گی۔ ظلم چھوٹے پیمانے پر ہوا ہے، اس کی جگہ آپ بڑے پیمانے پر ظلم کرتے ہیں اور اس بات کی توقع رکھتے ہیں کہ اس سے معاشرہ سدھر جائے گا! یہ ممکن نہیں بلکہ آپ بھی ظلم کریں گے تو ظلم بڑھے گا۔ اگر انصاف کرنے والے بھی ظلم کریں گے تو ظلم ہی بڑھے گا، وہ ظلم ہی کو بڑھوتری دے رہے ہیں۔ ظلم کو مٹانے کے لیے عدل و انصاف کی ضرورت ہے۔ تحقیق کی جائے، جس نے جرم کیا ہے اسے قرار واقعی سزا دی جائے اور اسے لوگوں کے سامنے سزا دی جائے تاکہ دوسروں کے لیے باعث عبرت ہو۔ رعایت نہ کی جائے، کوئی بڑا ہے یا چھوٹا، اسے سزا دی جائے

اور اسی میں معاشرے کی زندگی ہے۔

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰاُولِي الْاَلْبَابِ ۔۔۔۔اے صاحب دانش لوگو! قصاص میں اور انصاف میں معاشرے کی زندگی ہے۔ اگر انصاف اٹھ جائے گا تو لوگ جیتے تو رہیں گے لیکن انسانوں کی طرح نہیں، جانوروں کی طرح، انسان محض ایک کھانے پینے، بات کرنے اور چلنے پھرنے والا جانور ہوگا۔ انصاف ایسی صفت ہے جو اللہ سے رشتہ استوار کرتی ہے۔ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۹﴾ انصاف کرو کہ تمہیں اللہ کریم سے قرب، اس سے تعلق اور اس کی محبت نصیب ہو اور معاشرہ انسانی اوصاف کے ساتھ زندہ رہے۔

وراثت کے متعلق ابتدائی حکم:

شروع میں جب آیاتِ وراثت نازل نہیں ہوئی تھیں تو یہ آیہء کریمہ نازل ہوئی۔ قرآن کریم کے احکام میں ناسخ ومنسوخ احکام موجود ہیں اور جو احکام منسوخ کیے گئے وہ بھی دو طرح کے ہیں ایک تو وہ ہیں کہ حکم منسوخ کر دیا گیا لیکن تلاوتِ آیت باقی ہے اور کچھ احکام ایسے ہیں کہ آیات کی تلاوت منسوخ کر دی گئی لیکن حکم باقی رکھا گیا تو یہ آیہء کریمہ ان آیات میں سے ہے جن کا حکم منسوخ ہو گیا لیکن آیت باقی ہے۔ حکم یہ تھا كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرَ اِ نِ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَ الْاَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ ۔۔۔۔ کہ تم پر فرض کیا گیا ہے کہ جب کسی کی موت کا وقت آئے تو اگر اس کے پاس وراثت ہو یا مال ہو تو والدین کے لیے، رشتہ داروں کے لیے معروف طریقے سے، جائز طریقے سے وصیت کرے۔ کچھ حصہ والدین کو دے، اولاد کو دے، بھائیوں کو، رشتہ داروں کو، جس جس درجے میں رشتہ داری ہے، اتنا اتنا حصہ انہیں تقسیم کر کے اس کی وصیت کر دے۔ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۸۰﴾ اللہ کے بندوں کے لیے یہ ضروری ہے۔

فَمَنْۢ بَدَّلَهٗ بَعْدَ مَا سَمِعَهٗ ۔۔۔۔ پھر جو کوئی اسے سننے سمجھنے کے بعد اس میں تبدیلی کرتا ہے اس کی وفات کے بعد کوئی اسے تبدیل کرتا ہے۔ فَاِنَّمَآ اِثْمُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يُبَدِّلُوْنَهٗ ۔۔۔۔ تو اس گناہ کے ذمہ دار وہ لوگ ہوں گے جو اس میں تبدیلی کریں گے۔ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۸۱﴾ اللہ سننے والا بھی ہے اور جاننے والا بھی ہے۔ جو کچھ مرنے والے نے کہا، اللہ اسے سنتا بھی ہے، جانتا بھی ہے اور جو کچھ بعد والے کر رہے ہیں وہ بھی اس

کے علم میں ہے۔ وہ جانتا ہے، وہ دیکھ رہا ہے، سن رہا ہے۔ فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ جَنَفًا اَوْ اِثْمًا۔۔۔۔ ہاں، اگر وصیت کرنے والے کے متعلق کسی کو یہ ڈر ہو کہ اس نے جو وصیت کی ہے اس میں غلطی ہے یا اس میں طرف داری سے کام لیا ہے، تو یہ گناہ ہوگا، جرم کا ارتکاب ہوگا۔ فَاَصْلَحَ بَيْنَهُمْ۔۔۔۔ تو وہ ان وارثوں میں رضامندی سے اس کی اصلاح کر دے تو یہ تبدیلی جائز ہے۔ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ۔۔۔۔ اس پر کوئی گناہ نہیں ہوگا۔ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۸۲﴾ اللہ بخشنے والا ہے، رحم کرنے والا ہے۔

یہ آیت اس وقت تک کے لیے تھی جب تک وراثت کا حکم نہیں آیا تھا۔ جب وراثت کا حکم نازل ہو گیا اور حصے مقرر کر دیے گئے کہ اگر کوئی مرتا ہے تو اس کے والدین کا حصہ کتنا ہوگا، اولاد کا حصہ کتنا ہوگا، دوسرے رشتہ داروں کا، بہن بھائیوں کا کتنا ہوگا، جب اللہ نے خود حصے مقرر کر دیے تو پھر اس آیت کا حکم ختم ہو گیا، منسوخ ہو گیا لیکن آیت باقی رکھی گئی۔ آیات کی تلاوت کی اپنی برکت ہے۔ کلام الٰہی ہے اور ہر ہر لفظ کی اپنی کیفیات ہیں اور اس میں اپنی طرح کی رحمتیں اور بخششیں ہیں اگرچہ وراثت کا حکم الگ موجود ہے کہ کون سے رشتہ دار کو مرنے والے کی جائیداد سے یا مال سے کتنا حصہ ملے گا۔

سورۃ البقرہ رکوع 23 آیات 183 تا 188

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ
قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝۱۸۳ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ؕ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ
عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ؕ وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ
مِسْكِيْنٍ ؕ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ ؕ وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ
كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝۱۸۴ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ
وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ؕ
وَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ؕ يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ
الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ۫ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا
هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝۱۸۵ وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ ؕ
اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ لَعَلَّهُمْ
يَرْشُدُوْنَ ۝۱۸۶ اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ ؕ هُنَّ لِبَاسٌ
لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ؕ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ
فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ ۚ فَالْئٰنَ بَاشِرُوْهُنَّ وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ
لَكُمْ ۠ وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ
الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ۠ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ ۚ وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ

وَاَنۡتُمۡ عٰكِفُوۡنَ ۙ فِى الۡمَسٰجِدِ ؕ تِلۡكَ حُدُوۡدُ اللّٰهِ فَلَا تَقۡرَبُوۡهَا ؕ كَذٰلِكَ
يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمۡ يَتَّقُوۡنَ ۝١٨٧ وَلَا تَاۡكُلُوۡٓا اَمۡوَالَـكُمۡ بَيۡنَكُمۡ
بِالۡبَاطِلِ وَتُدۡلُوۡا بِهَآ اِلَى الۡحُـکَّامِ لِتَاۡکُلُوۡا فَرِيۡقًا مِّنۡ اَمۡوَالِ النَّاسِ
بِالۡاِثۡمِ وَاَنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ۝١٨٨

اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کیے گئے جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیے گئے تھے تاکہ تم پرہیزگار بن سکو ﴿۱۸۳﴾ (یہ) گنتی کے دن ہیں پھر (اگر) تم میں کوئی بیمار ہو یا سفر پر ہو تو دوسرے دنوں میں گنتی پوری کر لے اور جو لوگ اس کی طاقت رکھتے ہوں وہ فدیہ دے دیں جو ایک فقیر کا کھانا ہے پھر جو کوئی خوشی سے نیکی کرے تو وہ اس کے لیے بہتر ہے۔ اور اگر تم روزہ رکھو تو تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم جانتے ہو تو ﴿۱۸۴﴾ رمضان وہ مہینہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا جو لوگوں کی راہنمائی کرتا ہے اور (اس میں) ہدایت کی روشن دلیلیں ہیں اور فیصلہ کرنے والا (ہے)۔ سو جو تم میں سے اس مہینے کو پائے تو اسے چاہیے کہ اس کے روزے رکھے اور جو بیمار ہو یا مسافر ہو تو وہ دوسرے دنوں میں گنتی پوری کر لے۔ اللہ تمہارے لیے آسانی چاہتے ہیں اور تمہارے لیے دشواری نہیں چاہتے اور اس لیے کہ تم گنتی پوری کر لو اور اس لیے کہ تم اللہ کی بڑائی بیان کرو کہ اس نے تمہیں ہدایت دی اور تاکہ تم شکر ادا کر سکو ﴿۱۸۵﴾ اور جب آپ سے میرے بندے میرے بارے پوچھیں سو یقیناً میں قریب ہوں (اور) جب کوئی مجھے پکارتا ہے تو مانگنے والے کی دعا قبول کرتا ہوں پس چاہیے کہ یہ بھی میرا حکم قبول کریں اور میری ذات پر ایمان لائیں تاکہ وہ ہدایت پائیں ﴿۱۸۶﴾ روزوں کی راتوں میں تمہارے لیے تمہاری بیبیوں کے پاس جانا حلال کر دیا گیا ہے وہ تمہارا لباس ہیں اور تم ان کا لباس ہو اللہ جانتے ہیں کہ تم اس سے پہلے اپنے لیے خیانت کر جاتے تھے پس اس نے تمہاری توبہ قبول کی اور تمہیں معاف کر دیا پس اب ان سے مباشرت کر سکتے ہو اور جو اللہ نے تمہارے

حصے میں لکھا ہے وہ طلب کرو اور کھاؤ اور پیئو یہاں تک کہ فجر کی سفید لکیر رات کی سیاہ لکیر سے تمہارے لیے واضح ہو جائے پھر روزے کو رات تک پورا کرو اور جب تم مسجدوں میں اعتکاف کر رہے ہو تو ان (عورتوں) سے مباشرت نہ کرو۔ یہ اللہ کی حدود ہیں پس ان کے قریب مت پھٹکو۔ اسی طرح اللہ لوگوں کے لیے اپنے دلائل واضح کرتے ہیں تاکہ وہ پرہیزگار بن سکیں ﴿۱۸۷﴾ اور دوسرے کا مال آپس میں ناجائز طریقے سے مت کھاؤ اور تم اسے حکام کے پاس لے جاتے ہو تاکہ گناہ کرتے ہوئے دوسرے کے مال کا کچھ حصہ کھا سکو اور (یہ) تم جانتے بھی ہو ﴿۱۸۸﴾

تفسیر ومعارف

فرضیت صیام:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۸۳﴾ اے ایمان والو! تم پر رمضان فرض کیا گیا جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیا گیا تھا، یعنی روزہ ایک ایسی عبادت ہے جو تمام امتوں پر فرض کی گئی۔ اب یہ الگ بات ہے کہ احکام مختلف تھے۔ کس امت میں کتنے روزے ہیں، یا کن دنوں کے روزے ہیں یا کیسا روزہ ہے۔ چالیس دن کے بھی روزے تھے۔ حضرت موسیٰ علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام نے کوہ طور پر چالیس دن روزہ رکھا۔ تیس دن کے بھی تھے، بیس کے بھی ہوں گے، دس کے بھی ہوں گے۔

پہلی امتوں میں افطار کے بعد جب تک لوگ جاگتے رہتے، کھاتے پیتے رہتے اور جب کوئی سو جاتا تو اس کا روزہ شروع ہو جاتا اور پھر افطار تک اسے روزہ رکھنا ہوتا۔ شروع میں یہ طریقہ کار اسلام میں بھی آیا تھا۔ ایک دفعہ ایک صحابیؓ کام سے آئے۔ سارا دن مزدوری کی، تھکے ہارے تھے، روزہ افطار کیا تو ان کی اہلیہ کھانا بنانے میں لگ گئیں لیکن وہ لیٹے اور سو گئے۔ سو جائے تو اگلا روزہ شروع ہو جاتا تھا چنانچہ دوسرے دن وہ بھوک پیاس سے نڈھال ہو گئے، بے ہوش ہو گئے۔ اللہ کریم نے مسلمانوں کے لیے آسانی فرمادی کہ دوسرا حکم نازل فرمادیا جس میں سحری اور افطاری کی سہولت آ گئی۔

روزے کا حاصل:

روزہ کیا ہے؟ روزہ اطاعتِ الٰہی کا اور اللہ کے موجود ہونے پر یقین کا ایک نمونہ ہے۔ جس طرح عام زندگی میں اللہ پاک نے حکم دیا ہے کہ ناجائز طریقے سے کما کر نہ کھاؤ، چوری کا نہ کھاؤ، زبردستی کا نہ کھاؤ، حرام چیز نہ کھاؤ، حلال چیز کھاؤ۔ اس رب نے اس ایک مہینے میں ایک خاص وقت تک کے لیے حلال کھانے پینے سے بھی روک دیا۔ مقصد یہ ہے کہ ہر سال ایک مہینہ یہ کورس ہو جائے کہ وہ چیز کھانی ہے، جس کی اجازت اللہ دے اور جس کی اللہ اجازت نہ دے وہ نہیں کھانی۔ حرام نہیں کھانا، دوسرے کا مال نہیں کھانا، کسی کو لوٹنا نہیں، رشوت نہیں لینی ہے، چوری نہیں کرنی۔ یعنی اللہ کے ساتھ ہمارا ایسا تعلق ہے کہ جب وہ حلال سے روک دیتا ہے تو ہم حلال بھی نہیں کھاتے، تو جن چیزوں سے اس نے عمر بھر کے لیے روک دیا ہے، حرام کر دی ہیں، ان کے کھانے کا کیا مقصد! اس طرح جن کاموں کے کرنے سے منع فرما دیا ہے، انہیں کرنے کی کیا ضرورت ہے!

قربِ الٰہی کا احساس:

رمضان المبارک کی اپنی خاص برکت بھی ہوتی ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ ایک عام آدمی جو پارسا نہیں ہے، خطا کار ہے لیکن جب روزہ رکھ لیتا ہے تو اسے اللہ کے قریب ہونے کا یقین ہو جاتا ہے۔

یہ میرا چشم دید واقعہ ہے کہ گرمیوں کا رمضان شریف تھا۔ ایک چرواہا اپنی بھیڑیں لے کر تالاب پر آیا تو بھیڑیں پانی پر ٹوٹ پڑیں۔ چرواہے نے چادر کا سائبان سا بنا کر سر پر رکھا ہوا تھا۔ میں نے سڑک سے گزرتے ہوئے دیکھا کہ وہ آدمی اپنی نماز کی تیاری میں لگ گیا لیکن اس نے پانی کا گھونٹ تو جنگل میں بھی نہیں پیا۔ کیوں نہیں پیا؟ اس احساس سے کہ میرا اللہ میرے ساتھ ہے، وہ دیکھ رہا ہے، کوئی اور تو وہاں دیکھنے والا نہیں تھا۔ ہم گھروں میں ہوتے ہیں، سخت گرمی ہوتی ہے، اندر لیٹے ہوتے ہیں اور کوئی بندہ دیکھنے والا نہیں ہوتا۔ ٹھنڈا پانی فریج میں پڑا ہوتا ہے، گھڑے میں پڑا ہوتا ہے لیکن کوئی بندہ ایک قطرہ پانی نہیں پیتا، پیاس برداشت کرتا ہے، کیوں؟ رمضان شریف کی برکت سے اسے یہ احساس ہوتا ہے کہ میرا اللہ دیکھ رہا ہے، میرے پاس میرا اللہ ہے اور میرا اللہ میری ہر حرکت کو دیکھ رہا ہے۔ تو روزے کا مقصد یہ ہے کہ باقی زندگی میں بھی، باقی کے گیارہ مہینے بھی، ہم اپنے اللہ کو اپنے ساتھ محسوس کریں۔

شیطان کی مسلسل پیروی سے انسان شیطان بن جاتا ہے:

رمضان شریف کی برکات میں یہ بھی ہے کہ تمام چھوٹے بڑے شیاطین قید کر دیے جاتے ہیں لیکن یاد رکھیں!

ابلیس قید ہوتا ہے، ابلیس کی اولاد قید ہوتی ہے لیکن جو انسان شیطان بن جاتے ہیں، وہ قید نہیں ہوتے۔ اس لیے آپ نے دیکھا کہ رمضان المبارک میں جرائم میں، قتل و غارت گری میں، ظلم میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہم سارا سال تو ہر جرم ابلیس کے ذمے لگاتے رہتے ہیں کہ مجھے شیطان نے بہکا دیا لیکن رمضان المبارک کا چاند طلوع ہونے کے ساتھ شیطان تو قید ہو گیا اور شوال کا چاند آنے تک ایک مہینہ وہ قید ہے لیکن یہ قتل و غارت گری جو رمضان المبارک میں ہو رہی ہے، اس کے پیچھے کون ہے؟

ابھی رمضان میں یہ خبر نظر سے گزری کہ ایک بچہ قتل کیا گیا۔ پھر اس کے ٹکڑے بنائے گے، سر الگ، بازو الگ، دھڑ الگ، ٹانگیں الگ تاکہ دور پھینکے جائیں۔ کتنا ظلم ہے! کس قدر سفاک ہے انسان کہ دوسرے انسان کو مارنے کے بعد بھی اس طرح سے ظلم ڈھائے جا رہا ہے۔ شیطان تو قید تھا لیکن اس ظلم کا مشورہ کس نے دیا! انسان خود شیطان کی پیروی کرتے کرتے شیطان بن جاتا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا مفہوم ہے انسانوں میں سے جو شیطان بن جاتے ہیں، یہ اس شیطان سے زیادہ خطرناک ہیں جو جنوں میں سے ہے۔ اس لیے کہ شیطان صرف دل میں خیال ڈال سکتا ہے، آپ تعوذ پڑھیں، اللہ اللہ کریں، ذکر کریں، اللہ کو یاد کریں تو وہ خیال دل سے رفع ہو سکتا ہے لیکن جو انسان شیطان بن جاتے ہیں وہ آپ کے سامنے برائی کرتے ہیں، خود برائی کی مثال بن جاتے ہیں اور ہاتھ سے پکڑ کر لے جاتے ہیں کہ ایسا کرو۔ جیسا کہ دوسری جگہ ارشادِ باری ہے: شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ۔۔۔۔(الانعام: 112) انسان بھی شیطان بن جاتے ہیں، جن بھی شیطان بن جاتے ہیں اور آج کا انسان تو الا ماشاءاللہ جنہیں اللہ نے اپنی یاد کی توفیق دی ہے اور جو اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرتے ہیں، وہ بہت تھوڑے رہ گئے ہیں لیکن اکثریت نسل انسانی نے شیطان کا روپ دھار لیا ہے۔ نہ کسی کی عزت محفوظ ہے، نہ کسی کی آبرو محفوظ ہے، نہ کسی کی جان محفوظ ہے، نہ مال محفوظ ہے اور دنیا میں بڑی بڑی طاقتور حکومتیں ہیں، فوجیں ہیں، عدالتیں بھی لگی ہوئی ہیں، انتظامیہ ہے لیکن ہر حکومت میں ظلم بڑھتا جا رہا ہے، انصاف کسی کو نہیں ملتا۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ انسانوں نے شیطان کا روپ دھار لیا ہے، انسان شیطان بن گئے ہیں۔ اللہ کریم نے رمضان المبارک میں اس کا علاج تجویز فرمایا کہ انسان شیطان نہ بنے، اس مہینے میں شیاطین قید کر دیے جاتے ہیں، عبادات کا اجر کئی گنا بڑھا دیا جاتا ہے اور رحمت الٰہی کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں کہ ہے کوئی مانگنے والا جسے بخشا جائے۔ تو اس ماہِ مبارک کا ایک روزہ یا ایک قیام زندگی بھر کے گناہوں کو معاف کرا دیتا ہے۔

گناہوں کی معافی کی پہچان:

لیکن یہ یاد رکھیے! گناہ معاف ہو جائیں تو ہمارے پاس کیا دلیل ہے کہ میرے گناہ معاف ہو گئے؟ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی کو گہرا زخم لگا ہو اور پھر وہ بھر جائے۔ زخم بھر بھی جائے تو وہ جگہ زیادہ حساس ہو جاتی ہے۔ آپ وہاں انگلی رکھیں تو درد محسوس ہوتا ہے۔ گناہ معاف ہو جائیں تو پھر گناہ کرنے سے ڈر لگتا ہے۔ گناہ کے معاف ہونے کی دلیل یہ ہے کہ بندے کو گناہ کرنے سے ڈر لگتا ہے۔ رمضان المبارک اتنا مبارک مہینہ ہے کہ کوئی کتنا گنہگار بھی ہو، خلوص نیت سے توبہ کرے، ایک روزہ رکھے تو سارے گناہ معاف کرانے کے لیے کافی ہے۔ ایک رات کا قیام زندگی بھر کے گناہ معاف کرانے کے لیے کافی ہے لیکن ہم کیسے عجیب لوگ ہیں کہ تیس، تیس روزے رکھ کر، مہینہ بھر راتوں کو قیام کر کے رمضان گزرنے کے بعد بھی ویسے کے ویسے ہوتے ہیں، کوئی فرق نہیں پڑتا۔ چور چوری سے باز نہیں آتا جھوٹا جھوٹ بولنے سے باز نہیں آتا، لڑنے والا لڑائی سے باز نہیں آتا تو یہ بہت بڑی بدنصیبی ہے۔ رمضان کے بعد اپنا جائزہ لینا چاہیے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مَنْ صَامَ رَمَضَانَ اِيْمَانًا وَّ اِحْتِسَابًا غُفِرَ لَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ (البخاری والمسلم) جس نے رمضان کا روزہ اس ایمان ویقین کے ساتھ رکھا کہ اللہ میرے پاس موجود ہے تو ایک روزہ کتنی عجیب قوت پیدا کر دیتا ہے! تنہائی میں بھی، رات کی تاریکی میں بھی، اندھیرے کمرے میں بھی بندے کو احساس ہوتا ہے کہ میرا اللہ میرے پاس موجود ہے۔ وہ پانی کا گھونٹ نہیں پیتا کہ اللہ کی اجازت نہیں ہے۔ پھر وہ بندہ چوری کیسے کرتا ہے، برائی کیسے کرتا ہے، قتل کیسے کرتا ہے! وہ بھول جاتا ہے کہ میرے پاس میرا اللہ موجود ہے یا اللہ دیکھ رہا ہے۔ تو یہ محض ایک مشقت نہیں ڈالی گئی، روزی بچائی نہیں گئی کہ دن بھر لوگ بھوکے رہیں۔ دیکھا یہ گیا ہے کہ رمضان شریف میں ہر گھر کا خرچ بڑھ جاتا ہے۔ عام دنوں میں لوگ اتنا خرچ نہیں کرتے جتنا سحری وافطار پہ کرتے ہیں۔ اور اس سب کے نتیجے میں حضورِ حق نصیب ہوتا ہے کہ میرا اللہ میرے ساتھ ہے، میرے پاس موجود ہے اور ایک لمحے کا حضورِ حق زندگی بھر کے گناہ معاف کرا جاتا ہے۔ جن کے گناہ معاف ہوتے ہیں، انہیں ایک احساس عطا ہو جاتا ہے کہ پھر گناہ کرنے سے ڈر لگتا ہے اور اللہ کی اطاعت میں آجاتے ہیں اور یہی اس کا مقصد ہے۔

لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۸۳﴾ تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ۔ تم نیک بن جاؤ، تمہیں اللہ کے قرب کا احساس ہو جائے۔ روزہ رکھنے کا مقصد بھی یہ ہے۔ روزہ محض کھانے پینے سے رک جانا نہیں بلکہ خود کو اللہ کی نافرمانی سے روک لینے کا نام ہے۔ اس طرح زبان کا روزہ ہے کہ جھوٹ نہ بولے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر تم روزے سے ہو اور

کوئی تمہیں گالی دیتا ہے تو جواب میں گالی نہ دو، اسے کہو میں روزے سے ہوں۔ تم نے تو گالی دے لی لیکن میرا روزہ ہے، میں زبان کو آلودہ نہیں کرنا چاہتا۔ بری بات نہ کہو، برا سوچو نہیں، برائی کا ارتکاب نہ کرو اور کم از کم اس ایک مہینے کی جو تربیت ہے اسے گیارہ مہینے چلاؤ تو پھر رمضان المبارک نصیب ہو جائے گا۔ یہ مہینہ صرف روزوں کا نہیں، حقیقتاً تبدیلی کا مہینہ ہے۔ ایک بھٹی ہے جس میں جیسے سونے کو ڈالا جاتا ہے تو اس سے سارا کھوٹ نکل جاتا ہے اور وہ صاف ستھرا ہو جاتا ہے، اسی طرح بندہ مومن کے لیے یہ مہینہ ایک بھٹی کی طرح ہے جس میں سے وہ کندن بن کر نکلتا ہے۔ اللہ کریم اس پہ استقامت دے اور آئندہ نیکی کی توفیق پر قائم رکھے تو وہ بندہ اپنے روزے کے مقصد کو پا جاتا ہے۔

فرمایا: اَیَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ۔۔۔ گنتی کے دن ہیں۔ اللہ کریم کا یہ بھی احسان ہے کہ اس نے معدود یعنی گنتی کے دن رکھے ہیں۔ وہ چاہتا تو سارے سال کے روزے رکھ دیتا، ساری عمر کے رکھ دیتا لیکن اس نے ایک خاص مبارک مہینے کو چن لیا۔ یہ ایسا مبارک مہینہ ہے جو سال کے سارے مہینوں کا سردار ہے۔ روزہ رکھنے کے لیے گنتی کے دن ہیں لیکن روزے کے جو فوائد اور اللہ کی رحمتیں اور بخششیں ہیں وہ بے حد و بے حساب ہیں۔ ان کی کوئی انتہا نہیں ہے اور اللہ کریم ہی جانتا ہے کہ روزے کا اجر کیا ہوگا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ روزے کے اجر کا شمار انسانی بس سے باہر ہے۔

روزہ کے احکامات:

گنتی کے دنوں میں یہ رعایت بھی بخشی۔ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ۔۔۔ اگر رمضان شریف میں کسی کو سفر درپیش ہے یا ایسی بیماری ہے جس کے لیے دوا کھانا ضروری ہے یا روزہ رکھنے سے بیماری کے بڑھ جانے کا اندیشہ ہے یا کوئی ایسی بیماری ہے جس میں بار بار غذا لینا پڑتی ہے یا ایسے انجکشن لگانا پڑتے ہیں جن میں غذائیت ہوتی ہے، تو وہ قضا کر لے اور جب صحت ہو تو جتنے روزے رہ گئے ہیں، ان کو قضا کر لے۔ کوئی سفر میں ہے اثنائے سفر سحری کا بندوبست نہیں ہو سکتا یا سفر ایسا ہے کہ اس میں روزہ رکھنا مشکل ہے تو اس کے لیے رعایت ہے کہ وہ رمضان شریف کے بعد جب سفر ختم ہو، اس وقت قضا کر لے۔

وَ عَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ ۔۔۔ یہ آیہ کریمہ بھی ان آیات مبارکہ میں سے ہے جن کا حکم منسوخ ہو گیا اور آیت باقی ہے کہ اگر کسی میں طاقت ہو تو وہ ایک روزے کے بدلے ایک مسکین کو کھانا دے دے۔ یہ حکم اس طرح سے منسوخ ہوا کہ جو آدمی سفر میں بھی نہیں، صحت مند ہے بیمار بھی نہیں اس کے لیے یہ گنجائش ختم کر دی گئی لیکن ایسے لوگ جو عمر کے اس حصے میں ہیں کہ واپس صحت مند ہونے کی امید نہیں ہے یا بیماری ایسی ہے جس سے واپس آنے کی اُمید نہیں رکھتا، کسی کو شوگر ہے کسی کو کینسر ہو گیا ہے، دن بدن کمزور ہو رہا ہے، وہ عمر کے اس

حصے میں پہنچ گیا ہے جس میں اب اس کا واپس صحت مند ہونا آسان نظر نہیں آتا تو اس کے لیے یہ حکم آج بھی موجود ہے۔ وہ ایک روزے کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلا دے۔ یہ بھی اس کی کرم نوازی اور رعایت ہے کہ اسے بھی رمضان شریف کا اتنا ہی اجر نصیب ہوگا، ویسی ہی کیفیات نصیب ہوں گی، وہی رحمتیں، وہی عنایات ہوں گی جیسا روزہ رکھنے والے کے لیے ہیں۔

مختلف لوگوں کے کھانے کا معیار مختلف ہوتا ہے، ایک آدمی عام روکھی سوکھی کھاتا ہے، دوسرا اس سے زیادہ اچھا کھاتا ہے، تیسرا امیر ہے وہ بہت اچھا کھاتا ہے، تو ہر آدمی کا کھانے کا اپنا معیار ہے۔ مسکین کے کھانے میں بھی یہ رعایت موجود ہے کہ جس طرح کا کھانا وہ خود کھاتا ہے، اس معیار کا کھانا کسی مسکین کو کھلا دے یا اس کھانے کی اندازاً قیمت ایک روزے کے بدلے کسی مسکین کو دے دے۔

فَمَنۡ تَطَوَّعَ خَيۡرًا فَهُوَ خَيۡرٌ لَّهٗ۔۔۔ لیکن اگر کوئی اس سے زیادہ دینا چاہے، اللہ کی راہ میں اس سے زیادہ خرچ کرنا چاہے، روزے کا کفارہ تو یہ ہے کہ جس معیار کا کھانا وہ خود کھاتا ہے اسی معیار کا کھانا کسی مسکین کو کھلا دے یا اس کی قیمت ادا کر دے لیکن اگر وہ اپنی طرف سے زیادہ دینا چاہتا ہے تو بھلائی میں بھی جو زیادتی کرتا ہے، اسے زیادہ اجر ملتا ہے۔ جو شخص خوشی سے زیادہ خیرات کرنا چاہے یا زیادہ دینا چاہے فَهُوَ خَيۡرٌ لَّهٗ۔۔۔ تو وہ اس کے لیے بہت بہتر ہے، اسے اس کا اجر ملے گا۔ حق بات یہ ہے کہ جو کیفیات روزے سے پیدا ہوتی ہیں اور حضورِ حق روزے سے نصیب ہوتا ہے وہ خصوصیت روزے کی ہے، اس لیے فرمایا: وَاَنۡ تَصُوۡمُوۡا خَيۡرٌ لَّكُمۡ۔۔۔ تم روزہ رکھ سکو تو یہ بہت بڑی بات ہے، تمہارے لیے بہت بہتر ہے۔ اِنۡ كُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ۝ اگر تم علم رکھتے ہو، اگر جانتے ہو، بات کو سمجھتے ہو تو روزہ رکھنا ہی بہتر ہے۔

ایک تو یہ ہے کہ رمضان المبارک میں جو روزہ قضا ہو جاتا ہے، اس کی قضا ہمیشہ غیر رمضان میں ہی ادا کی جاتی ہے۔ چونکہ رمضان جب بھی آئے گا تو اس کے اپنے روزے فرض ہوں گے۔ رمضان میں تو قضا ہو نہیں سکتی۔ آدمی روزہ تو رکھے گا لیکن اس ماہِ مبارک کی برکات اور کیفیات اس میں نہیں ہوتیں۔ رمضان المبارک میں رحمتِ الٰہی کی فراوانی ہوتی ہے، بخشش جوش پہ ہوتی ہے۔ رمضان کی اپنی کیفیات، انوارات وتجلیات ہیں لیکن جو حضورِ حق روزہ رکھنے سے نصیب ہوتا ہے وہ روزے ہی کی خصوصیت ہے۔ آدمی یوں تو ساری عمر غلطیاں بھی کرتا ہے، کوتاہیاں بھی کرتا ہے اور بہت ہی خوش نصیب ہے وہ شخص جسے حضورِ حق کا احساس نصیب ہو جائے اور یہ احساس زندہ رہے لیکن روزہ ایک ایسی نعمت ہے کہ اس میں عام آدمی کو بھی حضورِ حق کا احساس نصیب ہوتا ہے اور یہ روزے کی عجیب دین

ہے۔ اگر کوئی خوش نصیب ہوتو اس کے لیے کافی ہے کہ رمضان المبارک کے روزوں میں اسے حضورِحق کا جو ادراک ہوتا ہے، اسے وہ باقی گیارہ مہینے بھی زندہ رکھے تاکہ پھر رمضان شریف آئے تو وہ اس میں تازہ دم ہوجائے اور اس احساس کی تجدید ہوجائے۔

وَ اَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ ۔۔۔۔ اگر تم بیماری میں بھی روزہ رکھ سکو، اگر سمجھو کہ ممکن ہے تو ضرور رکھو۔ سفر میں بھی اگر سمجھتے ہو کہ میں روزہ رکھ سکتا ہے اور اس سے تکلیف نہیں ہوگی تو ضرور رکھو چونکہ جو برکت رمضان کے روزہ رکھنے کی ہے، کفارہ دینے یا قضا کرنے سے شاید وہ مقام، وہ عظمت یا وہ کیفیات نصیب نہ ہوں۔ بیشک اللہ کے حکم کی اطاعت ہوجائے گی، فرض ادا ہوجائے گا لیکن فرض کا ادا ہوجانا ایک اور بات ہے اور کیفیات کا نصیب ہونا ایک اور بات ہے۔ اگر مسافر یا بیمار کے لیے ممکن ہو، روزہ رکھ سکے تو ضرور رکھے، یہ بہتر ہے۔ نہ رکھ سکے تو اللہ کی طرف سے رعایت ہے کہ وہ بعد میں قضا کرلے یا کوئی ایسا شخص ہے کہ جو قضا بھی نہیں کر سکتا تو اللہ کریم کی بخشش ہے، رعایتیں ہیں کہ وہ کفارہ ادا کرے۔

ایک صحابیؓ سے روزہ ٹوٹ گیا تو وہ بارگاہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضر ہوا۔ خوش نصیب تھے وہ لوگ! ذرا سی بات ہوتی تو بارگاہ رسالت پناہی صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضر ہوجاتے۔ یہ ایک احساس تھا۔ جو چیز اصل دین ہے، وہ احساسِ حضوری ہے کہ میرا رب، میرا خالق، میرا مالک، میرا پروردگار، میرا معبود ہر لحہ میرے پاس ہے۔ اس نے بارگاہِ رسالت پناہی صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضر ہوکر عرض کی، یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں نے روزہ توڑ دیا، اب میں کیا کرسکتا ہوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر جان بوجھ کر توڑا ہے تو اس کے بدلے ساٹھ رکھنے ہوں گے۔ اس نے عرض کی، یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میں ایسا کمزور آدمی جو رمضان کا روزہ توڑ بیٹھا ہوں، غیر رمضان میں کیسے رکھوں گا۔ مجھ میں اتنی ہمت کہاں! اگر رمضان کا روزہ ٹوٹ گیا تو یہ میری کمزوری ہے، اس کے بدلے میں ساٹھ کیسے رکھوں گا! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ساٹھ مساکین کو کھانا کھلا دو۔ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! اپنے بچوں کے لیے تو ہے کچھ نہیں، کبھی مزدوری لگ گئی تو کھانا نصیب ہوگیا اور کسی دن مزدوری نہ ملی تو رات فاقے میں گزر گئی، میں ساٹھ مساکین کو کیسے کھلا سکتا ہوں! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اچھا بیٹھ جاؤ، یہیں بیٹھو۔ تھوڑی دیر ہوئی تو کوئی شخص حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کھجوروں کا ٹوکرا لے آیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول فرمایا اور جس شخص سے روزہ ٹوٹا تھا، اس کو فرمایا: یہ کھجوریں لے جاؤ اور مساکین میں بانٹ دو، تمہارا کفارہ ادا ہوجائے گا۔ وہ جب کھجوروں کا ٹوکرا اٹھا چکا تو پھر عرض کرنے لگا، یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! مجھے تو شہر بھر میں اپنے گھر

والوں اور اپنے بیوی بچوں سے بڑا کوئی مسکین نظر نہیں آتا۔ اس شہر میں تو سب سے بڑے مسکین میرے اہلِ خانہ، میں ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اچھا گھر لے جاؤ، بچوں کو کھلا دو تو تمہارا کفارہ ہو جائے گا۔

تو یہ اللہ کریم کی عنایت ہے، بخشش ہے کہ اس نے رعایت فرمادی کہ بیمار ہو تو روزہ نہ رکھو، قضا کرلو، سفر میں ہو نہ رکھو، قضا کرلو یا کوئی ایسا بیمار جس کے صحت مند ہونے کی امید نہیں یا ایسا بوڑھا جسے پیر فرتوت کہتے ہیں، جس کے واپس آنے کی امید نہیں، تو وہ ایک مسکین کو فدیہ دے دے یا کھانا کھلا دے یا اس کے بدلے رقم دے دے، لیکن جو مزا روزہ رکھنے میں ہے، جو کیفیات روزہ رکھ کر نصیب ہوتی ہیں، جو حضورِ حق روزہ رکھنے سے نصیب ہوتا ہے وہ ان سے نصیب نہیں ہوسکتا۔ فرض کی ادائیگی ہوگئی، اطاعت ہوگئی۔ الحمد للہ اللہ کریم نے معاف فرمادیا لیکن اصل مقصد تو حضورِ حق کی اس کیفیت کا حصول ہے جو روزہ دار کو نصیب ہوتی ہے، جس کا دھیان وہ سارا دن رکھتا ہے، ساری رات رکھتا ہے، رات کو چین سے سو نہیں پاتا کہ مجھے سحری کرنی ہے، کہیں دیر نہ ہو جائے۔ سارا دن ایسے گزارتا ہے جیسے اللہ کریم اس کے ساتھ ہے۔ انتہائی پیاس میں بھی، گرمیوں کے روزوں میں بھی لوگ مزدوری کرتے بھی دیکھے اور اس کے باوجود استقامت کے ساتھ روزے رکھتے تھے اور نہیں توڑتے تھے۔ کیوں رکھتے تھے! ایک حضورِ حق نصیب ہوتا تھا، ایک کیفیت ہوتی تھی کہ میرا اللہ میرے ساتھ ہے، اب میں کیسے اس کی نافرمانی کرسکتا ہوں!

قرآن اور ماہ رمضان کی فضیلت:

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیٓ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ ۔۔۔ رمضان المبارک تو وہ مبارک مہینہ ہے جس میں اللہ کا کلام نازل ہوا۔ اللہ نے بندوں کو مخاطب فرمایا، بندوں سے کلام فرمایا یاد رہے کلام متکلم کی حالت یا کیفیت کے اثرات رکھتا ہے۔ اس لیے فرمایا گیا کہ اگر کوئی آدمی جسے بدکاروں یا گناہگاروں کی صحبت میں جا کر یہ اندیشہ ہو کہ ان کی باتیں اس پہ غالب آجائیں گی، وہ بھی ان جیسا ہو جائے گا، اگر یہ خطرہ ہو تو وہ تبلیغ کے لیے بھی نہ جائے، اس سے احتراز کرے، ان سے دور رہے۔ ہاں! کوئی ایسا شخص جسے یہ خطرہ نہ ہو کہ ان کی باتیں مجھ پہ غالب آجائیں گی بلکہ جسے یہ امید ہو کہ میری بات ان پر اثر کرے گی تو اس پر تبلیغ فرض ہے۔ وہ ضرور جائے، تبلیغ کرے، دین کی بات کرے، ہر طرح کے لوگوں سے ملے، ان سے بات کرے اور انہیں سمجھانے کی کوشش کرے۔ جب دو آدمی بھی آپس میں بات کرتے ہیں تو مزاجاً یا طبعاً جو کمزور ہوتا ہے، وہ دوسرے کی بات کا اثر لے لیتا ہے۔ آپ کسی ایک آدمی کو جواریوں کے ساتھ چھوڑ دیں، کچھ عرصہ رہے تو وہ بھی جواری بن جائے گا۔ ان کی باتیں، ان کی حرکات اس پر اثر کر جائیں گی۔ اسی طرح کسی کو نیکوں کی مجلس میں چھوڑ دیں تو رفتہ رفتہ وہ نیکی کی طرف مائل ہوتا چلا جائے گا۔ یہ حال تو ایک عام آدمی کی

بات کا ہے اور جب اللہ کریم جل شانہٗ کلام فرمائیں تو اس کی عظمت کی کیا بات ہے! جس نے وہ کلام سنا ہے اس نے تو ضرور مغلوب ہونا ہے اور اسی رنگ میں رنگے جانا ہے۔ اسی لیے کفار کے بارے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ یہ گونگے، بہرے ہیں، یہ سنتے سمجھتے ہی نہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم سے ان کے بارے میں ارشاد فرمایا: یَنۡظُرُوۡنَ اِلَیۡكَ وَ هُمۡ لَا یُبۡصِرُوۡنَ (الاعراف:198) آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی طرف نگاہیں تو گھماتے ہیں لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کو دیکھ نہیں پاتے۔ انہیں اپنے شہر مکہ کا، اپنے قبیلے قریش کا عزیز، محمد بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وسلّم) تو نظر آتا ہے لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلّم ان کی نگاہ میں نہیں آتا، اسی لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی مخالفت کرتے ہیں۔ یہ ایسے بدنصیب ہیں اور ان کی نگاہ ایسی کمزور پڑ گئی ہے کہ یَنۡظُرُوۡنَ اِلَیۡكَ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی طرف نگاہیں تو پھیرتے ہیں وَهُمۡ لَا یُبۡصِرُوۡنَ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کو دیکھ نہیں پاتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی شان، آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی حیثیت، آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی حقیقت، آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی عظمت سے آشنا نہیں ہوتے۔ اسی طرح جب حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کلامِ حق ارشاد فرما رہے ہوتے تھے، صحابہؓ تلاوت کرتے تھے تو یہ آواز تو سنتے تھے اور منصوبے بھی بناتے تھے کہ جب کوئی قرآن پڑھ رہا ہو تو تم شور کرو تا کہ اس کی آواز دوسرے نہ سنیں اور کسی پر اثر نہ ہو۔ یہ سارے منصوبے تو بناتے تھے لیکن اللہ کریم فرماتے ہیں کہ خود گونگے بہرے تھے، سن ہی نہیں سکتے اور جو سن لیتا ہے وہ اس رنگ میں رنگا جاتا ہے۔

یہ اللہ کریم کے کلام کی عظمت ہے اور کتنی بڑی بات ہے کہ اللہ رب العالمین نے اس مشتِ غبار کو، انسان کو خطاب فرمایا: شَهۡرُ رَمَضَانَ الَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ فِیۡهِ الۡقُرۡاٰنُ۔۔۔ یہ ایسا مبارک مہینہ ہے جس میں اللہ کریم نے قرآن نازل فرمایا اور قرآن ایسی حقیقت ہے جس کی نظیر کہیں مل نہیں سکتی۔ هُدًى لِّلنَّاسِ۔۔۔ قرآن کی خصوصیت یہ ہے کہ اولادِ آدم جہاں بھی ہے، جتنی بھی ہے اور جس حال میں بھی ہے، ان سب کے لیے ہدایت ہے۔ انسان مدنی الطبع ہے، مل جل کر رہنے والا ہے، ایک دوسرے پہ اس کا انحصار ہے، ایک دوسرے کا محتاج ہے۔ اس کے مل جل کر رہنے سے مختلف قبیلے، اقوام، پھر ممالک، حکومتیں، ریاستیں، علاقے وجود میں آئے۔ مختلف آب و ہوا، مختلف رنگ، مختلف قد کاٹھ اور مختلف زبانیں ہیں۔ علاقے مختلف، موسم مختلف، کھانے مختلف، مزاج مختلف، سوچنے کی استعداد مختلف، علمی استعداد مختلف، وجود کی طاقت مختلف، غرض بے شمار اختلافات ہیں، لیکن اس کے باوجود انسان ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ہر انسان دوسرے سے الگ ہے۔ کوئی دو بندے دنیا میں ایسے نہیں جن کی ہر چیز ملتی جلتی ہو، جن کی سوچ کا معیار ایک ہو، جن کے علم کا معیار ایک ہو، جن کے بولنے کا انداز ایک ہو، جن کا قد کاٹھ ایک ہو، جن کی شکل ایک ہو۔ ہر بندہ دوسرے سے الگ ہے لیکن انسان کا ایک دوسرے کے بغیر گزارا ممکن نہیں، اسے مل جل کر رہنا ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم سے پہلے جتنے نبیؑ مبعوث ہوئے اور جتنی کتابیں نازل ہوئیں وہ مختلف علاقوں، شہروں یا قوموں کے لیے تھیں اور مختلف زمانوں کے لیے تھیں۔ انسانیت ترقی پذیر تھی، بچپن سے جوانی کی طرف رواں تھی، اس کے حالات بدل رہے تھے۔ ایک بچہ جو گھٹنوں کے بل چلتا ہے اس کی ضرورت اور ہے اور جو ابھی چلتا نہیں اس کی ضرورت اور ہے۔ جو چلنا پھرنا شروع کر دیتا ہے اس کی ضرورتیں اور ہیں اور جو جوان ہو جاتا ہے اس کی ضرورتیں اور ہوتی ہیں۔ اسی طرح انسانیت بھی پروان چڑھ رہی تھی لیکن اللہ نے اسے نورِ نبوت سے محروم نہ رکھا۔ ہر آبادی میں، ہر علاقے میں، ہر قوم، ہر آبادی میں، ہر علاقے میں، ہر قوم میں مسلسل انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام تشریف لاتے رہے اور ہر نبیؑ دین اسلام کی تبلیغ کرتا رہا۔ ہر نبیؑ نے توحیدِ باری کی تبلیغ کی، اپنی رسالت کی تبلیغ کی اور اس وقت کے لیے جو احکامِ الٰہی موزوں تھے، وہ پہنچائے۔

قرآن کی عالمگیریت:

پھر ایسا زمانہ آیا کہ انسانیت اپنے کمال کو پہنچ گئی۔ نوعِ انسانی اپنی بلوغت کو پہنچ گئی۔ اب اس میں بالغ ہونے کے بعد مزید کسی تبدیلی کی گنجائش نہیں تھی تو اللہ کریم نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کو آخری نبیؑ بنا کر مبعوث فرمایا، ساری انسانیت کے لیے، بیک وقت اور یہ پہلی بار ہوا۔ روئے زمین پر بسنے والی ساری قوموں کے لیے، سارے لوگوں کے لیے، سارے افراد کے لیے، ایک ہی نبیؑ، ایک ہی رسول اور ایک ہی کتاب!

قرآن حکیم کا کمال یہ ہے کہ وہ کسی ایک زمانے کے لیے نہیں ہے۔ جب تک دنیا آباد ہے اور سورج طلوع وغروب ہو رہا ہے، قرآن حکیم ہی کتابِ ہدایت ہے۔ اس نے زندگی کے ایسے مکمل اصول وقوانین دیے ہیں جو دنیا کے ہر فرد کے لیے بہترین اور قابلِ عمل ہیں۔ کسی قوم کے لیے پڑھے لکھے اور بڑے چنے ہوئے دانشور کوئی قانون وضابطہ بناتے ہیں لیکن وہ قانون وضابطہ بھی حرفِ آخر نہیں ہوتا۔ جب اس کا نفاذ ہوتا ہے تو اس میں پھر تبدیلیوں کی ضرورت پیش آتی ہے اور تبدیلیاں کی جاتی ہیں۔ اللہ کریم نے جو قانون بنایا، وہ ساری کائنات کے لیے بنایا۔ ان علاقوں کے لیے بھی بنایا جہاں چھ مہینے دن اور چھ مہینے رات ہوتی ہے، ان علاقوں کے لیے بھی بنایا جہاں ہمیشہ سردی ہوتی ہے، ان علاقوں کے لیے بھی بنایا جہاں ہمیشہ گرمی ہوتی ہے۔ مشرق مغرب، شمال جنوب میں بسنے والے تمام لوگوں کے لیے بنایا۔ ان کی زبانیں مختلف ہیں، ان کے مزاج مختلف ہیں، عملی استعداد مختلف ہے، غذائیں مختلف ہیں، دن رات مختلف ہیں، ایک جگہ دن ہے تو دوسری جگہ رات ہے، موسم مختلف ہیں۔ اس کے باوجود یہ ایسا جامع اور معتدل قانون ہے، آسان ترین طرزِ حیات ہے، پاکیزہ ترین طرزِ حیات ہے، مبارک ترین طرزِ حیات ہے کہ

اس کے مطابق زندگی گزارنے والا نہ صرف اس دنیا میں خوش حال رہتا ہے، خوش رہتا ہے، اللہ کی رحمتوں کا مرکز رہتا ہے بلکہ دوسری دنیا میں بھی، آنے والی ہیشگی کی زندگی میں بھی کامیاب رہتا ہے۔ قرآن، کوئی معمولی کتاب نہیں ہے، کوئی عام بات نہیں ہے۔ یہ اللہ کریم کا ذاتی کلام ہے اور اللہ کی ساری مخلوق کے لیے ہے۔ اس کلام کے نزول کے لیے اللہ نے اس مبارک مہینہ کو چنا۔ رمضان المبارک وہ برکت والا مہینہ ہے **انزل فیه القرآن** جس میں قرآن نازل کیا گیا۔

اسلام ہی الھدیٰ ہے:

هُدًى لِّلنَّاسِ ۔۔۔۔ جو تمام انسانیت کے لیے ہدایت کا سبب ہے۔ کسی بھی کام کے کرنے کا جو صحیح ترین طریقہ ہوتا ہے، عربی میں اسے ھدیٰ کہتے ہیں۔ کسی کام کرنے کا جو صحیح ترین طریقہ ہوتا ہے وہ آسان بھی ہوتا ہے اور مختصر بھی ہوتا ہے۔ آپ دو نقطے بنائیے، ان کو ملانے کے لیے آپ لمبی لمبی لکیریں تو کھینچ سکتے ہیں، ٹیڑھی میڑھی لکیریں بھی کھینچ سکتے ہیں لیکن صحیح ترین وہ لائن ہوگی جس میں کوئی ٹیڑھا پن نہیں ہوگا، جو بالکل سیدھی ہوگی۔ آپ دیکھیں گے کہ سب سے مختصر وہ لائن ہوگی جو سیدھی ہوگی۔ باقی جو بھی ہوگی وہ غلط ہوگی، لمبی ہوگی، اس میں ٹیڑھا پن بھی ہوگا، اس میں موڑ بھی آئیں گے۔ اسی طرح ہدایت اس سلیقے، اس طریقے کو کہتے ہیں جو کسی بھی کام کرنے کا صحیح ترین طریقہ ہو۔ وہ آسان بھی ہوگا، اس پر محنت بھی تھوڑی آئے گی، وقت بھی تھوڑا خرچ ہوگا اور اس کام کے کرنے کا بہترین طریقہ بھی یہی ہوگا۔ فارسی شاعر نے کہا تھا۔

ہر چہ دانا کند کند ناداں
لیک بعد از خرابی بسیار

زندگی گزارنے کے لیے جو کچھ عقل مند کرتا ہے، کرتا بے وقوف بھی وہی ہے۔ تن ڈھانپنے کے لیے، پیٹ بھرنے کے لیے، گھر بنانے کے لیے جس طرح ایک عقل مند کوشش کرتا ہے، بے وقوف بھی اسی طرح کرتا ہے۔ بات یہ ہے کہ عقل مند سیدھا کر لیتا ہے اور بے وقوف ہزار خرابیوں میں پھنسنے کے بعد وہاں پہنچتا ہے۔ کام تو اسے بھی وہی کرنا ہے۔

اسلام کوئی پہلی صدی، پہلی دس صدیوں کا گزشتہ چودہ سو سال کے لیے نہیں بلکہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اور ساری انسانیت کی راہنمائی کے لیے ہے۔ اللہ کی کتاب اپنے اندر دائمی راہنمائی کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اب اگر انسان انسانیت ہی چھوڑ دے، انسان وحشت پہ اتر آئے جانوروں کی زندگی اپنا لے، ایک دوسرے کو کاٹ کھانے کو

دوڑے، ایک دوسرے کو لوٹنے کو دوڑے، ایک دوسرے کی امانت اور جان و مال کا دشمن بن جائے اور اس کے جواز کے لیے یہ سوچا جائے کہ قرآن کو کیسے بدلا جائے کہ یہ سب کچھ کرنے کے لیے کھلی چھٹی مل جائے، تو یہی کام پہلی قوموں نے بھی کیا تھا بلکہ اب تک کر رہی ہیں۔ عیسائی کر رہے ہیں، یہودی کر رہے ہیں۔ کلیسا ایک نیا قانون پاس کر دیتا ہے کہ اب سسر اور بہو آپس میں شادی کر سکتے ہیں۔ کلیسا نے قانون پاس کر دیا کہ اب ہم جنس ایک دوسرے سے شادی کر سکتے ہیں۔ اسلام کلیسا کا قانون نہیں ہے، اسلام اللہ کا قانون ہے اور اس میں جو کچھ ہے وہ اٹل ہے۔ اسلام کو ہم حالات حاضرہ کے مطابق نہیں بدل سکتے بلکہ جب تک دنیا قائم ہے، اسلام تب تک کے حالات کے لیے ہے۔

اجتہاد اور دور جدید کے مسائل:

کچھ چیزیں اصول ہوتی ہیں۔ قرآن نے سارے اصول بیان کیے۔ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس کی تشریح، فرع اور اس کی تفسیر بیان فرمائیں۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی پوری حیاتِ مبارکہ کا عمل قرآن کی تفسیر ہے۔ صحابہ کرامؓ کا حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کے سامنے عمل قرآن کی تفسیر ہے۔ ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ آج کے اس بگڑے ہوئے معاشرے کو کن حدود میں لایا جائے، کن حدود و قیود کا پابند کیا جائے کہ وہ قرآن کے مطابق ڈھل جائے جو اجتہاد ہے۔ ہم نے اجتہاد یہ نہیں کرنا کہ قرآن کو کہاں سے تبدیل کیا جائے، اجتہاد یہ کرنا ہے کہ جو کچھ ہم کر رہے ہیں اس کو کسی طرح قرآن کے بنائے ہوئے اصولوں میں ڈھالا جائے۔ ہمیں قرآن یا قرآن کے احکام میں قطع و برید نہیں کرنی، ہمیں قطع و بریداپنے کردار میں کرنی ہے۔

قرآن میں ایک چیز کا حکم موجود ہے تو اس پر کوئی اجتہاد نہیں، بات ختم ہوگئی۔ قرآن میں حکم موجود ہے اور سوائے ماننے کے کوئی چارہ نہیں، اس پہ کوئی اجتہاد نہیں ہوگا۔ ایک حکم حدیث شریف سے ثابت ہوتا ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم نے ایک حکم دے دیا تو بات ختم ہوگئی، اب اس پہ کوئی اجتہاد نہیں، کسی اجتہاد کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ تعمیلِ ارشاد کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے۔ اجتہاد کی ضرورت اس وقت پیش آتی ہے جب ایک ایسی بات سامنے آجاتی ہے یا ایسی ایجادات سامنے آجاتی ہیں جن کا براہ راست ذکر قرآن میں نہیں۔ اور ان کا حل ہم کتاب مجید سے تلاش نہیں کر سکتے۔ پھر ہمیں حدیث شریف سے تلاش کرنا ہوگا۔ پھر ہمیں متقدمین کے کردار میں تلاش کرنا ہوگا۔ صحابہ کرامؓ کے، تابعین، تبع تابعین کے کردار میں، ان کے فیصلوں میں اس کا حل تلاش کرنا ہوگا۔ وہاں بھی نہیں ملتا تو پھر وہ شخص اجتہاد کا اہل ہے جو قرآن کریم، اس کی تفسیر، اس کی شان نزول اور اس کے معانی و مفاہیم پر گہری نظر رکھتا ہے، جس کی نظر پورے ذخیرہ احادیث پر ہے، جس کی نظر سلف صالحین کے سارے حالات پر ہے۔ پھر اس چیز کو لے کر وہ شخص کہیں سے تطابق تلاش کرے گا۔ مطابقت تلاش کرے گا

کہ اس قسم کے واقعہ کی کوئی مثال قرآن میں، حدیث میں یا متقدمین سے ملتی ہو کہ اس کے مطابق اسے حل کیا جائے۔ اگر اس کے مطابق اسے حل کرے گا یہ تو اجتہاد کہلائے گا۔

اب یہ کہہ دینا کہ قومی اسمبلی اجتہاد کرے۔ قومی اسمبلی میں آدھے تو ایسے ہیں جنہیں اجتہاد لکھنا نہیں آتا۔ ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو قرآن پڑھ سکتے ہیں تو ترجمہ نہیں آتا۔ ایسے بھی ہیں جنہیں حدیث شریف سے کوئی تعلق نہیں۔ ایسے بھی ہیں جنہوں نے فقہ کبھی پڑھی ہی نہیں۔ وہ کیا اجتہاد کریں گے! اجتہاد کرنے کے لیے اسمبلی یا کسی کمیٹی کی ضرورت نہیں ہے۔ اجتہاد کرنا ہے تو آپ علماء کی ایک مجلس بنا دیں۔ اگر امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اجتہاد فرماتے تھے اور امت کے ایک بہت بڑے طبقے کے امام ہیں تو وہ بھی اپنی مرضی سے نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے بھی چالیس علماء کی ایک کونسل بنائی ہوئی تھی۔ مسئلہ ان کے سامنے پیش ہوتا اور اس پہ بحث ہوتی تھی۔ اس کی تفصیل کتابوں میں ملتی ہے۔ پھر جو ایک متفقہ رائے ہوتی اس کو امام صاحب اپنے علم کے ترازو میں تولتے تھے کہ اس کا یہ فیصلہ کیا جائے۔

ہم اگر ایک گریجویٹ کو اسمبلی کا ممبر بنا دیتے ہیں تو ایک گریجویٹ کے پاس دینی علم کتنا ہوتا ہے! اجتہاد کے لیے قرآن کریم، حدیث شریف، متقدمین کی سیرت و کردار اور فقہ پر پوری نظر ہو تو اس کے بعد وہ بندہ اس کا اہل ہے کہ قرآن اور حدیث کے احکام کی حدود کے اندر اس کا کوئی حل تلاش کرے۔ اسے اجتہاد کہتے ہیں۔ یہ اجتہاد نہیں ہے کہ جو ہم کرتے ہیں، اسے جائز بنانے کے لیے کہہ دیں کہ فلاں آیت کی یہ تاویل کر دو، فلاں حدیث اس وقت تو کارگر تھی لیکن اب زمانہ بدل گیا تو یہ غلط ہے۔ کچھ بھی نہیں بدلا۔ آج بھی وہی انسان ہیں، وہی ان کی غذا ہے، وہی ان کی دوائیں ہیں، وہی ان کی ضرورتیں ہیں۔ ہاں، وسائل بدل گئے ہیں۔ اس زمانے میں سواری کے وسائل اور تھے، لکھنے پڑھنے کے وسائل اور تھے، کھانے پینے کے، روزی کے وسائل اور تھے، آج وسائل بدلے ہیں لیکن انسان بدلا ہے نہ انسان کی ضرورتیں بدلی ہیں۔ کسی بڑے اجتہاد کی تو کوئی ضرورت ہی نہیں کہ بندہ بھی وہی ہے، اس کی ضرورتیں بھی وہی ہیں لیکن ان ضرورتوں کو پورا کرنے کے طریقے بدل گئے ہیں۔ اب اجتہاد یہی ہوگا کہ اس وقت ضرورت کے تحت اجازت تھی کہ گھوڑے پہ نماز ہو سکتی ہے، آج کا مجتہد یہ کہہ دے گا کہ ریل گاڑی پہ، بس پہ جا رہے ہو یا جہاز پہ جا رہے ہو، سواری پہ ہو اور نماز کا وقت ہوتا ہے تو کیا نماز ادا کی جا سکے گی۔ اس وقت کی سواری گھوڑا تھی آج کی سواری بدل گئی۔

ہوائی جہاز میں ادائیگی نماز:

اس پر بھی بڑا عرصہ بات ہوتی رہی لیکن علماء اس پہ متفق نہیں ہوتے تھے کہ جہاز میں نماز ادا ہوتی ہے کہ

نہیں۔دلیل یہ تھی کہ بحری جہاز پہ نماز ہوجاتی ہے کہ وہ پانی پہ ہے اور پانی کا تعلق زمین سے ہے، گھوڑے پہ اس لیے ہو جاتی ہے کہ اس کے پاؤں زمین پر ٹکے ہوئے ہیں اور بیت اللہ شریف زمین پر ہے لیکن جہاز تو فضا میں اڑتا ہے۔آج سے چند سال پہلے علماء اس نتیجہ پر پہنچے کہ بیت اللہ شریف صرف زمین پر نہیں اور یہ جو چار پتھر لگے ہوئے ہیں یہ بیت اللہ نہیں ہے، یہ بیت اللہ کی نشاندہی کرتا ہے۔ یہ جو بیت اللہ کی دیواریں یا چھت ہے یا جو پتھر لگے ہیں، یہ بذات خود بیت اللہ نہیں ہے۔ اگر ہم ان پتھروں کو اکھیڑ کر کسی دوسری جگہ عمارت بنا دیں تو نہ وہ بیت اللہ بن جائے گا، نہ ان پتھروں کو کوئی سجدہ کرتا ہے۔ یہ زمین کے ایک مرکز کی نشاندہی کرتے ہیں کہ یہ بیت اللہ ہے، مہبط تجلیات ہے۔تحت الثریٰ سے لے کر عرش علیٰ تک بیت اللہ ہی بیت اللہ ہے۔حطیم سمیت بیت اللہ کا جو احاطہ ہے، یہ عرش عظیم سے لے کر تحت الثریٰ تک یا دوسری طرف عرش عظیم تک یہ سارا بیت اللہ ہے۔ جہاز اگر فضا میں بھی ہوتا ہے تو بیت اللہ کی کسی سمت میں ہوتا ہے اس لیے جہاز میں بھی نماز ادا کرنی چاہیے۔ یہ تو ہوا اجتہاد جس کی دلیل یہ تھی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جہاں بیت اللہ ہے یہ اللہ کی تجلیات کا مہبط ہے۔عرش عظیم سے لے کر دنیا کی دوسری طرف بھی عرش عظیم تک بیت اللہ ہی بیت اللہ ہے، اس کے انوارات وتجلیات موجود ہیں اور اس کی مرکزیت موجود ہے۔علمائے حق نے یہ اجتہاد کیا کہ جب تجلیات باری ہی مقصود ہیں، وہی مرکز ہے اور یہ پتھر اس سمت کی نشان دہی کر رہے ہیں تو جہاز میں آپ اس طرف رخ کر کے نماز ادا کر لیجیے تو یہ اجتہاد ہو گیا۔

وسائل بدلے اور اس کے ساتھ کچھ نئے مسائل سامنے آئے لیکن ان پر اجتہاد وہ ہے جو قرآن، حدیث اور متقدمین کی آراء کے مطابق ہو۔ان سب کو چھوڑ کر کوئی نئی راہ نکالنا اجتہاد نہیں، بغاوت ہے۔دین کی تعبیر نہیں، تحریف ہے اور دین کو بدلنے والی بات ہے۔ یہ جو روز اجتہاد کا شور ہو رہا ہے تو میرے خیال میں یہ لوگ خود بھی نہیں سمجھتے کہ اجتہاد کسے کہتے ہیں۔ جیسے ایک معروف جج کی بڑی لمبی تقریر اسی بات پر تھی کہ جدید تقاضوں کے مطابق اجتہاد ہونا چاہیے۔ان کے جدید تقاضے کیا ہیں؟ وہ ٹی وی کی ایک محفل میں فرما رہے تھے کہ قرآن میں یہ تو کہیں نہیں لکھا ہوا کہ شراب حرام ہے، بس صرف یہ فرمایا گیا ہے کہ اس سے بچو یہ بری چیز ہے۔اب یہ اجتہاد تو نہیں ہے۔ جب بچنے کا حکم نازل ہوا تو اس کی تعبیر جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی وہ یہ تھی کہ کوئی شخص اس کے بعد نہ شراب پیے گا، نہ شراب بیچے گا، نہ شراب خریدے گا، نہ شراب گھر میں رکھے گا۔خود مدینہ منورہ میں جن لوگوں کے گھروں میں جو ذخیرہ تھا اور مٹکے بھرے ہوئے تھے، وہ لوگوں نے گلیوں میں بہا دیے۔تاریخ میں موجود ہے کہ مہینوں بعد بھی اگر بارش پڑتی تو زمین پہ جھاگ بن جاتی تھی۔جس آیت کی جو تفسیر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کی، اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمل کروایا۔اب جج صاحب کے لیے تو اس میں گنجائش نہیں ہے کہ وہ اسے اپنا معنی پہنائیں اور اسے اجتہاد کہیں۔ یہ

اجتہاد نہیں ہے، بے دینی ہے اور دین سے بغاوت ہے۔

ہمیں اجتہاد یہ کرنا ہے کہ ان وسائل کے ساتھ اس زمانے میں ہم کس طرح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی کا حق ادا کر سکتے ہیں کہ اس زمانے میں بھی رہیں، اس کا کپڑا بھی پہنیں، آج کی غذا بھی کھائیں، آج کی گاڑیوں پہ سفر بھی کریں، آج کے جہازوں پر سفر بھی کریں، آج کی مصروف شہری زندگی میں بھی رہیں لیکن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے۔ اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع ہوتا رہے۔ اگر یہ اجتہاد ہے تو درست ہے۔ یہ اجتہاد نہیں ہے کہ قرآن وحدیث کو آج کے تقاضوں کے مطابق بدلا جائے۔

اب بے دین اہل مغرب کا یہ کہنا ہے کہ قرآن وحدیث میں کچھ ایسی آیتیں ہیں جو جہاد کا حکم دیتی ہیں اور لوگ لڑتے ہیں لہٰذا قرآن سے وہ آیتیں نکالی جائیں۔ یہ انجیل تو نہیں کہ آپ کے ہاتھ پر اللہ نے رکھ دی اور آپ جو چاہیں اس کے ساتھ سلوک کریں، یہ تو قرآن ہے اور اللہ نے وعدہ کیا ہے کہ میں اس کی حفاظت کا ذمہ دار ہوں۔ اسے وہ ختم کرنے دیتا ہے نہ اس میں کچھ داخل کرنے دیتا ہے، نہ نکالنے دیتا ہے۔

موسیٰ علی نبینا علیہ الصلوٰۃ والسلام کے واقعہ میں مذکور ہے کہ جب وہ حضرت خضر علیہ السلام کے ساتھ ایک آبادی میں پہنچے تو بھوک لگی لیکن فَاَبَوْا اَنْ یُّضَیِّفُوْهُمَا (الکھف: 77) بستی والوں نے انکار کر دیا کہ ہم آپ کو کھانا نہیں دیتے۔ جب یہ آیہء کریمہ نازل ہوئی اور پھیلی تو اس بستی کے لوگ بارگاہ نبوت صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضر ہوئے کہ واقعی ہمارے بزرگوں نے جو کیا وہ اچھا نہیں تھا۔ ان کے ہاں دو مسافر آئے تھے، ایک اللہ کا جلیل القدر نبی اور دوسرا ولی اللہ تھا، اللہ کا مقبول بندہ اور ایسا ولی جس کی روح بعد از وفات فرشتوں کی طرح تعمیل ارشاد میں لگی ہوئی ہے، جسے اللہ نے ملائکہ میں شامل کر دیا اور اللہ کے جو تکوینی امور ہیں ان کی تکمیل میں لگے ہوئے ہیں۔ دونوں بڑے نورانی چہرے تھے۔ ایک پوری آبادی یا ایک شہر کے لیے دو بندوں کو کھانا دینے میں کیا مشکل تھی، انہوں نے اچھا نہیں کیا تھا، یہ تو ہم بھی مانتے ہیں لیکن اب قیامت تک کے لیے قرآن کریم میں یہی رہے گا۔ فَاَبَوْا اَنْ یُّضَیِّفُوْهُمَا ...... کہ انہوں نے ان کو کھانا دینے سے انکار کر دیا، جو بھی پڑھے گا اس کی دل میں ہماری توہین ہو گی، وہ ہمیں دل سے اچھا نہیں سمجھے گا کہ کیسے عجیب لوگ تھے کہ دو بندوں کو ایک پورے شہر نے کھانا دینے سے انکار کر دیا۔ لہٰذا ہم اہل شہر مل کر خیرات بھی کرتے ہیں، اللہ سے معافی بھی مانگتے ہیں، اللہ کی راہ میں خرچ بھی کرتے ہیں لیکن لفظ فَاَبَوْا میں ایک نقطہ اور بڑھ جائے تو، ب، سے، ت، بن جائے پھر فَاَتَوْا بن جائے گا اسے آیت کا حصہ بنا دیں تو آیت یوں ہوگی: فَاَتَوْا اَنْ یُّضَیِّفُوْهُمَا اس کا معنی ہوگا کہ وہ تیار ہو گئے کہ ہم آپ کو کھانا دیتے ہیں۔ ہماری یہ ساری عمر کی بدنامی ایک نقطے سے دھل جائے گی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا مفہوم ہے، فرمایا، مجھے اللہ کی

قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے۔قرآن کا ایک نقطہ میں نہ بڑھا سکتا ہوں نہ گھٹا سکتا ہوں۔ یہ اللہ کا کلام ہے اور جیسا نازل ہوا ویسا ہی رہے گا۔

قرآن کریم کے بارے حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کا فرمان تو یہ ہے اور آج کا مجتہد اجتہاد کر کے قرآن کو تبدیل کرنا چاہتا ہے۔

مغرب کو جہاد کے علاوہ بھی کچھ آیات پہ اعتراض تھا کہ ان میں کچھ تبدیلی ہونی چاہیے، یہ عیسائیوں اور یہودیوں سے نفرت سکھاتی ہیں۔قرآن میں ایسی آیات موجود ہیں جو کہتی ہیں کہ ان سے دوستی نہ کرو، یہ اچھے لوگ نہیں ہیں، تو ایسی آیات نہیں ہونی چاہیں۔اب تمہارے کہنے سے یا ہم میں کوئی مجتہد بن جائے تو اس کے کہنے سے یہ کچھ نہیں ہوگا۔ یہ اللہ کی کتاب ہے اور جب تک سورج طلوع و غروب ہو رہا ہے یہ بالکل ایسی ہی رہے گی۔اس کی حفاظت کا ذمہ اللہ نے لیا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کے ارشادات بھی اسی حفاظت کی ذیل میں آتے ہیں کہ وہ قرآن کی تفسیر ہیں۔خوب سمجھ لو کہ حدیث کی حفاظت کا ذمہ بھی اللہ کا ہے ورنہ سوا چودہ سو سال بعد بعینہٖ وہی الفاظ زیر زبر کے ساتھ ملنا آسان نہیں تھا۔ایک حدیث کی حفاظت کے لیے مسلمانوں نے سترہ 17 فنون ایجاد کیے جو حدیث کی حفاظت کرتے ہیں اور جن کے مطابق حدیث جانچی جاتی ہے۔اجتہاد کا دروازہ تو کھلا ہے، ہم بھی متفق ہیں لیکن اجتہاد اس بات پہ ہونا چاہیے کہ قرآن کے مطابق ہم آج کے مسائل کس طرح حل کریں۔

قرآن کے احکام میں اجتہاد کی جرأت کون کرتا ہے! قرآن نے حکم دے دیا، بات ختم ہوگئی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کی حدیث سے ثابت ہوگیا، بات ختم ہوگئی۔متقدمین کے کردار سے ثابت ہوگیا، بات ختم ہوگئی۔ پھر مجتہد کی ضرورت کیا ہے؟ تینوں جگہوں سے نہیں ملتا تو اجتہاد یہ ہوگا کہ سامنے جو مسئلہ ہے اس کی کوئی مماثلت قرآن سے، حدیث سے، متقدمین سے تلاش کرے، قرآن کی حدود کے اندر اس کا حل نکالا جائے، یہ نہیں کہ قرآن کو بدل دیا جائے تو اجتہاد ہو جائے گا۔

هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ---- یہ ایسی کتاب ہے جو تمام انسانوں کے لیے ہمیشہ کے لیے کتاب ہدایت ہے۔اور اس کے کسی حکم میں کوئی ابہام نہیں ہے ہر حکم واضح ہے دلائل کے ساتھ بھی، عقل و خرد کے ساتھ بھی، سائنس کے ساتھ بھی، اب عقل و خرد اور سائنس کو قرآن کے مطابق ڈھالنا ہے، قرآن کو ان کے مطابق نہیں۔اس میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جس میں کوئی غلط فہمی ہو، یہ واضح ہے---- مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ---- یہ واضح راہنمائی بھی ہے اور سچ اور جھوٹ میں فرق واضح کر دیتی ہے۔حق اور باطل میں فرق کر دیتی ہے، روشنی اور تاریکی کو الگ الگ بتا دیتی ہے۔ یہ قرآن کی خصوصیت ہے کہ یہ نہ صرف حق و باطل میں فرق کرتی ہے بلکہ سمجھنے کے لیے آسان ترین بھی ہے۔

ارشادِ باری ہے: وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ (القمر: 17) ہم نے سمجھنے کے لیے قرآن کو آسان ترین کر دیا ہے جو بھی سمجھنا چاہے، ہے کوئی جو سمجھنا چاہتا ہو! کوئی نہ چاہے اور بات ہے، جو سمجھنا چاہے اس کے لیے آسان ہے اور جو قرآن میں ہے وہ اللہ کا کلام اور حرف آخر ہے۔ انسان کا کلام نہیں ہے کہ آج کی بات تو کر دی لیکن کل پتہ نہیں کیا ہونے والا ہے۔ جو کچھ قیامت تک ہونے والا ہے وہ اللہ کریم کے سامنے حاضر و موجود ہے۔ جس طرح موجودہ زمانے میں کہیں دن ہے کہیں رات، یہاں سردیاں آرہی ہیں جنوب میں گرمیاں آرہی ہیں۔ کھانے مختلف ہیں، زبانیں مختلف ہیں، رنگ مختلف ہیں، سوچیں مختلف ہیں، زبانیں مختلف ہیں، لباس مختلف ہیں لیکن قرآن ایک ہے، اس کا حکم ایک ہے اور سب کے لیے قابلِ عمل ہے۔ اسی طرح نزول سے لے کر قیامت تک سارے زمانے ربِ جلیل کے اپنے بنائے ہوئے اور اس کے سامنے تھے۔ میں نے آپ نے، ہم نے اب دیکھے لیکن اس کے سامنے موجود تھے۔ اس کا حکم سارے زمانوں کے لیے ہے، جس طرح موجودہ زمانے کے اختلافات کے لیے ہے۔ اس نے ایک درمیانی اور سیدھی راہ بتا دی، اس کو چھوڑنا اجتہاد نہیں ہے، اس سے ہٹنا اجتہاد نہیں ہے۔

فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۔۔۔۔سو تم میں سے جو کوئی اس مبارک مہینے کو پائے ضرور روزے رکھے۔ کتنے لوگ تھے جو پچھلے رمضان میں ہمارے ساتھ تھے، کتنے لوگ تھے جو پچھلے اعتکاف میں ہمارے ساتھ تھے اور کتنے ہم میں سے ہیں جو غالباً! اگلے میں نہیں ہوں گے۔ تو جو بھی رمضان المبارک کو پائے، بڑی خوش قسمتی ہے کہ اسے پھر ایک رمضان شریف مل گیا تو وہ اس میں روزہ رکھے۔ وَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ۔۔۔۔اور ہاں بیمار مریض کے لیے یہ رعایت بحال ہے کہ وہ قضا کر لے۔

يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ۔۔۔۔اور ایک اصولی بات سن لو! اللہ نے دین اور قرآن عطا کر کے تمہارے لیے دنیا میں رہنا آسان کر دیا ہے۔ دین تمہیں کسی مصیبت میں نہیں ڈالتا۔ بلکہ دین تمہیں دنیوی زندگی میں بھی آسانیاں فراہم کرتا ہے۔ آپ دینی احکام کا اپنے رواجات کے ساتھ مقابلہ کریں، آپ کا ہر رواج آپ کو مشکل میں ڈالے گا اور دین کا حکم آپ کے لیے آسانی لائے گا۔ شادی بیاہ ہو، زندگی اور موت کا کوئی مسئلہ ہو، لین دین ہو، خرید و فروخت ہو، آپ دنیا کے رواجات، اقوام عالم کے رواجات، خود مسلمانوں نے جو رواجات اور رسومات اختیار کر رکھی ہیں ان کا موازنہ دین سے کریں، ان میں مصیبتیں بھی ہوں گی، اور بے عزتی بھی ہو گی لیکن دین میں آسانی ہوگی۔ فرمایا: يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ ۔۔۔۔اللہ نے دین عطا فرما کر تمہارے لیے

آسانیاں پیدا فرمائی ہیں۔ وَلَا یُرِیْدُ بِکُمُ الْعُسْرَ۔۔۔۔ اللہ تمہیں مشکلات میں نہیں ڈالنا چاہتا۔ دین کو مصیبت مت سمجھو، دین تکلیف نہیں ہے بلکہ یہ تمہارے لیے بہترین، آرام دہ اور باعزت زندگی کا راستہ ہے۔

وَلِتُکْمِلُوا الْعِدَّۃَ۔۔۔۔ اور جب توفیق ہو تو رمضان کی گنتی پوری کرلو تاکہ روزے رکھنے کی سعادت نصیب ہو جائے۔ وَلِتُکَبِّرُوا اللّٰہَ عَلٰی مَا ھَدٰکُمْ وَلَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ﴿۱۸۵﴾ اس بات پر اللہ کی بڑائی بیان کرو کہ اس نے تمہیں ہدایت نصیب فرمائی، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیسا راہنما نصیب فرمایا، قرآن جیسی بے مثال کتاب عطا فرمائی، قرآن کو ماننے کی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کرنے کی تمہیں توفیق عطا فرمائی۔ یہ ساری نعمتیں اللہ کی طرف سے ہیں لہٰذا وَلِتُکَبِّرُوا اللّٰہَ اللہ کی بڑائی بیان کرو، اچھے کپڑے پہنو، قیمتی نہیں ملتے تو ستے ہوں، صاف کرلو، دھولو، خوشبو لگالو، غسل کرو اور ایک میدان میں جمع ہو کر اللہ کی بڑائی بیان کرو۔ نماز عید کی دونوں رکعت میں وَلِتُکَبِّرُوا اللّٰہَ کی تعمیل میں، تین تین سے زائد تکبیریں کہی جاتی ہیں۔ اللہ کی بڑائی بیان کرو کہ اس نے تمہیں ہدایت سے سرفراز فرمایا، اس نے تمہیں رمضان المبارک کی نعمتیں عطا فرمائیں، اعتکاف کی سعادت بخشی اور وہ کریم ہے، اس نے تمہیں ہدایت نصیب فرمائی۔ اس کی بڑائی بیان کرو تاکہ تم اللہ کا شکر کرنے والے شمار کیے جاؤ۔

تمام احکام شریعت اور تمام عبادات، سب کا حاصل اور سب کا ثمر یہ ہے کہ قرب الٰہی حاصل ہو، اللہ کی رضا نصیب ہو، انسانی زندگی اپنا مقصد اور اپنا حاصل پالے۔ جیسا کہ ارشادِ باری ہے۔ فرمایا: وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ (الذاریات:56) میں نے جنوں اور انسانوں کو اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ مجھ پہچانیں۔ مفسرین نے لِیَعْبُدُوْنِ کا ترجمہ لیعرفون فرمایا ہے۔ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ ترجمہ یہ کیا ہے لیعرفون کہ وہ مجھے پہچانیں، میری عظمت کو پہچانیں، میری جلالت کو پہچانیں اور کوئی میرا جاننے والا ہو۔

معرفت باری تعالیٰ:

تفسیر مظہری میں درج ہے: کُنْتُ کَنْزاً مَخْفِیاً۔۔۔۔ میں چھپا ہوا خزانہ تھا، میری ذات کائنات کی خالق بھی ہے، مالک بھی ہے، کائنات کو پالنے والی بھی ہے۔ میں نے زمینیں پھیلا دیں، آسمان بنا دیے اور اس پر فرشتے پیدا کر دیے جو اللہ کی نوری مخلوق تھے، جن بھی پیدا فرمائے، بے پناہ مخلوق بنا دی۔ وہ خود جانے اس کی مخلوق کتنی تھی اور اب کتنی ہے لیکن ساری مخلوق میں یہ استعداد نہیں تھی کہ وہ اللہ کی ذات کو بھی پہچانیں۔ فرشتوں کو جو حکم ملتا بجالاتے لیکن اللہ کا حکم اللہ کی طرف سے القا ہوتا۔ اللہ کا حکم لانے والے نہ کارندے ہوتے، نہ اللہ کسی کے روبرو ہوتا اور نہ کوئی اللہ کو دیکھتا تھا۔ جو کلام الٰہی

ہوتا ہے یا وحی ہوتی ہے یا جس طرح بھی ہو، اسے سننے کے لیے بھی کان ضروری نہیں ہوتے بلکہ وجود کا ہر ذرہ اسے سنتا ہے۔ سارا وجود کان بن جاتا ہے۔ فرشتے تھے، حاملین عرش ملائکہ تھے لیکن سارے حکم کے بندے تھے۔ حاکم کون ہے اور کیسا ہے؟ یہ ان کا موضوع نہیں تھا۔ اس کی ان میں مجال اور جرأت ہی نہیں تھی۔ کُنۡتُ کَنۡزاً مَخۡفِیاً ۔۔۔۔۔ میں اپنی مخلوق سے ایسے چھپا ہوا تھا جیسے کوئی خزانہ چھپا دیا جاتا ہے۔ کسی کو خبر ہی نہیں ہوتی کہ اس کا راستہ کدھر ہے، اس میں سرمایہ کتنا پڑا ہے، اسے حاصل کیسے کیا جا سکتا ہے۔ کسی کو میرا کوئی پتا نہیں تھا جیسے چھپا ہوا خزانہ ہوتا ہے۔

فَأَحۡبَبۡتُ اَنۡ أُعۡرَفُ ۔۔۔۔۔ پھر مجھے یہ بات پسند آئی کہ کوئی میرا جاننے والا بھی ہونا چاہیے۔ میری مخلوق میں کوئی ایسا بھی ہو جو مجھے جانے، مجھے سمجھے، مجھے پہچانے اور پھر میری عظمت کا، میرے جمال کا، میری قدرت کا وہ اتنا شیدا ہو کہ میرے لیے پاگل ہو جائے۔ مجھے چاہنے لگ جائے، میرا قرب تلاش کرے، مجھ تک واسطے، وسیلے، ذرائع طریقے تلاش کرے کہ کس طرح میں اللہ کے روبرو ہو جاؤں۔ میں اس مالک کو دیکھوں جس نے یہ ساری کائنات پال رکھی ہے۔ دنیا بنائی ہے، آخرت بنائی ہے، جنت و دوزخ بنائی ہے، زمینیں آسمان بنائے ہیں، دریا پہاڑ بنائے ہیں۔ وہ کون ہے، کیسا ہے، کہاں ہے!

ان سوالوں کا جواب تلاش کرنے کے لیے فَخَلَقۡتُ الۡخَلۡقَ ۔۔۔۔۔ میں نے اس مخلوق، انسان کو پیدا فرما دیا اور پہلا انسان جو زمین پر بھیجا وہ اللہ کو جانتا تھا، اللہ کو پہچانتا تھا، اللہ کی ذات سے واقف تھا، اللہ کی صفات سے واقف تھا اور پہلا انسان ہی اللہ کا نبی تھا۔ نورِ نبوت وہ آئینہ ہے یا وہ ذریعہ ہے جس میں جمالِ الٰہی کو بھی دیکھا جا سکتا ہے، کلامِ الٰہی بھی سنا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری ہے وَ کَلَّمَ اللّٰهُ مُوۡسٰی تَكۡلِیۡمًا (النسآء: 164) اللہ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ایسے کلام کیا جیسے کلام کرنے کا حق ہوتا ہے۔ جس طرح ہم کلام ہوا جاتا ہے اس طرح ہم کلام ہوا اور یہ منصب صرف اور صرف انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے حصے میں آیا۔

جنّات میں نبوت نہیں:

اس بات پر علمائے حق کا اتفاق ہے کہ جنوں میں کوئی نبی پیدا نہیں ہوا۔ انسانوں سے پہلے زمین پر جنات آباد تھے۔ وہ بگڑتے تو آسمان سے فرشتے آتے۔ کسی کو اللہ کے حکم سے سزا دیتے، قتل کرتے، قید کرتے اور کسی کو محض مار پڑتی۔ جس طرح اللہ کا حکم ہوتا انہیں سیدھا کرتے اور ان میں جو کوئی نیک ہوتا، اسے حکمران بنا کے چلے جاتے۔ پھر آہستہ آہستہ بگاڑ آ جاتا تو پھر یہی طریقہ دہرایا جاتا۔ ابلیس کے بارے میں یہ لکھا گیا ہے کہ اسے فرشتوں میں ایک اہم مرتبہ حاصل تھا لیکن وہ خود چونکہ جنوں میں سے تھا تو اللہ کریم اس کی سربراہی میں

فرشتے دیتے اور یہ آکر جنوں کی اصلاح کا عمل کرتا۔

زراہِ تفاخر بفوج ملک

گہہ برزمین بود گہہ برفلک

بڑے فخر یہ انداز میں فرشتوں کی فوج لیے ہوئے کبھی زمین پر آتا، کبھی آسمانوں پہ چلا جاتا اور یہ سلسلہ چلتا رہا، حتیٰ کہ زمین جنوں سے خالی کرالی گئی اور انہیں پہاڑوں کی طرف دھکیل دیا گیا۔ انہیں حکم ہوا کہ زمین چھوڑ دو اور بلند پہاڑوں میں چلے جاؤ۔ اب بھی جنوں کے جو طاقت ور قبائل ہیں، وہ بلند پہاڑوں پہ پائے جاتے ہیں۔ جو ہمیں یہاں تنگ کرتے رہتے ہیں، یہ کوئی فالتو قسم کے ہیں لیکن ہم میں تو اتنی سکت بھی نہیں کہ ان کا سامنا کرسکیں۔ زمین خالی کرا کے آدم علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کو اتارا گیا اور نسل انسانی شروع ہوئی۔ پہلا انسان اس مخفی خزانے کو جاننے والا تھا۔ اس راستے سے بھی آگاہ تھا جس راستے سے وہاں تک پہنچا جا سکتا ہے اور وہ خزانہ کیا ہے؟

اللہ کون ہے اور اللہ کیسا ہے، اس کی ذات کیسی ہے، اس کی صفات کیسی ہیں، یہی معرفت الٰہی ہے اور اس ساری بات کو اللہ کا نبیؑ جانتا تھا۔ آگے اس نے دنیا کو ایک بڑی خوبصورت امتحان گاہ بنا دیا۔ انسان کو مادی وجود عطا فرمادیا جو مادی لذتوں سے آشنا ہوتا ہے۔ اس نے دنیا بنائی جو اس کی قدرت کا عجیب کرشمہ ہے۔ یہ وہی ہے جس نے اتنی نازک اور حساس دنیا بنائی جو انسان کی سمجھ سے آج بھی بالاتر ہے۔ سائنس کو ساری ترقی کے باوجود گھاس کا ایک تنکا اگانا پڑے تو سائنس مجبور ہے، آج بھی زمین سے اگانے والی کوئی مشین نہیں بنا سکی۔ ایک مچھر یا مکھی کا پر ٹوٹ جائے تو مصنوعی بن سکتا ہے لیکن ویسا نہیں بن سکتا جیسا قدرت نے بنایا تھا کہ اس میں وہ خصوصیات بھی ہوں اور ویسا ہی بن جائے۔ اللہ کی تخلیق آج بھی الگ ہے اور مخلوق ساری ترقی کے باوجود جو چیز بناتی ہے وہ آج بھی الگ ہے۔ یوں نسل انسانی کا سلسلہ چلتا رہا۔

انسان کا بچپن تھا، پھر جوں جوں وہ بڑا ہوا، تعداد بڑھی، شعور بھی بڑھا، عقلیں بھی بڑھیں، ضرورتیں بھی بڑھیں اور اسی طرح پے درپے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام مبعوث ہوتے رہے اور سب ایک بات پر متفق تھے۔ ایک بات! اللہ کی ذات اور صفات، آخرت، ملائکہ، ضروریات دین، یہ تمام انبیاءؑ میں ایک ہے۔ احکامِ شریعت میں فرق تھا۔ حسب استعدد لوگ جس قدر معرفت کے حامل تھے، اس کے مطابق مختلف شریعتوں میں احکام مختلف تھے تا آنکہ انسانیت بالغ ہوگئی، اپنے کمال کو پہنچ گئی۔ تب اللہ نے وہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث فرمایا جو بیک وقت ساری انسانیت کے لیے اللہ کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے اور یہ بہت بڑی بات ہے۔ ہر نبیؑ نے اس علاقے کی، اس قوم کی، ان لوگوں کی اصلاح فرمائی جہاں وہ مبعوث ہوئے۔ ان کے جو حالات تھے، جو موسم تھے، جو مزاج تھے، جو

ضروریات تھیں اور جو عہد تھا اس کے مطابق اصلاح فرمائی۔

گلوبل ویلیج عالمی نظام کا متقاضی ہے:

آج سائنس کو فخر ہے کہ گلوبل ویلیج بن گیا۔ گلوبل ویلیج تو اسی دن بن گیا تھا جس دن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم رسول نے اعلان فرمایا: یَاَیُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ جَمِیْعًا (الاعراف: 158) اے اولادِ آدم علیہ السلام! میں تم سب کے لیے اللہ کا رسول ہوں، گلوبل ویلیج تو اسی دن بن گیا تھا جب یہ اعلان فرمایا گیا۔ ساری دنیا میں علاقے مختلف ہیں، ان کے موسم مختلف ہیں حتیٰ کہ دن رات کا فرق ہے۔ ایک جگہ دن ہوتا ہے دوسری جگہ رات ہوتی ہے۔ موسموں کا فرق ہے، مزاجوں کا فرق ہے، غذاؤں کا فرق ہے، رنگوں کا فرق ہے۔ کون سا اختلاف ہے جو نسل انسانی میں نہیں لیکن اللہ نے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کو ساری انسانیت کے لیے مبعوث فرمایا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کو ایسا نظام عطا فرمایا جو بیک وقت ساری مخلوق کے لیے قابل عمل ہے اور زندگی کے سارے راستوں سے آسان راستہ ہے۔ جینے کے تمام راستوں سے آسان اور قابل عمل ہے۔ انسان کو ایک نظام کی ضرورت ہوتی ہے۔ جہاں مل جل کر رہتا ہے، وہاں کچھ حدود و قیود ہوتی ہیں۔ کچھ اس کے حقوق ہوتے ہیں کچھ اس کے فرائض ہوتے ہیں۔ بیک وقت ساری مخلوق کے لئے قواعد وضوابط وضع کرنا اور ایسے وضع کرنا کہ اہل مشرق کو بھی راس آئیں اور اہل مغرب کو بھی اسی طرح شمال وجنوب میں رہنے والوں کو بھی راس آئیں۔ زبانیں مختلف ہوں، رنگ مختلف ہوں، فکر مختلف ہو، استعداد مختلف ہو لیکن ان اصولوں پر ہر کوئی عمل کر سکے۔ وہ اصول سب سے آسان بھی ہوں، قابل عمل بھی ہوں اور سب کے لیے مفید بھی ہوں۔ اب یہ وہی بنا سکتا ہے جس نے مخلوق بنائی۔

پھر ایک پہلو اس کا اور بھی ہے۔ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم مبعوث ہوئے تو صرف اس وقت کے لیے یا سو سال کے لیے، پچاس سال کے لیے ایک عالمی نظام بن جاتا لیکن یہ نظام تو قیام قیامت تک کے لیے ہے یعنی کائنات میں کتنی تبدیلیاں آئیں، نظام یہی رہے گا۔ اس زمانے سے اس زمانے تک تبدیلیاں کیا آئی ہیں؟ انسان پیدا ہوتا ہے، انسان مرتا ہے، انسان بیمار ہوتا ہے، انسان صحت مند ہوتا ہے، انسان کو بھوک لگتی ہے، انسان کو نیند آتی ہے۔ انسان کی ساری ضرورتیں وہی ہیں۔ صرف تکمیل کے ذرائع بدلے ہیں۔ چولہا جلا کر کھانا پکاتا تھا اب اس نے مشین کے ذریعے پکی پکائی روٹی لے لی لیکن اس کی بھوک تو نہیں بدلی یعنی ضرورت کی تکمیل کے صرف ذرائع بدلے ہیں۔ اسلام نے ذرائع پر کوئی قدغن نہیں لگائی۔ ایک زمانے میں لوگ پیدل حج کرتے تھے، اونٹ پر سفر کرتے تھے،

گھوڑے پر سفر کرتے تھے آج جہاز پہ جاتے ہیں۔ ذرائع میں کوئی منع نہیں فرمایا۔ ہر جائز ذریعہ اختیار کر سکتے ہیں۔ قیامت تک جو تبدیلیاں آئیں گی، وہ ذرائع میں آئیں گی لیکن انسانی حالات نہیں بدلے کہ اس کا توالد وتناسل بدل جائے یا اس کا مرنا جینا بدل جائے یا اس کی بھوک اور پیاس بدل جائے یا گرمی سردی کو محسوس کرنا بدل جائے۔ اسلام کی صورت ایسا خوبصورت، ایسا جامع، ایسا مکمل ترین نظام حیات عطا فرمایا جو جینے کا سب سے آسان راستہ ہے اور مزے کی بات یہ ہے کہ اسی آسان زندگی کو اپنی معرفت کا سبب بنا دیا کہ تم مزے سے جیو، جس طرح میرا نبی صلی اللہ علیہ وسلم تمہیں حکم دیتا ہے اسی طرح کرو، جس بات سے روکتا ہے رک جاؤ تو یہ تمہیں میرا جمال جہاں آرا دکھانے کا سبب بن جائے گا۔ اب اس کے بعد عبادات مزید انعام ہے جسے ہم بوجھ سمجھ بیٹھے ہیں یعنی دین پر اصل عمل تو وہ ہے جو کچھ ہم عملی زندگی میں کرتے ہیں۔

نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ یا جو عبادات ہیں، یہ اس پر مزید انعام ہے کہ چونکہ تم میری ہی اطاعت کرتے ہو، تو آؤ مجھ سے روبرو بات بھی کرلو۔

جو فلسفیوں سے کھل نہ سکا اور نکتہ وروں سے حل نہ ہوا
وہ راز ایک کملی والے نے بتلا دیا چند اشاروں میں

دنیا کے دانا موجود تھے، دانش ور موجود تھے، شاعر موجود تھے، فلاسفر موجود تھے، مورخ موجود تھے۔ کون سا فن تھا جو نہیں تھا لیکن کوئی اللہ کو نہیں جانتا تھا۔ ایک جملے میں، صرف ایک جملے میں اللہ کی ساری پہچان کرا دی۔ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ، اللہ اور اس کی ساری پہچان کا سبب ہے مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم

ہم سخن کر دیا بندوں کو خدا سے تو نے

اب آدمی جب بازار میں، زندگی میں، میدان میں، کاروبار میں، دوستی دشمنی میں اللہ کے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کر کے آتا ہے اور اللہ کے حضور دست بستہ کھڑا ہو جاتا ہے، اللہ اکبر کہہ کر ساری کائنات سے کٹ جاتا ہے تو اللہ سے بات کر رہا ہوتا ہے۔ نمازی کے بارے میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: اِذَا كَانَ اَحَدُكُمْ فِي الصَّلَاةِ فَاِنَّهُ يُنَاجِي رَبَّهُ (مسند احمد بن حنبل) اپنے رب سے سرگوشیاں کر رہا ہے، اسے ڈسٹرب (Disturb) مت کرو، اسے مت چھیڑو اس کے آگے سے نہ گزرو، وہاں شور نہ کرو، اسے اپنے رب سے بات کرنے دو۔ کہاں وہ مشت غبار اور کہاں وہ ذات عالی! محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر بندے کو، ہر امتی کو، ہر کلمہ گو کو اللہ سے بات کرنے کی اجازت عطا فرمائی اور سلیقہ سکھا دیا۔

ہمیں معرفت باری کیوں حاصل نہیں:

اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ جو میں کہہ رہا ہوں، یہ ساری باتیں ہمارے تجربے میں کیوں نہیں آتیں جب یہ برحق ہیں۔ مسجد اللہ کا گھر ہے میں اس میں بیٹھا ہوں، منبر رسول صلی اللہ علیہ وسلّم پہ بیٹھا ہوں، باوضو بیٹھا ہوں، میرے سامنے اللہ کا قرآن کھلا ہوا ہے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے ارشادات کے، قرآن کی آیات کے حوالے دے رہا ہوں، تو جو سچ میں کہہ رہا ہوں یہ سچ ہم نے کبھی محسوس ہی نہیں کیا۔ ہم نماز پڑھتے ہیں تو جلدی ہوتی ہے کہ اٹھیں بیٹھیں، سجدے پورے کیے اور بھاگ گئے۔ وضو کرتے ہیں تو ہمیں کوئی مزا نہیں آتا، وضو کرنے میں آدھا بازو گیلا آدھا خشک رہ گیا، ٹوٹل (Total) پورا کیا اور بھاگ گئے۔ آپ کسی مسجد میں بیٹھ کر دیکھیں، لوگ آتے ہیں، سنتیں ادا کرتے ہیں، نوافل ادا کرتے ہیں لیکن بہت کم لوگ ہوں گے جو رکوع پورا کریں گے، بہت کم لوگ ہوں گے جو سکون سے سجدہ کریں گے جیسے کوئی پولیس پیچھے لگی ہوئی ہے اور اس نے بھاگ دوڑ کر ٹوٹل (Total) پورا کرنا ہے۔ کیا یہ اللہ سے ہم کلام ہونا ہے؟

میرے بھائی! نبیؐ دو چیزیں لاتا ہے۔ ایک تعلیمات نبوت، اللہ کون ہے، اللہ کیسا ہے، اللہ کہاں ہے، اللہ کس بات پہ راضی ہے، اللہ کس بات پہ خفا ہے، حلال کیا ہے، حرام کیا ہے، کیا کرنا ہے، کیا نہیں کرنا، عبادت کیسے کرنی ہے، نماز کیسے پڑھنی ہے، اس میں کیا پڑھیں گے، تسبیحات کیا ہوں گی، رکوع و سجود کیا ہیں، رکعتیں کتنی ہیں؟ یہ سب تعلیمات نبوت ہیں۔

ایک بات اور ہے! یہ ساری چیزیں زبانی ہوتی ہیں، کلام میں ہوتی ہیں، لکھی جاتی ہیں، پڑھی جاتی ہیں لیکن ایک بات اور ہوتی ہے، برکات نبوت صلی اللہ علیہ وسلّم نبی علیہ السلام کے قلب اطہر میں جمال الٰہی کو دیکھنے کا اور اللہ کے قرب کی کیفیات کو محسوس کرنے کا جو کمال ہوتا ہے وہ برکات نبوت صلی اللہ علیہ وسلّم ہیں۔ بات تب بنتی ہے جب تعلیمات نبوت صلی اللہ علیہ وسلّم بھی ہوں اور برکات نبوت صلی اللہ علیہ وسلّم بھی ہوں۔ تعلیمات پر عمل کرے اور دل میں برکات ہوں تو جو سجدہ وہ کرتا ہے وہ اور ہی سجدہ ہوتا ہے۔

سیدنا عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ وتر کی ایک رکعت پڑھا کرتے تھے لیکن اسی ایک رکعت میں سورۃ فاتحہ کے بعد والناس تک قرآن ختم کر کے رکوع فرماتے اور کئی صحابہ کرامؓ سے یہ ملتا ہے کہ وہ ایک رکعت میں تیس پارے پڑھ لیتے تھے۔ کیا عجیب بات ہے، کیسے پڑھ لیتے تھے! ہم دو رکوع پڑھیں تو تھک جاتے ہیں۔ وہ کیوں نہیں تھکتے تھے، ان کے پاس وہ کیفیات بھی تھیں۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے پڑوس میں ایک رئیس آدمی رہتا تھا۔ امام صاحب کے وصال کے بعد اس کے بیٹے نے والد سے پوچھا! ابا ہمارے پڑوس میں ایک بڑا خوبصورت ستون بنا ہوا تھا، کبھی رات کو آنکھ کھلتی تو یہاں ایک ستون ہوتا تھا، وہ آج کل نظر نہیں آتا۔ اس نے کہا بیٹا وہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ تھے جو رات کو کھڑے ہوتے تو فجر ہو جاتی، اب اس دنیا میں نہیں رہے۔

میرے بھائی! کسی انسان سے دوستی ہو، محبت ہو اور وہ مل جائے تو رات چھوٹی پڑ جاتی ہے، جس کا تعلق جمالِ باری سے ہو، جمالِ الٰہی سامنے ہو تو اس کے لیے رات کم پڑ جاتی ہے۔ اس کے تو ایک سجدے میں زمین پر سر رکھے برسوں بیت جائیں اور اسے محسوس ہو کہ جس کے سامنے میں نے سر رکھا ہے اس نے مجھ پر لطف و کرم کی نگاہ ڈالی ہے تو سر کیوں اٹھائے گا!

جب دین ذریعہ معاش بن جائے:

ہم نے دین کو اہمیت ہی نہیں دی۔ دوسرے کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جنہوں نے دین کو ذریعہ معاش بنا لیا۔ دین ان کا پیشہ ہے اور پیشہ میں اونچ نیچ ہوتی رہتی ہے۔ پیشہ کا تقاضا ہوتا ہے کہ مجھے کتنے پیسے ملتے ہیں۔ ایک دوست برطانیہ سے آیا ہوا تھا، پوچھنے لگا مجھے سعودیہ میں بھی ایک ملازمت کی پیشکش ہوئی ہے، میں کہاں ملازمت کروں؟ میں نے کہا جہاں زیادہ پیسے ملتے ہیں۔ جب دین ذریعہ معاش بن جائے تو پھر وہی دین ہوگا جس میں زیادہ پیسہ ملتا ہے۔ کچھ لوگ تو ویسے ہی غافل ہو گئے اور جنہوں نے کوشش کی، انہوں نے تعلیمات کو غنیمت سمجھا لیکن برکاتِ نبوت صلی اللہ علیہ وسلّم کو حاصل نہ کیا۔ اسی لیے ہمیں عبادات بوجھ لگتی ہیں اور ہم جان چھڑاتے ہیں۔ برکات نبوت صلی اللہ علیہ وسلّم وہ ہیں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کی ایک نگاہ سے ایک نو مسلم کو شرفِ صحابیت عطا کر گئیں۔ ابھی کلمہ پڑھا، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم پر ایک نگاہ پڑی یا آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی نگاہ پڑی تو وہ صحابیؓ ہو گیا۔ اب صحابیؓ محض ایک اصطلاح نہیں ہے۔ صحابیؓ کا مفہوم ہے کہ دیانت میں، امانت میں، تعلق باللہ میں، عبادت ریاضت ہر کام میں باقی غیر صحابہ سے افضل ترین آدمی! اس کے ذاتی کمالات، عبادات یا اللہ نے خود اس کے جو اوصاف بیان فرمائے، وہ الگ ہیں۔ یہ تو ایک نگاہ کی بات ہے کہ ایک نگاہ میں وہ اس مرتبے تک پہنچ گیا کہ کیفیات کا جو سمندر، بحر ناپیدا کنار محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے سینہ اطہر میں موجزن تھا، اسی سے ایک دھارا اس کے سینہ میں بھی اتر گیا۔

ان کے لیے اللہ نے آسمانوں سے فرشتوں کو حکم دیا کہ جاؤ ان کی جگہ جا کر لڑو۔ میری رضا کے لیے یہ میدان جنگ میں اتر آئے ہیں، ان کے پاس اسلحہ بھی نہیں ہے، تعداد بھی کم ہے، تم جاؤ جا کر ان کی طرف سے لڑو، کیسے عجیب لوگ تھے! ہم

تو عبادات کے لیے آتے ہیں تو ہمارے ساتھ شیطان آجاتا ہے، وہ لڑائی کے لیے جاتے ہیں تو ان کے ساتھ فرشتے جاتے ہیں، عجیب بات ہے! ہم میں اور ان میں فرق کیا ہے؟ ہمارے پاس زبانی باتیں ہیں، ان کے پاس ساری زبانی باتیں بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تھیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب اطہر کی کیفیات بھی تھیں، یہ فرق تھا۔

آج بھی اگر کسی کو ان کیفیات کا ذرہ نصیب ہو جائے! صحابی کا مقام تو نہیں پا سکتا لیکن جمال باری سے محروم بھی نہیں رہتا، اسے کچھ نظر نہیں آتا لیکن وہ دیکھتا ہے۔

اللہ اور بندے کے درمیان کوئی پردہ حائل نہ ہو:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان تعبد اللہ کانك تراہ اللہ کی عبادت کا مزا یہ ہے کہ اللہ روبرو ہو۔
ایک قوالی ہوا کرتی تھی:

تو سامنے ہو میں سجدہ کروں
تب لطف ہے سجدہ کرنے کا
تو اور کہیں میں اور کہیں
تیرے نام کا سجدہ کون کرے

جب سامنے کچھ بھی نہیں ہے تو یہ خالی اور بے کیف سجدے بوجھ ہی ہوں گے۔ وہ پہلے ہی مخفی ہے، آج بھی ہم سے مخفی ہو تو سجدے بوجھ نہیں بنیں گے تو اور کیا ہوں گے؟

آیہء کریمہ میں ارشاد ہوتا ہے کہ میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم جو بندے تیری اطاعت کریں گے، اپنے اعمال کو تیری اطاعت میں ڈھالیں گے، تیرے حکم، پر تیرے بتائے ہوئے طریقے پر عبادت کریں گے اور انہیں میں نظر نہیں آؤں گا اور مجھے پا نہیں سکیں گے تو وہ پھر میرے بارے میں پوچھیں گے: وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ۔۔۔۔ کہ آقا علیہ الصلوٰۃ والسلام! ہمارا رب کہاں ہے؟ کیسا ہے؟ ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت بھی کی، ہم نے سجدے بھی کیے، ہم نے روزے بھی رکھے لیکن ہمارے لیے تو وہ ابھی تک وہی مخفی خزانہ ہے جو مخلوق کے پیدا ہونے سے پہلے تھا تو میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم انہیں کہہ دو، فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ۔۔۔ یہ جو تمہارے دل کی دھڑکن ہے، میں اس سے بھی تمہارے قریب ہوں، میں تمہاری شہ رگ سے بھی قریب ہوں۔ یہی بات دوسری جگہ یوں ارشاد فرمائی: وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ (ق:16) سب سے زیادہ تمہارے قریب میں ہوں۔

یہ بھی انہیں فرما دیجیے اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ۔۔۔ تم جب بھی مجھ سے دعا مانگتے ہو میں

قبول کرتا ہوں، تمہاری دعا کبھی رد نہیں کرتا۔ اس قدر تمہارے قریب ہوں کہ تم الفاظ زبان سے ادا نہ بھی کرو، تمہارے دل میں آئیں، تمہارے دماغ میں آئیں، مجھے پتا ہوتا ہے۔ میں ان الفاظ سے بھی تمہارے قریب تر ہوں، تمہاری سوچوں سے قریب ہوں۔ اتنا قریب اور پھر اتنا کریم کہ تمہاری ہر بات مانتا ہوں۔

مومن کی دعا کبھی رد نہیں جاتی:

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ مومن کی دعا کبھی رد نہیں ہوتی لیکن قبولیت کے انداز اپنے ہیں۔ کبھی تو جو وہ مانگتا ہے، وہی دے دیتا ہے۔ کبھی یہ ہوتا ہے کہ جو مانگتا ہے، دیتا وہی ہے لیکن اس میں وقفہ آ جاتا ہے کیونکہ وہ بہتر جانتا ہے کہ کون سی چیز اسے کب دینی ہے۔ جس طرح ماں چاہتی ہے کہ بچہ جو مانگے، وہ اسے دے دوں لیکن کبھی وہ کہتی ہے کہ یہ تھوڑی دیر بعد ملنا چاہیے۔ کبھی یہ ہوتا ہے کہ جو ہم مانگ رہے ہوتے ہیں، وہ ہمارے لیے نقصان دہ ہوتا ہے جیسے بچہ چاقو مانگ رہا ہے تو ماں اس کی بجائے کوئی اور خوش نما چیز دے دیتی ہے۔ اللہ کریم اس دعا کو رد نہیں کرتے بلکہ اس کے بدلے ہمیں بہتر چیز دے دیتے ہیں۔ پھر فرمایا، اگر دنیا میں اسے کچھ بھی نہ ملے تو اللہ اس دعا کو اپنے خزانہ خاص میں رکھتا ہے جس کی فرشتوں کو بھی خبر نہیں ہوتی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں جب حشر کا میدان ہوگا اعمال تولے جائیں گے فرشتے عرض کریں گے، بارالہا ہم نے فلاں ابن فلاں کے اعمال تول لیے۔ اللہ کریم فرمائے گا: نہیں، سارے نہیں، اس کے کچھ اعمال میرے پاس بھی امانت ہیں۔ اس نے دنیا میں دعائیں کی تھیں جو اس وقت موزوں نہیں تھیں لیکن میں نے اپنے پاس اس کے آخرت کے خزانے میں جمع کر لیں، وہ بھی لے جاؤ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں اس وقت بڑے بڑے مستجاب الدعوات آرزو کریں گے کہ کاش دنیا میں ہماری کوئی دعا قبول نہ ہوتی۔ فرماتے ہیں، جوتے کا تسمہ ٹوٹ جائے تو اللہ سے دعا کرو، اللہ مجھے تسمہ دلا دے۔ ہر کام کے لیے دعا کرو۔

اللہ کا بندے سے کلام:

فرمایا میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم! میرے بندوں کو دو باتیں بتا دو کہ میں تمہارے سب سے زیادہ قریب ہوں اور میں تمہاری ہر خواہش پوری کرتا ہوں، ہر آرزو قبول کرتا ہوں لیکن تمہیں اس کا ادراک کیوں نہیں ہوتا! فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي ۔۔۔ تمہیں ادراک اس لیے نہیں ہوتا کہ جو باتیں میں کرتا ہوں وہ بھی تو سنو۔ جو بات میں کہتا ہوں اگر تم نہیں سنتے تو پھر تمہیں کیا ادراک ہوگا! کلام مجید کے یہ تیس پارے اللہ کی بات ہے۔ ہم ساری عمر پڑھتے رہتے ہیں کہ اللہ نے لوگوں کے لیے یہ فرمایا، اللہ نے لوگوں کو اس سے منع کیا۔ کبھی قرآن کو اس طرح بیٹھ کر پڑھو کہ

ایک میں ہوں، ایک میرا رب ہے اور یہ بات وہ مجھ سے کر رہا ہے۔ جہاں منع کر رہا ہے مجھے کر رہا ہے، جہاں کرنے کا حکم دے رہا ہے مجھے دے رہا ہے۔ ایک دفعہ کائنات کو درمیان سے ہٹا دو۔

ایک مولوی صاحب جب بھی جمعہ پڑھاتے، دوزخ سے ہی شروع کرتے اور دوزخ پر ہی تقریر ختم کرتے۔ ایک دو جمعے گزر گئے تو ایک زمیندار نے اٹھ کر کہا۔ مولانا! اللہ نے صرف دوزخ بنائی ہے، ہم نے تو سنا ہے کوئی اور جگہ بھی ہے، جنت وغیرہ بھی ہے۔ کیا دوزخ کے لیے ہم ہی رہ گئے ہیں! یہ باتیں اس لیے ہوتی ہیں کہ قرآن کی وعید کو، عذاب کو دوسروں پر بانٹتے رہتے ہیں۔ نافرمانی دوسروں کے کھاتے میں ڈالتے ہیں، قرآن کا یہ حکم مخلوق کے لیے ہے۔ مخلوق کو چھوڑ، تو جو کر رہا ہے، وہ تجھ سے بات کر رہا ہے۔

فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ۔۔۔ میں تیرے قریب ہوں اُجِیْبُ دَعْوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ۔۔۔ جب تو مجھے پکارتا ہے، میں تیری ہر بات قبول کرتا ہوں لیکن تو مجھ سے دور ہے، اب اس کا کیا علاج ہے! فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ۔۔۔ میں جو کہتا ہوں، تو بھی اسے قبول کر۔ تو مشت غبار ہے، تو پل پل میرا محتاج ہے، تیرا رواں رواں میرا محتاج ہے۔ تو میری بات سنتا ہی نہیں اور مجھے کہتا ہے کہ میں تیری بات نہیں مانتا۔ تو جو مخلوق ہے، مجبور ہے، بے بس ہے، تو مجھ سے بے نیاز ہے! تو مجھے پابند کرتا ہے کہ میں تیری باتوں پہ کان لگائے بیٹھا رہوں۔ میں تو پھر بھی سنتا ہوں، نور چشم عطا کرتا ہوں، دماغ دے رکھا ہے، سوچ دے رکھی ہے، فکر دے رکھی ہے، اولاد دے رکھی ہے، دنیا کی نعمتوں سے مالا مال کر رکھا ہے۔ میں نے کتنی نعمتیں دے رکھی ہیں اور تو ہے کہ میری سنتا ہی نہیں۔ تیرے پاس فرصت ہی نہیں اور پھر تو کہتا ہے کہ اللہ کہاں ہے؟ تو میری طرف پشت کر کے کھڑا ہے اور پھر مجھ سے پوچھتا ہے اے اللہ تو کہاں ہے؟ فرمایا، میں تیرے سب سے قریب ہوں، تو بھی تو میری طرف متوجہ ہو۔ تو بھی برکات محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سینے میں سجا، تو بھی تو میرے طرف متوجہ ہو۔ تو بھی برکات محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو سینے میں سجا کہ تیرے دل کی آنکھ کھلے، تیرے سجدوں، تیرے قیام اور تیرے رکوع میں مزا آجائے۔ تو دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو تجھے پتا ہو کہ میرے ہاتھوں پہ تجلیات باری رقصاں ہیں۔ کام ہو نہ ہو، تجھے بات کرنے کا مزا آجائے۔ جنہیں اللہ سے کلام کا یہ مزا نصیب ہوتا ہے، وہ کام کے لیے دعائیں نہیں کرتے۔ انہیں چسکا لگ جاتا ہے کہ بات تو اللہ سے ہو رہی ہے۔ آگے جو ہوگا اس کی مرضی، جو اس کا جی چاہے وہ کرے گا لیکن بات تو رب العلمین سے کر رہا ہوں۔ دعا کا یہ درجہ کیا کم ہے کہ ایک بندہ براہ راست اللہ کریم سے بات کر رہا ہے!

فرمایا: میں تو قریب تر ہوں اور میں تمہاری دعائیں بھی قبول کرتا ہوں لیکن فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ۔۔۔ تم بھی تو میری بات سن لو۔ وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ۔۔۔ مجھے مانو تو سہی کہ اللہ بھی ہے۔

قرآن نے فرمایا: اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ ۔۔۔۔نماز بے حیائی اور برائی سے روک دیتی ہے۔اس کے برعکس صورت یہ ہے کہ اکثر پانچ وقت نماز بھی پڑھتے ہیں لیکن تولتے کم ہیں، قیمت دگنی لیتے ہیں، چیز غلط دیتے ہیں، ہر خرابی کرتے ہیں تو نماز کیوں نہیں روکتی۔ بھئی یہ نماز ہو تو روکے لیکن اگر رسم نماز ہو تو وہ کیا روکے گی! صاحب استطاعت پر اللہ نے زندگی میں ایک حج فرض کیا ہے یعنی جس کے پاس اخراجات ہوں، صحت بھی ساتھ دے، کوئی خطرہ بھی نہ ہو، پسماندگان کو بھی اخراجات دے آئے، اتنے پیسے ہوں کہ ان کا انتظام بھی ہو جائے تو زندگی میں ایک مرتبہ حج کرلے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ حاجی گناہوں سے اس طرح پاک ہوتا ہے جیسے آج پیدا ہوا ہو لیکن ہمارا آج کا تجربہ اس کے برعکس ہے کہ ہر دکاندار، ہر بیوپاری، جسے دیکھو حاجی ہے لیکن الٹی چھری سے ذبح کیے جارہا ہے۔ یہ ٹھیک کیوں نہیں ہوتے اس لیے کہ حج نہیں ہوتا، رسم حج ہوتی ہے۔ حج ہوتا تو جانے والا بندہ اور جو آتا وہ دوسرا بندہ ہوتا۔ اس کی شخصیت بدل جاتی، اس میں محبت، پیار، کرم آجاتا، امانت، دیانت آجاتی اور اس کے لین دین کے سارے طریقے بدل جاتے۔

تو وہ فرماتا ہے کہ میں تمہارے قریب ہوں، سب سے قریب ہوں، تمہاری بات مانتا ہوں لیکن یہ تم ہی ہو جو میری بات سنتے بھی نہیں، مانتے بھی نہیں، خرابی یہاں ہے۔ جہاں سے رحمتیں بٹ رہی ہیں، جمال الٰہی تقسیم ہو رہا ہے وہاں خرابی نہیں ہے۔ اپنے ارادے ٹھیک کرو۔ برکات محمد صلی اللہ علیہ وسلّم دلوں میں سجاؤ۔ احکام شریعت سے کردار کو روشن کرو اور پھر دیکھو کہ میں تمہارے ہر سجدے میں تمہیں گلے لگالیتا ہوں۔ میں تمہارے ہر قیام میں تمہیں پیار کرتا ہوں۔تمہاری ہر بات کے جواب میں تم پر اپنے انوارات و برکات برساتا ہوں۔

فرمایا: میری بات مانو وَلْيُؤْمِنُوا بِی ۔۔۔۔تمام عمر کلمہ پڑھتے رہے لیکن مجھے مان کر نہیں دیا۔ یہ عجیب بات ہے کہ ہم کلمہ پڑھتے ہیں لیکن اللہ فرماتا ہے کہ تم نے مجھے مانا ہی نہیں۔ جب کلمہ پڑھ کے مرضی اپنی کرتے ہیں تو مانا کیسے! ماننے کا مطلب تو یہ ہے کہ ہماری آرزوئیں ہماری نہ رہیں، اللہ کے احکام بن جائیں اور اگر ہر کام ہم نے اپنی مرضی سے کرنا ہے تو کس بات کو مانا! فرمایا: میں تو قریب ہوں لیکن تم دور ہو۔ مجھے مانو تو سہی۔ جب تم میں سے ہر ایک خدا بنا ہوا ہے اور اپنی بات منوانا چاہتا ہے تو پھر مجھے کب مانتے ہو فَلْيَسْتَجِيبُوا لِی وَلْيُؤْمِنُوا بِی لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ ﴿۱۸۶﴾ فلاح کا، رشد کا، نیکی کا اور بھلائی کا راستہ صرف یہ ہے کہ مجھے مانو اور میری بات سنو۔

رمضان المبارک کے احکام بیان فرماتے ہوئے اللہ کریم نے یہ کرم فرمایا کہ روزے کے اوقات طلوع فجر سے غروب آفتاب تک مقرر فرما دیے اور باقی ساری رات کھانے پینے کی اجازت فرما دی۔ اب اس کے ساتھ ہی ایک

اور اہم مسئلہ خانگی امور کا تھا۔ فرمایا: أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَىٰ نِسَآئِكُمْ ۔۔۔۔رمضان کی راتوں میں میاں بیوی کو جمع ہونے کی اجازت دے دی گئی۔ افطار سے طلوع فجر تک جس طرح عام کھانے پینے کی اجازت ہے، اسی طرح میاں بیوی بھی جمع ہو سکتے ہیں۔

رشتہ زوجین:

دنیا میں جتنے فساد ہوتے ہیں ان میں ایک بہت بڑا سبب جنسی اختلاط بھی ہے ایک مقولہ ہے کہ ہر جھگڑے میں زن، زر یا زمین بنیاد ہوتی ہے۔ جنسی باتوں پہ جھگڑا ہوتا ہے، دولت کے حصول پہ ہوتا ہے یا زمین کا جھگڑا ہوتا ہے۔ ہر فساد کی جڑ میں ان تین باتوں میں سے ایک بات ہوتی ہے۔

جہاں مرد کے کسی خاتون سے تعلقات جھگڑے کی بنیاد بنتے، اسلام نے جنسی اختلاط کو ایک بہت خوبصورت شکل دے دی۔ میاں اور بیوی کا رشتہ اللہ کریم کے نام پر اور اس کے بتائے ہوئے طریقے سے قائم ہوتا ہے۔ اسلام نے ازدواجی تعلقات کو ایک شرعی حیثیت دی اور اس کی حدود و قیود مقرر فرمائیں۔ کن رشتوں میں شادی ہو سکتی ہے اور کیسے رشتے ہیں جو ایک دوسرے پر حرام ہیں، جن میں شادی نہیں ہو سکتی۔ جن میں ہو سکتی ہے ان میں اتنے ہی حقوق خواتین کو دیے جتنے مردوں کو دیے۔ دونوں ذمہ دار ہیں اور دونوں برابر کے حصہ دار ہیں۔

فرمایا: هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَ أَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ۔۔۔۔وہ تمہارا لباس ہیں اور تم ان کا لباس ہو یعنی ازدواجی تعلقات کو اتنا حسن دیا کہ جہاں شرعی طریقے سے یہ تعلق بنتا ہے، دونوں خاندانوں میں باہمی الفت پیدا ہو جاتی ہے۔ بجائے فساد کے ایک نیا رشتہ شروع ہو جاتا ہے اور ایک نئے خاندان کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔ یہ تعلق لوگوں کو قریب لانے کا سبب بنتا ہے جبکہ عام معاشرے میں یہ فساد کا سبب تھا۔ اسلام نے اسے ایسا خوبصورت موڑ دیا کہ وہ لوگوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے کا سبب بن گیا۔ پھر میاں اور بیوی کے لیے جامع بات ارشاد فرما دی کہ عورتیں تمہارا لباس ہیں اور تم عورتوں کا لباس ہو، بیویوں کا لباس ہو۔ سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ لباس ستر پوشی کرتا ہے، پردہ پوشی کرتا ہے، پورے وجود کو ڈھانپ لیتا ہے اور پورے وجود کی پردہ داری رکھتا ہے میاں بیوی میں سے اگر کسی میں کوئی چھوٹی موٹی غلطی بھی ہو یا کسی سے قصور بھی ہو جائے تو اسے اشتہار نہ بنایا جائے، ایک دوسرے کو بدنام نہ کیا جائے۔ یہ میاں بیوی دونوں پر برابر واجب ہے کہ اگر میاں سے قصور ہوتا ہے تو بیوی اس کا لباس ہے، اس سے بات کرے لیکن اس بات کو عام نہ کرے۔ اسی طرح اگر بیوی سے کوئی غلطی سرزد ہو جاتی ہے تو میاں کا کام ہے کہ اس سے تو بات کرے، اس کی اصلاح کی کوشش کرے لیکن اسے عام نہ کرے اور اسے بدنام نہ کرے۔ لباس صرف ستر پوشی

نہیں کرتا، لباس عزت اور زینت کا سبب بنا چاہیے۔

تیسری بات یہ ہے کہ لباس گرم و سرد سے بھی بچاتا ہے۔ گرمیوں کا لباس الگ اور سردیوں کا الگ ہوتا ہے۔ گرمیوں کا لباس گرمی کی شدت سے محفوظ رکھتا ہے، سردیوں کا سردی کی شدت سے محفوظ رکھتا ہے۔ گویا میاں بیوی کا رشتہ بھی ایسا ہے کہ دنیوی امور میں، مشکلات میں، دنیوی تکالیف میں ایک دوسرے کا ساتھ دیں اور ایک دوسرے کو تحفظ دیں۔ یعنی ایک خاتون نے، ایک مرد نے اللہ کے نام پر رشتہ جوڑا ہے۔ اللہ نے انہیں ایک دوسرے پر حلال کر دیا ہے تو اب ان دونوں کی ذمہ داریاں بھی ہیں۔ جیسے خاتون کی ذمہ داری ہے کہ مرد کما کر لاتا ہے تو اس کے مال میں اسراف نہ کرے، اس کو ضائع نہ کرے، اس کے مال کی حفاظت کرے، اس کے بچوں کی اچھی طرح سے تربیت کرے، اس کی آبرو کی حفاظت کرے۔ اسی طرح مرد کے ذمے بھی ہے کہ وہ خاتون کی ضروریات پوری کرے، اسے تنگ نہ کرے، اس کا احترام کرے، اس کے والدین اور اس کے بہن بھائیوں سے محبت سے پیش آئے اور اسے ہر طرح کا تحفظ فراہم کرے۔ یہ عورت کا شرعی حق ہے۔ اگر کوئی خاوند بیوی کے حقوق ادا نہیں کرتا تو عورت کے پاس راستہ کھلا ہے کہ وہ خلع حاصل کر سکتی ہے اور قاضی کو اختیار ہے کہ وہ نکاح کو ختم کر دے۔

حقوقِ نسواں:

آج عورتوں کے حقوق کی بات ہو رہی ہے اور بڑی عجیب بات ہے کہ جو لوگ عورتوں کے حقوق بری طرح پامال کر رہے ہیں، وہی حقوق نسواں کے مدعی بنے ہوئے ہیں۔ خود ان لوگوں نے اور ان اقوام نے خاتون کو انتہائی ذلت اور رسوائی سے دوچار کر دیا ہے۔ چند سکوں کی چھوٹی چھوٹی مصنوعات بیچنے کے لیے عورت کو اشتہار بنا دیا ہے، اس کی حرمت کو مجروح کر دیا ہے، اس کی کوئی اہمیت باقی نہیں چھوڑی اور برابری کے حقوق صرف یہ دیے ہیں کہ مردوں کے ساتھ اسے بھی مشقت کے میدان میں جوت دیا ہے لیکن بحیثیت خاتون اس کا جو اعزاز تھا وہ سارا چھین لیا ہے۔

اسلام سے پہلے بھی یہی عالم تھا کہ عورتوں کو انسان سمجھا ہی نہیں جاتا تھا بلکہ استعمال کی چیز سمجھا جاتا تھا۔ خرید فروخت ہوتی، قتل کر دیتے تو کوئی پوچھنے والا نہیں ہوتا تھا اور جہاں ڈاکے پڑتے، قتل و غارت گری ہوتی، لوگ مال لوٹتے، وہاں عورتیں اور بچے بھی لوٹ کر لے جاتے۔ بچوں کو غلام بنا کر بیچ دیتے اور عورتوں کو بیچ کر پیسہ کما لیتے۔ پھر ان کی کوئی حرمت، کوئی عزت، کوئی احترام نہیں تھا۔ جس کا جو جی چاہتا ان کے ساتھ وہ سلوک کرتا۔ پہلی دفعہ غالباً چھٹی صدی عیسوی کے نزدیک رومیوں نے ایک قانون بنایا جس میں عورت کو انسان تسلیم کیا گیا۔ قانونی طور پر تو اسے انسان ہونے کا درجہ دیا گیا لیکن اس قانون میں بھی اسے یہ درجہ دیا گیا کہ یہ انسان تو ہے

لیکن مرد کی خدمت کے لیے پیدا ہوئی ہے، مرد کا حق ہے کہ جس طرح چاہے، خاتون سے خدمت لے، جیسا چاہے سلوک کرے لیکن وہ فریاد نہیں کرسکتی۔ یہ ایک بہت بڑا انقلابی قانون تھا لیکن اس میں بھی عورت کی بحیثیت عورت کوئی عزت، کوئی حرمت نہیں تھی۔

یہ احسان بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا، اسلام اور دین برحق کا ہے کہ خاتون کو برابر کا انسان قرار دیا۔ اسلام نے یہ بتایا کہ جس طرح خاتون کے ذمے حقوق ہیں، اسی طرح خاتون کو بھی حقوق حاصل ہیں۔ کسی کو کسی پر اس طرح برتری حاصل نہیں ہے کہ یہ عورت ہے اور یہ مرد ہے۔ بلکہ برتری کا معیار اس کا کردار، اس کے اعمال، اس کا ایمان، اس کی عقیدت اور اس کا حسن عمل ہے۔ مرد کو عورت پر اس کی جسمانی ساخت کے اعتبار سے حقوق دیے۔ خاتون اور مرد کے وجود میں، جسمانی ساخت میں بھی فرق ہے، مزاجوں میں بھی فرق ہے اور اس اعتبار سے ان کے فرائض میں بھی فرق رکھا گیا۔

میں اسے یوں عرض کیا کرتا ہوں کہ اگر ایک نیا باغ لگایا جائے اور اس میں ننھے ننھے پودے لگائے جائیں تو اس باغ کی خبر گیری کرنا، نالی کھود کر اس کے لیے پانی لے کے آنا، سر پر بوجھ اٹھا کر کھاد لانا، اسے تحفظ دینا، مشقت کے کام جتنے تھے، یہ مرد کے ذمے لگائے گئے۔ جسمانی ساخت کے اعتبار سے وہ مضبوط ہے اور معاشرے میں مل جل کر کام کرسکتا ہے لیکن ان ننھی مُنّی کونپلوں کو پیار و محبت سے پروان چڑھانا، ان کی نگہداشت کرنا، ایک ایک پتے کی نگہداشت کرنا، ان سب کے لیے ایک ایسی محبت چاہیے تھی جو اللہ نے صرف ماں کے وجود میں، ماں کے دل میں سموئی ہے۔ ایک خاندان جس کی نئی بنیاد رکھی گئی ہے، اس کے بچوں کی پرورش، ان کی تربیت، ان ننھی کونپلوں کو پروان چڑھا کر نیک، صالح اور سنجیدہ نوجوان بنانا، یہ مشقت عورت کے ذمے لگائی گئی اور اس کے دل میں وہ محبت اور شفقت ڈال دی گئی جو اس کام کے لیے ضروری تھی۔ ان کے تحفظ کے اقدامات کرنا اور باہر سے روزی کما کر لانا، یہ سارے کام مرد کے ذمے لگائے گئے۔

فرائض میں فرق ہے، فرائض کی صورت میں فرق ہے لیکن ذمہ داری میں فرق نہیں ہے۔ اتنی ہی عورت کی ذمہ داری ہے جتنی مرد کی ذمہ داری ہے۔ ایک ہی میدان میں دونوں کا حساب ہوگا، ایک جیسے اعمال پر ایک جیسا صلہ ملے گا، ایک ہی جنت ہے اور ایک ہی جہنم جو مرد و عورت، دونوں کے لیے ہے۔ جہنم میں اگر اپنے کردار سے، اپنے کفر کی وجہ سے مرد جائیں گے تو کافر عورتیں بھی جائیں گی اور جنت میں اگر اہل ایمان جائیں گے تو اہل ایمان خواتین بھی جائیں گی۔ ان دونوں میں کوئی فرق نہیں رکھا گیا۔

مزاج اور وجود کے اختلاف کی وجہ سے ان کی ذمہ داریاں بھی مختلف کر دی گئیں لیکن بحیثیت انسان، دونوں انسان ہیں، دونوں برابر مکلف ہیں اور دونوں کے حقوق برابر ہیں۔ جتنا مرد کا حق ہے کہ عورت اس کے مال کی حفاظت کرے، اس کا احترام مدنظر رکھے، اس کی آبرو کی حفاظت کرے اور ہر مشکل میں اس کا ساتھ دے۔ اسی طرح مرد کے ذمہ بھی واجب ہے کہ عورت کی آبرو کا لحاظ رکھے، اس کے اہل خاندان کا احترام کرے، اس کے ساتھ بنا کے رکھے، اس کو تنگی نہ آنے دے، حتی الامکان جتنی محنت کر سکتا ہے، جو کما کے لاتا ہے وہ اسے دے اور بچوں کی تربیت میں اس کا ہاتھ بٹائے۔ مرد فارغ ہو تو گھر کے کام کاج میں بھی ہاتھ بٹانا چاہیے۔

خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم ازواج مطہرات رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے ساتھ خانگی امور میں بھی ہاتھ بٹایا کرتے تھے۔ ایک دفعہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم حضرت عائشہ صدیقہ، حبیبہ حبیب کبریا رضی اللہ عنہا کے پاس مقیم تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا: کھانا ذرا جلدی بنا دو کہ باہر لوگ تیار کھڑے ہیں اور مجھے ان کے ساتھ جانا ہے۔ وہ جب آگ جلانے لگیں تو آٹا گوندھا ہوا پڑا تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا، تم آگ جلاؤ، میں اتنے میں روٹی بنا لیتا ہوں، جلدی ہو جائے گی۔ روٹی بن گئی تو ام المومنین رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے توے پہ ڈال دی۔ اب حضور صلی اللہ علیہ وسلّم منتظر ہیں، آگ جل رہی ہے، توا گرم ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کو جلدی بھی ہے اور آٹا ویسے کا ویسا توے پر پڑا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا: عائشہ دیر ہو رہی ہے۔ انہوں نے عرض کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم آپ صلی اللہ علیہ وسلّم نے جس آٹے کی روٹی بنائی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کے ہاتھ جس کو لگے ہیں، آگ تو اس پر اثر نہیں کر رہی۔ میں نے تو عرض کیا تھا کہ مجھے بنانے دیجیے۔ یعنی اس حد تک حضور صلی اللہ علیہ وسلّم خانگی امور میں تعاون فرماتے تھے۔

کوئی عیب کی بات نہیں کہ مرد فارغ بیٹھا ہے تو سبزی کٹوا دے یا کسی اور کام میں مدد کر دے بلکہ یہ مسنون بھی ہے۔ مرد پر یہ واجب ہے کہ عورت کا لحاظ رکھے، اس کے رشتہ داروں عزیزوں کا لحاظ رکھے، کسی طرح سے پریشان نہ کرے اور کوئی ایسا کام نہ کرے جس میں اس کی توہین کا پہلو نکلتا ہو۔ اگر اس سے کوئی غلطی بھی ہو جائے تو اس کی اصلاح کی کوشش کرے، اسے تنبیہ بھی کرے لیکن اس کی غلطی کو اشتہار نہ بنائے، بے عزتی نہ کرے، لوگوں میں اسے بدنام نہ کرے۔ یہ کتنا خوبصورت چھوٹا سا جملہ ہے جس میں معانی کے دریا سمو دیے۔ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ ۔۔۔ عورتیں تمہارا لباس ہیں وَأَنتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ۔۔۔ اور تم عورتوں کا لباس ہو۔ دونوں کو ذمہ داریاں برابر تقسیم فرما دیں۔

صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا عمل آسانی کا موجب بنا:

جب رمضان المبارک کے سحری و افطاری کے اوقات معین ہو گئے تو یہ حکم آنے سے پہلے بعض

صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے اپنی بیویوں سے مباشرت کر لی لیکن وہ کیسے عجیب لوگ تھے کہ جو بات ہو جاتی اور وہ سمجھتے کہ ہم سے قصور ہوا تو فوراً بارگاہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلّم میں حاضر ہوتے اور عرض کرتے یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم میں نے تو ایسا کر دیا۔ بات بارگاہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلّم میں پہنچی تو جواب اللہ کی طرف سے آیا۔

فرمایا: عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَ عَفَا عَنْكُمْ۔۔۔

اللہ جانتا ہے، اللہ کو پتا ہے کہ اس معاملے میں تم میں سے بعض لوگوں سے غلطی ہوگئی اور انہوں نے مباشرت کر لی۔ فَتَابَ عَلَيْكُمْ۔۔۔ اس نے تمہاری توبہ قبول کر لی۔ تم نے جب بارگاہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلّم میں بات عرض کر دی تو اس نے تمہاری توبہ قبول کر لی وَ عَفَا عَنْكُمْ۔۔۔ اور تمہیں معاف کر دیا۔

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی زندگی حق و باطل کا معیار ہے۔ ان کے درمیان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم جلوہ افروز تھے اور وحی الٰہی آ رہی تھی۔ وہ جو کام کرتے، اگر اس میں کہیں قصور ہوتا تو اصلاح بھی فرما دی جاتی اور ساتھ ہی معافی کا مژدہ بھی سنا دیا جاتا کہ اللہ نے تمہیں معاف کر دیا۔ اللہ کو پتا ہے کہ بعض لوگوں سے یہ غلطی ہوئی لیکن تم اصحابِ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم ہو، تم نے غلطی کو چھپا کر اسے بڑھانے کی کوشش نہیں کی بلکہ اگر غلطی ہوئی تو بارگاہِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلّم میں آئے، بات اللہ کی بارگاہ میں پہنچی اور اس نے تمہارے اس اقبال جرم کو تمہاری توبہ بنا دیا فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَ عَفَا عَنْكُمْ۔۔۔ اس نے تمہاری توبہ قبول کر لی اور تمہیں معاف فرما دیا۔ یعنی بات کی وضاحت ہوگئی۔

فَالْـٰٔنَ بَاشِرُوْهُنَّ وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ۔۔۔ اب آپ اپنی بیویوں سے مباشرت کر سکتے ہو۔ اللہ نے جو تمہارے لیے لکھ دیا ہے اسے حاصل کرو یعنی یہ ازدواجی تعلق محض شہوت رانی نہیں، بلکہ اس پر ایک خاندان کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔ معاشرے کو ایک نیا خاندان دیا جاتا ہے اور جس خاندان کی پرورش نفرت پر ہوگی، ایک دوسرے کے ساتھ جھگڑے پر ہوگی، ایک دوسرے کو طعنے دینے پر ہوگی، ایک دوسرے کی تذلیل پر ہوگی، وہ کیا پروان چڑھے گا؟ چونکہ میاں بیوی کو ایک دوسرے کے لیے حلال کرتے ہوئے ایک نئے خاندان کی بنیاد رکھ دی گئی تو ظاہر ہے کہ اس کی بنیاد میں مٹھاس ہونی چاہیے، ایک دوسرے کے احترام کی مٹھاس ہونی چاہیے، ایک دوسرے کے تحفظ کا اثر ہونا چاہیے تا کہ اللہ تمہیں جو بچے دے، وہ بچے، میاں بیوی، ایک نیا خاندان معاشرے میں قابل رشک ہو، محبت کرنے والا ہو، ایثار کرنے والا ہو، جرأت مند ہو، حق پر ڈٹ جانے والا ہو اور باطل کا مقابلہ کرنے کی سکت رکھتا ہو۔

صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم معیارِ حق ہیں:

یہ بھی واضح ہوگیا کہ اسلام کیا ہے؟ قرآن کیا ہے؟ قرآن اللہ کی کتاب ہے، اس میں اللہ کے احکام ہیں اور اللہ کے احکام کی وضاحت ہے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی حدیث، آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی سنت اور سنت کی وضاحت ہے۔ صحابہ کرامؓ سے اگر بتقاضائے بشریت کوئی کام سنت کے خلاف ہوگیا تو اللہ نے، اللہ کے حبیب صلی اللہ علیہ وسلّم نے فوراً اصلاح فرمادی اور اس سے روک دیا لہٰذا اصحابہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے صحابہؓ بعد میں آنے والی ساری امت کے لیے معیارِ حق ہیں۔

امت کے تین گروہ جن سے اللہ راضی ہوا:

اللہ کریم نے پوری امت کو تین حصوں میں تقسیم فرمایا ہے۔ وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ۔۔۔۔ مہاجرین کا وہ گروہ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلّم پر مکہ مکرمہ میں ایمان لایا، ہجرت کی سعادت سے سرفراز ہوا اور ہجرت کر کے مدینہ منورہ آیا۔ وَالْاَنْصَارِ۔۔۔۔۔ دوسرا وہ گروہ جنہوں نے مدینہ منورہ میں اپنے سینے وا کر دیے، اپنے گھروں کے دروازے کھول دیے، انہیں قبول فرمایا اور ان کی نصرت کی یعنی انصار۔ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے یہ دو گروہ ہیں مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ۔۔۔۔ ہجرت کر کے آنے والے اور ان کی نصرت کرنے والے۔ تیسرا گروہ قیامت تک آنے والے لوگوں میں وہ ہے وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ (التوبہ:100) جو خلوصِ دل سے ان کے نقوشِ قدم پر چلا، جس نے پوری دیانت داری سے اور دل کی گہرائی سے اور پورے خلوص سے انصار و مہاجرین کا اتباع کیا اللہ ان پر راضی ہوا اور اللہ ان کو راضی کرے گا، علماء نے لکھا ہے کہ اس آیت سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ صحابہ کبار رضوان اللہ علیہم اجمعین معیارِ حق ہیں۔

اوقات سحر وافطار:

وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ۔۔۔۔ کھاؤ پیو جب تک طلوع فجر کی سفیدی اور سیاہی الگ الگ نظر نہ آنے لگے۔ جب فجر طلوع ہو جائے، تب تک خواہ کوئی سو جائے تو اٹھ کر پھر کھا لے۔ جب فجر طلوع ہوتی ہے تو اندھیرا اٹھنے لگتا ہے اور نیچے سے سفیدی نظر

آنے لگتی ہے، جب سفیدی کا خط واضح ہو جائے تو روزہ شروع ہو جائے گا۔ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ پھر روزے کو رات تک پورا کرو۔ یہ امت محمد یہ پہ اللہ کریم نے احسان فرمایا کہ ایک ماہِ مبارک معین فرما دیا اور اس معین مہینے میں بھی اوقات معین فرما دیے کہ سپیدہ سحر تک، یعنی دن کا روزہ رکھا اور رات کا معاف فرما دیا گیا۔ یہ آسانی فرما دی گئی کہ طلوع فجر کے ساتھ روزہ رکھیں اور رات میں داخل نہ کریں۔ رات ہونے سے پہلے ختم کر دیں۔

عموماً روزہ رکھنے میں تو لوگ احتیاط کرتے ہیں، افطاری میں احتیاط نہیں کرتے۔ قمری مہینوں میں غروب آفتاب سے پچھلا دن ختم ہوتا ہے۔ رات شروع ہوتی ہے تو یہ اگلی تاریخ کی ہوتی ہے۔ جس رمضان کا چاند دیکھ کر آپ تراویح پڑھتے ہیں۔ لیکن وہ دن تو شعبان کا تھا، دن ختم ہوا، چاند نظر آیا تو رمضان شروع ہو گیا۔ یہ رات رمضان شریف کی ہے۔ اسی طرح شوال کا چاند نظر آتا ہے تو آپ تراویح نہیں پڑھتے، اگلی صبح عید کرتے ہیں۔ رات کو کوئی تراویح نہیں پڑھتا۔ کیوں نہیں پڑھتے؟ اس لیے کہ رمضان مغرب کے ساتھ سورج ڈوبنے کے ساتھ ہی ختم ہو گیا۔ مغرب کی اذان اگلے دن کی پہلی اذان ہے اور مغرب کی نماز اگلی تاریخ کی پہلی نماز ہے اور وہ تاریخ چونکہ شوال کی ہے، اس میں تراویح نہیں ہے۔ جس طرح شمسی تاریخ رات بارہ بجے بدلتی ہے اسی طرح قمری تاریخ سورج ڈوبنے کے ساتھ تبدیل ہو جاتی ہے۔ لوگ عموماً افطار میں تاخیر کرتے ہیں، دیر کرتے رہتے ہیں کہ اچھی طرح اندھیرا ہو جائے۔ اس طرح رات شروع ہو جاتی ہے اور روزے کا حکم ہے کہ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ۔۔۔ روزے کو رات تک پورا کرو، رات میں داخل نہیں کرنا۔

ہمارے زمانے میں ایک رواج تھا کہ اذان ہوتی تھی تو ہم افطار کرتے تھے، وہ بھی غلط تھا۔ اذان سے پہلے افطار کا وقت ہوتا ہے اور افطار کرنے کے بعد مغرب کی اذان کا وقت آتا ہے۔ جب سورج ڈوب جاتا ہے تو روزہ افطار ہو جاتا ہے اس کے درمیان پانچ سات منٹ کا وقفہ ہوتا ہے، پھر مغرب کی اذان کا وقت ہوتا ہے۔ دین کے معاملے میں ہماری کوتاہی یہ ہے کہ دین کے پاس آج قوت نافذہ نہیں ہے۔ دین اللہ کا حکم ہے اور یہ حاکم ہو کر رہتا ہے۔ جب اس کے پاس اختیار نہ ہو، اقتدار نہ ہو تو پھر دین نہیں رہتا، پھر جس کا جو جی چاہے وہ کرتا رہتا ہے۔ اب سرکاری حکم ہے تو جس نے چاند دیکھا اس نے بھی عید کر لی اور جس نہیں دیکھا اس نے بھی کر لی لیکن افطار پہ چونکہ کوئی سرکاری حکم نہیں ہوتا، چھوٹے چھوٹے گاؤں میں بھی پانچ پانچ دفعہ افطار کے وقت کا اعلان ہوتا ہے۔ ہر مولوی نے اپنی اپنی گھڑی کے مطابق مقرر کیا ہوتا ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ گھڑیاں کبھی ایک ٹائم پر نہیں ہوتیں۔ ہر گھڑی کا اپنا ٹائم ہوتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ روزہ اور نماز گھڑی کی محتاج نہیں ہے۔ جب نمازیں فرض ہوئیں تب کوئی گھڑی نہیں تھی اور جب روزے فرض ہوئے تب کوئی گھڑی نہیں تھی۔ آپ کو سورج کی گردش کے ساتھ وقت کا تعین کرنا ہے۔

سورج ڈوب گیا، روزہ افطار ہو گیا۔ گھڑی کی مرضی جو اس کا جی چاہے کہتی رہے۔ علماء حق فرماتے ہیں کہ ہم جو متعین کر لیتے ہیں کہ دو بجے نماز ہو گی تو روزانہ دو بجے ہی پڑھنا مکروہ ہے۔ اللہ نے ایک کھلا وقت دیا ہے کہ آفتاب جب زوال پر آجائے اور دوپہر سے ٹل جائے تو ظہر کا وقت شروع ہو جاتا ہے۔ عصر تک یہ سارا وقت ظہر کا ہے۔ اب اس میں کسی وقت بھی نماز پڑھ سکتا ہے۔ اول وقت پڑھنا افضل ہے۔ علماء فرماتے ہیں کہ اگر نماز کا وقت مقرر کیا جاتا ہے کہ دو بجے پڑھیں گے تو کبھی پانچ منٹ کم دو پر پڑھ لو، کبھی دو بج کر دو منٹ پر پڑھ لو، کبھی دو بجے پڑھ لو، اس لیے کہ گھڑی کے ساتھ نماز کو نتھی کرنا مکروہ ہے۔ نماز کسی گھڑی کی پابند نہیں، اوقات نہار کی پابند ہے۔ جب اللہ نے کوئی ایک وقت مقرر نہیں کیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی گھڑی کا وقت مقرر نہیں کیا تو کسی تیسرے کو کیا حق ہے کہ وہ ایک وقت معین کر دے۔ مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے تھے کہ یہ ٹن کی نمازیں مکروہ ہیں۔ گھڑی نے ٹن کی اور نماز کھڑی ہو گئی۔ فرماتے تھے یہ ٹن کی نمازیں ہیں، وقت کی نمازیں نہیں ہیں۔

روزے کے لیے شرط یہ ہے کہ سپیدۂ سحر نمودار ہو تو روزہ بند کریں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ احتیاطاً بہت جلدی کر لینا چاہیے وہ بھی درست نہیں ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ حضرت ''بلال'' کی اذان تمہیں سحری کھانے سے مانع نہ ہونی چاہیے کیونکہ وہ رات سے اذان دے دیتے ہیں اس لیے تم بلال کی اذان سن کر بھی اس وقت تک کھاتے پیتے رہو جب تک ابن اُم مکتوم کی اذان نہ سن لو کیونکہ وہ ٹھیک طلوعِ صبح صادق پر اذان دیتے ہیں''۔ (البخاری) (مزید حوالہ معارف القرآن جلد اوّل) لہٰذا جب تک طلوع سحر نہ ہو، جب تک سپیدہ سحر نمودار نہ ہو، تاریکی اور سفیدی میں خط فاصل نظر نہ آجائے، تب تک روزہ رکھنے کا وقت ہے، تب تک سحری کا وقت ہے اور سحری کھانا سنت ہے جو بجائے خود افضل ہے۔

وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ ۙ فِی الْمَسٰجِدِ ؕ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿۱۸۷﴾ ہاں جو لوگ مساجد میں آکر اعتکاف بیٹھ جاتے ہیں ان کے لیے مباشرت پر بھی پابندی ہو جاتی ہے کیونکہ اعتکاف کلی طور پر دنیوی امور سے یکسو ہو کر اللہ کی یاد میں بیٹھ جانا ہے۔ مسنون اعتکاف بیس رمضان سے شوال کا چاند طلوع ہونے تک ہوتا ہے۔ نفلی اعتکاف آپ تھوڑی دیر کا بھی کر سکتے ہیں، تھوڑے دنوں کا بھی کر سکتے ہیں اور رمضان یا غیر رمضان میں بھی کر سکتے ہیں۔ مسنون اعتکاف ہو یا کوئی بھی اعتکاف ہو، اگر آپ مسجد میں بیٹھیں تو اعتکاف کے دورانیہ میں مباشرت جائز نہ ہو گی۔ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا ۔۔۔۔۔ یہ احکام شرعی اللہ کی حدود ہیں حدود کے قریب بھی مت پھٹکو کہ بالکل عین حدود کے قریب ہونا کسی وقت حد کو توڑنے کا سبب بھی بن سکتا ہے۔ جیسے میاں بیوی روزے کی

حالت میں ایک دوسرے کو ہاتھ لگا لیتے ہیں، پیار کر لیتے ہیں، بوس و کنار کر لیتے ہیں تو یہ منع نہیں ہے۔ جب تک مباشرت نہ ہو اس سے روزہ نہیں ٹوٹے گا لیکن مکروہ ہے، اس لیے کہ مباشرت کی طرف لے جانے کا سبب ہے۔ ایک دن نہ سہی لیکن کسی روز تو روزہ ٹوٹ بھی سکتا ہے۔ اس لیے فرمایا، حدود کے قریب بھی مت پھٹکو یعنی ایسے کاموں سے بھی پرہیز کرو جو گناہ کا سبب بن سکتے ہوں یا شرعی حکم کو توڑنے کا سبب بن سکتے ہوں۔ یہ اللہ کی حدود ہیں اور ان کے قریب مت پھٹکو۔

اللہ کے احکام واضح اور ان پر عمل آسان ترین ہے:

كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿۱۸۷﴾ اسی طرح اللہ واضح کر کے تمہیں احکام سناتا ہے، کسی میں کوئی ابہام نہیں ہوتا۔ اللہ کا کوئی حکم بھی ایسا نہیں ہے جس میں کسی کو شبہ گزرے، اشتباہ پیدا ہو یا ابہام پیدا ہو۔ اللہ کے احکام بڑے واضح، بڑے صاف ستھرے، بڑے روشن ہیں اور سب کا مقصد یہ ہے لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿۱۸۷﴾ کہ تمہیں تقویٰ نصیب ہو جائے۔ اللہ کریم تم سے بیگار نہیں لینا چاہتے، تم پر بوجھ نہیں لادنا چاہتے بلکہ تمہیں وہ طرز عمل بتا رہے ہیں جس میں تمہیں اللہ سے ایک خالص تعلق پیدا ہو جائے، تم اللہ سے محبت کرنے لگو، اللہ کو چاہنے لگو اور اس حد تک اللہ کے طالب بن جاؤ کہ تمہیں اللہ کی نافرمانی کا تصور بھی نہ آئے۔ انسان کو مجبور کرنے یا اس پر مصیبت ڈالنے یا اس پر بوجھ ڈالنے کے لیے نہیں بلکہ یہ تو نری آسانیاں ہیں۔ آپ معاشرے میں اور زندگی میں دوسرے طریقوں کو بھی آزما کر دیکھیں، اور اسی کام کو شرعی طریقے سے بھی کر کے دیکھیں تو شرعی طریقے سے کام کرنا غیر شرعی طریقے کی نسبت آسان ہوتا ہے۔ اس میں آسانی بھی ہے، اس میں اللہ کی رحمت بھی ہے اور اس میں اللہ کی یاد قدم قدم پہ وابستہ ہے، ایک ایک دم کے ساتھ وابستہ ہے۔ آپ جو کام کر رہے ہیں، وہ جب اللہ کے حکم کے مطابق کر رہے ہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مطابق کر رہے ہیں تو اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی یاد بھی اس میں دم دم کے ساتھ وابستہ ہے اور یہی مقصد حیات ہے۔ یہ سعادت ہے کہ تمہیں اللہ کریم سے اتنا تعلق پیدا ہو جائے، اتنی محبت پیدا ہو جائے، جنوں کی حد تک عشق پیدا ہو جائے کہ تم متقی بن جاؤ یعنی اللہ کی نافرمانی برداشت نہ کر سکو۔

مالی معاملات:

تقویٰ کے برعکس بات جب مال کی آتی ہے تو آپس میں جھگڑا ہوتا ہے۔ زمین بھی مال میں آجاتی ہے اور دولت بھی مال میں آجاتی ہے۔ اللہ کریم نے اس کا بھی ایک خوبصورت حل بتا دیا ہے۔ فرمایا: وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ

بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ۔۔۔۔ ناجائز طریقے سے آپس میں ایک دوسرے کا مال کھانے کی کوشش نہ کرو۔

وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿١٨٨﴾ اور کسی کی سفارش ہو یا کسی کی واقفیت ہو تو وہ اپنے جھگڑے کو عدالتوں میں یا حکومت میں لے جائے تاکہ ادھر سے اپنے لیے ناجائز فیصلہ کروا لے اور اپنا حق ثابت کروا لے حالانکہ اس کا حق نہ بنتا ہو۔ یاد رکھو! ایک وقت آنے والا ہے جب تم اس عدالت میں کھڑے ہو گے جہاں نہ کوئی ناجائز کام ہوگا، نہ کوئی ناجائز سفارش ہوگی۔ بعض لوگوں کے وسائل کم ہوتے ہیں، بعض کے زیادہ ہوتے ہیں۔ اگر زیادہ وسائل والے لوگ دوسروں سے ان کے مال چھیننا شروع کر دیں تو یہ درست نہیں ہے۔

اموال دو طرح کے ہیں۔ ایک مال وقفِ عام ہے اس میں کسی کا حق نہیں کہ دوسرے کو روکے جیسے سورج کی تپش ہے، دھوپ ہے، ہوا یا بارش ہے تو یہ چیزیں ہر انسان، ہر ذی روح کے لیے وقفِ عام ہیں۔ مال کا دوسرا درجہ وہ ہے جس میں انسان کو ملکیت کا حق دیا گیا ہے۔ اب جو چیز انسان کی ملک بن گئی ہے، زمین ہے یا اس کی دولت ہے، جائز طریقے سے کماتا ہے تو یہ ایک ایسا حق ہے جسے دنیا تسلیم کرتی ہے خواہ دنیا کا کوئی بھی مذہب ہو، کوئی بھی قوم ہو یا کوئی بھی معاشرہ ہو۔ بعض ایسی برائیاں ہیں جن پر پوری دنیا متفق ہے، مثلاً چوری، ڈاکہ، بدکاری، قتل و غارت۔ یہ سارے اس طرح کے کام ہیں جن کے برا ہونے پر پوری انسانیت متفق ہے۔ اسلام نے اس کو آگے بڑھاتے ہوئے ایک خوبصورت حل دے دیا کہ جس کا جو حق ہے، اس سے چھینا نہ جائے، ناجائز طریقے سے نہ لیا جائے اور اگر آپ نے اس کی ملکیت جائز طریقے سے لینی ہے تو قیمت دے کر لیں۔ حصولِ رزق کے معروف ذرائع ہیں اور اسلام نے ایک اصول دیا ہے کہ جو رزق معروف ذرائع کے علاوہ آتا ہے وہ حلال نہیں ہوتا۔ معروف ذرائع کے علاوہ جو بھی آئے گا، وہ چوری کا ہو گیا یا چھینا ہوا ہوگا، وہ اس بندے پر حلال نہیں ہوتا۔ حرام رزق آدمی کو آدمیت سے گرا دیتا ہے۔

حرام رزق کھانے والے کی دعا قبول نہیں ہوتی:

حرام رزق کا سب سے پہلا نقصان یہ ہوتا ہے کہ حرام کھانے والے کی دعا قبول نہیں ہوتی۔ جو بندہ حرام کھاتا ہے، وہ کتنی گریہ وزاری کرے، اس کی دعا قبول نہیں ہوتی۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادِ پاک کا مفہوم ہے۔ کہ ایک شخص بہت دور سے سفر کر کے آئے گا، اس کے پاؤں مٹی سے اٹے ہوں گے، اس کے بال پریشان ہوں گے، اس کے کپڑے پھٹے ہوں گے اور وہ بیت اللہ کے گرد طواف کر رہا ہوگا، اللہ کو پکار رہا ہوگا لبیک اللھم لبیک لیکن بارگاہِ الوہیت سے اس کا کوئی جواب آئے گا نہ

اللہ اس کی فریاد سنے گا۔ عرض کی گئی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اتنی محنت، اتنا مجاہدہ کر کے جو بیت اللہ شریف پہنچ کر اللہ کو پکار رہا ہوگا تو اس کی بات کیوں نہیں سنی جائے گی؟ فرمایا، اس لیے کہ" وَمَطْعَامُهُ حَرَامٌ، وَمَشْرَبُهُ حَرَامٌ، وَمَلْبَسُهُ حَرَامٌ وَغُذِيَ بِالْحَرَامِ فَأَنّٰى يُسْتَجَابُ لِذٰلِكَ "(مسلم)

ترجمہ: اس کا کھانا حرام کا ہے، اس کا پینا حرام کا ہے، اس کا لباس حرام کا ہے اور وہ حرام سے پرورش پایا گیا تو اس کی پکار کا جواب (کیسے) دیا جائے گا؟

اگر حرام کھاتا ہے، چوری سے پیسہ کماتا ہے، رشوت لے کر پیسے جمع کر لیتا ہے، دوسروں کے حقوق غصب کر لیتا ہے اور پھر وہ حج پہ بھی چلا جاتا ہے تو کوئی فائدہ نہیں۔ دنیا میں یہ ہوتا ہے کہ اللہ کریم اس کی درخواست رد فرما دیتے ہیں۔

آخرت میں یہ ہوگا، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: كُلُّ لَحْمٍ نَبَتَ من السُّحْتِ فَالنَّارُ أَوْلَى بِهِ (حلیۃ الاولیاء) کسی کے وجود پر جو گوشت حرام کے رزق سے بنے گا اس کے لیے آگ ہی سزاوار ہے۔ حدیث شریف کی تشریح میں ملتا ہے کہ بعض ایسے مسلمان ہوں گے جن کی نجات تو ہو جائے گی، جو کچھ انہوں نے حرام کھایا اس کی تلافی بھی ہوگئی، معافی بھی ہوگئی لیکن اس کھانے سے جو گوشت وجود کا حصہ بن گیا، اس گوشت کا جلانے کے لیے انہیں جہنم بھیجا جائے گا۔ وہ جل جائے گا تو اس کی جگہ اللہ کریم انہیں نیا گوشت عطا فرما کر جنت بھیجیں گے۔ یعنی بعض ایسے لوگ ہوں گے کہ انہوں نے توبہ کر لی، جس کا رزق لیا تھا اس سے معافی مانگ لی، اللہ نے نجات دے دی لیکن نجات کے بعد اگر ان کے وجود میں حرام کا گوشت ہوگا تو وہ گوشت ضرور آگ میں جلے گا۔ اس کے جلانے کے لیے انہیں دوزخ جانا ہوگا۔ جب وہ جل جائے گا تو اللہ انہیں دوسرا گوشت عطا فرما کر جنت بھیجیں گے۔ حرام کا کوئی ذرہ جو وجود میں ہوگا، وہ جنت میں نہیں جائے گا۔

دنیا کی عارضی زندگی میں اس تھوڑی سی چھینا جھپٹی سے آدمی کی ابدی زندگی کتنی متاثر ہوتی ہے! سب سے بڑی تباہی، سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ اس کی دعا نہیں سنی جاتی۔ انسان کے پاس سب سے بڑا ہتھیار اس کی دعا ہے۔ جب وہ اللہ کی بارگاہ میں ہاتھ اٹھاتا ہے تو اللہ اس کی دستگیری فرماتا ہے۔ یہ سب سے بڑا ہتھیار ہے۔ اس کا مقابلہ دنیا کا کوئی ایٹم بم نہیں کر سکتا، کوئی بڑی سے بڑی توپ نہیں کر سکتی کہ جب کوئی ہاتھ اٹھائے اور اللہ اس کی دست گیری فرما دے، اس کی بات پوری کر دے تو کوئی روکنے والا نہیں ہے۔ اگر حرام لقمہ کھا لیا تو اس سعادت سے محروم ہو گئے، اس سے بڑا نقصان کیا ہوگا! اگر کسی نے لوگوں کو دھوکا دے کر یا رشوت لے کر یا چوری کر کے کروڑوں بھی جمع کر لیے تو حاصل کیا ہوا! اتنا کما نہیں سکتا جتنا اس کا نقصان ہو گیا کہ اس کی دعا ہی رد ہو گئی۔ پھر اس کا دوسرا نقصان یہ ہوا کہ اگر وہ توبہ بھی کر لیتا ہے، تلافی مافات بھی کر دیتا ہے، نجات بھی ہو جاتی ہے لیکن جب حرام کھاتا رہا تو وجود کا جو حصہ یا گوشت پوست حرام سے بنا وہ جنت میں نہیں جائے گا۔

وہ جلانے کے لیے اسے جہنم جانا ہوگا۔ اللہ کریم معاف فرمائے، چند ٹکوں کے لیے کتنا بڑا نقصان ہے!

بعض لوگوں کے حکمرانوں سے، عدالتوں سے، ججوں سے تعلقات ہوتے ہیں۔ وہ ان تعلقات کا ناجائز فائدہ اٹھا کر لوگوں کے اموال ہڑپ کر لیتے ہیں۔ بعض لوگ چرب زبان ہوتے ہیں اور اس چرب زبانی سے ناجائز فائدہ اٹھا لیتے ہیں۔ ایسے لوگ حق پر نہ بھی ہوں تو باتیں کر کے منوا لیتے ہیں کہ میں حق پر ہوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں ترجمہ حدیث: ''بے شک میں بشر ہوں اور بے شک تم میری طرف تنازعات لاتے ہو اور شاید کہ تم میں سے بعض اپنے دلائل بیان کرنے میں چرب زبان ہوں اور میں فیصلہ کر دوں اس کے حق میں جیسا کہ میں سنوں۔ پس جس چیز کا فیصلہ میں اس کے حق میں کر دوں پس اسے چاہیے کہ وہ اسے نہ لے (جبکہ وہ جانتا ہے کہ یہ اس کے بھائی کا حق ہے اس کا نہیں اور اگر اس نے ایسا کر لیا) تو گویا اس نے آگ کا ایک ٹکڑا سمیٹ لیا۔'' (بخاری) یاد رہے! کہ ان عدالتوں سے تو منوایا جا سکتا ہے لیکن روز محشر ایسا کوئی داؤ نہیں چلے گا۔ لہٰذا بات کرتے وقت روز حشر کو یاد رکھنا چاہیے کہ اس عدالت میں کوئی ایچ پیچ نہیں چلے گا۔ وہاں تو سیدھی سیدھی بات ہوگی، حق کی بات ہوگی، حق کے مطابق ہوگی۔

دنیا میں انسانی معاشرے کو تباہ کرنے والے جو دو کام تھے، اسلام نے ان دونوں کو اتنا خوبصورت موڑ دیا کہ وہ معاشرے کی آبادی کا سبب بن گئے۔ جو فساد کا سبب بن رہے تھے وہ صلح کا سبب بن گئے۔ ازدواجی تعلقات کو بھی ایک خوبصورت حسین موڑ دے کر انسانی آبادی کا سبب بنا دیا، معاشرے کی آبادی اور بقا کا سبب بنا دیا اور مالی امور میں بھی اپنے اپنے حقوق کے اندر رہنے کا حکم دے کر فساد کو یکسر ختم کر دیا۔ اب اگر ہم حدود الٰہی سے تجاوز کرتے ہیں تو فساد ہوگا۔

بنیادی بات یہ ہے کہ اگر لوگ اپنے حقوق تک محدود رہیں تو کوئی فساد پیدا ہی نہیں ہوتا اور اگر کوئی اپنی حد میں نہیں رہتا تو اس کے لیے شرعی عدالتیں ہوں۔ انصاف ہونا چاہیے، حکومت کو انصاف کرنا چاہیے، حق دار کو حق دلانا چاہیے اور جو ناجائز کرے اسے سزا دینی چاہیے۔ جزا و سزا کا نظام اصلاح معاشرہ کے لیے ہے۔ محض لوگوں کو تنگ کرنے کے لیے نہیں ہے بلکہ یہ بھی لوگوں کی سہولتوں کے لیے ہے کہ معاشرے میں اصلاح ہو، احترام آدمیت ہو، انصاف ملے، لوگوں کا جائز حق روکا نہ جائے اور کسی کو ناجائز کرنے نہ دیا جائے۔ ہمارے ہاں یہ ہے کہ جو تگڑا ہے وہ ناجائز بھی کر لیتا ہے اور جو کمزور ہے اس کا جائز بھی رہ جاتا ہے۔ اس کے نتیجے میں فساد تو ہوگا! اگر ہمیں اسے ختم کرنا ہے تو ہمیں دیکھنا یہ ہوگا کہ معاشرے میں جس کا جو حق ہے وہ اسے ملنا چاہیے۔ اس بات کو یقینی بنانا ہوگا کہ ہر مستحق کو اس کا حق ملنا چاہیے اور ہر اس بندے کا ہاتھ روکنا چاہیے جو دوسرے کا حق چھیننا چاہتا ہے۔ اگر یہ اصول نافذ ہوگا تو فساد از خود ختم ہو جائے گا۔ کسی کو کسی سے شکایت ہی نہیں رہے گی تو وہ اسے مارنے کیوں بھاگے گا!

سورۃ البقرہ رکوع 24 آیات 189 تا 196

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ؕ قُلْ هِىَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ ؕ وَلَيْسَ الْبِرُّ
بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى ۚ وَاْتُوا الْبُيُوْتَ
مِنْ اَبْوَابِهَا ۪ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۱۸۹﴾ وَقَاتِلُوْا فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ
الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ﴿۱۹۰﴾
وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَاَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ
وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ۚ وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى
يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ ۚ فَاِنْ قٰتَلُوْكُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ ؕ كَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۹۱﴾
فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۹۲﴾ وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ
وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ؕ فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۹۳﴾
اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ ؕ فَمَنِ اعْتَدٰى
عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ ۪ وَاتَّقُوا اللّٰهَ
وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۹۴﴾ وَاَنْفِقُوْا فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا
بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ۛۚ وَاَحْسِنُوْا ۛۚ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۹۵﴾ وَاَتِمُّوا
الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ ؕ فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْىِ ۚ وَلَا
تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْىُ مَحِلَّهٗ ؕ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ
بِهٖٓ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ ۚ فَاِذَآ

اٰمِنۡتُمۡ ۟ فَمَنۡ تَمَتَّعَ بِالۡعُمۡرَةِ اِلَى الۡحَجِّ فَمَا اسۡتَيۡسَرَ مِنَ الۡهَدۡىِ ۚ فَمَنۡ لَّمۡ يَجِدۡ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِى الۡحَجِّ وَسَبۡعَةٍ اِذَا رَجَعۡتُمۡ ؕ تِلۡكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ؕ ذٰلِكَ لِمَنۡ لَّمۡ يَكُنۡ اَهۡلُهٗ حَاضِرِى الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعۡلَمُوۡٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيۡدُ الۡعِقَابِ ﴿۱۹۶﴾

آپ سے چاندوں کے بارے پوچھتے ہیں۔ فرما دیجیے یہ لوگوں کے لیے وقت کی شناخت ہے اور حج کے لیے۔ اور یہ کوئی نیکی نہیں کہ تم گھروں میں اُن کے پیچھے سے آؤ اور لیکن نیکی پرہیزگاری اختیار کرنے میں ہے اور گھروں میں ان کے دروازوں سے آؤ اور اللہ سے ڈرو تا کہ تم فلاح پا سکو ﴿۱۸۹﴾ اور جو تم سے قتال کریں ان سے اللہ کی راہ میں قتال کرو اور زیادتی نہ کرو یقیناً اللہ زیادتی کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتے ﴿۱۹۰﴾ اور ان کو جہاں پاؤ ان کو قتل کرو اور جہاں سے انہوں نے تم کو نکالا تھا انہیں نکال باہر کرو اور شرارت قتل سے بھی سخت تر ہے اور ان سے مسجد حرام کے قریب مت لڑو یہاں تک کہ وہ تم سے وہاں لڑنا نہ شروع کر دیں سو اگر وہ تم سے قتال کریں تو ان کو قتل کرو (کہ) کافروں کی یہی سزا ہے ﴿۱۹۱﴾ پس اگر وہ باز آ جائیں تو یقیناً اللہ بخشنے والا مہربان ہیں ﴿۱۹۲﴾ اور ان سے اس حد تک لڑو کہ فتنہ (کفر) ختم ہو جائے اور دین صرف اللہ کے لیے ہو۔ پس اگر وہ باز آ جائیں تو سوائے غلط کاروں کے کسی پر زیادتی نہ ہوگی ﴿۱۹۳﴾ حرمت والا مہینہ حرمت والے مہینے کے مقابل ہے اور حرمتیں (ایک دوسرے کا) بدلہ ہیں سو اگر کوئی تم سے زیادتی کرے تو تم بھی اس سے اتنی زیادتی کرو جتنی زیادتی اس نے تم پر کی اور اللہ سے ڈرتے رہو اور خوب جان لو کہ اللہ پرہیزگاروں کے ساتھ ہیں ﴿۱۹۴﴾ اور اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور (اپنے آپ کو) اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ ڈالو اور نیکی کرو بے شک اللہ نیکی کرنے والوں کو دوست رکھتے ہیں ﴿۱۹۵﴾ اور حج اور عمرہ اللہ کے لیے پورا کرو پھر اگر تم

روک دیے جاؤ تو جو قربانی میسر ہو کرو اور جب تک قربانی اپنے مقام پر نہ پہنچ جائے اپنے سر نہ منڈاؤ پھر اگر تم میں سے کوئی بیمار ہو یا اس کے سر میں کوئی تکلیف ہو تو اس کا فدیہ (بدلہ) روزوں یا صدقہ یا قربانی سے دے پھر جب تم امن میں ہو تو جو کوئی حج کے وقت میں عمرے سے فائدہ اٹھانا چاہے تو جو میسر ہو وہ قربانی دے پھر جسے (قربانی) میسر نہ ہو تو وہ حج کے دنوں میں تین روزے رکھے اور سات جب تم واپس پہنچو یہ پورے دس ہوئے یہ اس شخص کے لیے ہے جس کے اہل وعیال مسجد حرام (مکہ مکرمہ) میں نہ رہتے ہوں اور اللہ سے ڈرتے رہو اور جان لو کہ اللہ سخت عذاب دینے والے ہیں ﴿۱۹۶﴾

تفسیر ومعارف

مشرکینِ مکہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام پر مختلف سوالات کیا کرتے تھے کہ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم واقعی اللہ کے رسول ہیں تو ان سوالوں کا جواب دیجیے اور یہ سولات وہ یہود کے علماء سے سیکھتے۔

یہود کے بڑے بڑے علماء مدینہ منورہ یا اس کے آس پاس یہودیوں کے جو قلعے تھے، ان میں تھے۔ مشرکینِ مکہ وہاں تک کا سفر کرتے اور ان سے مختلف سوالات لے آتے جو بارگاہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں پیش کرتے۔ ان میں سے روح کے بارے میں بھی سوال تھا۔ اسی طرح یہ سوال بھی تھا کہ چاند کے گھٹنے بڑھنے میں اللہ کی حکمت کیا ہے؟ یہ بہت باریک سا طلوع ہوتا ہے، پھر یہ پورا ہوتا ہے، پھر کم ہونے لگ جاتا ہے یہاں تک کہ ختم ہو جاتا ہے اور پھر طلوع ہو جاتا ہے حالانکہ سورج یا دوسرے ستاروں اور سیاروں میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔

قمری ماہ وسال میں حکمتِ الٰہی:

یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ۔۔۔۔ یہاں اَهِلَّةِ کا لفظ آیا ہے یعنی چاندوں کے متعلق پوچھتے ہیں چونکہ ہر چاند دوسرے چاند سے الگ ہوتا ہے تو جمع کا لفظ فرمایا کہ یہ چاندوں کی حقیقت جاننا چاہتے ہیں کہ یہ بڑے چھوٹے کیوں ہوتے ہیں۔ قُلْ هِیَ مَوَاقِیْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ۔۔۔۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے فرما دیجیے کہ چاند کا گھٹنا بڑھنا، اس کا ختم ہونا اور نئے کا طلوع ہونا، اس کو اللہ نے اوقاتِ عبادت اور حج سے متعلق کر دیا ہے۔ مَوَاقِیْتُ

لِلنَّاسِ۔۔۔۔ یہ نسل انسانی کے لیے وقت کی پہچان ہے اور اس سے حج کے امور یعنی عبادات کے امور کا تعین ہے۔

چاند کے اس گھٹنے بڑھنے میں ایک عجیب حکمتِ الٰہی ہے۔ اسلام چونکہ دائمی اور ابدی دین ہے، ساری مخلوق کے لیے بیک وقت قابلِ عمل ہے، ساری عبادات ساری انسانیت کے لیے ہیں، تو عبادات کا مدار اگر شمسی مہینوں پہ ہوتا، مثلاً اگر رمضان جون میں مقرر ہو جاتا تو ہر سال جون میں آتا، دسمبر کو رمضان قرار دے دیا جاتا تو ہر سال سردیوں میں آتا۔

یہاں میں ضمناً عرض کر دوں کہ شمسی مہینے بھی اہل یورپ کی ایجاد نہیں ہیں، یہ بھی مسلمانوں کی ایجاد ہیں۔ یورپین اقوام میں سب سے پہلے رومن ایمپائر تھی جو باضابطہ ایک حکومت تھی اور جس کے کچھ قوانین تھے۔ ایک طرح کی اسمبلی اور اس کے ممبرز، یہ سارا کچھ سب سے پہلے تاریخ میں رومن ایمپائر میں ملتا ہے۔ یہ ہندسے جو اب متروک ہو چکے ہیں، ایک کے لیے ایک ڈنڈا، دو کے لیے دو ڈنڈے، تین کے لیے تین، چار کے لیے ایک ڈنڈا اور ایک "V" پانچ کے لیے صرف "V" یہ رومنوں نے ایجاد کیے تھے۔ یہ جو اہل مغرب کے ہندسے ہیں، یہ جو ہم انگریزی ہندسے لکھ رہے ہیں، یہ بھی انگریز کے نہیں ہیں، یہ ایجاد بھی مسلمانوں کی ہے اور ان کو استعمال کرنا، ان کے مطابق مختلف مواقع کے لیے اپنی تاریخیں مقرر کرنا کوئی غلط نہیں ہے۔ ہاں، عبادات کے اوقات کو اللہ نے چاند سے متعین کر دیا ہے۔

چاند کا سال پورے سال کے سارے موسموں میں گھومتا رہتا ہے۔ اس لیے حج کو، رمضان کو، عبادات کو اللہ نے چاند کے اوقات کے ساتھ مقرر کر دیا۔ سردیوں میں بھی روزے آتے ہیں، گرمیوں میں بھی آتے ہیں۔ سردیوں میں بھی حج ہوتا ہے، گرمیوں میں بھی حج ہوتا ہے۔ دورانِ سال دنیا میں موسم بھی چلتے رہتے ہیں۔ اب یہاں سردی ہے تو جنوبی حصے میں خطِ استواء کے نیچے گرمی ہوگی۔ ہم خطِ سرطان پہ بیٹھے ہیں، یہاں سردی ہے لیکن جو جدی پہ بیٹھے ہیں وہاں گرمی ہوگی۔ جب یہاں گرمی ہوگی تو وہاں سردی ہوگی۔ ایک طرف دن کے دو بج رہے ہیں تو دوسری طرف رات کے دو بج رہے ہوں گے۔ جس طرح رات دن چلتے رہتے ہیں، موسم چلتے رہتے ہیں، اسی طرح چاند کے اوقات بھی سارے سال میں ROTATE کرتے ہیں۔ اللہ کریم نے چاند کا نظام ایسا بنا دیا کہ اس کے طلوع و غروب کے ساتھ عبادات کی تاریخیں متعین کر دیں جیسے حج ہے یا رمضان المبارک ہے۔ عبادات کی تعیین شمسی مہینوں جنوری فروری سے نہیں ہوگی بلکہ چاند کے ساتھ ہوگی۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ تو یہ ہے کہ اللہ کریم کی اطاعت ہے جو فائدہ ہی فائدہ ہے۔ یہ ایک فائدہ ہے لیکن اس میں بے شمار حکمتیں بھی ہوں گی جو ہم نہیں جانتے۔ ایک حکمت جو ہمارے

سامنے ہے اور جسے ایک عام آدمی بھی سمجھ سکتا ہے، وہ یہ ہے کہ قمری مہینے پر عمل کرنے سے یہ ساری عبادتیں کبھی بہار میں، کبھی خزاں میں، کبھی گرمی میں، کبھی سردی میں، سارے سال میں گھومتی رہتی ہیں۔

فرمایا، لوگوں سے کہہ دیجیے کہ یہ کوئی عجیب بات نہیں ہے۔ اللہ خود حکیم و دانا ہے اور اس نے حج اور دیگر عبادات کو چاند سے متعلق کر دیا تا کہ کہیں گرمی کے روزے ہوں تو کہیں سردیوں کے ہوں، کہیں بہار کے ہوں، کہیں خزاں کے ہوں اور وہ سب موسموں میں چلتے رہیں۔ اگر کسی ایک مہینے مثلاً دسمبر یا جنوری میں مقرر ہوتے تو ہمارے ہاں سردی ہے لیکن قطب جنوبی میں سخت گرمی ہوتی ہے۔ جن کے حصے میں گرمی آتی ہے تو ہمیشہ گرمی میں روزے رکھتے اور جن کے حصے میں سردی آتی وہ ہمیشہ سردی میں روزے رکھتے۔ اللہ نے اپنی حکمت کاملہ سے ان کو چاند کے طلوع و غروب کے ساتھ متعلق کر دیا اور اسلام چونکہ آفاقی مذہب ہے تو ہر ملک کے ہر شہری کے پاس ہر موسم میں وہ عبادات چلتے چلتے آتی رہتی ہیں، تبدیل ہوتی رہتی ہیں۔

خودساختہ رسومات کو نیکی نہیں کہا جا سکتا:

ایامِ حج میں مشرکین مکہ یہ کرتے تھے کہ گھروں کے دروازے تو بند کر لیتے تھے لیکن مکانوں کے پیچھے سے کسی جگہ سے دیوار پھاڑ کر راستہ بنا لیتے تھے۔ ظاہر تو یہ تھا کہ ہمارا گھروں سے کوئی تعلق نہیں ہے، گھر بند ہیں اور حج کے دنوں میں صرف بیت اللہ میں رہیں گے۔ گھر آنا جانا ہوتا تو پیچھے سے سوراخ بنا لیتے اور اپنا معمول جاری رکھتے۔ فرمایا، ان سے کہہ دیجیے کہ تمہیں چاند کے گھٹنے بڑھنے پر تو اعتراض ہے لیکن یہ جو حرکتیں تم نے ایجاد کر رکھیں ہیں، ان کا کیا جواز ہے؟ تم نے کہا کہ ہم نے اللہ کے لیے گھر چھوڑ دیے ہیں اور دروازے کو تالا لگا دیا لیکن پیچھے سے سوراخ کر لیا تا کہ آنا جانا بھی اسی طرح جاری رہے اور دروازہ بند ہے۔ فرمایا: وَ لَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا۔۔۔۔ یہ کوئی نیکی نہیں ہے کہ تم سامنے کے راستے سے گھر میں داخل نہ ہو اور پیچھے سے دیوار پھاڑ کر داخل ہو جاؤ۔ یہ کون سی نیکی ہے اور اس میں کون سی دانش مندی ہے؟ تم نے محض رسومات بنا رکھی ہیں۔ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى۔۔۔۔ جبکہ نیکی، وہ کام ہے جس سے اللہ کا قرب نصیب ہوتا ہے۔

تقویٰ اللہ تعالیٰ سے تعلق کا نام ہے:

اتَّقٰى یا تقویٰ یا اس طرح کے جتنے الفاظ ہیں، ان کا مفہوم ایک ہے کہ اللہ کریم سے ایسا تعلق قائم ہو جائے کہ بندے کو اس کی اطاعت میں لطف آئے اور نافرمانی کرتے ہوئے ڈر لگے۔ اس مثال سے سمجھیں کہ جیسے بھائیوں کا باہمی تعلق خاطر ہوتا ہے۔ ایک بھائی کہیں دنیا کے دوسرے ملک میں بیٹھا مزدوری کر رہا ہے اور

یہاں کسی بات کا فیصلہ کرنا ہے، کوئی رشتے لینے دینے ہیں، ووٹوں میں بھی لحاظ کرتے ہیں کہ اس سے پوچھ لیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کی رائے مختلف ہو اور اگر ہم نے اس کی مخالفت کی تو تعلقات بگڑ جائیں گے۔ اللہ سے اس طرح کا رشتہ بن جائے اور جب کوئی کام سامنے آئے تو فوراً دل میں یہ احساس پیدا ہو کہ یہ کام اللہ کی پسند کے خلاف تو نہیں ہے! اگر اللہ کی پسند کے خلاف ہے تو میں نہیں کروں گا۔ اسے تقویٰ کہتے ہیں۔ ہر وہ کام نیکی ہے جس سے یہ نسبت حاصل ہوتی ہے۔ ہر عبادت کا حاصل یہ ہے کہ اللہ سے یہ تعلق بنتا چلا جائے۔

فرمایا، اللہ کا یہ حکم نہیں ہے کہ دروازہ باہر سے بند کر دو اور پیچھے سے گھر پھلانگ کے آتے جاتے رہو۔ بات تو وہی رہی اور دکھاوا ہو گیا۔ اس میں تو کوئی حکمت، کوئی دانائی نہیں ہے۔ نیکی اس کام میں ہے جو اللہ کا حکم ہے، اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کا بتایا ہوا طریقہ ہے اور اس پر عمل کرنے سے تقویٰ بڑھتا ہے، اللہ کریم سے تعلق پیدا ہوتا ہے۔ پتہ چلتا ہے کہ میرا بھی اللہ سے ایک تعلق ہے؛۔ میں اس کے خلاف نہیں کروں گا، میرا رسول صلی اللہ علیہ وسلّم ہے، میں آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی مرضی کے خلاف نہیں کروں گا، جب یہ نسبت پیدا ہو جاتی ہے تو اس کی کیفیات عجیب ہوتی ہیں۔

ایک صحابیؓ مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلّم میں حاضر ہوئے تو ان پر ایک سرخ رنگ کی پھولدار سی چادر تھی۔ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ارشاد کا مفہوم یہی تھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کے الفاظ مختلف تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا تمہیں یہ جچی نہیں، اچھی نہیں لگی اور بات آئی گئی ہو گئی۔ کچھ دنوں بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کو خیال گزرا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا، وہ چادر دوبارہ آپ کے پاس نہیں دیکھی؟ عرض کی گئی، یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم میں نے تندور میں جھونک دی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا، تم نے ایسا کیوں کیا، میں نے تو اس لیے کہا تھا کہ وہ شوخ رنگ مردوں پر نہیں جچتا، تم گھر میں کسی خاتون کو دے دیتے۔ انہوں نے عرض کی یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم! جس چیز کو ایک دفعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم ناپسند فرما دیں اور ہمارے بس میں ہو تو وہ چیز دنیا میں باقی بھی رہے، یہ ممکن نہیں۔

بظاہر یہ ایک چادر کا واقعہ ہے، معمولی سی بات ہے لیکن اس کے پیچھے کیفیات کتنی ہیں اور اس کے پیچھے خلوصِ نیت کس قدر ہے! اسے کہتے ہیں تقویٰ کہ میرے محبوب صلی اللہ علیہ وسلّم نے ناپسند فرمائی تو یہ دنیا میں ہی کیوں رہے! بظاہر واقعہ چھوٹا ہے لیکن اس کے پیچھے جذبات کا ایک سمندر، بحرنا پیدا کنار موجزن ہے جس نے مجبور کر دیا کہ اسے تندور میں جھونک دو۔ نیکی وہ عمل ہے جو اللہ اور اللہ کے حبیب صلی اللہ علیہ وسلّم کا قرب عطا کر دے۔

وَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ أَبْوَابِهَا ۔۔۔ اور حج میں گھر جانا کوئی منع بھی نہیں ہے۔ تم مقامی لوگ ہو، تم

طواف کرتے ہو، فارغ وقت میں گھر جاؤ اور دروازے سے جاؤ۔ اصل بات یہ ہے وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ۔۔۔۔ اللہ سے تعلق قائم کرلو۔ گھر ہو، بیت اللہ ہو، بازار ہو، صحرا ہو یا جنگل ہو، تم کہیں بھی ہو تمہارا اللہ تمہارے ساتھ ہو۔ کرنے کا کام یہ ہے کہ اللہ کی اطاعت اس طرح سے کرو، اللہ کا ذکر اتنا کرو کہ اس کی یاد روئیں روئیں میں رچ بس جائے اور کسی بھی لمحے وہ تم سے جدا نہ ہو۔ اللہ تو ہر وقت ہر جگہ موجود ہے، ہماری شہ رگ سے قریب تر ہے، ہمارے اپنے ہوش و حواس سے زیادہ ہمارے قریب ہے۔ اس میں فاصلہ اور دوری کیا ہے؟ ہمارا اپنا وجود، ہماری ذاتی رائے جو ہم رکھتے ہیں۔ دن بھر میں نے یہ کیا، میں نے وہ کیا، میں نے یہ کر دیا۔ یہ ''میں'' اگر یہاں سے نکال دو تو فاصلے مٹ جاتے ہیں۔ بات صرف یہ ہے کہ اپنے اور اپنے اللہ کے درمیان ہم خود حائل ہیں۔ ہمیں جمالِ الٰہی نظر نہیں آتا، کیوں، ہمیں اللہ سے بات کرنے میں لذت کیوں نہیں آتی، وہ سامنے کیوں نہیں آتا؟ وہ تو سامنے ہے، دیوار ہم بنے ہوئے ہیں۔

فرمایا: لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴿۱۸۹﴾ اس دیوار کو گراؤ، تقویٰ اختیار کرو کہ تم کامیاب ہو جاؤ۔ انسان کی تخلیق تو اس لیے ہوئی ہے کہ وہ اللہ کا قرب تلاش کرے، اللہ کو پہچانے اور اپنے دل سے مجبور ہو کر سجدہ کرے، بوجھ نہ سمجھے کہ یہ مصیبت گلے پڑ گئی۔ بھاگتے دوڑتے آئے، پانی کے چھینٹے مارے، اٹھے بیٹھے اور بھاگ گئے۔ یہ سجدہ نہیں! اللہ کو اس طرح پہچاننا ہو کہ اب اس کا جی چاہے کہ اس کے سامنے سجدہ ریز ہو۔

عبادت کی روح جمالِ باری کا ادراک ہے:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عبادت کے دو درجے بیان فرمائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ ۔۔۔ عبادت کا مزا تو جب ہے کہ تو سجدے میں جائے تو تیرا دل اللہ کو دیکھ رہا ہو۔ تو ایسے سجدے کرے جیسے اللہ کے روبرو کر رہا ہے۔ یہ اصل ہے لیکن اگر اتنی ہمت نہ ہو وَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ اگر تجھ میں اتنی جرأت نہیں ہے کہ تو اللہ کو دیکھ سکے فَاِنَّهٗ يَرَاكَ تو پھر یہ یقین کامل ہو کہ وہ تو دیکھ رہا ہے اگرچہ میں نہیں دیکھ سکتا۔ اگر یہ بھی نہیں تو پھر ایک exercise، ورزش ہے، آپ اٹھ بیٹھ رہے ہیں۔

فرمایا: اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ اللہ کی اطاعت ایسے کر جیسے تو اسے سامنے دیکھ رہا ہے۔ وہ تیرے روبرو ہے، تجھے وہی کرنا ہے جو وہ چاہتا ہے۔ اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ وَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ جیسے تو اپنی آنکھوں سے اسے دیکھ رہا ہے۔ دنیا میں آنکھ اسے دیکھ نہیں سکتی لیکن دیکھتی بھی ہے۔ انسان کے پاس صرف یہ آنکھ نہیں جو پیشانی میں ہے۔ یہ تو کافر کے پاس بھی ہے اور اللہ کریم فرماتے ہیں: يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ اے میرے حبیب! صلی اللہ علیہ وسلم یہ لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نظریں تو گھماتے ہیں وَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ (الاعراف: 198) لیکن تجھے دیکھ نہیں

پاتے۔ انہیں قریش کا ایک نوجوان نظر آتا ہے، محمد بن عبداللہ نظر آتا ہے، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نظر نہیں آتا۔ ظاہری آنکھ محمد بن عبداللہ کو تو دیکھتی تھی لیکن دیکھنا تو جب ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کو دیکھا جائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کا یہ فرمانِ عالی کہ اس طرح سے اللہ کی عبادت کر جیسے تو اسے دیکھ رہا ہے، اس کا مطلب ہے کہ دل میں آنکھ بھی ہے، کان بھی ہیں، زبان بھی ہے اور دل کی آنکھ دیکھ سکتی ہے۔

جو کام بندے کے لیے ناممکن ہوتا ہے، وہ کام بندے پر فرض نہیں ہوسکتا جیسے مشین کا سبب اختیار کیے بغیر ہم اڑ نہیں سکتے۔ کسی بندے سے کہیں کہ آپ بیٹھ کر سوچیں کہ میں اڑ رہا ہوں تو وہ نہیں اڑ سکتا۔ تصور میں بھی نہیں اڑ سکتا۔ ایک چڑیا، ایک مکھی اڑتی پھرتی ہے۔ ہم کبھی سوچیں کہ میں اڑ کر اس دیوار پر بیٹھ جاؤں، مکھی بیٹھ جاتی ہے۔ ہم نہیں سوچ سکتے چونکہ ہم نہیں کر سکتے۔ جو کام ناممکن ہوتا ہے، انسان کے اختیار میں نہ ہو، تو اس کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتا۔ تصور بھی انہی کاموں کا کرتا ہے جو وہ کر سکتا ہے۔ تو جو کام بندے کے لیے کرنا ممکن نہیں ہوتا ہے اس کے بارے اسے کہنا کہ اس طرح سوچ اور پھر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم فرمائیں! آپ صلی اللہ علیہ وسلّم نے جو فرمایا، حق فرمایا۔ بندہ اللہ کو دیکھ سکتا ہے۔ اگر دل کی آنکھ بھی جمالِ باری نہ دیکھ سکتی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلّم یہ ارشاد ہی نہ فرماتے کہ اَنۡ تَعۡبُدَ اللّٰہ کَاَنَّکَ تَرَاہُ۔۔۔۔

اس آنکھ سے نہ سہی، اس سے دیکھے جس سے دیکھ سکتا ہے۔ اسے دیکھے جمالِ باری کو دیکھے تو سجدے کا مزا آجائے۔ جمالِ باری کو دیکھے تو شریعت پر عمل کرنے کا مزا آجائے، لطف آجائے۔ پھر اگر ہمت ہو تو ہر سو دیکھے، وہ میری رگ وپے میں موجود ہے، میرے باہر موجود ہے، میرے آگے موجود ہے، میرے پیچھے موجود ہے۔ ھُوَ الۡاَوَّلُ وَالۡاٰخِرُ وَالظَّاھِرُ وَالۡبَاطِنُ (الحدید:3) ہر طرف موجود ہے۔

تجلی تیری ذات کی سو بسو ہے
جدھر دیکھتا ہوں ادھر تو ہی تو ہے

عبادت کرنے کا پھر مزا آئے گا۔ ہیرا پھیریوں سے نہیں کہ دروازہ سامنے سے بند کر دو، گھر میں پیچھے سے چلے جاؤ۔ معمول وہی رہیں اور گھر اسی طرح استعمال ہوتا رہے، صرف ایک ظاہری صورت بنالو۔ یہ نیکی نہیں بلکہ نیکی وہ ہے جو تمہیں اللہ سے نسبت عطا کر دے، تقویٰ عطا کر دے۔ تقویٰ اختیار کرو کہ تم کامیاب ہو جاؤ۔ تقویٰ کے بغیر کامیابی ممکن نہیں ہے، کامیابی کے لیے تقویٰ ضروری ہے۔

اللہ سے دوستی کا تقاضا:

وَ قَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ وَ لَا تَعْتَدُوْا ۔۔۔۔ جان کو، مال کو، قوت کو، علم کو، جو کچھ اللہ نے دیا ہے، وہ اللہ کے دین کو بچانے کے لیے، اللہ کے دین کو زندہ رکھنے کے لیے، اللہ کے دین کی خدمت کے لیے نچھاور کردو۔ جب روبرو ہو گئے تو تمہارا تعلق دوستی کی حد میں داخل ہو گیا۔ ہم عربی میں تو اللہ کو دوست کہتے ہیں، ولی اللہ! ولی کا مطلب ہی دوست ہوتا ہے، ولایت دوستی ہے۔ جب اللہ سے تمہارا تعلق دوستی کا ہو گیا تو پھر دوستی میں کچھ بچا کے رکھنا کون سی دوستی ہے! جب دوستی کا دعویٰ ہے تو دوستی میں کچھ بچا کے رکھنا دوستی نہیں ہوتی۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بے شمار نعتیں لکھی گئیں، اللہ کریم کی بے شمار مدحت لکھ گئی۔ میں شاعر نہیں ہوں لیکن کبھی کبھی چند جملے موزوں کر لیتا ہوں۔ مزاج میں، طبیعت میں بات آ گئی تو کچھ کہہ دیا۔ اس میں اللہ کی حمد بھی لکھی، نعت بھی لکھی۔ میری لائبریری میں ہندو شعراء کی نعتوں کی کتاب بھی موجود ہے اور حیرت ہوتی ہے کہ بعض نعتیں بڑے بڑے مسلمان شاعروں سے بھی اچھی ہیں لیکن اس کے باوجود ہندو کے ہندو ہی رہے۔ الفاظ چنے، ان سے مصرعہ بنایا، انہیں موزوں کیا لیکن یہ سارا کچھ دماغ اور زبان کا کھیل تھا۔ دل وہی رہا جو پہلے تھا، پھر اس نعت کا کیا فائدہ! اسی طرح میں نے یہ دیکھا ہر نعت خوان نے کچھ لینے کی بات کی۔ ہر اس بندے نے جس نے اللہ کی تعریف لکھی ہے، کچھ لینے کی بات کی۔ ظاہر ہے اللہ سے بھی لینا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی لینا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں وَاِنَّمَا اَنَا قَاسِمٌ وَاللّٰہُ یُعْطِی (بخاری) اوکما قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہ یقیناً میں تقسیم کر رہا ہوں، لٹا رہا ہوں، اللہ دے رہا ہے اور میں بانٹ رہا ہوں۔ لینا تو وہیں سے ہے لیکن جب بات دوستی میں داخل ہو گئی تو دوستی کے اصول تو مختلف ہوتے ہیں۔ دوستی محض لینے سے نہیں بنتی، دوستی دینے سے نہیں بنتی ہے۔ یہ سوچ کہ اس سے مجھے کیا فائدہ ہوگا، دوستی نہیں ہے۔ اس پر میں کیا قربان کرتا ہوں، دوستی یہ ہے۔

بعض لوگوں نے ایک روایت نقل کی ہے کہ جب حضرت یوسف علیہ السلام کی نیلامی سے قبل بازاروں میں اعلان کیا گیا تو ایک بڑھیا جو سوت کات کر بیچا کرتی تھی، وہ بھی چل پڑی۔ کسی نے راستے میں پوچھا، بڑی بی کہاں جاتی ہو؟ اس نے کہا: سنا ہے ایک بہت خوبصورت غلام آیا ہے، یوسف نام ہے، لوگ خریدنے کے لیے بولیاں لگائیں گے تو میں بھی بولی لگاؤں گی۔ اس نے پوچھا تیرے پاس کیا ہے؟ یہ سوت کی اٹی ہے۔ اس اٹی سے یوسف کی بولی لگاؤ گی؟ میرے پاس سرمایہ تو کچھ نہیں لیکن جو ہے وہ یوسف پہ لٹانا چاہتی ہوں۔ یوسف کے خریداروں میں شمار ہو جاؤں گی، طلب گاروں میں شامل ہو جاؤں گی۔ نعت لکھنے میں بھی یہ سلیقہ ہونا چاہیے کہ ہم اس بارگاہ میں کیا پیش کر سکتے

ہیں۔ سرمایہ کم ہی سہی، مثل سوت کی انٹی کی طرح لیکن پیش کرو گے تو طلب گاروں میں شامل ہو سکتے ہو۔

جہاد فی سبیل اللہ:

اللہ سے ہر چیز مانگو، اس نے دینی ہے لیکن تم اس کے لیے کیا دے رہے ہو؟ صرف لینا ہی دوستی نہیں ہوتی، دوستی کی بنیاد تو دینے پہ ہوتی ہے۔ تم کیا قربانی دے سکتے ہو؟ اگر تمہیں اللہ سے ولایت نصیب ہے وَ قَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ تو پھر اٹھو، لڑو اور اس کی راہ میں جانیں دو، مال دو، بیٹے شہید کراؤ، بیٹوں کی لاشیں اٹھاؤ، پتہ چلے کہ تمہاری دوستی ہے اور تم دوستی نچھاور کر رہے ہو۔

حضرت خنساء رضی اللہ تعالیٰ عنہا ایک صحابیہؓ تھیں اور شاعرہ بھی تھیں۔ انہوں نے قبول اسلام سے پہلے اپنے بھائی کی موت پر مرثیہ کہا تھا ''یذکر طلوع شمس صخراً'' صخر ان کے بھائی کا نام تھا۔ سورج طلوع ہوتا ہے تو ساری دنیا کو مختلف امور میں لگا دیتا ہے، کوئی کاروبار پہ نکلتا ہے، کوئی کاشتکاری پہ، کوئی لین دین پہ، کوئی دکان پہ، کوئی ملازمت پہ لیکن مجھے ہر طلوع ہونے والا سورج صخر بھائی کی یاد دلا دیتا ہے۔ آنکھ کھلتی ہے تو بھائی کو یاد کرتی ہوں۔ ''واذکرہ بکل غروب شمسیہ'' اور ہر سورج کے ڈوبنے تک میں بھائی کی یاد میں گم رہتی ہوں۔ قبول اسلام کے بعد ان کے جذبات کا رخ اللہ کریم کی محبت کی طرف ہو گیا۔ غالباً قادسیہ کی جنگ میں شریک تھیں اور چار نوجوان بیٹے ہمراہ تھے۔ یکے بعد دیگرے چاروں شہید ہو گئے تو انہیں خیمے میں اطلاع ملی۔ چار جوان بیٹوں کی نعشیں خیمے میں لائی گئیں۔ وہ خیمے سے نکل کر کھڑی ہو گئیں اور کہنے لگیں؟ اے اللہ! تو کتنا بے نیاز ہے، تو نے میرے چار بیٹے قبول کر لیے، تو کتنا کریم ہے، میں تو کچھ بھی نہ تھی! چار جوان بیٹوں پر کوئی مرثیہ نہیں کہا، کوئی شعر نہیں کہا بلکہ اللہ کے حضور کہنے لگیں، میں تیرا کیسے شکر ادا کروں تو نے میرے چار بیٹے قبول کر لیے۔ تیرے سامنے قیامت کو میں چار شہیدوں کی ماں بن کر کھڑی ہوں گی، تو نے مجھ پر کتنا احسان کیا!

فرمایا، دوستی کا دعویٰ ہے تو میدان میں نکلو۔ تمہارے پاس اپنا تو کچھ بھی نہیں ہے، نہ وجود تمہارا، نہ مال تمہارا، نہ جان تمہاری لیکن چھپا چھپا کے پھرتے ہو: وَ قَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ۔۔۔۔ دوستی کا دم بھرتے ہو تو پھر دوستی کے لیے کیا نچھاور کرتے ہو؟ میدان میں آؤ اور یہ قتال محض قتال نہیں ہے کہ لوگوں کو مارنا ہے، نہیں الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ۔۔۔۔ ان لوگوں سے مقابلہ کرو جو اللہ کو ماننے والوں کو قتل کرتے ہیں، جب کفار تم سے جنگ کرتے ہیں تو تم بھی جواباً ان سے جنگ کرو۔ اللہ کی راہ میں جان مال اور اپنی تمام قوت لگا دو۔ وَ لَا تَعْتَدُوْا۔۔۔۔ اور زیادتی نہ کرو۔ سبحان اللہ! اسلام کیا خوبصورت دین ہے! جو تمہارے ساتھ زیادتی کرتا ہے، مقابلہ کرو لیکن تم زیادتی نہ کرو۔ جو مسلمانوں کو قتل کرتا ہے، مقابلے میں نکلو، جہاد کرو، قتل کرو، قتل ہو جاؤ لیکن زیادتی نہ کرو۔

مشرکین مکہ جنگوں میں ایسا کرتے تھے کہ کسی کے خلاف بہت غصہ ہوتا اور وہ کہیں ان کے ہاتھوں مارا جاتا تو اس کا مثلہ بناتے۔ مثلہ یہ ہوتا تھا کہ ناک، زبان، کان اعضاء کاٹ کر ایک ہار بناتے اور اسے میت کے گلے میں ڈال دیتے۔ یہ ان کا بڑا انتقام تھا۔ بدر میں حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے داد شجاعت دی تھی اور نامور قریش کو قتل کیا تھا۔ احد میں خود شہید ہو گئے تو مشرکین مکہ کی خواتین نے ان کا مثلہ کیا اور اعضاء کاٹ کر گلے میں ہار پہنا دیا۔ جب مشرکین کو شکست ہوئی اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم تشریف لے گئے تو محبوب چچا کا یہ حال دیکھ کر اتنا غصہ آیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا، اللہ کی قسم میں اَسّی کافروں کا یہ حال کروں گا۔ میں کافروں کے اَسّی سرداروں کا مثلہ کراؤں گا۔ فوراً وحی آ گئی کہ میرے نبی صلی اللہ علیہ وسلّم ایک کے بدلے ایک، اَسّی نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم نے قسم کھائی ہے تو قسم کا کفارہ دیجیے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم نے قسم کھائی تھی۔ اللہ پاک نے فرمایا: زیادتی نہیں ہو سکتی، قسم کا کفارہ دیجئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا میں ایک کا بھی نہیں کروں گا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلّم نے قسم کا کفارہ دیا۔

دوستی کا تقاضا تو کچھ اور ہے تمہیں تو پیسے، پیسے سے پیار ہے، اس کے لیے دھوکے دیتے ہو، دوسروں سے جھوٹ بولتے ہو، خیانت کرتے ہو، کہتے ہو اللہ نظر نہیں آتا، اللہ سے بات نہیں ہوتی، نماز میں لطف نہیں آتا۔ کہاں سے آئے گا! لوٹو نہیں، لٹا کے دیکھو۔ لینے پہ ہی نہ رہو، کچھ دے کر بھی دیکھو، کچھ لٹا کر بھی دیکھو۔ وَ قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَ لَا تَعْتَدُوْا ۔۔۔ ہاں، اللہ کی راہ میں لڑو لیکن ان سے جو تم سے لڑتے ہیں۔ خواہ مخواہ لوگوں کے پیچھے تلوار سونت کر نہیں پھرنا اور لڑائی میں بھی دھیان رہے وَ لَا تَعْتَدُوْا ۔۔۔۔ زیادتی نہ ہونے پائے۔ جیسے وہ لڑ رہے ہیں اسی طرح تم بھی لڑو لیکن ظلم اور زیادتی گوارا نہیں ہوگی۔

اب تو اہل مغرب کا قانون ہے Every thing is fair in love and war محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہے۔ اسلام اس طرح کا مذہب نہیں ہے کہ کہیں بندے کی باگ ڈھیلی چھوڑ دے۔ سب جائز کہیں لیکن سب جائز نہیں ہے، محبت میں نہ جنگ میں، ہر طرف حدود ہیں۔ محبت میں بھی، جنگ میں بھی حدود ہیں۔ آپ حدود سے باہر نہیں جا سکتے۔ آپ کے ساتھ تو اللہ موجود ہے! آپ کے دل میں تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم بستے ہیں، آپ زیادتی کیسے کر سکتے ہیں! زیادتی کافر سے بھی نہ کرو جو تمہارے مقابلے میں میدان جنگ میں لڑ رہا ہے۔ کیوں نہ کرو؟ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ﴿۱۹۰﴾ کہ اللہ زیادتی کرنے والوں سے محبت نہیں رکھتا۔ تمہیں اللہ کی محبت چاہیے، تم اس کی محبت کے طالب ہو۔ تم زیادتی نہیں کر سکتے۔ اسلام پہ الزام آتا ہے کہ یہ تلوار سے پھیلایا گیا ہے۔ یہ کیسے تلوار سے پھیلایا گیا جو جنگ میں بھی ایک حد کا لحاظ رکھتا ہے اور زیادتی نہیں کرتا۔

سلطان صلاح الدین ایوبی رحمۃ اللہ علیہ نے بیڑا اٹھایا کہ مسجد اقصیٰ کو عیسائیوں سے آزاد کراؤں گا۔ آج تو ہر گھر مین ہر بندہ خود کو ایوبی سے بڑا سمجھتا ہے لیکن مسجد اقصیٰ یہودیوں کے قبضے میں ہے۔ ہماری یہ جرأت بھی نہیں ہے کہ ہم کبھی سوچیں کہ اسے آزاد بھی کرایا جا سکتا ہے۔ وہ بھی تو تھے جنہوں نے کہا، یہ تو وہ مسجد ہے جسے فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آزاد کرایا تھا، اس پر دوبارہ عیسائیوں کا قبضہ! اس کے لیے ایک جنگ نہیں، ہزاروں جنگیں لڑنا پڑیں تو وہ لڑے اور مسجد اقصیٰ کو آزاد کرایا۔ King Richard برطانیہ کی ایک سلطنت کا حکمران تھا۔ اسے برطانیہ والے بڑے فخر سے اب بھی لکھتے ہیں Richard the lion Hearted شیر دل رچرڈ۔ وہ شیر دل کیا تھا؟ برطانیہ سے چلا تو راستے سے عیسائی حکمرانوں کی فوجیں ساتھ ہوئیں اور ایک بڑا لشکر فلسطین پہنچا۔ سلطان صلاح الدین ایوبی سے میدان میں مقابل ہوا۔ اللہ کے بندوں کی کیا بات ہے، عین لڑائی میں تیر لگا تو رچرڈ کی سواری کا گھوڑا مر گیا اور وہ پا پیادہ ہو گیا۔ صلاح الدین ایوبی رحمۃ اللہ علیہ نے خادم کو بلایا اور اسے کہا کہ شاہی اصطبل سے میری سواری کا گھوڑا رچرڈ کو دے کر آؤ۔ وہ یہ نہ کہے کہ میں پیدل تھا اس لیے مارا گیا۔ صلاح الدین کو شیر دل کسی نے نہیں کہا۔ رچرڈ نے شکست کھائی ناکام واپس گیا لیکن انگریزوں کی تاریخ اسے شیر دل لکھتی ہے۔ جس نے فتح کیا، اس سے مقابلہ کیا، اسے کسی نے شیر دل نہیں کہا۔ اس لیے کہ یہ لکھنا ہمارا کام تھا۔ ہم سے مردانگی رخصت ہو گئی اور نامردوں کو اللہ ملتا ہے، کیسے عجیب لوگ ہو، نامرد اولیاء اللہ ہو سکتے ہیں؟ کبھی نہیں! ہمارے پاس سب کچھ اللہ کا ہے۔ اس کی راہ میں لٹاؤ، جہاں ضرورت پڑے نچھاور کرو لیکن زیادتی نہ ہو۔

اب سارا مغرب جہاد سے لرزاں ہے جہاد کو قرآن سے کیوں نکال دو؟ جہاد تو ایک ضابطے کا پابند ہے، اس کی حدود و قیود ہیں۔ کسی پر ظلم اور زیادتی کا سوچا بھی نہیں جا سکتا۔ زیادتی نہ کرو، اس لیے کہ تم تو اللہ کی محبت کے دیوانے ہو اور زیادتی کرنے والوں سے وہ محبت نہیں کرتا۔

وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ ۔۔۔ جب وہ عہد شکنی کریں یا تم پر چڑھائی کریں یا تم سے لڑنا چاہیں تو پھر انہیں جہاں پاؤ، ان سے قتال کرو **وَاَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ** ۔۔۔ اور انہیں اس طرح نکلنے پر مجبور کردو جس طرح وہ تمہارے گھروں کو برباد کرتے ہیں اور تمہیں نکلنے پر مجبور کرتے ہیں۔

جہاد اور جنگ میں فرق:

وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ۔۔۔ اور یاد رکھو! فساد پھیلانا قتل سے بہت بڑا جرم ہے۔ قتل کسی ایک ذات کا ہوتا ہے۔ اگر جنگ ہوتی ہے، جہاد ہوتا ہے تو اس میں بھی قتال ہوتا ہے۔ جہاد میں بھی ان لوگوں کا

قتل ہوتا ہے جو اس میں شریک ہوتے ہیں، جو مقابلہ کرتے ہیں لیکن فتنہ سب کی تباہی اور پریشانی کا سبب بنتا ہے، خواہ وہ خواتین ہوں، بچے ہوں، بوڑھے ہوں وہ جنگ میں حصہ لے رہے ہوں یا نہ لے رہے ہوں۔ فتنہ سب کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔

اسلام نے جنگ کو ایک نیا رخ دیا ہے۔ تاریخِ انسانی جب سے شروع ہوئی، زمین پر تب سے قتال اور لڑائی کا سراغ ملتا ہے۔ پہلا قتل آدم علیہ السلام کے بیٹے نے اپنے بھائی کا کیا۔ جب سے انسان نے زمین پر قدم رکھا، تب سے اختلاف چلا آ رہا ہے اور ایک دوسرے کو قتل کر دینا، یہ اختلاف کی انتہا ہے۔ یہ ایک ایسی بات ہے جو اقوامِ عالم میں سدا سے موجود رہی ہے۔ انسان غیر مہذب رہا، جنگلوں میں چلا گیا، تہذیب سے نابلد ہو گیا تو اس کا مقابلہ کبھی کسی زمین کے ٹکڑے پر، کبھی کسی بات پر چلتا رہا لیکن انسان جب اپنے آپ کو تہذیب کی انتہا پر سمجھنے لگا، تو بھی جنگ اس کے ساتھ ہے اور لڑائی چل رہی ہے۔

جنگ میں یہ ہوتا ہے کہ مخالف کو تباہ کیا جائے، اس کے وسائل برباد کیے جائیں اور اسے اس طرح کچل دیا جائے کہ وہ دوبارہ سر اٹھانے کے قابل نہ رہے۔ جنگ میں دونوں فریقوں کی یہی کوشش ہوتی ہے لیکن اسلام نے جنگ کی بجائے جہاد کا تصور دیا ہے۔

جب زمین پر فساد پھیلے تو جو لوگ فساد پھیلا رہے ہیں، ان کو فساد سے روکنا جہاد ہے۔ انہیں تباہ کرنا مقصد نہیں ہے، ان کے وسائل تباہ کرنا مقصد نہیں ہے، انہیں اپنا غلام بنانا مقصد نہیں ہے، مقصد یہ ہے کہ وہ اللہ کے دیے ہوئے انسانی حقوق کا احترام کریں اور دوسروں کے حقوق کو پامال نہ کریں۔ اگر اس سے باز آ جائیں تو ان کے ساتھ جنگ نہیں ہوگی۔ نیز اسلام نے یہ قانون بھی دیا کہ جو جنگ میں شریک نہیں ہوتا، بوڑھا ہے، خاتون ہے، بچے ہیں، ان کے ساتھ جنگ نہیں ہوگی۔ کسی کے عبادت خانے نہیں اجاڑے جائیں گے، پھلدار یا مفید درخت نہیں کاٹے جائیں گے، فصلیں نہیں اجاڑی جائیں گی۔ جنگ میں تو یہ سب کچھ جائز تھا لیکن جہاد میں یہ جائز نہیں ہے۔ جہاد صرف ان قوتوں اور ان افراد کے خلاف ہوگا جو میدانِ جنگ میں اترتے ہیں اور تب تک ہوگا، جب تک وہ اپنی فتنہ گری سے، لوگوں کے حقوق چھیننے سے اور لوگوں کو تباہ کرنے سے باز نہیں آ جاتے۔ دوسروں کی تباہی کے درپے نہیں ہوتے تو ان سے جہاد نہیں کیا جائے گا، ان سے لڑا نہیں جائے گا۔ ہاں، اگر وہ بدعہدی کرتے ہیں اور فتنہ گری سے باز نہیں آتے تو فرمایا: پھر جہاں پاؤ انہیں قتل کرو اور انہیں اسی طرح بے گھر کر دو، جس طرح وہ تمہیں بے گھر کرتے ہیں اور تمہیں اجاڑتے ہیں۔

وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۔۔۔۔ مسجد الحرام میں کسی کے ساتھ قتال نہیں کیا جائے گا لیکن شرط یہ ہے کہ کفار بھی مسجد کا احترام کریں اور مسجد الحرام میں آ کر قتال نہ کریں۔ تاہم اگر وہ مسلمانوں کو مسجد میں پا کر قتل کرنے کے لیے چڑھ دوڑیں تو فرمایا: حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ ۔۔۔۔ اگر وہ مسجد میں بھی تم سے لڑنا چاہتے ہیں تو پھر مسجد میں بھی جہاد کرو، قتال کرو۔ مسجد الحرام کی اپنی عظمت تھی اور بیت اللہ کی عظمت کے مشرکین مکہ بھی قائل تھے۔ اہل عرب بھی قائل تھے اگرچہ انہوں نے مسجد الحرام میں بت کدہ بنالیا تھا۔ سینکڑوں بت رکھے ہوئے تھے لیکن پھر بھی ان کے دل میں حرمت والے مہینوں کا اور اس حرمت والی مسجد کا احترام تھا۔ حرمت والے مہینوں میں وہ آپس میں جنگیں روک دیتے تھے اور مسجد میں کسی سے زیادتی نہیں کرتے تھے لیکن جب انہوں نے خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کو مسجد میں ایذائیں پہنچائیں، مسجد میں مسلمانوں کے ساتھ قتال کرنا چاہا تو اللہ کریم نے اجازت دے دی۔

وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۔۔۔۔ حرم میں ان کے ساتھ جنگ نہ کرو، جب تک وہ خود حرم میں تمہارے ساتھ جنگ نہ چھیڑیں۔ فَاِنْ قٰتَلُوْكُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ ۔۔۔۔ اگر وہ جنگ چھیڑ دیں تو پھر تم ان کے ساتھ جہاد کرو، لڑو قتل کرو۔ كَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۹۱﴾ کافروں کی یہی سزا ہے فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۹۲﴾ اور اگر وہ جنگ سے باز آجائیں تو تم بھی ان کے ساتھ جنگ بند کردو لیکن اگر کفر سے ہی باز آجائیں تو اللہ بخشنے والا ہے، رحم کرنے والا ہے۔ کوئی کتنا دور نکل گیا ہے، کسی نے کتنی ہی برائی کی ہے، کسی نے بیت الحرام میں بھی قتال کیا ہے، اس سے بڑا جرم کیا ہوگا لیکن اگر وہ بھی توبہ کرلے تو اللہ کریم اس کی توبہ قبول فرمائیں گے کہ وہ بخشنے والے ہیں، رحم کرنے والے ہیں۔

جہاد کی حدود:

جہاد کی حدود کیا ہیں، یہ کہاں تک جاری رہنا چاہیے اور اسے کب ختم ہونا چاہیے؟ یوں تو روزانہ قتلِ عام ہوتا ہے، دنیا کے ہر ملک میں بے شمار لوگ مارے جاتے ہیں۔ اہلِ مغرب اپنے آپ کو تہذیب کا علمبردار کہتے ہیں لیکن سب سے زیادہ وارداتیں اہل مغرب کے ممالک میں ہوتی ہیں، سب سے زیادہ جرائم وہاں ہوتے ہیں۔ عام لوگوں کا آپس میں لڑنا بھڑنا، لوگوں کا ذاتی وجوہات پر، کاروبار لین دین جائیداد کے جھگڑوں پر ایک دوسرے کو قتل کردینا، یہ تو انسانوں میں چلتا رہتا ہے لیکن جہاد کسی ایک فرد کے خلاف نہیں ہوتا، کسی ایک قوم کے خلاف بھی نہیں ہوتا، کسی ایک مذہب کے خلاف بھی نہیں ہوتا بلکہ جہاد ظلم کے خلاف ہوتا ہے، ظالم کے خلاف ہوتا ہے۔ جہاد کا مقصد ظالم کو تابع کرنا یا غلام بنانا یا تباہ کرنا نہیں ہے بلکہ اس کو ظلم سے روکنا ہوتا ہے۔

اللہ کریم نے بعض حقوق تمام انسانوں کو عطا فرمائے۔ زندہ رہنے کا حق ہر انسان کا ہے۔ مومن ہے یا کافر ہے، اللہ نے اس زندگی دی ہے اور اللہ ہی اسے موت دے سکتا ہے۔ اللہ کے حکم سے مارا جا سکتا ہے لیکن اپنی مرضی سے نہیں۔ اللہ کے قانون کے تحت، اللہ کے ضابطے کے تحت اگر وہ سزائے موت کا مستحق بنتا ہے تو اور بات ہے لیکن کوئی شخص اپنی مرضی سے اسے قتل نہیں کر سکتا۔ زندگی اللہ نے دی ہے، لینا بھی اس کا حق ہے۔ اگر کوئی ناجائز قتل کرتا ہے تو فرمایا: اگر کسی ایک بندے کو مارتا ہے تو یہ اتنا بڑا جرم ہے کہ جیسے اس نے ساری انسانیت کو قتل کر دیا۔ اسی طرح تعلیم حاصل کرنا، صحت، علاج معالجہ، بچوں کی تعلیم، گھر کا تحفظ، کاروبار کی اجازت انسانی زندگی کے لیے ضروری ہیں اور ان سب میں کافر کا بھی حق ہے۔ اگر وہ مسلمان نہیں ہوتا، نہ ہو لیکن وہ انسان ضرور ہے اور اسے انسانی حقوق حاصل ہیں جو اس سے کوئی نہیں چھین سکتا۔ نہ اسلامی حکومت چھین سکتی ہے، نہ کوئی مجاہد چھین سکتا ہے۔ اللہ نے اسے حقوق دیے ہیں، وہ اس کے رہیں گے۔ ہاں، اگر وہ اپنی حد سے تجاوز کرتا ہے، فتنہ سازی کرتا ہے، دوسروں کے لیے مصیبتیں کھڑی کرتا ہے، دوسروں کے حقوق چھینتا ہے، لوگوں کو قتل کرتا ہے، ان کی آبرو لوٹتا ہے یا ان کا مال لوٹتا ہے تو جب وہ حد سے تجاوز کرے گا، ظلم کرے گا تو ظلم کو روکنے کے لیے اس کے ساتھ جہاد کیا جائے گا، قتال کیا جائے گا۔

اگر وہ ظلم سے باز آ جائے لیکن کافر ہی رہنا چاہتا ہے تو رہے۔ کلمہ قبول کرنا یا نہ کرنا، یہ اس کا حق ہے، یہ ہر انسان کا حق ہے۔ جس طرح زندہ رہنے کا حق دیا ہے، اسی طرح مذہب قبول کرنے کا بھی ہر انسان کو اس کی پسند کے مطابق حق دیا ہے۔ وہ حق قبول کرنا چاہتا ہے یا کافر رہنا چاہتا ہے لیکن اس کے ساتھ کوئی زبردستی نہیں کی جائے گی بلکہ بحالت کفر بھی اس کے سارے انسانی حقوق کا تحفظ کیا جائے گا۔ اگر وہ کفر سے باز آ جائے یا فساد سے باز آ جائے تو اللہ کی رحمت بے پناہ ہے۔ وہ بخشنے والا ہے، وہ اسے بھی بخش دیتا ہے۔ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۹۲﴾ اگر وہ باز آ جائیں تو یقیناً اللہ بخشنے والا بھی ہے، رحم کرنے والا ہے۔

جہاد کب تک رہے گا؟

اب یہ جہاد کب تک رہے گا؟ آج مغرب کا بڑا شور ہے کہ جہاد ختم کیا جائے، جہاد کی آیات ختم کی جائیں، جہاد کی تعلیم ختم کی جائے کہ اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔ اللہ کریم فرماتے ہیں وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ ۔۔۔۔ جب تک فتنہ موجود ہے تب تک جہاد جاری رہے گا اور اگر دنیا سے فتنہ ختم ہو جائے تو پھر جہاد کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔ جب تک ظلم رہے گا، جب تک فساد رہے گا، تب تک جہاد رہے گا۔ اور اگر کوئی ایسی صورت بن جائے کہ فساد ختم ہو جائے وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ۔۔۔۔ اور روئے زمین پر سارا دین خالص اللہ کے

لیے ہو جائے تو پھر جہاد کی ضرورت نہیں۔ چونکہ یہ ممکن نہیں ہے تو اس کا مطلب یہ ہے، جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قیام قیامت تک جہاد جاری رہے گا۔ اَلْجِهَادُ مَاضٍ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ (نصب الریاۃ) جب تک قیامت قائم نہیں ہو جاتی تب تک جہاد جاری رہے گا۔ ظلم بھی رہے گا، کفر بھی رہے گا، زیادتی بھی رہے گی اور اسے روکنے کی ضرورت بھی رہے گی۔ فرمایا: فَإِنِ انْتَهَوْا اور اگر لوگ ظلم سے باز آجائیں فَلَا عُدْوَانَ إِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۹۳﴾ تو پھر کسی پر کوئی سختی نہیں کی جائے گی۔ ہاں، پھر بھی جو ضابطے توڑے گا یا ظلم کرے گا اس کو سزا دی جائے گی۔

جہاد کا حکم کون دے گا؟

اور یاد رکھیں! بات بات پر تلوار نہیں اٹھائی جاتی۔ اگر کوئی غلطی کر رہا ہے تو اسے سمجھانا بھی جہاد ہے۔ اگر آپ سمجھا کر روک لیتے ہیں تو یہ بھی جہاد ہے۔ آپ معاشرے میں پھیلتی ہوئی کسی برائی کے خلاف لکھتے ہیں، لوگوں تک بات پہنچاتے ہیں تو یہ بھی جہاد ہے۔ فساد کو ختم کرنے کے لیے آپ جو بھی کوشش زبانی کرتے ہیں، قلمی کرتے ہیں، جانی و مالی کرتے ہیں، یہ سب جہاد ہیں لیکن اگر بات ان سب سے گزر جائے تو پھر بھی کسی فرد کو ذاتی طور پر بندوق اٹھا کر بندے مارنے کی اجازت نہیں ہے۔ پھر جو اسلامی حکومت ہوگی، جو اسلامی ادارہ ہوگا، جسے فیصلہ کرنے کی حیثیت حاصل ہوگی، اس کے حکم پر اور اس کی شرائط کے مطابق جہاد ہوگا۔ اگر ہر بندہ اپنے طور پر فیصلہ کر کے بندوق اٹھا کر بندے مارنے شروع کر دے تو یہ جہاد نہیں ہوگا۔ کیونکہ ہر فرد کا فیصلہ نافذ نہیں ہو سکتا۔ جس طرح ہم اپنی باقی زندگی میں دیکھتے ہیں کہ ایک نظام ہوتا ہے، ایک حکومت ہوتی ہے اور ہمارے تمام لین دین کے اختلافات طے کرنے کے لیے عدالتیں ہوتی ہیں، حکومت کا ایک نظام ہوتا ہے جس کے تحت فیصلے ہوتے ہیں جو ہم سب کو قبول کرنا پڑتے ہیں، اسی طرح جہاد کے لیے بھی یہ شرط ہے کہ کوئی مسلمان اولی الامر ہو، حاکم ہو، اس کے پاس اقتدار و اختیار ہو اور وہ فیصلہ کرے۔ اس کے بعد قوم کی ذمہ داری ہے کہ اس فیصلے کو عملی جامہ پہنائے اور ہر فرد کی ذمہ داری ہے کہ اپنی جان و مال سے جہاد کرے۔ اب اگر ہر فرد، ہر خطیب ہر امام، ہر نمبردار، ہر چوہدری قتل عام شروع کر دے تو یہ جہاد نہیں ہوگا بلکہ یہ قتل عام ہوگا۔ آج کل رواج بن گیا ہے کہ مساجد میں بھی بم پھینکے جا رہے ہیں، بازار میں بے گناہ لوگ مارے جا رہے ہیں۔ کوئی آٹا دال خریدنے گیا، کوئی سبزی خریدنے گیا اور اسے قتل کر دیا گیا۔ کوئی بم بلاسٹ میں مارا گیا یا فائرنگ میں مارا گیا۔ یہ ساری صورتیں جہاد کی نہیں ہیں بلکہ یہ لوگوں کے انفرادی فیصلے ہیں۔ چند لوگوں کی ایک جماعت بن جاتی ہے اور وہ

فیصلہ کر لیتی ہے یا کوئی شخص اکیلا فیصلہ کر لیتا ہے تو یہ صورت جہاد کی نہیں ہے۔ جہاد کے لیے اقتدار اور مسلمانوں کی قوت نافذہ کا ہونا شرط ہے۔

جہاد کا اصول یہ ہے کہ اگر ایک ملک کے ساتھ ظلم ہو رہا ہے جو اپنا دفاع نہیں کر سکتا اور اس کے ساتھ ایک دوسرا ملک مسلمان ہے تو اس کے لیے اس میں شریک ہونا فرض ہو جائے گا۔ اگر ان سے بھی دفاع نہیں ہوتا تو ساتھ والوں پر فرض ہو جائے گا اور اسی طرح یہ آگے فرض ہوتا چلا جائے گا، حتیٰ کہ تمام مسلم امت یکجان ہو کر ڈٹ جائے لیکن یہ یاد رہے کہ جہاد کا طریقہ ہے، اس کے قاعدے اور ضابطے ہیں۔ مسلمانوں کی بنائی ہوئی جو باضابطہ حکومت ہوتی ہے، ایک سوسائٹی میں جس جماعت کو، جن افراد کو اقتدار سونپا جاتا ہے، ان پر فرض ہے کہ وہ ظلم کے خلاف جہاد کے لیے قوم کو تیار بھی کریں، لوگوں کو تربیت بھی دیں، لوگوں کو اس طرف مائل بھی کریں اور جہاں ظلم ہوتا ہو اس کا دفاع بھی کریں۔

ہم کہتے ہیں کہ ہمارے حکمران دین دار نہیں۔ آپ یہ سمجھتے ہیں لیکن اس کا مطلب کیا ہے؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم دین دار نہیں۔ کیونکہ حکومتیں ہم بناتے ہیں، لوگوں کو ہم چنتے ہیں اور اگر ہم دین دار ہیں تو ایسے لوگوں کو چنیں جو اہل ہیں۔ اگر ہم نااہلوں کو چن کر انہیں اقتدار و اختیار سونپ دیں گے تو پھر یہ جرم بھی ہمارا ہے چونکہ جیسے لوگ ہوتے ہیں ویسے ہی ان پر حکمران ہوتے ہیں۔ ہمیں حکمرانوں میں تو بڑی خامیاں اور برائیاں نظر آتی ہیں لیکن ہم اپنے اندر جھانک کر نہیں دیکھتے کہ ان خرابیوں یا ان برائیوں کا مالک ہمارا حاکم کیوں بنا؟ اسے ہم نے بنایا جس کا مطلب یہ ہے حکمران کی نسبت وہ برائیاں ہم میں زیادہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر جگہ قتل عام ہو رہا ہے اور عجیب بات ہے کہ خود کو مسلمان کہلانے والے مساجد میں بم چلاتے ہیں یہ کتنی عجیب بات ہے! مسجد تو صرف اللہ کی ہوتی ہے۔ یہ لوگوں نے خواہ مخواہ بورڈ لگا رکھے ہیں کہ یہ فلاں کی مسجد ہے، یہ فلاں کی مسجد ہے۔ کوئی مسجد کسی کی نہیں ہوتی وَاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰہِ یقیناً مساجد اللہ کی ہیں۔ مسجد میں کوئی عبادت کے لیے آتا ہے اور اس کا عقیدہ آپ سے مختلف ہے تو کوئی حرج نہیں۔ اسے وہاں اپنی عبادت کرنے کا حق حاصل ہے، حتیٰ کہ نجران کے عیسائی جب اپنا وفد بنا کر مدینہ منورہ بارگاہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضر ہوئے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں ٹھہرادیا اور وہاں انہیں اپنے طریقے سے عبادت کرنے سے منع نہیں فرمایا۔

جنگوں میں جو قیدی یا غلام ہاتھ آتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم انہیں ان کے طریقے کے مطابق عبادت کرنے سے روکنے پر منع فرماتے بلکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ انہیں وہ کھلاؤ جو خود کھاتے ہو، انہیں وہ

پہناؤ جو خود پہنتے ہو اور ان کا جو عقیدہ ہے اس کے مطابق اگر یہ عبادت کرنا چاہیں تو انہیں مت روکو۔ خواہ وہ آگ کو پوجتے ہیں، بتوں کو پوجتے ہیں، آپ کو روکنے کا حق نہیں ہے۔

پھر آج کسی کو کیا حق ہے کہ وہ مسجد پر قبضہ جما کر کہہ دے کہ یہ بریلویوں کی ہے، یہاں دیوبندی نماز نہیں پڑھ سکتا، یہ سُنّیوں کی مسجد ہے اور یہ اہل حدیثوں کی مسجد ہے۔ یہ سارے ہمارے بنائے ہوئے ڈھکوسلے ہیں۔ تمام مساجد صرف اللہ کی ہیں اور ہر بندے کو حق حاصل ہے کہ وہ مسجد میں عبادت کرے۔ اسے روکنا جائز نہیں ہے کیونکہ عبادت اللہ کی ہے اور اس کا اجر اس نے دینا ہے اگر وہ غلط طریقے سے کر رہا ہے اور اللہ کے حکم کے خلاف کر رہا ہے تو اسے سزا دینے کا حق بھی اللہ کو ہے، مجھے اور آپ کو نہیں۔ پھر یہ مساجد ہماری نہیں ہیں۔ ہم نے خواہ مخواہ ان پر مختلف ناموں اور مسالک کی تختیاں لگا رکھی ہیں۔ تمام مساجد اللہ کی ہیں۔

اہل عرب حرمت کے مہینوں میں جنگ سے اعراض کرتے تھے۔ باوجود کفر و شرک کے ان میں دینِ ابراہیمی کی بعض باتیں، جیسے بیت اللہ شریف کی عظمت یا بیت اللہ شریف کا طواف، باقی تھیں اگرچہ انہوں نے اس میں بہت تبدیلیاں کر دی تھیں لیکن حرمت کے مہینوں کا احترام باقی تھا کہ ان میں جنگ نہ کی جائے گی۔ یہ حرمت اسلام نے باقی رکھی لیکن ارشاد فرمایا کہ حرمت ان کے لیے ہے جو خود بھی اس حرمت کا احساس کریں۔

اَلشَّهۡرُ الۡحَرَامُ بِالشَّهۡرِ الۡحَرَامِ ۔۔۔حرمت ادلہ بدلہ ہے کہ دونوں فریق اس کا لحاظ کریں۔ اگر کفار، مشرکین اس کا لحاظ نہیں کرتے اور مسلمانوں پر جنگ مسلط کرتے ہیں تو پھر مسلمان بھی آزاد ہیں کہ وہ مقابلہ کریں اور حرمت کا خیال نہ کریں۔ وَالۡحُرُمٰتُ قِصَاصٌ ۔۔۔۔ حرمت تو ایک لین دین ہے اب یہ نہیں ہے کہ حرمت کے مہینے کو دیکھ کر مسلمان ہاتھ باندھے رکھیں اور کافران کی گردنیں کاٹتے رہیں۔ یہ تو ایک ادلے کا بدلہ ہے، قصاص ہے۔ اگر وہ حرمت کے مہینوں کا لحاظ کریں گے تو مسلمان بھی ان کا لحاظ کریں گے، ان سے نہیں لڑیں گے لیکن اگر وہ لحاظ نہیں کریں گے تو پھر مسلمانوں کو بھی اجازت ہے کہ مقابلہ کریں۔

فَمَنِ اعۡتَدٰى عَلَيۡكُمۡ فَاعۡتَدُوۡا عَلَيۡهِ ۔۔۔ جو تم سے زیادتی کرے تم بھی اس سے زیادتی کرو، جو تم پر جنگ مسلط کرے تم بھی اس سے مقابلہ کرو لیکن ایک بات یاد رہے بِمِثۡلِ مَا اعۡتَدٰى عَلَيۡكُمۡ ۔۔۔۔ اتنی ہی زیادتی آپ لوگ بھی کر سکتے ہیں جتنی انہوں نے آپ سے کی ہے۔ جو جنگ میں آتا ہے آپ اس سے مقابلہ کر سکتے ہیں لیکن یہ درست نہیں ہے کہ اس کے بیوی بچوں کا قتل کر دو یا بوڑھوں کو یا جو معذور لوگ ہیں، انہیں قتل کر دو۔ حکم یہ ہے کہ جو لوگ جنگ میں شریک نہیں ہیں، انہیں قتل نہ کیا جائے ان کے شہر نہ اجاڑے جائیں اور بے گناہ لوگوں کو نہ مارا جائے۔

معیتِ باری تقویٰ سے نصیب ہوتی ہے:

وَ اتَّقُوا اللّٰہَ۔۔۔۔ اللہ جل شانہ سے اپنے تعلقِ عبدیت کا احساس دل میں زندہ رکھو۔ اس بات سے ڈرتے رہو کہ کہیں اللہ کریم ناراض نہ ہو جائیں۔ آپ جب جہاد کرتے ہیں یا مقابلہ کرتے ہیں تو وہ اللہ کی رضا کے لیے ہے۔ اب اس میں ایسی زیادتی کی جائے یا اس طرح کا کام کیا جائے کہ بجائے رضامندی کے ناراضگی حاصل ہو تو پھر اس کا کیا فائدہ!

وَ اعْلَمُوْٓا۔۔۔۔ اور یہ بات یاد رکھو! یہ بات ہمیشہ ذہن میں رہے اَنَّ اللّٰہَ مَعَ الْمُتَّقِیْنَ﴿۱۹۴﴾ کہ اللہ ہمیشہ اہلِ تقویٰ کا ساتھ دیتا ہے، متقین کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس کی رحمت، اس کی برکتیں، اس کا فضل و کرم ان لوگوں کے ساتھ ہے جو اپنا رشتہ اس کے ساتھ استوار رکھتے ہیں۔ وہ لوگ جو ہر کام میں یہ احساس زندہ رکھتے ہیں کہ میں اللہ کا بندہ ہوں، وہ میرا مالک ہے اور مجھے اس کی رضا مقدم ہے۔ مجھے تمام امور میں اس کے حکم اور اس کی مرضی کے مطابق چلنا ہے۔ متقی وہ ہے جسے یہ احساس، اللہ سے یہ نسبت نصیب ہو جائے کہ وہ اپنے ہر کام میں مرضیات باری کو تلاش کرے اور اس کے مطابق عمل کرے۔ یاد رکھو! جہاد ایک بہت بڑی عبادت ہے، مجاہد کا درجہ بہت بڑا ہے بلکہ مجاہد کے گھوڑوں کے سموں سے اڑنے والی چنگاریوں اور مٹی کو بھی اللہ کریم نے عظمت بخشی ہے اور اس کی قسمیں کھائی ہیں۔ قرآن حکیم میں اسے گواہ بنایا ہے، شاہد قرار دیا ہے۔ شہید کا ایک قطرہ خون تمام جہانوں میں، تمام جہان کی نعمتوں سے زیادہ فضیلت رکھتا ہے اور شہید موت کو بھی شکست دے دیتا ہے۔ شہید کبھی مرتا نہیں، ہمیشہ زندہ رہتا ہے لیکن اس ساری عظمت کا راز اس میں ہے کہ جہاد بھی اور شہادت بھی ان حدود کے اندر ہو جو اللہ نے مقرر کر دی ہیں۔ اپنی مرضی سے اگر کسی کو قتل کر دیا جائے یا اپنی ناراضگی سے کسی کو مار دیا جائے تو یہ جہاد نہیں ہوگا، یہ شہادت نہیں ہوگی یا کوئی اس طرح مارا جائے تو شہادت نہیں ہوگی۔ اللہ کے حکم کے مطابق، اللہ کی رضامندی کے حصول کے لیے اور اللہ کریم سے اپنی نسبت کو دھیان میں رکھتے ہوئے آپ سارا کام کریں اور یاد رکھیں اَنَّ اللّٰہَ مَعَ الْمُتَّقِیْنَ﴿۱۹۴﴾ کہ معیت باری انہی کو نصیب ہوتی ہے جو اللہ کی رضا کا احساس رکھتے ہیں اور وہ احساس ان کے تمام اعمال پہ غالب ہوتا ہے۔

اسراف، انفاق اور بخل:

وَ اَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ۔۔۔۔ دو چیزوں کی طرف خصوصی طور پر توجہ دلائی گئی، مال اور جان۔ جہاں ضرورت پڑے اپنا مال اللہ کی راہ میں خرچ کرو۔ انفاق ہوتا ہے کہ جہاں اللہ حکم دے، اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم حکم دیں، شریعت حکم دے وہاں خرچ کیا جائے اور محض اپنی شہرت کے لیے مال لٹوانا اسراف ہوتا ہے، یہ فضول خرچی ہے،

اس کی اجازت نہیں ہے۔

مومن کو یہ بنیادی بات یاد رکھنی چاہیے کہ بڑائی صرف اللہ کے لیے ہے۔ جیسا کہ قرآن میں دوسری جگہ ارشادِ باری ہے: وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ۔۔۔۔۔(المنافقون:8) عزت اللہ کے لیے ہے، وہ سب سے معزز ہے وہ سب سے بڑا ہے اور ساری تعریفوں کا مستحق ہے۔ اللہ کے بعد عزت اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلّم کے لیے ہے۔ دنیا میں کوئی دوسرا ایسا شخص نہیں ہے جس کی عزت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کے مقابلہ میں ہو۔ تیسرے درجے میں عزت ان لوگوں کا حق ہے جو اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلّم پر ایمان لاتے ہیں، اطاعت کرتے ہیں اور اپنے ایمان پر قائم رہتے ہیں۔ کوئی شخص اپنی شہرت کے لیے پیسے لٹاتا ہے تو یہ اسراف ہے، جہاں شریعت حکم دیتی ہے وہاں خرچ کرتا ہے تو یہ انفاق ہے اور جہاں اللہ اور اللہ کا رسول صلی اللہ علیہ وسلّم خرچ کرنے کا حکم دیں وہاں روکنا بخل ہے۔ مال سے اتنی محبت نہ کرو کہ اللہ کے حکم پر اور اس کے حبیب صلی اللہ علیہ وسلّم کے حکم پر خرچ نہ کرسکو۔

جہاد سے رک جانا خودکشی ہے:

اور دوسری بات یہ یاد رکھو! وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ۔۔۔۔ اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ ڈالو۔ حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے تھے کہ اس آیت کا شانِ نزول یہ ہے کہ جب اسلام نے جزیرہ نمائے عرب کو فتح کرلیا اور اسلامی ریاست مضبوط ہوگئی تو بعض لوگوں کا یہ خیال تھا کہ اب جہاد کی کیا ضرورت ہے؟ اب تو محنت کرنی چاہیے، کھیتی باڑی پر توجہ دینی چاہیے اور حصولِ رزق کے لیے وقت لگانا چاہیے، تو ارشاد ہوا کہ اگر تم جہاد سے رک جاؤ گے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم نے خودکشی کرلی۔ تم نے اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں ہلاکت میں ڈال لیا۔ اگر یہ دونوں باتیں جمع ہوجائیں کہ مال کی محبت بھی اتنی ہوجائے کہ اللہ کی راہ میں خرچ نہ کیا جائے اور جہاد سے جی چرانے لگو تو پھر بربادی میں کوئی کسر باقی نہیں رہتی، تو اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں سے ہلاکت میں نہ ڈالو۔

کس کام میں حسن ہے:

وَاَحْسِنُوْا۔۔۔۔ احسان کرو، اچھے کام کرو۔ اچھائی کا معیار کیا ہوگا؟ انسان کا ایک بڑا عجیب مزاج ہے کہ آپ کسی قاتل، کسی چور، کسی ڈاکو سے پوچھیں تو اس نے اپنے قتل کرنے یا ڈاکے مارنے کا جواز بنایا ہوتا ہے۔ میرے ساتھ ظلم ہوگیا، ایسا کرنا میری مجبوری تھی، مجھے یہ ضرورت تھی ایسا کیا۔ گویا ہر آدمی کا اچھائی اور برائی کا اپنا ایک معیار ہے کہ وہ کسی چیز کو برا سمجھتا ہے اور کسی کو اچھا سمجھتا ہے۔ جب یہ فرمایا گیا کہ اچھا کرو تو یہ ہماری پسند پر نہیں چھوڑ دیا گیا۔ حسن کس چیز میں ہے؟ حسن اللہ کی اطاعت میں ہے۔ حسن ہر اس کام میں ہے جسے کرنے کا

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے۔ حسن حدیث میں ہے، سنت میں ہے اور جو اس کے خلاف ہے وہ کبھی احسن نہیں ہو سکتا۔ میری رائے ہو، آپ کی رائے ہو، پیر صاحب کی رائے ہو، مولوی صاحب کی رائے ہو، دنیا میں کوئی ایسا فرد نہیں کہ جس کی رائے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد عالی کے مقابلے میں کوئی حیثیت رکھتی ہو۔ لہٰذا فرمایا: وَ اَحْسِنُوْا اس کا سیدھا سیدھا ترجمہ یہ ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی کو شعار بنا لو، اس سے باہر مت نکلو، ہر حال میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دامانِ رحمت کو تھامے رہو اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادِ عالی کی تعمیل کرو۔ یہی حسن ہے اور یہی اللہ کو پسند ہے۔ اور صرف تعمیل نہیں بلکہ احسان کرو وَ اَحْسِنُوْا احسان یہ ہے کہ تعمیلِ ارشاد میں دل بھی شامل ہو اور دل کی گہرائی سے، خوش اسلوبی سے ہو کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی کا حق ادا کیا۔ اس میں دلی طور پر پورا خلوص شامل ہو۔ اگر تمہیں یہ مرتبہ نصیب ہو جائے تو پھر تم یہ سمجھو کہ تم اللہ کے محبوب بن گئے ہو۔

احسان کیا ہے:

وَ اَحْسِنُوْا جو بھی عبادت الٰہی کرو، وہ تہہ دل سے کرو۔ اللہ کریم کو صرف ارکان کو دیکھنا ہی پسند نہیں ہے کہ آدمی ارکان پورے کرے، وضو صحیح کرے، نماز درست پڑھے۔ ٹھیک ہے، بہت اچھی بات ہے لیکن اس کے ساتھ دل میں بھی خلوص ہو، ایمان بھی خالص ہو اور ادائیگی میں بھی خلوص ہو۔ حدیث جبرائیل علیہ السلام میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے جبرائیل امین علیہ السلام نے سوال کیا کہ احسان کیا ہے؟ فرمایا: احسان یہ ہے کہ ان تعبد اللہ کانك تراہ کہ اللہ کی عبادت ایسے کی جائے جیسے کہ تم اللہ کو روبرو دیکھ رہے ہو۔ اَنْ تَعْبُدَ اللہ كَاَنَّكَ تَرَاهُ وَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ اور اگر اتنا حوصلہ نہ ہو تو پھر کم از کم یہ یقین ضرور ہو کہ وہ مجھے دیکھ رہا ہے۔ اب آپ دیکھ لیجیے کہ ہم جب بات کرتے ہیں اور ہمارے سامنے کوئی افسر یا کوئی حاکم ہوتا ہے تو اس کی موجودگی کا احساس دامن گیر ہوتا ہے۔ عدالت میں جاتے ہیں، سامنے جج ہوتا ہے تو ہم کس انداز سے بات کرتے ہیں۔ ہر آدمی اتنا محتاط ہوتا ہے کہ کوئی اونچا دم نہیں لیتا، کوئی آپس میں سرگوشیاں یا باتیں نہیں کرتا یعنی پوری طرح متوجہ اور باادب رہ کر بات کی جاتی ہے۔ جب حضورِ الٰہی ہو، اللہ کریم کے حکم کی بجا آوری ہو اور بندہ اللہ کریم کے روبرو ہو تو اس کی کیا کیفیت ہونی چاہیے! اس کیفیت کا نام احسان ہے۔

اللہ کے محبوب کون!

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۹۵﴾ یقیناً اللہ محسنین کے ساتھ محبت کرتا ہے۔ جو شخص بھی اس مرتبے کو پالے کہ اس کا دل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت پر خوش ہو، پیسہ صرف کرنا پڑے تو پیسہ صرف کرے، زبان سے بات کرنی پڑے تو اپنا

علم خرچ کرے، اقتدار واختیار ہوتو اپنی قوت اور اقتدار واختیار کی طاقت حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کے اتباع میں خرچ کرے۔ جو اس کے پاس ہے، جو کچھ اللہ نے دیا ہے اسے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کے اتباع میں خرچ کرے تو انفاق ہے۔

صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے سوال کیا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم! جب انفاق کی بات آتی ہے تو جن لوگوں کو اللہ نے رزق زیادہ دیا ہے وہ زیادہ انفاق کر لیتے ہیں اور ہم جو غریب ہیں، ہم تھوڑا کرتے ہیں۔ وہ زیادہ ثواب لے جاتے ہیں، ہمیں تھوڑا ملتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا تم یہ تسبیحات پڑھا کرو۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلّم نے وہ تسبیحات فرمائیں تو سارے لوگ سن رہے تھے، سب نے پڑھنا شروع کر دیں۔ غریب بھی پڑھتے تھے اور اہل ثروت بھی پڑھتے تھے۔ انہوں نے پھر عرض کی کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم! اب یہ جو تسبیحات آپ صلی اللہ علیہ وسلّم نے عطا فرمائیں یہ تو وہ بھی پڑھتے ہیں، ان کا ثواب تو پھر زیادہ ہو گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ یہ اللہ کی تقسیم ہے، اس پر کوئی جھگڑا نہیں کر سکتا۔ جن پر اللہ کا کرم ہے کہ اللہ نے انہیں دولت دی تو وہ دولت بھی اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔ میں نے تسبیحات بتائیں تو وہ تسبیحات بھی پڑھتے ہیں۔ اب یہ تقسیم تو اللہ کی ہے، اس میں تو کچھ نہیں ہو سکتا۔

بات دردِ دل کی ہے، دلی خواہشات کی ہے، بات انسان کی ہے کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ ایک شخص اسلام قبول کرتے ہی بڑے جوش کا اظہار کرنے لگا۔ کسی نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کے سامنے عرض کیا، یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم! نیا مسلمان ہوا ہے لیکن بڑا جذبے والا مسلمان ہے، ہم سے تو اس میں جوش زیادہ ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا، لیکن یہ جہنمی ہے۔ بات آئی گئی ہوگئی۔ اس کے بعد میدان جہاد میں وہ شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کے ساتھ شامل تھا، زخمی ہو کر گرا، زخموں کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں، درد ہو رہا تھا تو اس سے برداشت نہ ہو سکا۔ اس نے اپنا ایک تیر نکالا اور زمین پر کھڑا کر کے خود کو اس کے اوپر گرا دیا، خودکشی کر لی۔ پھر اس صحابیؓ نے عرض کی یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم! میں نے دیکھ لیا وہ حرام کی موت مرا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کا فرمان برحق تھا۔ دیکھنے میں بڑا مسلمان لگتا تھا لیکن اللہ کی راہ میں، آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی اطاعت میں تھوڑا سا درد برداشت نہ کر سکا، خودکشی کر لی۔

تو کہنا ایک الگ حیثیت رکھتا ہے اور کرنا کچھ اور حیثیت رکھتا ہے۔ آدمی کہتا تو بہت ہے، میں یہ بھی کر دوں گا، یہ بھی کر دوں گا لیکن بات تو کرنے کی ہے۔ عمل کتنا کرتا ہے اور پھر اس عمل میں اس کا دل کتنا شامل ہے، کتنے خلوص سے کرتا ہے اور وہ کام کر کے اسے کتنی خوشی ہوتی ہے کہ میں نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی غلامی کی۔ اگر یہ خوشی، یہ کیفیت نصیب ہو جائے تو اللہ فرماتا ہے: پھر جان لو کہ میرے محبوب بن گئے ہو، میں ایسے لوگوں سے محبت کرتا ہوں

جو میرے محبوب صلی اللہ علیہ وسلّم کا اتباع خلوص دل سے کرتے ہیں۔ اتباع کر کے انہیں خوشی سے نصیب ہوتی ہے تو وہ میرے محبوب بن جاتے ہیں، میں ان سے محبت کرتا ہوں۔

وَ اَتِمُّوا الْحَجَّ وَ الْعُمْرَةَ لِلّٰهِ ۔۔۔۔ اب احسان کے لیے ایک نسخہ تجویز فرمایا۔ قلبی کیفیات حاصل کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ اللہ کے لیے حج اور عمرہ کرو۔ قرب الٰہی کا ایک دروازہ کھول دیا کہ اگر تمہیں توفیق نصیب ہو تو اللہ کی راہ میں حج کرو، عمرہ کرو۔ حج صاحب حیثیت پر زندگی میں ایک بار فرض ہے۔ اگر حیثیت نہیں ہے تو فرض نہیں ہے لیکن اگر میسّر ہو جائے تو بڑی سعادت ہے۔ ایک صورت بنتی ہے کہ آدمی عمرہ کرے تو عمرہ بھی حج ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ عمرہ میں منیٰ جانا، عرفات جانا، مزدلفہ ٹھہرنا یا قربانی نہیں ہے۔ باقی بیت اللہ شریف میں طواف کرنا، نوافل پڑھنا، صفا مروہ کی سعی کرنا اور پھر بال منڈوانا، یہ سب تو عمرے میں بھی ہے جو گویا چھوٹا حج ہے۔

حج میدان حشر کا منظر ہے:

وَ اَتِمُّوا الْحَجَّ وَ الْعُمْرَةَ لِلّٰهِ ۔۔۔۔ حج بجائے خود کیا ہے؟ اگر ترتیب دیکھی جائے تو قرآن حکیم میں، تو اس سے پہلے احسان کی بات ہے وَ اَحْسِنُوْا جہاد کی بات ہے، مال خرچ کرنے کی بات ہے۔ اپنے پاس جو کچھ ہے، جان، مال، اقتدار اختیار، علم، طاقت وہ اللہ کی راہ میں صرف کرنے کی بات ہے اور یہ بات ہے کہ بندہ اللہ کا محبوب بن جاتا ہے۔ اس کے بعد فرمایا: وَ اَتِمُّوا الْحَجَّ وَ الْعُمْرَةَ لِلّٰهِ ۔۔۔۔ حج کرو۔ حج کیا ہے؟ بیت اللہ شریف روئے زمین پر تجلیات ذاتی کا واحد مہبط ہے۔ زمین کا ایک ایسا ٹکڑا جس پر ہر وقت، ہر حال میں اللہ کی ذاتی تجلیات متوجہ رہتی ہیں، برستی رہتی ہیں اور کبھی وہ اس کیفیت سے خالی نہیں ہوتا۔

آپ خواہ بادشاہ ہیں، خواہ فقیر ہیں۔ آپ کا لباس قیمتی ہے یا عامیانہ ہے۔ اپنے سارے پہناوے اتار کر دو ان سلی چادریں استعمال کرتے ہیں، ایک کمر سے باندھ لی، ایک اوپر اوڑھ لی۔ یعنی جس طرح آدمی کو دو چادروں کا کفن دیا جاتا ہے۔ زندگی میں بندہ اپنی وہ صورت بناتا ہے۔ پھر اللہ کے حضور پیش ہو کر اس کے گھر کا طواف کرتا ہے۔ بیت اللہ شریف مہبط تجلیات ہے، وہ حضورِ حق کا مشاہدہ کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ اللہ کی ذاتی تجلیات برس رہی ہیں اور میں ان کے گرد گھوم رہا ہوں۔ پھر وہاں نوافل ادا کرتا ہے، پھر صفا اور مروہ کی سعی کرتا ہے۔ اگر حج ہے تو پھر منیٰ جاتا ہے، منیٰ سے عرفات جاتا ہے اور واپسی پر مزدلفہ میں ٹھہرتا ہے۔ صبح منیٰ آتا ہے رمی کرتا ہے قربانی کرتا ہے اور سر منڈواتا ہے۔

وَ اَتِمُّوا الْحَجَّ وَ الْعُمْرَةَ لِلّٰهِ ۔۔۔۔ حج اور عمرہ اللہ کے لیے کرو کہ یہ حضورِ حق کو دل میں اتارنے کا ایک

بہت بڑا نسخہ ہے۔ آپ صرف دو ان سلی چادریں لے کر اللہ کے گھر کے سامنے کھڑے ہو کر پکار کر کہتے ہیں، اے اللہ! میں حاضر ہوں۔ لَبَّيْكَ اللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ، لَبَّيْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ لَبَّيْكَ تیرا کوئی شریک نہیں ہے، میں تیری بارگاہ میں حاضر ہوں۔ اِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ لَكَ وَالْمُلْكَ تمام خوبیاں، تمام نعمتیں اور ساری سلطنت صرف تیری ہے۔ میں تیری بارگاہ میں حاضر ہوں۔ گویا اس کے لیے حشر کی گھڑی ہے۔ اللہ کریم کا دربار سجا ہوا ہے۔ اللہ روبرو جلوہ افروز ہے اور وہ اپنا کفن اٹھائے، جیسے قبر سے اٹھ کر جاتے ہیں، اس طرح وہ اپنا کفن اٹھائے اپنی جواب دہی کے لیے اللہ کے روبرو حاضر ہے۔

حج کے ارکان بھی ہیں۔ اس طرح شروع کرے، یہ یہ رکن ادا کرے۔ ظاہری طور پر ان احکام کی تعمیل کی جائے گی لیکن حج کی حقیقت یہ ہے کہ ہر جانے والا اپنا لباس بدل کر ایسا لباس بنا لے جیسا یوم حشر مومنین کو نصیب ہوگا۔ ہر بندہ حشر میں لباس سمیت نہیں ہوگا۔ لوگ بے لباس اٹھیں گے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بے شمار لوگ برہنہ اٹھیں گے تو یہ کیسا ہجوم ہوگا۔ وہ ایک دوسرے کو دیکھ کر کیا کہیں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، دوسرے کو دیکھنے کا ہوش نہیں ہوگا، ہر شخص اپنی پریشانی میں اتنا گھرا ہوگا جیسے وہ سرتاپا پسینے میں غرق ہو، کسی کو نظر ہی نہ آرہا ہو اور بڑے خوش نصیب ہوں گے وہ لوگ جو قبر سے اٹھیں گے تو اپنا کفن سلامت ہوگا۔ وہی اللہ کے محبوب ہوں گے۔ وہی خوش نصیب لوگ ہوں گے۔ تو وہ حال بنا کر جیسے حشر کو اٹھے ہیں، کفن کی دو ان سلی چادریں لپیٹ کر اللہ کے حضور پیش ہو رہے ہیں، بندہ وہ حال بنا کر اس زندگی میں، اس فانی دنیا میں اللہ کے روبرو پیش ہوتا ہے۔

اب یہ ایک کیفیت ہے جو انسان کی سوچ سے، اس کے دل سے، اس کے دل کی گہرائیوں سے تعلق رکھتی ہے۔ ایک شخص جاتا ہے، میدان حشر کا لباس زیب تن کرتا ہے، ویسی صورت بناتا ہے اور اللہ کے روبرو کھڑے ہو کر اقرار کرتا ہے لیکن اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ واپس آتا ہے تو وہی ہوتا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ اس نے ظاہری ارکان تو ادا کیے لیکن اس قلبی کیفیت کے بغیر، جس کے بارے میں ارشاد ہے کہ جس نے حج کیا وہ گناہوں سے اس طرح پاک ہو گیا گویا وہ آج دنیا میں پیدا ہوا۔ اس کے سارے گناہ دُھل گئے۔ گناہ تو دھل ہی جانے تھے جب وہ اللہ کے روبرو جا کر کھڑا ہو گیا اور تجلیات ذاتی اس پر برسیں۔

ایک باطنی کیفیت ہو کہ دل کی گہرائی کے ساتھ خود کو اللہ کے روبرو کھڑا محسوس کرے، اور اس کا اثر تادمِ مرگ ہی نہیں، مرنے کے بعد بھی باقی رہے۔ قبر میں بھی تجلیات باری اور اللہ کی حضوری نصیب ہو، حشر میں بھی اللہ کی حضوری اور

تجلیات نصیب ہوں۔ جس طرح بیت اللہ میں دو چادریں اٹھا کر گیا تھا میدان حشر میں بھی کفن کو اسی طرح سلامت اٹھا کر اللہ کے حضور حاضر ہو، حج کا مزا تو تب ہے، یہ حج ہے۔

قیامِ پاکستان سے قبل کا ایک واقعہ ہے کہ ایک صاحب حج پر تشریف لے گئے جن کے چچا ایک معروف عالم تھے۔ مکہ مکرمہ سے ان کے نام خط بھیجا کہ میرے فلاں کام کا بھی دھیان کیجیے گا، میرا فلاں کام بھی تھا، فلاں چیز بھی تھی، اس وقت آنے جانے میں سال لگ جاتا تھا، میرے آنے تک ان کا خیال رکھیے۔ انہوں نے جواب بھیجا کہ تمہارا دل تو ہندوستان میں ہے، اس سے تو بہتر ہوتا کہ تمہارا وجود ہندوستان میں ہی رہتا اور دل حرم میں رہتا۔ اگر وہاں جا کر بھی تمہیں یہ سب یاد ہے تو اس کا مطلب ہے کہ تمہارا وجود حرم میں ہے اور دل ہندوستان میں ہے، وہاں جا کر کیا حاصل کیا؟ مطلوب وہ کیفیت ہے کہ آپ اس زندگی میں کفن پہن کر میدانِ حشر کی صورت بنا کر اللہ کے روبرو پیش ہو جاتے ہیں اور پکار کر کہتے ہیں، اے میرے مالک! میں حاضر ہوں۔

حج درس خلافت دیتا ہے:

روئے زمین سے مسلمان جمع ہوتے ہیں جن کا امام ایک ہوتا ہے۔ اسلوبِ حج بتا دیتا ہے کہ روئے زمین پر تم جہاں بھی ہو، سارے عالمِ اسلام کا امام، خلیفہ اور حاکم بھی ایک ہو۔ جیسے اسلامی ریاستیں سو بھی بن جائیں لیکن سب کا مرکز ایک ہے۔ اسی طرح سب حکمرانوں کا ایک امام، ایک خلیفہ بھی ہونا ضروری ہے۔

حج سے ہمیں دوسری کیفیت یہ ملتی ہے کہ روئے زمین سے آئے ہوئے مسلمان گورے، کالے، مختلف زبانیں بولنے والے، ممالک مختلف ہیں، عادتیں مختلف ہیں، مزاج مختلف ہیں، غذائیں مختلف ہیں، قد مختلف ہیں، سوچیں مختلف ہیں لیکن اسلام ایک ہے۔ سب کا قرآن ایک ہے، سب کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک ہے، سب کا اللہ ایک ہے لہٰذا سب کا امام بھی ایک ہونا چاہیے۔ پھر آپ دیکھتے ہیں کہ پچیس تیس لاکھ لوگ ایک امام کے اللہ اکبر کہنے پر اللہ کی بارگاہ میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ایک امام کے رکوع کرنے پر رکوع کرتے ہیں۔ ایک امام کے سجدے کے ساتھ سجدہ ادا کرتے ہیں۔ دنیوی زندگی کو بھی ایسے ہی ترتیب دیا جائے کہ تمام ریاستوں کا مرکز ایک ہو اور روئے زمین پر ایک خلیفہ ہو۔ عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر ترک حکمرانوں کے عہد تک یہ خلافت جاری رہی۔ اس بیسویں صدی میں اہلِ مغرب نے سلطان عبدالحمید کو حکومت سے ہٹا کر اور ترکی کو جمہوریہ بنا کر مسلمانوں کی خلافت ختم کر دی جس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ مسلمانوں کا مرکز جاتا رہا۔

بڑی عجیب بات ہے کہ یہودیوں کا مرکز باقی ہے، عیسائیوں کا مرکز باقی ہے۔ انہوں نے پوپ کے شہر ویٹ

کن سٹی کو ایک الگ حکومت کا درجہ دے دیا ہے اور کوئی عیسائی حکمران ایسا نہیں ہے جو پوپ کے مقابل سر اٹھا سکے۔ اس کی بات سب مانتے ہیں لیکن مسلمانوں کا جو مرکز تھا وہ انہوں نے بڑی ہوشیاری اور بڑی سازش سے ختم کر دیا۔ ہندوستان میں تو علماء نے تحریک بھی چلائی۔ تحریک خلافت میں لوگ شہید بھی ہوئے لیکن افسوس یہ بیس کی دہائی کا واقعہ ہے اور اب وہ بیسویں صدی بھی گزر چکی۔ 1921,1922 کا واقعہ ہے اور اب اکیسویں صدی ہے۔ اب تو مسلمانوں کو خلافت کا خیال بھی نہیں رہا حالانکہ حج کی تربیت میں خلافت کا تصور موجود ہے ورنہ وہاں بھی پانچ دس امام ہوسکتے ہیں۔ پچیس تیس لاکھ بندے جمع ہوتے ہیں۔ حدحرم تو دور تک ہے۔ اگر ایک ایک لاکھ الگ ہوکر نمازیں ادا کر لیں تو ہجوم نہ ہو لیکن مقصد یہ تھا کہ عملی زندگی میں بھی ایسی یکجہتی ہو کہ کتنی بھی حکومتیں بن جائیں، مرکز ایک ہو اور خلیفہ کی اجازت کے بغیر کوئی حکمران قدم نہ اٹھائے، سب کا مرکز ایک ہو۔

افغانستان میں جب طالبان کی حکومت بنی تو انہوں نے احیائے خلافت کے لیے ملا عمر کو خلیفہ نامزد کر دیا۔ اب عیسائی حکمرانوں کو، عیسائی دنیا کو، یہودی حکمرانوں کو، یہودی دنیا کو یہ احساس ہوا کہ یہ پھر سے خلافت پر اکٹھے ہو رہے ہیں، انہیں پھر ایک مرکزیت مل جائے گی۔ اس کو ختم کرنے کے لیے ایک ملک تباہ کر دیا گیا اور پچاس سے زائد مسلمان ریاستیں اور حکمران اس پر افسوس کا ایک جملہ تک نہ کہہ سکے۔ کیسی عجیب بات ہے کہ چھپن کے قریب اسلامی ریاستیں ہیں، مسلمان ملک ہیں اور مسلمان حکمران ہیں لیکن قرارداد مذمت بھی پیش نہ کر سکے کہ جو کچھ امریکہ نے یہاں کیا وہ ظلم ہے، زیادتی ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ اگر کسی کے منہ سے کوئی لفظ نکلا تو خلیفہ کے خلاف نکلا، خلافت کے حق میں نہیں نکلا۔

این تفاوت را از کجا است تا کجا

حق وانصاف میں، جرأت میں، ایمان میں فاصلے دیکھیے کتنے بڑھ گئے ہیں اور ایمان سے دوری اور ایمان میں کمزوری کتنی بڑھ گئی ہے۔ جس آدمی کا جو اختیار ہے، اتنا تو وہ کرے، کچھ تو حاصل کرے، کچھ تو سیکھے اور اس کے لیے کوشش کرے۔ پھر اللہ کارساز ہے، کام ہو جاتے ہیں۔ اگر عالمِ کفر کو فتح کر کے خلافتِ اسلامی قائم کی جاسکتی ہے تو کیا مسلمانوں کو جمع کر کے نہیں کی جاسکتی؟ یہ تب ہوسکتی ہے جب ہمیں حج کا مقصد معلوم ہو، حج کی کیفیت ہمارے سینوں میں اترے، ہمیں لذتِ دیدار سے آشنا کر دے، پھر جا کر یہ بات بن سکتی ہے ورنہ ہم مکہ گئے، گھومے پھرے، بیت اللہ کے چکر لگائے اور گھر آ گئے۔

خر عیسیٰ گر بمکہ میود

چوں بہ آید ہنوز خر باشد

گدھا خواہ عیسیٰ علیہ السلام جیسے پیغمبر کا ہو، آپ اسے بیت اللہ لے جائیں اور چکر لگوا کر لے آئیں لیکن واپس آئے گا تو گدھے کا گدھا ہی رہے گا۔ گدھے کو کوئی فرق پڑنے والا نہیں ہے۔ عظمت انسانوں کے حصے میں ہے۔ انسان ہو، سینے میں دل رکھتا ہو، دل میں درد رکھتا ہو، ایمان رکھتا ہو پھر اس خشوع و خضوع کے ساتھ وہاں حاضر ہو تو اس حضوری کا مزا آئے۔ اس حضوری میں جو کچھ وہ پہلے تھا، وہ سب کچھ مٹ جائے اور اس حضوری سے ایک نیا انسان ظہور پذیر ہو۔ ایک نیا آدمی جو سچ بولے، جو محنت کرے، جو حق کی بات کرے اور جو حق کا ساتھ دے۔ اگر ایسا آدمی اس بھٹی سے نکلے تو پھر خلافت قائم ہو اور اگر وہاں گئے، گھوم پھر کے آ گئے تو پھر وہی خرِ عیسیٰ والی بات ہے کہ گدھے کو پکڑ کر لے جاؤ، خواہ ایک نبیؐ کا ہو لیکن واپس آئے گا تو گدھے کا گدھا ہی رہے گا۔ فرمایا: **وَ اَتِمُّوا الْحَجَّ وَ الْعُمْرَةَ لِلّٰهِ** ۔۔۔۔ اسی ایک لفظ لِلّٰہِ میں ساری بات آ جاتی ہے۔ حج اور عمرہ ادا کرو اللہ کے لیے اور اگر اللہ ہی تمہارے روبرو نہیں ہے، تم نے اپنے دل کی گہرائی میں عظمتِ الٰہی کو محسوس ہی نہیں کیا، تمہیں کوئی خیال ہی نہیں آیا تو پھر اس حج اور عمرے کا کیا فائدہ!

حج ذوالحج میں معین دنوں اور اوقات میں ہوتا ہے، اس کے معین ارکان ہیں۔ عمرہ بھی حج ہے اور اس کے سارے احکام کم و بیش حج ہی کی طرح ہیں سوائے عرفات و منیٰ میں جانے کے، وہ ضرورت اس میں نہیں پڑتی۔ باقی طواف، نوافل اور سعی، وہ حج ہی کی طرز پر ہے اور یہ بھی چھوٹا حج ہے۔ عمرہ سارا سال کسی وقت بھی کیا جا سکتا ہے اور حج سال میں انہی مخصوص دنوں میں ہوتا ہے۔

حدِ حرم اور احرام باندھنے کے متعلق ایک وضاحت:

حدِ حرم بیت اللہ کے چاروں طرف بہت دور دور تک ہے۔ جدہ سے نکلیں تو جدہ کے قریب ہی حدِ حرم شروع ہو جاتی ہے۔ مکہ مکرمہ کے شہر کے ساتھ مسجدِ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا حدِ حرم ہے اور یمن کی طرف تو تقریباً پچیس کلومیٹر ہے۔ اسی طرح جنوب مغرب کی طرف حدِ حرم مقرر ہے، جہاں سے منیٰ شروع ہوتا ہے وہاں تک حدِ حرم ہے۔ یہ چاروں کونے ہیں اور ان کے اندر سارا حرم ہے۔ جہاں بھی آپ نماز ادا کریں، اس پر حرمِ بیت اللہ میں نماز ادا کرنے کا، مسجد الحرام میں نماز ادا کرنے کا ثواب ہوگا اور جو ادب و احترام یا جو چیزیں حرم میں منع ہیں، وہی سارے حرم میں بھی منع ہیں اور اسی طرح اس کا ادب و احترام بھی ہے۔ اسی طرح مدینہ منورہ کی بھی حدودِ حرم ہیں جو شہر سے باہر دور دور تک ہیں۔ جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے کہ مکہ اللہ کا حرم ہے اور مدینہ منورہ میرا حرم ہے۔ اس کی بھی حدود ہیں، ان حدود کے اندر صلوٰۃ ادا کرنے یا نیکی کرنے کا اتنا ہی ثواب ہے جتنا مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں ہے۔ تو حدِ حرم میں

حرم کی برکات سب جگہ پر ایک جیسی ہیں۔

حرم میں داخل ہونے کے لیے باہر سے جو مسلمان بھی سیدھا آتا ہے وہ بغیر احرام کے نہیں آسکتا۔ آفاقی یعنی آنے والے کو احرام باندھنا پڑتا ہے۔ ضمناً احرام باندھنے کے متعلق ایک وضاحت کر دی جائے ہمارے علمائے کرام ہمیں اسلام آباد سے احرام پہنوا دیتے ہیں اور احرام کی اپنی شرائط ہیں۔ بال نہ ٹوٹے، خوشبو نہ لگاؤ، پاؤں نہ ڈھکا جائے تو اس طرح بڑی مشکل ہو جاتی ہے۔ یہاں سے کیوں احرام بندھوا دیتے ہو؟ اس لیے کہ جہاز حرم کی حد سے گزر کر جدہ میں جا کر اترتا ہے، اس لیے باندھنا چاہیے لیکن یاد رکھیں! مسئلہ یہ ہے کہ اگر کوئی حد حرم سے گھوڑے پر سوار بھی نکل جائے تو اسے احرام باندھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جب وہ حج کی نیت سے حرم میں داخل ہوگا یا کسی بھی کام سے حدِ حرم میں داخل ہوتا ہے تو زمین پر قدم رکھتے ہوئے اسے احرام میں ہونا چاہیے۔ اگر آپ حج کے لیے جاتے ہیں تو یہاں سے احرام باندھنا ضروری نہیں ہے۔ بے شک آپ آرام سے جدہ جائیں۔ جدہ سے جب روانہ ہوں گے تو بے شک جہاں تک حدِ حرم نہیں ہے، آپ کپڑوں میں جائیں۔ حدِ حرم پر مسجد بنی ہوئی ہے، وہاں جا کر احرام باندھیں، دو نوافل ادا کریں اور آگے چلے جائیں۔ یہ سہولت ہے لیکن اسے کچھ لوگ جانتے نہیں تو وہ یہاں سے احرام باندھ لیتے ہیں۔ احرام کی اپنی حدود و قیود ہیں، انہیں پورا کرنا بھی مشکل ہو جاتا ہے، ان کا لحاظ نہیں کرتے اس لیے کوشش یہ کرنی چاہیے کہ اللہ حج نصیب کرے تو حج پر جانے سے پہلے کم از کم ان چیزوں کا مطالعہ کر لینا چاہیے یا کسی سے پوچھ یا سیکھ لیا جائے تا کہ ساری محنت محض آمد و رفت نہ بنے، اللہ کریم اس کا حج پورا فرمائے اور قبول فرمائے۔

حج کے چند احکام:

وَ اَتِمُّوا الْحَجَّ وَ الْعُمْرَةَ لِلّٰهِ ۔۔۔ حج اور عمرہ اللہ کے لیے ادا کرو۔ یعنی پورا پورا ادا کرو۔ حج کے اور عمرے کے کچھ ارکان ہیں، فرائض ہیں، سنتیں ہیں اس میں واجبات ہیں اور حج ایک ایسی عبادت ہے جس کے بارے میں ارشاد ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حج کرنے والا گناہوں سے ایسے پاک ہو جاتا ہے جیسے دنیا میں آج پیدا ہوا ہو لیکن اسے اس کے پورے ارکان اور پورے سنن واجبات اور پورے آداب کے ساتھ ادا کیا جائے۔

وَ اَتِمُّوا الْحَجَّ ۔۔۔ حج کو پورا پورا ادا کرو، پورا پورا مکمل کرو۔ ہوتا یہ ہے کہ ہم لوگ جو وہاں حاضری دیتے ہیں تو پروا نہیں کرتے کہ حج کے ارکان کیا ہیں، فرائض کیا ہیں، ان میں سنن واجبات کیا ہیں، کس چیز کی احتیاط کرنی

ہے اور کس وقت پر کون سا کام کرنا ہے۔ کوئی بھی آدمی باہر سے جب وہاں وارد ہوتا ہے تو اس کے لیے عمرہ ضروری ہو جاتا ہے۔ سب سے پہلے عمرہ ادا کرنے کے بعد وہ کوئی اور کام کر سکتا ہے۔ اگر حج کے ارادے سے جائے تو حج کے دو طریقے ہیں، تمتع اور قران۔ تمتع میں یہ ہوتا ہے کہ عمرہ ادا کر کے احرام کھول دے، بال کٹا لے اور جب حج کی باری آئے تو حج ادا کر لے۔ دوسرا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ حاجی جب باہر سے آتا ہے تو یہ نیت کر لیتا ہے کہ میں نے جو عمرہ کیا ہے، اسی احرام کے ساتھ حج بھی کروں گا۔ پھر اس میں دو، چار، دس دن جتنے حج میں باقی ہوں، وہ دن اسی احرام کے ساتھ گزارتا ہے۔ احرام کی اپنی شرائط ہیں کہ پاؤں نہ ڈھانکے، خوشبو نہ لگائے، کسی چیز کو حتیٰ کہ مکھی، جوں تک نہ مارے۔ اس طرح بہت سی چیزیں ہیں جن کی احتیاط ضروری ہوتی ہے۔ فرمایا جو بھی کرو اس کے سارے ارکان پوری پوری طرح، خلوص سے اور پورے اہتمام سے ادا کرو۔

احکامِ حج:

اب آگے حج کے احکام ہیں۔ فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۔۔۔۔ اگر تمہیں راستے میں کوئی رکاوٹ آجائے تو جو قربانی ساتھ لائے ہو، جس کی تمہیں توفیق ہے، وہ بھیج دو۔ وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ ۔۔۔۔ جب تک قربانی اپنے مقام پر پہنچ نہ جائے تب تک سر نہ منڈواؤ۔ اگر کسی وجہ سے راستے میں کوئی رکاوٹ آجائے، جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم عمرہ ادا کرنے کے لیے تشریف لے گئے تو مشرکینِ مکہ نے حدیبیہ پہ روک دیا تھا، کوئی بیماری روک دے، دشمن روک دے، جانے کے وسائل پیدا نہ ہو سکتے ہوں تو کم از کم قربانی کو وہاں پہنچا دیا جائے اور تب تک سر نہ منڈوایا جائے جب تک قربانی اپنی جگہ پر پہنچ نہیں جاتی۔

فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖٓ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ ۔۔۔۔ اگر کوئی ایسا بیمار ہو جو سر نہیں منڈوا سکتا تو پھر وہ روزے رکھے یا صدقہ دے یا اس کی جگہ قربانی دے۔ سر منڈانے میں بھی رعایت ہے۔ اگر تم میں کوئی بیمار ہو یا اس کے سر میں کوئی تکلیف ہو اور وہ سر منڈوا نہیں سکتا، سر پورا بھی منڈوایا جاتا ہے جیسے استرے سے بھی اور قینچی سے بھی، اگر سر سے بال ہر طرف سے تھوڑے تھوڑے کاٹ دیے جائیں تو بھی درست ہے لیکن اگر کوئی بیمار ہو اور یہ بھی نہ کر سکے تو پھر اسے صدقہ دینا پڑتا ہے۔ فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۔۔۔۔ اور جب تمہیں امن نصیب ہو اور بیت اللہ پہنچ جاؤ تو جو حج اور عمرہ سے تمتع کرے، جسے بھی اس کی استطاعت ہے، اس کے مطابق حج کی تکمیل کے بعد قربانی دے۔ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ ۔۔۔۔ اگر کسی کو قربانی کی توفیق نہیں ہے تو تین

دن کے روزے حج کے ایام میں رکھے، ذوالحج میں اور سات روزے اس کے بعد جب واپس پہنچے۔

تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ۔۔۔۔ یہ دس روزے ہو جائیں گے۔ ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ۔۔۔۔ یہ ان لوگوں کے لیے ہے جو حرم کے باہر سے حرم میں حاضر ہوتے ہیں۔ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ﴿۱۹۶﴾ اور اللہ کے ساتھ رشتہ بندگی استوار رکھو اور یہ یاد رکھو کہ اللہ کریم ناراض ہو جائیں تو پھر اس کی گرفت بھی اور اس کی سزا بھی بہت سخت ہے۔

اللہ کے ساتھ اپنا معاملہ درست رکھو:

وَ اتَّقُوا اللّٰهَ اپنا معاملہ رب جلیل کے ساتھ درست رکھو۔ صرف یہ نہ سمجھو کہ لوگوں میں حاجی کہلانے سے بات بن جائے گی یا گھوم پھر کر آ جانے سے بہت کچھ ہو جائے گا۔ حج کے ارکان کا پورا خیال رکھو۔ فرائض، واجبات، سنن کو اپنے اپنے موقع پر پوری احتیاط سے ادا کرو۔ ارکان حج کا پورا لحاظ کرو۔ حج اور تمام عبادتوں کا حاصل یہ ہے کہ بندے کا تعلق رب کریم کے ساتھ مضبوط سے مضبوط تر ہوتا چلا جائے، اسے حضوری حق نصیب ہو اور ایک کیفیت پیدا ہو جائے کہ ہمہ وقت اپنے پروردگار کو اپنے ساتھ حاضر سمجھے۔ اللہ ہر وقت ہر جگہ موجود ہے۔ ہم نے اسے اپنی کسی کوشش یا کاوش، دعا یا عبادت یا بلاوے سے بلانا نہیں ہے، اللہ کریم تو ہر وقت ہر جگہ موجود ہے۔

وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ (الحدید: 4) تم کسی وقت بھی، کہیں بھی ہو، اللہ تمہارے ساتھ ہے تو پھر یہ حضورِ حق کے لیے محنت کیا معنی رکھتی ہے؟ حضوری حق سے مراد یہ ہے کہ ہمیں بھی اس کا ادراک ہو۔ اللہ تو موجود ہے لیکن ہم غائب ہوتے ہیں، حضورِ حق سے بھی اور اس احساس سے بھی کہ اللہ ہمارے پاس موجود ہے ہمارا احساس بھٹک جاتا ہے، ہمارا احساس مر جاتا ہے، ہمیں یہ خیال نہیں رہتا کہ اللہ کریم موجود ہے۔ عبادات سے انسان کی اپنی ذات اور ان کیفیات کی تعمیر ہوتی ہے۔ عبادات، فرائض آدمی کی ضرورت ہیں۔ فرض کا لغوی مفہوم بھی اگر تلاش کیا جائے تو یہ بنتا ہے کہ کسی کو ایسی چیز عطا کر دی جائے جس کے بغیر اس کی زندگی ممکن نہ تھی، جس کا وہ انتہائی ضرورت مند تھا، جس کی اسے اشد ضرورت تھی، وہ چیز اسے عطا کر دی جائے تو اسے فرض کہتے ہیں۔ تو فرائض کوئی بوجھ نہیں لادا گیا بلکہ نوع انسانی فرائض کے بغیر بنی آدم تو ہے، انسان نہیں، حیوان ناطق تو ہے، ایسا حیوان ہے جو باتیں کر سکتا ہے، سمجھ سکتا ہے، لکھ پڑھ سکتا ہے لیکن اس میں انسانیت تب آتی ہے جب اللہ کی طرف سے اسے فرائض نصیب ہوتے ہیں۔ اس سعادت سے بہرہ ور ہوتا ہے تو اس کے اندر جو کیفیت بنتی ہے وہ اسے انسان بناتی ہے۔ مسلمان کا لفظی مفہوم ہے، ماننے والا، تسلیم کرنے والا لیکن اس کا حاصل یہی ہے کہ وہ ایک بہترین انسان بن جائے اور ہر عبادت اسے بہتری کی

طرف لے کر چلے۔ اس کی سوچ بہتر ہو، اس کا کردار بہتر ہو، اس کے افعال بہتر ہوں اور اللہ کی مخلوق کے لیے وہ ایک مفید انسان بنے، باعث تکلیف نہ بنے۔ عبادات اور فرائض میں یہ تصور اور اس فکر کو لے کر چلنا چاہیے۔

حج ادا کرنے سے حاجی صاحب کہلوانا مقصود نہیں ہے بلکہ مقصد یہ ہے کہ انسان بالکل بدل جائے اور اسے قرب الٰہی نصیب ہو جائے۔ زندگی بھر کے کردار میں جب کبھی وہ کچھ سوچنے لگے تو اسے احساس ہو کہ میرا اللہ میرے پاس ہے، بولنے لگے تو یہ احساس ہو کہ میرا اللہ سن رہا ہے۔ کوئی کام کرنے لگے تو اسے پتہ ہو کہ میرا اللہ میرے پاس ہے اور میری ہر حرکت کو دیکھ رہا ہے۔ آپ خیال فرمائیے کہ اگر کسی کو یہ احساس نصیب ہو جائے، اس کا شعور بیدار ہو جائے تو وہ کتنا بھلا انسان بن جائے، ایسا انسان جس پر فرشتے بھی رشک کریں۔ تو گویا تمام عبادات سے مراد اور حاصل یہی کیفیت ہے جس کا نام تقویٰ ہے۔ تقویٰ ایک ایسی نسبت ہے جو انسان کو مرضیاتِ باری کے مطابق ڈھال دے۔

وَاعْلَمُوْٓا اور یہ بات بھی اچھی طرح یاد رکھو اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ﴿۱۹۶﴾ اللہ کی سزائیں بھی بڑی سخت ہیں۔ نافرمانی کرنے والوں کو، لاپروائی کرنے والوں کو، مخالفت کرنے والوں کو اگر سزا دے گا تو اس کی سزائیں بھی بڑی سخت ہیں۔ کسی کو اگر حرم کی حاضری نصیب ہوتی ہے، بیت اللہ شریف تک ایمان کے ساتھ اس کی رسائی ہوتی ہے تو یہ اللہ کا ایک انتہائی کرم ہے لیکن اگر وہاں پہنچ کر وہ پروا نہیں کرتا، سستی کرتا ہے، کوتاہی کرتا ہے اور وہاں جا کر اسے جو احساس حاصل ہوتا تھا کہ اللہ بہت بڑا ہے اور میں اس کی عاجز مخلوق ہوں، اس سے گزر کر وہ اپنی بڑائی کے زعم میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ میں بڑا پارسا ہوں اور میں نے بہت نیکی کی اور میں حاجی صاحب ہو گیا تو بات ہی بدل گئی، کام الٹ ہو گیا۔ اس طرح بجائے اس کے کہ اسے اللہ کا قرب نصیب ہو، ڈر اس بات کا ہے کہیں اس بات پر اللہ کریم ناراض نہ ہو جائیں۔ اگر وہ ناراض ہو جائیں تو اللہ کے عذاب بھی بڑے سخت ہیں۔

ارکانِ حج سُنّتِ ابراہیمی کا پرتو ہیں:

طوفان نوح (علیہ السلام) میں بیت اللہ شریف ختم ہو گیا تھا صرف ایک ٹیکری سی تھی۔ کئی انبیاء علیہم السلام جن کی اقوام ہلاک ہوئیں، ہجرت کر کے وہیں آ جاتے، جھونپڑیاں بنا کر رہتے، یہیں ان کے وصال ہوئے اور وہیں ہوا نے ریت کو اڑا اڑا کر ان کے مدفن بنا دیے۔ طوفانِ نوح (علیہ السلام) کے بعد بیت اللہ شریف تعمیر نہیں کیا گیا تا آنکہ آخری عمر میں اللہ جل شانہ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حضرت اسماعیل علیہ السلام عطا فرمائے۔ بڑھاپے کی اولاد تھی، اللہ کے اولوالعزم رسول تھے، نورِ نبوت رخِ نور پہ چمک رہا تھا لیکن اللہ کے اپنے کام ہیں اور وہ خود اپنے کاموں کو صحیح سمجھتا ہے۔ انہیں قیامت تک آنے والی نسل انسانی کی راہنمائی کرنی تھی۔ اللہ کریم نے حکم دیا کہ آپ علیہ السلام

اسماعیل علیہ السلام کو اور ان کی والدہ حضرت ہاجرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو وہاں چھوڑ آئیں جہاں کبھی بیت اللہ تھا۔ بیت اللہ تو معدوم ہے، ہم کیسے پہنچیں گے! فرمایا: جبرائیل امین علیہ السلام رہنمائی فرمائیں گے۔ آپ علیہ السلام اہلیہ اور ننھے سے بچے کو لے کر نکل پڑے۔ اس واقعہ میں علماء لکھتے ہیں کہ جہاں کہیں جبرائیل امین علیہ السلام ٹھہر جاتے کہ یہاں آپ ستالیں تو آپ علیہ السلام سمجھتے کہ شاید یہی وہ جگہ ہے، منزل پہ آپہنچے، ورنہ ہر قدم انہیں اپنے گھر سے دور لیے جارہا تھا، اس زمانے میں وہ علاقہ غالباً مصر کے زیرنگیں تھا جہاں وہ قیام فرماتے تھے اور کہاں بیت اللہ شریف تھا۔ پھر چل پڑتے یہاں تک کہ جبرائیل امین علیہ السلام نے انہیں وہاں پہنچایا جہاں اب آب زم زم کا کنواں ہے۔ بیت اللہ شریف کا یہ صحن نہیں تھا، درمیان میں گول سی ٹیکری بنی ہوئی تھی۔ بارش کی صورت اطراف سے سارے نالے آکر اس ٹیکری کے گرد جمع ہوتے اور پھر اس سے ایک طرف کو پانی بہہ جاتا۔ درمیان میں بیت اللہ کی جگہ چھوٹی سی پہاڑی بن گئی تھی اور اردگرد خشک نالہ تھا۔ آپ علیہ السلام نے وہاں قیام فرمایا۔

یہ سعی جو حج اور عمرہ میں کی جاتی ہے، صفا اور مروہ کے درمیان جو دوڑ لگائی جاتی ہے، یہ بھی حضرت ہاجرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی مقبولیت کی یادگار ہے۔ حکم ہوا کہ اب آپ علیہ السلام چلے جائیں۔ اللہ سے وحی نبیؐ وصول کرتا ہے، سنتا بھی وہ ہے، سمجھتا بھی وہی ہے۔ حضرت ہاجرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا صحابیہؓ تو تھیں، ابراہیم علیہ السلام کی اہلیہ محترمہ بھی تھیں لیکن نبی تو نہیں تھیں۔ کوئی خاتون نبوت سے سرفراز نہیں کی گئی۔ کوئی خاتون نبی نہیں ہے۔

بڑا سادہ مسئلہ نیچے امامت تک آتا ہے۔ آج عورتوں کو امامت کا شوق آگیا ہے، یہ عورتوں کے لیے نہیں ہے۔ اگر عورتوں کی امامت کرنا ہوتی تو کوئی خاتون بھی نبیؐ ہوتی۔ اللہ کریم نے اپنی اپنی ذمہ داریاں بانٹی ہیں۔ جس کے جو ذمے ہے، وہی اس کے لیے صحیح اور درست ہے اور اس کے خلاف کرنا حدودِ الٰہی سے تجاوز ہے۔

تو جو دانہ پانی، کچھ کھجوریں، پانی کی چھاگل، مشکیزہ پاس تھا وہ حضرت نے انہیں دیا اور آپ علیہ السلام واپس جانے کے لیے گھوڑے پہ سوار ہونے لگے تو مائی صاحبہ نے دامن پکڑ لیا۔ اس ویرانے میں، بے آب وگیاہ صحرا میں، ان سیاہ پہاڑوں اور ان چٹانوں میں آپ علیہ السلام ہمیں چھوڑ کر کیوں جارہے ہیں؟ ہمارا کیا ہوگا؟ انہوں نے فرمایا اللہ کا حکم یہی ہے۔ مائی صاحبہ نے فرمایا اگر یہ اللہ کا حکم ہے تو پھر ہمیں اللہ ہی کافی ہے، وہی ہماری حفاظت فرمائے گا، آپ علیہ السلام تشریف لے جائیں۔ آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام وہاں سے تو بڑی حوصلہ مندی سے چل پڑے لیکن جب جگہ اوجھل ہوئی اور نالے کا موڑ مڑے تو رک گئے اور دعا فرمائی۔

رَبَّنَا إِنِّي أَسْكَنتُ مِن ذُرِّيَّتِي بِوَادٍ غَيْرِ ذِي زَرْعٍ عِندَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا

لِيُقِيمُوا الصَّلَاةَ فَاجْعَلْ أَفْئِدَةً مِنَ النَّاسِ تَهْوِي إِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِنَ الثَّمَرَاتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُونَ (ابراہیم: 37) اے اللہ میں اپنے معصوم بچے اور بیوی کو ایک بے آباد ویران جگہ پر چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ اللہ تو اس جگہ کو ایسا شرف عطا فرما کہ یہاں دنیا بھر کی مخلوق جمع ہو، تیرے بندے یہاں حاضر ہوں۔ یہاں شہر بنے، آبادیاں ہوں اور انہیں وافر رزق عطا فرما اور انہیں دنیا کی ہر نعمت عطا فرما۔

آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام تشریف لے گئے۔ پانی نے دو دن گزارا کیا ہوگا، تین دن کیا ہوگا، آخر ختم ہوگیا۔ پیاس لگنے لگی حتیٰ کہ اسماعیل علیہ السلام کو پلانے کے لیے مائی صاحبہ کا دودھ تک خشک ہوگیا۔ آپ پریشان ہوگئیں۔ چھوٹا سا وہاں پودا تھا، اس کی ٹہنی کے سائے کے نیچے لٹایا اور آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کوہ صفا پہ چڑھیں کہ اس پہاڑی پہ چڑھ کر دیکھیں کہ کہیں کوئی پرندہ اڑتا نظر آئے، کہیں کوئی جانور دکھائی دے، کوئی انسان نظر آئے، تو پتہ چلے کہ کہیں پانی کے کوئی نشان ہیں۔ صفا اور مروہ پہاڑیاں تھیں۔ یہ نسبتاً کم بلند تھیں جبکہ دوسرے پہاڑ بہت بلند تھے۔ پھر پہاڑی سے نیچے اتریں، جب تک اسماعیل علیہ السلام سامنے تھے، آرام سے چلتی آئیں لیکن نیچے گہرائی میں اتریں تو بیٹا نظروں سے اوجھل ہوگیا تو آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے دوڑ لگائی اور وہاں جا کر رکیں جہاں سے پھر اسماعیل علیہ السلام نظر آتے تھے۔ اس پہاڑی پر بھی کچھ نظر نہ آیا تو پھر واپس آئیں۔ پھر جہاں سے اسماعیل علیہ السلام نظروں سے اوجھل ہوئے تو آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اگلی پہاڑی تک دوڑ لگائی۔ ساتویں مرتبہ جب وہ مروہ پہ چڑھیں تو دیکھا کہ اسماعیل علیہ السلام جہاں پاؤں رگڑ رہے تھے، وہاں سے چشمہ ابل رہا تھا۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا تشریف لے گئیں، میٹھے پانی کا چشمہ تھا۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اس کے گرد ریت کی دیوار بنانا شروع کر دی کہ ضائع نہ ہو جائے، بہہ نہ جائے، پھر اسے حکم دیا، زم زم، رک جا، ٹھہر جا۔ وہ چاہِ زم زم اب تک جاری وساری ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر مائی صاحبہ اسے زم زم نہ کہتیں، رکنے کا حکم نہ دیتیں تو یہ چشمہ یہاں سے بہہ کر کسی دریا میں جاتا اور جب تک دنیا قائم ہے، تب تک یہ چشمہ چلتا اور بہتا رہتا۔ اللہ کریم کو مائی صاحبہ کی وہ ادا پسند آئی کہ حج کے ساتھ سعی کو رکن بنا دیا۔ طواف کے بعد سعی لازمی قرار پائی اور اسی طرح دوڑنا آج بھی ضروری ہے کہ جہاں تک مائی صاحبہ صفا اور مروہ کے درمیان چلیں، وہاں تک چل کر آئے اور جہاں وہ دوڑیں تھیں، وہاں دوڑے۔

صحرا میں جہاں پانی ہوتا ہے، سب سے پہلے پرندے دیکھتے ہیں، وہ ادھر آتے ہیں۔ پھر جانوروں کو، انسانوں کو، قافلوں کو بھی پتہ چلتا ہے کہ یہاں پرندے اڑ رہے ہیں، یہاں پانی ہوگا۔ بنی جرہم کا ایک قبیلہ وہاں سے گزر رہا تھا، انہوں نے وہاں آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی اجازت سے اپنا ڈیرہ لگایا تو آہستہ آہستہ گھر بننے لگے۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کبھی کبھی تشریف لاتے اور واپس چلے جاتے تا آنکہ آپ علیہ السلام نے ایک خواب

دیکھا کہ میں اپنے بیٹے اسماعیل علیہ السلام کو اللہ کی راہ میں ذبح کر رہا ہوں۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بارے میں قرآن حکیم بتاتا ہے۔ فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ (الصّٰفّٰت:102) جب وہ باپ کے ساتھ چلنے پھرنے کے قابل ہوئے، یعنی اس عمر کو پہنچے جس میں بچہ جب انگلی پکڑ کر چلتا پھرتا ہے، دوڑتا بھاگتا ہے تو آپ علیہ السلام تشریف لائے۔ مائی صاحبہ سے فرمایا کہ انہیں خوب نہلائیں، دھلائیں اور اچھے سے کپڑے پہنا کر تیار کریں۔ مائی صاحبہ کی عظمت دیکھیں کہ جہاں آپؓ نے دوڑیں لگائی وہاں ساری دنیا دوڑی حتیٰ کہ آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس سنت کا اتباع کیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی وہاں دوڑ لگائی لیکن مائی صاحبہ نبی نہیں تھیں۔ انہیں نہیں بتایا کہ میں نے یہ خواب دیکھا ہے۔ نبیؑ کا خواب وحی ہے اور وحی کو جاننا اور سمجھنا نبیؑ کا منصب ہے۔ اسماعیل علیہ السلام کو ساتھ لے کے چلے۔ تین جگہ شیطان نے روکنے کی کوشش کی کہ آپ علیہ السلام بزرگوار ہیں، اللہ کے نبیؑ ہیں، یہ کیا غضب کرنے جا رہے ہیں کہ بیٹے کو ذبح کر دیا جائے۔ آپ علیہ السلام نے اسے کنکر مارے تو وہ بھاگ گیا۔ دوسرے جگہ پھر روکنے کی کوشش کی، تیسری جگہ پھر کوشش کی۔ آج بھی حاجی اس سنت کی پیروی کرتے ہیں۔ مزدلفہ سے کنکر اٹھا کر لاتے ہیں اور تینوں مقامات پر سات سات کنکر روزانہ مارتے ہیں۔

آپ علیہ السلام جب وہاں پہنچے، جہاں منیٰ میں قربان گاہ بنی ہوئی ہے تو بیٹے سے بات کی اِنِّيْٓ اَرٰى فِي الْمَنَامِ ۔۔۔۔۔ میں نے خواب دیکھا کہ اَنِّيْٓ اَذْبَحُكَ ۔۔۔۔۔ (الصّٰفّٰت:102) میں آپ علیہ السلام کو ذبح کر رہا ہوں۔ اسماعیل علیہ السلام اگرچہ ننھے بچے تھے لیکن تھے تو اللہ کے رسولؑ اور رسالت وہبی ہوتی ہے۔ ارواح جب تخلیق ہوئیں تو اسی وقت نبوت و رسالت بانٹ دی گئی تھی۔ اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے ارواح سے جب وعدہ لیا تو اس وقت کی بات ہے وَاِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِيّٖنَ (الاحزاب:7) انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی ارواح سے بھی الگ عہد لیا۔ اس کا مطلب ہے کہ جب ارواح خلق ہوئیں تو وہاں نبیؑ، نبیؑ تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام اللہ کے اولوالعزم رسول تھے، جب انہوں نے ارشاد فرمایا: میں نے خواب دیکھا ہے، میں آپ کو ذبح کر رہا ہوں تو حضرت اسماعیل علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جواباً والد محترم سے عرض کیا يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ۔۔۔۔۔ لہٰذا آپ علیہ السلام ایسا کریں، اس لیے کہ نبیؑ کا خواب محض خواب نہیں ہوتا۔ آپ علیہ السلام رسول ہیں اور نبیؑ اور رسول کا خواب وحی الٰہی ہوتا ہے۔ آپ علیہ السلام کو حکم دیا گیا ہے۔ آپ علیہ السلام کو جو حکم دیا گیا، آپ علیہ السلام اس کی تکمیل کریں اور رہی بات میری کہ میں کم عمر ہوں، ننھا ہوں، میں شور کروں گا، چلاؤں گا نہیں۔ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَاۗءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ (الصّٰفّٰت:102) آپ علیہ السلام مجھے صبر کرنے والوں میں پائیں گے۔ آپ علیہ السلام بھی اللہ کے رسولؑ ہیں، میں

بھی اللہ کا رسولؑ ہوں۔ آپ علیہ السلام کو ذبح کرنے کا حکم ہے تو مجھے ذبح ہو جانے کا حکم ہے۔ آپ علیہ السلام بھی اس کی تکمیل فرمایئے اور میں اپنی ذمہ داری کی تکمیل کروں گا۔ ان شاء اللہ آپ علیہ السلام مجھے صابر پائیں گے۔

اب دیکھیں عجیب معاملہ ہے۔ کسی بندے کو بھی بتادیں کہ آپ بیٹے کو اس طرح لٹائیں اور اس کی گردن پہ چھری چلادیں لیکن اسے ذبح نہیں کریں گے بلکہ ذبح کوئی اور جانور ہوگا تو یہ کام ہر آدمی کر سکتا ہے۔ علوم الٰہی کی کوئی حد نہیں ہے۔ انبیاء علیہم السلام کو جو علوم دیے جاتے ہیں وہ ہماری سمجھ سے بالاتر ہیں لیکن وہ ایسا قادر ہے کہ جو چاہے وہ دیتا ہے، جو نہ چاہے اس کی بھنک نہیں پڑ سکتی۔ یہی ابراہیم علیہ السلام ہیں کہ ایک وقت میں انہوں نے دعا کی تو اللہ کریم نے فرمایا: وَكَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ ۔۔۔ (الانعام: 75) ہم نے زمینوں اور آسمانوں کی ساری بادشاہی ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سامنے کھول کر رکھ دی۔ اب کون اندازہ لگا سکتا ہے کہ اس میں آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کیا کیا دیکھا، کیا کیا جانا، لیکن دوسرے وقت بیٹے کی قربانی کا حکم دیا اور تکمیل ارشاد تک آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو کوئی پتا نہیں تھا کہ یہ ذبح ہوں گے یا بچ جائیں گے۔ آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنی طرف سے تو ذبح کر دیے لیکن اللہ کو بچانا مقصود تھا اور یہ راز نہ بتایا، جب تک اس پر عمل نہیں ہوا۔ علم الٰہی کی کوئی حد نہیں ہے۔ وہ اپنے بندوں کو بھی بے پناہ علوم عطا فرماتا ہے۔ دنیاداروں کو دنیا کے بے پناہ علوم عطا فرمائے، اہل اللہ کو دین کے اور آخرت کے بے پناہ علوم عطا فرمائے اور سب علوم کا خزانہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ عالی صفات ہے لیکن جو نہ بتانا چاہے وہ نہیں بتائے۔

ابراہیمؑ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنی آنکھوں پر پٹی باندھی کہ ذبح کرتے وقت بیٹے کو دیکھ کر کہیں شفقت پدری ہاتھ نہ لرزا دے۔ بیٹے کی آنکھوں پہ بھی پٹی باندھی کہ کہیں بے بسی سے میری طرف نہ دیکھے اور لٹا دیا۔ بہت تیز چھری کر کے ذبح کر دیا کہ تکلیف نہ ہو۔ بسم اللہ، اللہ اکبر، خون کے فوارے چھوٹے لیکن یہ اللہ کی حکمت کہ جب آپ علیہ السلام نے چھری چلائی تو اللہ کریم نے جبرائیل امین علیہ السلام کو حکم دیا کہ جنت سے دنبہ لے جا کر چھری کے نیچے رکھ دو اور اسماعیل علیہ السلام کو کھڑا کر دو۔ انہیں اتنا پتا نہیں چلا کہ جبرائیل امین علیہ السلام نے وہاں دنبے کی گردن رکھ دی اور اسماعیل علیہ السلام کو کھڑا کر دیا۔ جب آپ علیہ السلام نے چھری چلائی، خون کے فوارے بہے، جسم تڑپا، ٹھنڈا ہو گیا تو آپ علیہ السلام نے آنکھوں سے پٹی کھولی۔ دیکھا کہ اسماعیل علیہ السلام تو کھڑے ہیں اور ایک دنبہ کٹا پڑا ہے۔ آپ علیہ السلام پریشان ہو گئے کہ جو مجھے حکم تھا اس کی تعمیل نہ ہو سکی۔

وحی الٰہی آئی: قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا ۔۔۔ (الصفت: 105) اے ابراہیم علیہ السلام تم نے خواب سچ کر

دکھایا۔اب یہ ہماری مرضی، اسماعیل علیہ السلام کی پیشانی میں تو ہم نے نورِ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم رکھا ہوا ہے۔ان کی نسل سے تو میرا حبیب صلی اللہ علیہ وسلّم پیدا ہوگا، انہیں ذبح کرانا مقصود نہیں تھا۔آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بلندیِ درجات مقصود تھی۔آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اسماعیل علیہ السلام کو ذبح کر دیا۔اب یہ میری مرضی کہ میں نے اس جگہ ایک دنبہ کٹوا دیا لیکن آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے تو حکم کی تکمیل کر دی۔تب سے یہ قربانی کی سنت چلی آرہی ہے۔

قربانی کی حقیقت:

آج ہم خلوص سے جو جانور اللہ کی راہ میں قربان کرتے ہیں، ذبح تو ہم ایک بکرا، ایک دنبہ، گائے، بیل، بھینس یا کوئی جانور کرتے ہیں لیکن رحمت الٰہی کے وہ انوارات متوجہ ہوتے ہیں جو سیدنا ابراہیم علیہ السلام پر وقتِ ذبح اسماعیل علیہ السلام متوجہ ہوئے تھے۔ یہ اس کا احسان ہے کہ اس نے یہ نعمت عام کر دی۔ آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کے اتباع کا حکم دیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نعمت امت پر عام کر دی۔ ہمیں بطفیل محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نصیب ہوئی ہے۔ یہ بھی یاد رکھیں، اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلّم قربانی نہ فرماتے تو یہ ہمارے دین کا حصہ نہ بنتی چونکہ ہمیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا اتباع کرنا ہے۔ ہم جو قربانی کرتے ہیں تو باتباع محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کرتے ہیں لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلّم نے اس سنت ابراہیمی کا احیاء کر کے پوری امت پہ یہ احسان کر دیا کہ مال و دولت، زر و جواہر، حکومت و سلطنت سے خونِ جگر زیادہ عزیز ہوتا ہے۔ پھر عام بیٹا نہ ہو، بیٹا اولوالعزم رسول ہو، اسماعیل علیہ السلام جیسا بیٹا ہو جس کی پیشانی نورِ محمدی سے منور ہو، ایسے بیٹے کو انتہائی بچپن میں جب وہ توتلی باتیں کرتا ہے اور لڑکھڑاتا ہوا چلتا ہے، ذبح کرنے کا حکم مل جائے اور اللہ کے اولوالعزم رسول ابراہیم علیہ السلام اطاعتِ الٰہی بجالانے کے لیے چھری لے کر تیار ہو جائیں اور اسماعیلؑ گردن کٹانے کو تیار ہو جائیں تو کس طرح رحمتِ الٰہی ادھر متوجہ ہوئی ہوگی! کیفیت کیا ہوگی! آج اگر ہمیں بطفیل محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم اللہ نے یہ سعادت بخشی ہے کہ ہم بھی ایک جانور اللہ کی راہ میں ذبح کریں اور ان رحمتوں کا، ان عنایات کا اور اللہ کی اس بخشش کا مزا لیں اور وہ کیفیات ہم پر بھی وارد ہوں اور وہ بخشش ہم پر بھی وارد ہو تو یہ قربانی کی حقیقت ہے اور یہاں سے قربانی شروع ہوئی جو حج کا لازمی حصہ بن گئی کہ حج کرے تو قربانی ضرور کرے۔ عامۃ الناس کے لیے بھی روئے زمین پر اللہ نے یہ دروازہ کھول دیا کہ جو مسلمان، جہاں ہے، وہ اس دن قربانی کرے تو اللہ کریم اسے وہی برکات عطا فرماتا ہے۔ یہ بھی یاد رہے کہ ہم خانہ پری کرتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ ایک ہی قربانی کی جائے۔ اپنی حیثیت کے مطابق کوئی ایک کرے، پانچ کرے، دس کرے، سو

کرے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم نے ایک دفعہ سو اونٹ کی قربانی دی تھی، تریسٹھ اونٹ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم نے خود نیزے سے گرائے تھے۔ اونٹ کو دو طرح ذبح کیا جاتا ہے ایک تو گردن کاٹ کر اسی جگہ تکبیر پڑھ کر نیزہ مارا جاتا ہے جس سے وہ جلدی گر جاتا ہے۔ چونکہ گردن لمبی ہوتی ہے، بعد میں دو تین جگہ سے تکبیر پڑھ کر گردن بھی کاٹ دیتے ہیں تاکہ خون نہ جم جائے۔ تریسٹھ اونٹوں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلّم نے خود نیزے مارے تھے اور باقی حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کے سپرد کر دیے۔ اس کا مطلب ہے کہ ایک آدمی اگر سو اونٹ کی قربانی بھی کرے تو یہ بھی سعادت ہے۔ یعنی صاحب حیثیت جس کے پاس دولت ہے، پیسہ ہے وہ کر سکتا ہے۔

عہد حاضرہ کا ایک اور مسئلہ کہ جانور ذبح نہ کیا جائے کسی غریب کو، پیسے دے دیے جائیں۔ پیسے کسی غریب کو دو، مستحق کو دو، صدقہ دینے کا ثواب ہوگا لیکن قربانی ادا نہیں ہوگی جب تک آپ اللہ کی راہ میں جانور نہیں ذبح کریں گے۔ ہاں، جانور کا گوشت بے شک مساکین کو دے دو، حق ادا ہو جائے گا۔ قربانی کے لیے ضروری ہے کہ اسی طرح کی جائے جس طرح سنت نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام ہے۔ سب سے بڑی سعادت یہ ہے کہ اگر آدمی خود ذبح کرنے کی استطاعت رکھتا ہو تو خود ذبح کرے۔ خود سے نہیں ہو سکتی تو کسی سے کروا لے لیکن جانور ذبح کر کے قربانی ادا ہوتی ہے۔ قربانی کی عید تین دن ہوتی ہے، پہلے دن ذبح ہو سکتا ہے، دوسرے دن ذبح ہو سکتا ہے اور تیسرے دن دوپہر سے پہلے زوال آفتاب تک ذبح ہو سکتا ہے۔

سورۃ البقرہ رکوع 25 آیات 197 تا 210

اَعُوۡذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيۡطٰنِ الرَّجِيۡمِ

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

اَلۡحَجُّ اَشۡهُرٌ مَّعۡلُوۡمٰتٌ ۚ فَمَنۡ فَرَضَ فِيۡهِنَّ الۡحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوۡقَ ۙ
وَلَا جِدَالَ فِى الۡحَجِّ ؕ وَمَا تَفۡعَلُوۡا مِنۡ خَيۡرٍ يَّعۡلَمۡهُ اللّٰهُ ؕ وَتَزَوَّدُوۡا فَاِنَّ
خَيۡرَ الزَّادِ التَّقۡوٰى ۚ وَاتَّقُوۡنِ يٰٓاُولِى الۡاَلۡبَابِ ﴿۱۹۷﴾ لَيۡسَ عَلَيۡكُمۡ جُنَاحٌ اَنۡ
تَبۡتَغُوۡا فَضۡلًا مِّنۡ رَّبِّكُمۡ ؕ فَاِذَآ اَفَضۡتُمۡ مِّنۡ عَرَفٰتٍ فَاذۡكُرُوا اللّٰهَ عِنۡدَ
الۡمَشۡعَرِ الۡحَرَامِ ۖ وَاذۡكُرُوۡهُ كَمَا هَدٰٮكُمۡ ۚ وَاِنۡ كُنۡتُمۡ مِّنۡ قَبۡلِهٖ لَمِنَ
الضَّآلِّيۡنَ ﴿۱۹۸﴾ ثُمَّ اَفِيۡضُوۡا مِنۡ حَيۡثُ اَفَاضَ النَّاسُ وَاسۡتَغۡفِرُوا اللّٰهَ ؕ
اِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ﴿۱۹۹﴾ فَاِذَا قَضَيۡتُمۡ مَّنَاسِكَكُمۡ فَاذۡكُرُوا اللّٰهَ
كَذِكۡرِكُمۡ اٰبَآءَكُمۡ اَوۡ اَشَدَّ ذِكۡرًا ؕ فَمِنَ النَّاسِ مَنۡ يَّقُوۡلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِى
الدُّنۡيَا وَمَا لَهٗ فِى الۡاٰخِرَةِ مِنۡ خَلَاقٍ ﴿۲۰۰﴾ وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ يَّقُوۡلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِى
الدُّنۡيَا حَسَنَةً وَّفِى الۡاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۲۰۱﴾ اُولٰٓـئِكَ لَهُمۡ
نَصِيۡبٌ مِّمَّا كَسَبُوۡا ؕ وَاللّٰهُ سَرِيۡعُ الۡحِسَابِ ﴿۲۰۲﴾ وَاذۡكُرُوا اللّٰهَ فِىۡٓ اَيَّامٍ
مَّعۡدُوۡدٰتٍ ؕ فَمَنۡ تَعَجَّلَ فِىۡ يَوۡمَيۡنِ فَلَآ اِثۡمَ عَلَيۡهِ ۚ وَمَنۡ تَاَخَّرَ فَلَآ اِثۡمَ
عَلَيۡهِ ۙ لِمَنِ اتَّقٰى ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعۡلَمُوۡٓا اَنَّكُمۡ اِلَيۡهِ تُحۡشَرُوۡنَ ﴿۲۰۳﴾ وَمِنَ
النَّاسِ مَنۡ يُّعۡجِبُكَ قَوۡلُهٗ فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا وَيُشۡهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِىۡ قَلۡبِهٖ ۙ
وَهُوَ اَلَدُّ الۡخِصَامِ ﴿۲۰۴﴾ وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِى الۡاَرۡضِ لِيُفۡسِدَ فِيۡهَا وَيُهۡلِكَ

الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ ﴿۲۰۵﴾ وَاِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ
الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ ؕ وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿۲۰۶﴾ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ
يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۲۰۷﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ
اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِى السِّلْمِ كَآفَّةً ۖ وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ
عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۲۰۸﴾ فَاِنْ زَلَلْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْكُمُ الْبَيِّنٰتُ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ
اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۰۹﴾ هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِىْ ظُلَلٍ مِّنَ
الْغَمَامِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَقُضِىَ الْاَمْرُ ؕ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۲۱۰﴾

حج کے مہینے معلوم ہیں سو جو ان میں حج کا ارادہ کرے تو نہ عورتوں سے اختلاط کرے اور نہ کوئی برا کام اور نہ جھگڑا ایام حج میں۔ اور جو نیکی تم کرو گے اللہ اس سے واقف ہیں۔ اور راستے کا خرچ لے لیا کرو تو بے شک بہترین زادِ راہ نیکی ہے اور اے صاحب دانش لوگو! مجھ سے ڈرو ﴿۱۹۷﴾ (اس میں) تم پر کوئی گناہ نہیں کہ (حج کے دنوں میں) اپنے پروردگار سے روزی طلب کرو پھر جب تم عرفات سے واپس چلو تو مشعرِ حرام (مزدلفہ) میں اللہ کا ذکر کرو اور جیسا تم کو سکھایا ہے ایسے اس کو یاد کرو اور اگرچہ اس سے پہلے تم ان طریقوں کو نہیں جانتے تھے ﴿۱۹۸﴾ پھر جہاں سے لوگ واپس ہوں وہیں سے تم بھی واپس ہو اور اللہ سے بخشش طلب کرو یقیناً اللہ بخشنے والے مہربان ہیں ﴿۱۹۹﴾ پھر جب تم اپنے تمام ارکان پورے کر چکو تو اللہ کا ذکر ایسے کرو جیسے اپنے آباء کا ذکر کرتے تھے یا اس سے بہت زیادہ یاد کرو پس بعضا آدمی کہتا ہے کہ اے ہمارے پروردگار! ہم کو دنیا میں ہی دے دیں اور اس کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں ﴿۲۰۰﴾ اور کوئی ان میں سے کہتا ہے اے ہمارے پروردگار! ہمیں دنیا

میں بھی بھلائی دیں اور آخرت کی بھلائی بھی عطا کریں اور ہمیں آگ کے عذاب سے بچائیں ﴿۲۰۱﴾ یہی لوگ ہیں جن کے لیے ان کے (نیک) کاموں کا حصہ ہے اور اللہ بہت جلد حساب لینے والے ہیں ﴿۲۰۲﴾ اور کئی روز تک اللہ کو یاد کرو پھر جس نے (مکہ مکرمہ آنے میں) دو دن میں جلدی کی تو اس پر کوئی گناہ نہیں اور جس نے تاخیر کی تو اس پر بھی گناہ نہیں جو اللہ سے ڈرتا رہے۔ اور اللہ سے ڈرو اور جان لو کہ تم اس کے پاس اکٹھے کیے جاؤ گے ﴿۲۰۳﴾ اور آپ کو بعضے آدمی کی بات دنیا کے اعتبار سے بہت اچھی معلوم ہوتی ہے اور وہ اس پر جو اس کے دل میں ہے اللہ کو گواہ بناتا ہے اور وہ آپ کی مخالفت میں بہت شدید ہے ﴿۲۰۴﴾ اور جب واپس پلٹتا ہے (جب بس چلتا ہے) تو کوشش کرتا ہے کہ زمین میں فساد کرے اور (کسی کی) کھیتی تباہ کر دے اور جانور۔ اور اللہ فساد کو پسند نہیں کرتے ﴿۲۰۵﴾ اور جب اس سے کہا جائے کہ اللہ کا خوف کرو تو غرور اسے اور گناہ میں ڈال دیتا ہے سو ایسوں کے لیے دوزخ کافی ہے اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے ﴿۲۰۶﴾ اور بعضا آدمی ایسا بھی ہے جو اللہ کی رضا کے بدلے اپنی جان بیچ ڈالتا ہے اور اللہ اپنے بندوں کے ساتھ شفقت کرنے والے ہیں ﴿۲۰۷﴾ اے ایمان والو! سارے کے سارے اسلام میں داخل ہو جاؤ اور شیطان کے قدموں کی پیروی نہ کرو یقیناً وہ تمہارا کھلا دشمن ہے ﴿۲۰۸﴾ پھر اگر واضح دلائل آنے کے بعد تم ڈگمگانے لگو تو جان رکھو کہ اللہ غالب ہیں حکمت والے ہیں ﴿۲۰۹﴾ کیا یہ اس بات کے منتظر ہیں کہ اللہ بادلوں کے سائے میں ان کے پاس آئیں اور فرشتے (بھی) اور کام ختم ہو جائے اور سب کام اللہ کی طرف پھیرے جاتے ہیں ﴿۲۱۰﴾

تفسیر ومعارف

اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ۔۔۔۔۔ حج معلوم مہینے ہیں، شوال، ذوالقعدہ اور ذوالحج کے پہلے دس دن تاریخیں ہیں فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ ۔۔۔۔۔ اور جو ان میں ارادہ کرلے کہ مجھے حج کرنا ہے تو پھر یہ خیال رکھے فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ حج کے دوران ازدواجی تعلق، گناہ، جھگڑے سے مکمل اجتناب کرے۔

وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ قرآن کریم نے ایک اور بڑی باریک بات کی طرف توجہ دلائی کہ انسان اپنی زندگی میں اکثر اس بات پہ اڑا رہتا ہے کہ میں ایسا کروں گا تو لوگ کیا کہیں گے۔ کبھی تو اس بات میں ایسے جرم اور ایسے گناہ سرزد ہو جاتے ہیں جو شرعاً حرام ہوتے ہیں اور وہ سمجھتا ہے کہ ایسا کرنے سے لوگ مجھے بڑا آدمی سمجھیں گے۔ کبھی وہ اس طرح سے نیکیاں ضائع کرتا ہے کہ کام تو وہ درست کر رہا ہوتا ہے لیکن اسے امید یہ ہوتی ہے کہ دیکھنے والے لوگ مجھے بھلا اور نیک اور اچھا کہیں۔ فرمایا یہ بہت ہی غلط سوچ ہے، یہ بات یاد رکھو! وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ جو بھلائی بھی تم کرتے ہو، جو اچھا کام بھی کرتے ہو، جو نیکی تم کرتے ہو يَعْلَمْهُ اللّٰهُ اللہ اسے جانتا ہے۔ نیکی اللہ کی رضا کے لیے کی جاتی ہے بھلائی اللہ کریم کو راضی اور خوش کرنے کے لیے کی جاتی ہے۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ آپ نیکی کرتے ہیں لیکن لوگ آپ کو برا کہتے ہیں۔ تو اس کی پروا نہیں کرنی چاہیے اور صرف اللہ کو راضی رکھنے پر توجہ مرکوز رکھنی چاہیے۔

ہمارے ہاں شادی کی رسومات ہوں یا موت کی، سب کا مقصود لوگوں کی نظروں میں اپنا مقام بلند کرنا ہوتا ہے۔ ایک بندہ فوت ہوتا ہے اور اس کے نابالغ بچے رہ جاتے ہیں تو جب تک وراثت تقسیم نہیں ہوتی، جب تک وہ بالغ نہیں ہوتے ان کا مال کھانا حرام ہے لیکن لوگ دعوتیں اڑاتے ہیں۔ ایک آدمی بیمار ہے تو کوئی اس کی دوا نہیں پوچھتا، کوئی اس کی خیریت نہیں پوچھتا لیکن جب مر جاتا ہے تو دعوتیں اڑانے پر لاکھوں روپے خرچ کرتے ہیں۔ یہ چیزیں حرام ہیں لیکن بندہ کیوں کرتا ہے؟ شاید اس لیے کہ وہ سمجھتا ہے کہ لوگوں کی نظروں میں وہ اچھا کہلائے۔ کوئی برائی اس لیے کرتا ہے کہ لوگ اچھا کہیں یا کوئی نیکی اس غرض سے کرتا ہے کہ لوگ اچھا کہیں۔ وہ برائی تو پہلے ہی برائی تھی، اس میں اللہ کی ناراضگی کی پروا نہ کرتے ہوئے لوگوں کی رضامندی مدنظر رکھی تو اس کا عذاب کئی گنا بڑھ گیا، اس کی برائی کئی گنا بڑھ گئی۔ نیکی نیکی تھی، اللہ کی رضا کے لیے کی جاتی لیکن کرنے والے نے اس سے امید رکھی کہ لوگ مجھے اچھا کہیں تو نیکی بھی جرم بن گئی۔ فرمایا: وَاعْلَمُوْٓا یہ بات بڑی اچھی طرح سے جان لو کہ جو بھلائی تم کرتے ہو، اللہ اسے جانتا ہے۔

حج کے اخراجات کا اہتمام لازم ہے:

وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى ۫ وَاتَّقُوْنِ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ ﴿١٩٧﴾ اور حج پر جانے کے لیے خرچ کا اہتمام کرو۔ جس کے پاس اخراجات نہیں ہیں اس پر حج فرض ہی نہیں ہے۔ وہ لوگوں سے مانگ کر کیوں جاتا ہے اور بڑی عجیب بات یہ ہے کہ ان بے شمار لوگوں میں بڑے بڑے علماء بھی ہیں، امراء بھی ہیں، حکومت کے عہدے دار بھی ہیں۔ یہ لوگ ویسے ہی اتنے مالدار ہوتے ہیں کہ ان پر حج فرض ہوتا ہے لیکن سرکاری خرچ پر حج پہ جاتے ہیں۔ یہ سرکاری خزانہ پورے ملک کے ہر شہری کا ہے، غریب اور مسکین کا ہے۔ اس کا بھی اس پر حق ہے جس کے پاس شام کے کھانے کا انتظام نہیں ہے۔ اگر اپنے خرچ کا اہتمام نہیں کرتے ہو تو دوسروں کے خرچ پر حج پہ کیوں جاتے ہو، اس کی ضرورت کیا ہے؟ ہماری مصیبت یہ ہے کہ ہم باتیں کرتے ہیں، دوسروں کو روکتے ہیں لیکن یہ دیکھا گیا ہے کہ بڑے بڑے علماء بھی سیاست دانوں کے ساتھ سرکاری خرچ پر حج کرنے چلے جاتے ہیں۔ یہ سرکار کون ہے؟ سرکاری پیسہ تو بیت المال ہے! اگر اخراجات نہیں تو آپ پر حج فرض نہیں ہے۔ عام لوگوں کو بھی دیکھا گیا ہے کہ مانگتے پھرتے ہیں، امراء کے دروازے پہ جاتے ہیں کہ میں نے حج پر جانا ہے، میری مدد کیجیے۔ پھر عامۃ الناس کو دیکھیں، بے شمار لوگ مجھ سے بھی ملتے ہیں کہ حج پر جانے کی بڑی آرزو ہے۔ جب پیسے نہیں تو حج تو آپ پر فرض نہیں ہے۔ لیکن جو باتیں آپ پر فرض ہیں، کیا آپ نے وہ پوری کر لیں؟ حج بھی تو اللہ کا ایک حکم ہے جسے آپ پورا کرتے ہیں، صرف مکہ جانا مقصود نہیں۔ یوں تو مکہ میں ابولہب اور ابوجہل بھی رہے ہیں، وہیں پیدا ہوئے۔ ابولہب مکہ میں دفن ہے اور ابوجہل بدر میں دفن ہے لیکن کیا بدر میں دفن ہونا، مکہ مکرمہ میں دفن ہونا یا وہاں پیدا ہونا، وہاں عمر بسر کرنا انہیں کوئی فائدہ دے سکا؟ محض مکہ مکرمہ جانا مقصد نہیں، مقصد اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اور فرمانبرداری ہے۔ اب جو چیز اللہ نے کسی پر فرض نہیں کی، اس کا تو اسے بڑا شوق ہے اور جو فرائض اس کے ذمے ہیں ان کی اسے فکر ہی نہیں۔

وَتَزَوَّدُوْا۔۔۔ اپنے اخراجات کا اہتمام کرو۔ حج اس بندے پر فرض ہے جس کے پاس اپنے آنے جانے اور قیام کا خرچ بھی ہو۔ جتنا عرصہ اسے گھر سے باہر رہنے کی امید ہے اتنے عرصے کے اخراجات بھی دے کر جائے تاکہ گھر والے کسی کے محتاج نہ ہوں۔ اگر اتنی حیثیت نہیں ہے تو اس پر حج فرض نہیں ہے اور جن پر فرض نہیں ہے وہ کیوں دوسروں سے مانگ کر اور گدا کر کے جائیں۔

فرمایا: فَاِنَّ خَیْرَ الزَّادِ التَّقْوٰی۔۔۔۔۔۔ اور بہترین زادِراہ تو تقویٰ ہے یعنی اللہ کی اطاعت کا جذبہ، اگر یہ جذبہ زندہ ہو تو آپ جہاں ہیں، جو فرائض آپ پر ہیں، وہ پورے کریں تو آپ کو وہیں حج کا ثواب ملتا رہے گا۔ ایسا غریب جس کے پاس اخراجات کی سکت نہیں ہے اس کے لیے ہر جمعہ میں حج کا درجہ ہے، اشراق کے نوافل ادا کرتا ہے تو اسے عمرے کا ثواب مل جاتا ہے چونکہ وہ وہاں پہنچ نہیں سکتا۔

مقصد اللہ کریم کی اطاعت ہے، صرف سفر کرنا مقصود نہیں ہے۔ اخراجات کا اہتمام ہے تو ضرور جاؤ اور نہیں ہے تو جو فرائض ہیں وہ پورے کرو، اجر تو اس نے دینا ہے۔ وَاتَّقُوْنِ یٰٓاُولِی الْاَلْبَابِ﴿۱۹۷﴾ اور دانش مندی کی بات یہ ہے کہ اللہ کے ساتھ اپنے معاملے کو درست رکھے۔

حج کے دوران دنیوی منفعت:

لَیْسَ عَلَیْکُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّکُمْ ؕ فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْکُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ ۪ وَاذْکُرُوْهُ کَمَا هَدٰىکُمْ ۚ وَاِنْ کُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّیْنَ﴿۱۹۸﴾ دورانِ حج بھی اگر تم روزی کمالو تو کوئی حرج نہیں۔ روزی کمانے کی غرض سے حج پر جانے سے حج ادا نہیں ہوتا اگر کوئی اس نیت سے جائے کہ وہاں جا کر میں پیسے کمالوں گا، وہاں سونا سستا ملتا ہے خرید کر لے آؤں گا، وہاں سے وہ چیز سستی ملتی ہے وہ لے آؤں گا، یہاں آ کے بیچوں گا، پیسے کمالوں گا۔ اس نیت سے جائے تو حج تو نہیں ہوگا۔ حج کی نیت سے گیا اور وہاں رہتے ہوئے مزدوری مل گئی یا کوئی چیز پاس تھی وہ اچھے داموں بک گئی یا کوئی چیز سستی خرید لی تو وہ منع نہیں ہے۔ غرض اور مقصد حج ہو تو ساتھ مزدوری یا تجارت کر لینا منع نہیں ہے اور مقصد ہی پیسہ کمانا، مزدوری کرنا یا تجارت کرنا ہو تو پھر حج نہیں ہوگا۔ اگر خلوص نیت سے حج کے لیے جاؤ اور وہاں موقع ملے تو اللہ کی طرف سے جو نصیب میں ہے کمالو۔ اس میں کوئی حرج نہیں۔

لسانی، عملی اور قلبی ذکر:

فَاذْکُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ۔۔۔۔ جب عرفات سے واپس ہوتے ہو اور پھر شب کا قیام، مزدلفہ میں ہوتا ہے تو کثرت سے اللہ کا ذکر کرو۔ یعنی تمام عبادات کا حاصل یہ ہے کہ بندے کا یہ شعور بیدار ہو جائے کہ اسے ہمہ وقت اللہ کی معیت نصیب ہو اور اسے یہ بات یاد رہے کہ میرا اللہ میرے ساتھ ہے۔

ذکر الٰہی کیا؟

ذکر الٰہی کیا ہے۔ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ ۔۔۔۔ ذکر کیا ہے، اللہ کا کیا ذکر کرے؟ اللہ کو یاد رکھنا ہی اللہ کا ذکر ہے۔ اگر ہم کوئی کام کرتے ہیں اور اس میں اللہ کی رضا مقصود ہے تو یہ بھی ذکر ہے اور وہ کام بھی عملی ذکر ہے۔ تمام عبادات میں اللہ کی یاد موجود ہے۔ اللہ کے حکم کے مطابق کی جاتی ہیں، وہ سب عملی ذکر ہے۔ دوسرا ذکر لسانی ہے۔ جب بھی ہم کوئی نیک بات کرتے ہیں، جب بھی قرآن کی تلاوت کرتے ہیں یا کوئی حدیث شریف پڑھتے ہیں، نیکی کا حکم دیتے ہیں، کسی کو بھلا مشورہ دیتے ہیں، زبان سے کوئی اچھی بات نکلتی ہے، وہ لسانی ذکر ہے اور اگر کوئی زبان سے صرف اللہ کا نام ہی لیتا رہا تو بہت اچھی بات ہے۔ اللہ اللہ کرتا رہے تو یہ تیسری قسم ہے کہ یہ ذکر، یہ یادیں دل میں رچ بس جائیں۔ یہی مقصدِ حیات ہے کہ یادِ الٰہی دل میں ایسی رچ بس جائے کہ دل دھڑکنا بھول جائے لیکن اللہ اللہ کرنا نہ بھولے۔ موت آجائے، زندگی منقطع ہو جائے لیکن یادالٰہی منقطع نہ ہو اور یہ ان لوگوں کو نصیب ہوتا ہے جو ساری زندگی اللہ کی یاد کو دل میں بسائے رکھتے ہیں۔ وہ دل ایسا آباد ہو جاتا ہے کہ اسے موت بھی ویران نہیں کرسکتی۔ موت بھی انہیں دلوں کو ویران کرتی ہے جو زندگی میں ویران ہوتے ہیں۔ ایسے دل جو زندگی میں یادالٰہی سے محروم ہوتے ہیں انہیں موت بھی ویران کر دیتی ہے کہ زندگی میں ان کا صرف حیات جسمانی کے ساتھ رشتہ تھا، موت وہ رشتہ بھی کاٹ دیتی ہے لیکن جو دل زندگی میں یادالٰہی کو اپنے اندر سمو لیتے ہیں اور ہر آن ہر لحظہ حضورِ حق انہیں یاد رہتا ہے، موت ان سے حضورِ حق نہیں چھین سکتی۔ موت انہیں اللہ کی یاد سے جدا نہیں کرسکتی۔

فرمایا، مشعر الحرام کے قریب اللہ کا ذکر کرو۔ قریش اسلام سے پہلے اپنے آپ کو کعبہ کا مجاور سمجھتے تھے اور اگرچہ ان میں حج کی کچھ رسومات باقی تھیں لیکن انہیں بگاڑ دیا گیا تھا۔ اپنی اجارہ داری قائم رکھنے کے لیے انہوں نے ایک طریقہ یہ نکالا کہ احرام کے بجائے جسے اہل مکہ، قریش یا مکہ کے دوسرے قبائل لباس دیں، وہ پہن کر طواف کرے اور اگر اس کو لباس نہ مل سکے یا وہ لباس کی اجرت نہ دے سکے تو پھر بغیر لباس کے طواف کرے۔ پھر اچھلتے کودتے، سیٹیاں بجاتے مشعر الحرام تک تو جاتے تھے لیکن وہاں جا کر اپنے باپ دادا کے قصے چھیڑ دیتے اور اپنی بڑائی کی باتیں کرتے۔ فرمایا یہ درست نہیں ہے بلکہ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ ۔۔۔۔ اور اللہ کا ذکر بھی اس طرح سے کرو جس طرح سے اس نے حکم دیا ہے اور اس احسان کو یاد رکھو کہ زمانہ جاہلیت میں یہی اہل مکہ اور جو عرب باہر سے آتے تھے، کیا جہالتیں کرتے تھے! اللہ نے تمہیں ہدایت دی، یہ اس کا بہت بڑا احسان ہے

کہ دینِ حق سے سرفراز فرمایا۔ تمہیں یاد ہے کہ اسلام سے پہلے تم کس گمراہی میں تھے، حقیقت سے نا آشنا تھے اور ہدایت سے کس قدر دور تھے وَاِنۡ كُنۡتُمۡ مِّنۡ قَبۡلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّيۡنَ﴿۱۹۸﴾ تمہیں پتہ ہے کہ تم اس سے پہلے بالکل ہی ناواقف تھے۔ تمہیں ان باتوں کی کوئی خبر نہیں تھی۔ نہ اللہ کی ذات سے آشنا تھے، نہ اس کی صفات سے آشنا تھے، نہ اس بات سے آشنا تھے کہ اس کی رضامندی کس چیز میں ہے، نہ اس بات سے باخبر تھے کہ وہ کن باتوں پر ناراض ہو گا۔ اس نے رحمت للعالمین صلی اللہ علیہ وسلّم کو مبعوث فرما کر تم پر احسان فرمایا کہ تمہیں ان باتوں سے آشنا کر دیا اور تمہیں ہدایت آشنا کر دیا لہٰذا اس کا ذکر کرو۔

ثُمَّ اَفِيۡضُوۡا مِنۡ حَيۡثُ اَفَاضَ النَّاسُ۔۔۔۔ اور عرفات سے لوٹو جہاں سے ساری دنیا لوٹتی ہے۔ رؤسائے مکہ مشعر الحرام سے لوٹ آتے تھے جو منیٰ اور عرفات کے درمیان ہے اور دوسرے لوگوں کو عرفات بھیجتے تھے کہ ہم تو خانہ کعبہ کے مجاور ہیں، ہمیں کیا ضرورت ہے! ہم تو بخشے ہوئے لوگ ہیں، تم وہاں تک جاؤ۔ فرمایا، نہیں ہر شخص کے لیے فرائض وواجبات برابر ہیں، وہیں تک جاؤ جہاں تک لوگ جاتے ہیں اور اللہ سے توبہ کرتے رہو۔ اگر حج کی سعادت نصیب ہوئی ہے یا حج کے ارکان ادا کر رہے ہو تو استغفار پھر بھی کرتے رہو۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اگر ہم سارے فرائض وواجبات، سنن اور مستحبات پورے ادا کرلیں تو ہماری ادائیگی اس شان کی نہیں ہوئی جس شان کی اس کی بارگاہ ہے۔ ہم سے کمی رہ جاتی ہے، خلوص میں کمی رہ جاتی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہم پوری طرح کر ہی نہیں پاتے لہٰذا ہر آن اللہ سے بخشش بھی طلب کرتے رہو اور یہ دعا کرتے رہو کہ اے اللہ! میں کمزور ہوں، جو میرے بس میں ہے وہ میں کر رہا ہوں۔ جس کا مجھے علم نہیں یا میں جانتا ہوں لیکن میں کر نہیں پاتا، اے اللہ اس پر مجھے معاف فرما دے اور میرے ٹوٹے پھوٹے اعمال کو قبول فرما۔ یہ احساس رہے کہ میں بندہ ہوں، میں کمزور ہوں، میں محتاج ہوں۔ وہ اللہ ہے، وہ میرا مالک ہے، سب سے بڑا ہے، بہت بڑا ہے، کبریائی اسی کو زیب دیتی ہے۔ وَاسۡتَغۡفِرُوا اللّٰهَ دورانِ حج بھی اللہ سے استغفار کرتے رہو۔ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ﴿۱۹۹﴾ یقیناً اللہ معاف کرنے والا بھی ہے، اللہ رحم کرنے والا بھی ہے۔

فَاِذَا قَضَيۡتُمۡ مَّنَاسِكَكُمۡ فَاذۡكُرُوا اللّٰهَ كَذِكۡرِكُمۡ اٰبَآءَكُمۡ اَوۡ اَشَدَّ ذِكۡرًا اور جب حج کے ارکان پورے کرلو تو اللہ کا ذکر اس طرح کرو جس طرح تم اپنے آباؤ اجداد کے قصے بیان کرتے ہو بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ اپنی بڑائی یا اپنے بزرگوں کی بڑائی بیان کرنے سے کہیں زیادہ اللہ کی بڑائی بیان کرو اور سب سے زیادہ شدت کے ساتھ اللہ کا ذکر کرو۔

اللہ سے دنیا وآخرت دونوں طلب کرو:

بعض لوگ حج میں بھی دنیا ہی تلاش کرتے ہیں۔ فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ۔۔۔ بعض لوگوں کی نیتیں یہ ہوتی ہیں کہ لوگ مجھے بہت بڑا آدمی کہیں، لوگ مجھے الحاج کہیں، لوگ میرا بڑا احترام کریں، دنیا میں مجھے بہت سی دولت مل جائے، یہاں سے بہت سی دولت گھسیٹ کے لے جاؤں۔ فرمایا، اگر دورانِ حج بھی جو نہایت ہی افضل ترین عبادت ہے، کسی کا مقصد حصول دنیا ہی ہو تو وہ ایسا محروم ہوتا ہے کہ آخرت میں اس کے لیے کوئی حصہ باقی نہیں رہتا۔ وَمِنْهُمْ اور کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں۔ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿٢٠١﴾ جو اس بات کو یاد رکھتے ہیں کہ اے اللہ! دنیا میں بھی مجھ پر رحم فرما، مجھے بھلائی عطا فرما، آخرت میں بھی مجھ پر رحمت فرما، میری خطاؤں سے درگزر فرما اور مجھے بھلائی عطا فرما اور اے اللہ ہمیں آگ کے عذاب سے بچالے۔ وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ۔۔۔ یا اللہ آگ کے عذاب سے محفوظ رکھ۔ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا۔۔۔ یہ ایسے لوگ ہیں جو دونوں جہانوں میں اپنی محنت کا بہت بڑا صلہ پاتے ہیں۔

انسان کو دنیا میں بھی رہنا ہے۔ انسان محتاج ہے، اس کی ضروریات ہیں اور سب اللہ کریم نے ہی پوری کرنی ہیں۔ تو وہ دنیا بھی اللہ سے مانگتا ہے لیکن اس کے ساتھ ربِّ جلیل سے آخرت بھی مانگتا ہے اور یہ یاد رکھتا ہے کہ وہ عاجز بندہ ہے، تو کہتا ہے اے اللہ! میں تیری مخلوق ہوں، میں عاجز ہوں، میں دنیا میں بھی محتاج ہوں، مجھے دنیا میں بہتری عطا فرما اور مجھے آخرت میں بھی بہتری عطا فرما اور مجھے آگ کے عذاب سے محفوظ رکھ۔ فرمایا یہ وہ لوگ ہیں جنہیں یہ بات یاد رہتی ہے کہ جو عمل وہ کررہے ہیں اس کا اجر بھی انہیں ملے گا۔ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿٢٠٢﴾ اور کوئی دیر نہیں ہے، اللہ بہت جلد حساب کرنے والا ہے، اللہ حساب میں دیر نہیں فرمائے گا۔

جزا وسزا دنیا اور آخرت دونوں میں ہے:

ربّ العالمین کا بڑا عجیب نظام ہے۔ انسان کی سمجھ اور اس کی دانش کا قصور ہے ورنہ برائی کی تکلیف اور دکھ دنیا میں بھی نقد ملتا ہے۔ آدمی اگر غلط کاری کرتا ہے یا اللہ کے احکام سے روگردانی کرتا ہے اور عظمتِ الٰہی کو نہیں سمجھتا تو دنیا میں بھی اس کی سانسیں اس کے لیے عذاب بن جاتی ہیں۔ اس کے دل کو سکون نہیں ملتا، اس کے دل پر آخرت کا پرتو پڑتا ہے اور اگر آخرت میں وہ اپنے لیے جہنم خرید رہا ہے تو اس کی تپش یہاں دنیا میں بھی اس کے دل کو پہنچتی رہتی ہے، اسے سکون نصیب نہیں ہوتا۔ اگر نیکی کرتا ہے تو آخرت میں بھی درجات بلند ہوتے ہیں اور یہاں بھی اسے سکون واطمینان

نصیب ہوتا ہے۔ دنیا میں بھی اس کی ٹھنڈک اور اس کی خوشبو اسے نصیب ہوتی رہتی ہے۔ تو اللہ کے حساب میں تاخیر نہیں ہے۔ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ﴿۲۰۲﴾ اللہ بہت جلد حساب کرتا ہے، فوراً ادائیگی ہوتی ہے۔ جو کچھ بندہ کرتا جاتا ہے، اس کی اسے ادائیگی بھی فوراً ہوتی چلی جاتی ہے لیکن یہ الگ بات ہے کہ وہ اسے سمجھے یا نہ سمجھے۔ نیکی دل کو ٹھنڈک پہنچاتی ہے، سکون پہنچاتی ہے اور بندہ اطمینان سے جیتا ہے۔ برائی بے سکونی پہنچاتی ہے اور نیند کی گولیاں کھائے تو پھر بھی نیند نہیں آتی۔ لوگ دکھوں کو بھلانے کے لیے نشے پیتے ہیں، بے ہوش ہوجاتے ہیں لیکن جب ہوش آتی ہے تو دکھ کئی گنا بڑھ چکے ہوتے ہیں بلکہ نشہ پینے کا ایک دکھ مزید ہوجاتا ہے۔ مال ضائع کرنے کا ایک دکھ اور ہوجاتا ہے، عزت و آبرو ضائع ہونے کا دکھ اور بڑھ جاتا ہے۔ اگر اللہ کی اطاعت کی جائے، آخرت کا دھیان رکھا جائے اور یہ دعا کی جائے کہ اے اللہ میں کمزور ہوں، دنیا میں بھی مجھ پر احسان فرما، مجھے آگ سے بچالے تو فرمایا، یہ وہ لوگ ہیں جنہیں ان کا اجر دنیا میں بھی ملتا ہے اور آخرت میں بھی ملتا ہے۔ یہ مت سمجھو کہ آخرت آئے گی تو حساب ہوگا۔ حساب کتاب ساتھ ساتھ بے باق ہوتا جا رہا ہے، اللہ کی نافرمانی کرنے سے دنیا میں بھی زندگی انگاروں پر لوٹ جاتی ہے اور اللہ کی اطاعت کرنے سے گل و گلزار ہوجاتی ہے۔

وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ۔۔۔۔ جو گنتی کے دن ہیں، جو حج کے مقرر دن ہیں ان میں اللہ کا ذکر کرتے رہو۔ فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۔۔۔۔ قربانی کے بعد اگر کوئی منیٰ میں دو دن ٹھہرنا چاہتا ہے تو بھی گناہ نہیں ہے اور کوئی طواف وداع کے لیے ایک دن پہلے آنا چاہتا ہے تو بھی اس میں کوئی حرج نہیں اور یہ سب کچھ اللہ سے ڈرنے والوں کے لیے ہے۔ لِمَنِ اتَّقٰى ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ﴿۲۰۳﴾ احکامِ حج میں کتنی دفعہ اس بات کو دہرایا گیا کہ اس بات کا خیال رکھو کہ تمہیں اللہ سے تعلق کو مضبوط کرنا ہے۔ اللہ سے رشتہ استوار کرنا ہے۔ تم نے حضورِ حق کو دل میں جاگزیں کرنا ہے۔ حج کرنے کا حاصل یہ ہے کہ حج کے بعد کہیں بھی جاؤ تو تمہارا پروردگار تمہارے ساتھ ہو۔ تم تنہا ہو یا مجلس میں ہو، ہر وقت تمہارا اللہ تمہارے ساتھ ہو۔ گھر میں ہو خواہ سفر میں، تمہارا اللہ تمہارے ساتھ ہو۔ یہی حج کا حاصل ہے اور اسی پر خاتمہ بالایمان نصیب ہوگا۔ اس سے قبر روشن ہوگی، اس سے برزخ روشن ہوگا، اس سے حشر کے دن عزت نصیب ہوگی، اس سے آگ کا بچاؤ نصیب ہوگا اور اگر محض رسمیں ادا کرتے رہے اور حضورِ حق نصیب نہ ہوا تو کتنا بدنصیب ہے وہ شخص جو حج کا سفر کر کے حرم سے ہو کر آئے لیکن پھر بھی محروم رہے۔

لہٰذا وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۔۔۔۔ اللہ کے ساتھ اپنا معاملہ درست رکھو۔ وَاعْلَمُوْٓا ۔۔۔۔ اور یہ بات یاد رکھو! یہ بات ذہن میں پکی کرلو۔ اَنَّكُمْ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ﴿۲۰۳﴾ تمہیں مڑ کر اللہ کی بارگاہ میں حاضر ہونا ہے۔ تم ہزار

تبدیلیوں سے گزرو، ہزار انقلاب سے گزرو، بچپن، جوانی، بڑھاپا بیتے، دولت کماؤ عہدے کماؤ یا غریبی اور مفلسی رہے، کسی حال میں، کسی رنگ میں رہو موت نے آنا ہے۔ موت بارگاہ الوہیت کی طرف واپسی ہے۔ تم ہواؤں میں بکھر جاؤ یا زمین پہ منتشر ہو جاؤ یا آگ میں جل جاؤ، تمہیں واپس اس کے حضور حاضر ہونا ہے۔ اللہ کریم قبول فرمائے۔

دین کا مدار کیفیت قلبی پر ہے:

وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ يُّعۡجِبُكَ قَوۡلُهٗ فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا وَيُشۡهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِىۡ قَلۡبِهٖ ۙ وَهُوَ اَلَدُّ الۡخِصَامِ ﴿۲۰۴﴾ دینِ اسلام درحقیقت ایک قلبی کیفیت کا نام ہے اور اس کیفیت پر پورے دین کا مدار ہے۔ اگر بندے کا دل نہ مانے لیکن اس کی زبان مانتی رہے۔ بظاہر وہ نماز روزہ بھی کرتا رہے، اچھی باتیں بھی کرے لیکن اللہ کے نزدیک اچھائی وہ اچھائی ہے جب وہ دل سے اللہ کی عظمت کا اقرار کرے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کا اقرار کرے اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشنودی کے لیے اللہ اور اللہ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام بجالائے تو ایسا بندہ مسلمان ہے۔ اللہ کی رحمت وسیع ہے، اگر اس سے کچھ خطا بھی ہوتی ہے اور اس میں کچھ کمی بھی رہ جاتی ہے تو اس کی بخشش اس کمی کو پورا کرنے کے لیے کافی ہے۔ اگر دل ساتھ نہ دے، دنیوی مجبوریوں کے تحت یا دنیا میں نیک کہلانے کے لیے، دنیوی باتیں بنانے کے لیے بظاہر قرآن و حدیث بھی پڑھتا رہے اور نماز روزہ بھی کرتا رہے لیکن لوگوں کے ساتھ اس کے معاملات کبھی درست نہیں ہو پاتے، لین دین میں وہ دیانت دار نہیں رہے گا، دوسروں کے لیے مصیبتیں کھڑی کرتا رہے گا اور فساد پیدا کرتا رہے گا۔

حج آخری درجۂ علاج ہے:

حج کے سلسلۂ کلام کے ساتھ قول اور قلبی کیفیت کے تضاد کا ذکر اس لیے کر دیا گیا ہے کہ حج ایک ایسی عبادت ہے جسے آخری درجۂ علاج کی حیثیت حاصل ہے۔ کچھ دوائیں ایسی ہیں جو آخری طور پر دی جاتی ہیں جن کے بغیر مریض بچ نہیں سکتا۔ ایسی دوا جو اس کی جان بچانے کے لیے دی جاتی ہے، اسے زندگی بچانے والی دوا Life Saving drug کہتے ہیں۔ حج بھی اپنے طور پر ایک آخری علاج ہے۔ اور اتنا کامیاب علاج ہے کہ زندگی میں ایک بار ساری زندگی کو کامیابیوں سے ہمکنار کرنے کے لیے کافی ہے۔ اب اگر حج ادا کرنے کے بعد بھی کسی کا دل نہیں بدلا تو پھر وہ لا علاج ہے، پھر سمجھو وہ مر جائے گا۔

حقیقتِ موت:

وہ موت جو مادّی موت ہے، جس میں جسم بے حس ہوجاتا ہے اور روح الگ ہوجاتی ہے، دراصل یہ حقیقی موت نہیں ہے۔ حقیقی موت وہ ہے جس میں انسان گمراہ ہوجاتا ہے اور روح اور جسم اللہ کے عذاب اور اللہ کی ناراضگی کی نذر ہوجاتے ہیں۔ چونکہ موت ایک ہیبت ناک چیز ہے، اس کے نام سے ہر کوئی تھر تھر کانپتا ہے لیکن یہ موت تو انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو بھی آئی۔ یہ موت تو صالحین کو، شہداء کو بھی آئی لیکن یہ موت نہیں ہے۔ نبی علیہ السلام تو بہت عظیم ہے، انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی اطاعت میں، اللہ کی راہ میں شہید ہونے والا بھی اس موت کو شکست دے دیتا ہے۔

وَلَا تَقُولُوا لِمَنۡ يُقۡتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمۡوَاتٌۢ بَلۡ أَحۡيَاء۔۔۔(البقرہ:154) جولوگ اللہ کی راہ میں قتل ہوتے ہیں انہیں مردہ نہ کہو، وہ زندہ ہیں۔ قتل کا فعل بدن پہ صادر ہوتا ہے، جگر پھٹ جاتا ہے، گولیاں گزر جاتی ہیں، جسم کے ٹکڑے ہوجاتے ہیں، اسے دفن کیا جاتا ہے تو قبر بنتی ہے لیکن اس کے باوجود حکم ہے کہ اسے مردہ نہ کہو۔ وہ مرانہیں بَلۡ أَحۡيَاءٌ وَلَٰكِن لَّا تَشۡعُرُونَ (البقرہ:154) بلکہ یہ لوگ زندہ ہیں۔ دوسری جگہ ایسا سوچنے پر بھی پابندی لگادی ہے وَلَا تَحۡسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمۡوَاتًا ۚ بَلۡ أَحۡيَاءٌ عِندَ رَبِّهِمۡ يُرۡزَقُونَ (آل عمران:169) تمہیں کیا خبر ہے کہ اللہ سے انہیں اچھی زندگی نصیب ہوگئی۔ یہ موت تو ایک تبدیلی ہے، زندگی کا ایک رخ ہے۔

ارواح عالمِ امر میں تھیں اور ابدان خاک پہ منتشر تھے۔ ربّ کریم نے ہر ایک ذرہ بدن کو مختلف غذاؤں اور دواؤں میں ڈھال کر یکجا کیا۔ کچھ صلبِ پدر میں پہنچے، کچھ والدہ کے وجود کا حصہ بنے۔ وہ ملے تو ایک نیا وجود پیدا ہوا، پھر اس میں روح پھونکی گئی۔ یہ سارے زندگی کے مختلف پہلو ہیں۔ پھر وہ دنیا میں پیدا ہوا تو ہماری آنکھوں نے 'ہمارے دل نے' ہمارے دماغ نے یقین کیا کہ یہ زندہ ہے لیکن جس دن جسم سے روح الگ ہوتی ہے تو وہ فنا نہیں ہوتا۔ روح بھی بارگاہِ الوہیت میں پیش ہوتی ہے اور بدن کا ذرہ ذرہ بھی اللہ کے حضور ہوتا ہے۔ بدن کا روح کے ساتھ ایسا تعلق بن جاتا ہے کہ خواہ کوئی جل جائے، جانور کھاجائیں، خاک ہوجائے لیکن ہر ذرہ کسی صورت میں تو موجود رہتا ہے۔ مادّے کی کوئی شکل تو ہوتی ہے اور ہر ذرے کا تعلق روح سے ہوتا ہے۔ اگر روح عنداللہ مغفور ہے تو وہ ذرات بھی سکون میں ہوتے ہیں اور اگر روح اللہ کے غضب کی شکار ہے تو وہ ذرات، جہاں ہوں، ان تک غضبِ الٰہی پہنچتا رہتا ہے۔ عرصہ محشر میں پھر سے بدن اور روح کو اکٹھا کردیا جائے گا۔ دنیا میں روح بدن کے تابع ہے، برزخ میں دونوں الگ الگ ہیں لیکن بدن جہاں بھی ہو، روح کے تابع ہوتا ہے۔ روح کے ساتھ جو سلوک ہورہا ہو وہ اسے پہنچتا

رہتا ہے۔ آخرت میں بدن اور روح دونوں برابر محسوس کریں گے۔ میدانِ حشر میں دونوں حاضر ہوں گے اور جنت یا دوزخ میں دونوں اکٹھے ہو جائیں گے۔ یہ تو زندگی کے مختلف روپ ہیں جو ختم نہیں ہوتے۔ اہلِ جنت ہمیشہ جنت میں رہیں گے اور اہلِ دوزخ، جو کفر پر مرے، وہ دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے۔ دونوں کے لیے خلود ہے تو پھر موت کیا ہے؟

موت ہے عظمتِ الٰہی سے محرومی، ایمان سے محرومی، چلتے پھرتے لوگ بھی مرے ہوئے ہوتے ہیں اگر انہیں نورِ ایمان نصیب نہ ہو۔

وَأَجْسَامُهُمْ قَبْلَ الْقُبُوْرُ قُبُوْرُهُمْ ان کے جسم قبر میں جانے سے پہلے خود قبریں بن جاتے ہیں۔ روح کی لاش کو، روح کی میت کو اٹھائے ہوئے ان کے بدن چلتی پھرتی قبریں ہوتی ہیں۔ اگر دل نے نہیں مانا تو کیا حاصل !:

خرد نے کہہ بھی دیا لا الہ تو کیا حاصل!
دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

خرد کی مجبوری ہے کہ اسے ایک ایسی طاقت کو ماننا پڑتا ہے جو سب سے اوپر ہے اور اس کے اوپر کوئی نہیں اور وہی اللہ کریم ہے۔ اگر اللہ کو نہ مانا جائے تو پھر یہ سوال مسلسل جاری رہتا ہے کہ اس کو کس نے بنایا؟ فلاں نے، اس کو کس نے بنایا؟ اس کو کس نے بنایا؟ یہ سوال آخر تک چلا جاتا ہے۔ آخر ایک ایسی ہستی آجاتی ہے جس کا کوئی بنانے والا نہیں۔ وہ خود سب کو بنانے والا ہے اور یہ مجبوراً ماننا پڑتا ہے ورنہ تسلسل ختم نہیں ہوتا۔ تو عقل نے کہہ بھی دیا کہ وہی بزرگ و برتر ہے، عبادت کا مستحق ہے تو کچھ حاصل نہیں، دل و نگاہ مسلمان نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ دل یہ بات قبول کرلے تو اس کا اثر نگاہ پہ آجاتا ہے اور نگاہ سارے اعمال کی راہنمائی کرتی ہیں، سارا کردار سدھر جاتا ہے۔

قول و فعل میں تضاد:

حج اس لیے ہے کہ آخرت کی شکل بنا کر، دو اَن سلی چادریں لپیٹ کر، بیت اللہ کے سامنے جو مہبط تجلیات ذاتی ہے، ہر آن جس پر تجلیات ذاتی متوجہ رہتی ہیں، وہاں اللہ کے حضور پیش ہو کر بندہ کہتا ہے: لبیك اللھمہ لبیك اے میرے اللہ! میں حاضر ہوں، میں تیرا بندہ ہوں، میں تیری عظمت کو تسلیم کرتا ہوں، میں تیری بڑائی بیان کرتا ہوں، میں تیرے پر، تیری کتاب پر، ضروریاتِ دین پر تہہ دل سے ایمان لاتا ہوں۔ اگر یہ حاصل نہیں ہے تو محض بھاگ دوڑ ہے جیسے نماز میں بھی اگر ایمان قلبی نصیب نہیں ہے تو ایک ورزش ہے۔ بندہ اٹھتا بیٹھتا رہتا ہے تو اس سے کیا ہوگا!

فرمایا: وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا بعض لوگ ایسے ہیں جو دنیا میں باتیں کر

کے بندے کو حیران کر دیتے ہیں۔ اے میرے حبیب! (صلی اللہ علیہ وسلّم) آپ (صلی اللہ علیہ وسلّم) کے سامنے بھی جب باتیں کریں گے تو بڑے جاں نثار لگیں گے، بڑے پارسا نظر آئیں گے، بڑی لمبی تقریریں کریں گے، بڑے بلند دعوے کریں گے وَيُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِىْ قَلْبِهٖ ۔۔ لیکن اللہ گواہ ہے، اللہ جانتا ہے جو کچھ ان کے دلوں میں ہے۔ ان کے دلوں میں وہ بات نہیں جو زبانوں پر ہے۔ وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ ﴿۲۰۴﴾ اصل وہ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی مخالفت میں سب سے آگے ہیں۔ جب بات کرتے ہیں، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کے سامنے ہوتے ہیں تو بڑی پارسائی کی بات کرتے ہیں، بڑی نیکی کی بات کرتے ہیں، بڑی لمبی تقریریں کرتے ہیں، بڑے اونچے دعوے کرتے ہیں لیکن اللہ جانتا ہے جو ان کے دلوں میں ہے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی خدمت سے اٹھ جاتے ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کے احکام کے خلاف، آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی ذات کے خلاف، آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کے دین کے خلاف، آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کے پیغام کے خلاف اتنا کام کرتے ہیں کہ اللہ کی زمین پر فساد پیدا ہو جاتا ہے۔

ابتدائے اسلام میں نہ ٹی وی تھا، نہ ریڈیو تھا، نہ ٹیلی فون تھا، نہ اخبار چھپتے تھے، نہ کوئی بڑے جلسے ہوتے تھے اور نہ لمبی تقریریں ہوتی تھیں۔ سادہ سادہ باتیں ہوتی تھیں لیکن کرۂ زمین کو امن نصیب تھا۔ سلطنتِ اسلامیہ میں کافروں کو بھی امن نصیب ہوتا اور ان کی جان، مال آبرو بھی محفوظ رہتی تھی۔ آج اس دور کو دیکھیے! انٹرنیٹ پر روزانہ علماء قرآن کے مفہوم بیان کر رہے ہوتے ہیں، تقریریں کر رہے ہوتے ہیں۔ بے شمار چیزیں چھپتی ہیں۔ کتابیں، اخبار رسالے، سب میں دینی مضامین ہوتے ہیں۔ کچھ لوگ تو سارا کام چھوڑ کر تبلیغ پر ہی لگ گئے ہیں اور ساری دنیا کے چکر لگاتے رہتے ہیں۔ اس سارے عمل کا حاصل کیا ہے! جب یہ چیزیں نہیں تھیں، اتنی بڑی تبلیغ نہیں تھی اور نشریات اتنی دور نہیں جاتی تھیں تو پوری دنیا میں امن تھا۔ اب اتنی زیادہ تبلیغ ہے لیکن پوری دنیا آگ سے کھیل رہی ہے۔ گھر گھر میں فساد ہے، ملک ملک میں فساد ہے اور روئے زمین آگ کی لپیٹ میں ہے۔ فرق کیا ہے؟ فرق یہ ہے کہ وہ چند کلمات ہوتے تھے، وہ دل کی آواز ہوتی تھی اور جو ہم کہتے ہیں یہ حلق سے اوپر کی آواز ہے لیکن دل ساتھ نہیں رہے۔ آدمی کہتا کچھ اور ہے، چاہتا کچھ اور ہے۔ کہتا کچھ اور ہے، کرتا کچھ اور ہے۔

حج کے تذکرہ کے ساتھ ہی فرمایا گیا کہ میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلّم ایسے لوگ بھی ہوں گے جو ساری عبادتیں کر گزریں گے، حج بھی ادا کر لیں گے، سعی بھی کر لیں گے، طواف بھی ہو جائے گا، قربانیاں بھی کریں گے لیکن یہ سب دنیا کو دکھانے کے لیے، نیک نامی حاصل کرنے کے لیے یا حاجی صاحب کہلانے کے لیے ہوگا۔ ان کے دل نہیں بدلیں گے۔ باتیں کریں گے تو ایسا نظر آئے گا کہ موتی لٹا رہے ہیں وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ

آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کو حیران کر کے رکھ دیں گے لیکن یہ سب دنیا کے حصول کے طریقے ہیں۔ دل سے نہیں کہہ رہے، اللہ گواہ ہے ایسے لوگوں پر جن کے دلوں میں کھوٹ ہے۔ وَهُوَ أَلَدُّ الْخِصَامِ اور وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی مخالفت میں بھی سب سے آگے آگے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کے عہد مبارک میں آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی مخالفت کیا تھی؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کے ارشادات کی مخالفت، آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی سنت کی مخالفت۔ لیکن آج بھی نبوت آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی ہے، آج بھی نبی آپ صلی اللہ علیہ وسلّم ہیں، قیامت تک نبوت آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی ہے۔ اس طرح قیامت تک آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی سنت کی مخالفت، آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کے پیغام کی مخالفت دراصل آپ صلی اللہ علیہ وسلّم ہی کی مخالفت ہے۔

وَإِذَا تَوَلَّىٰ سَعَىٰ فِي الْأَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ۗ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ (205) اور جب آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی محفل سے واپس جاتے ہیں تو روئے زمین پر فساد پھیلا دیتے ہیں اور لوگوں کی فصلیں، لوگوں کی نسلیں، لوگوں کے جانور، ہر چیز کی تباہی کا سبب بنتے ہیں۔ اس آیہء کریمہ نے واضح بتا دیا کہ اسلام تو سب کے لیے امن کا خواہاں ہے۔ انتہائی حالت میں جسے اللہ قتل کرنے کا حکم دے، جس کی سزا اللہ کی طرف سے قتل ہو، اسے ہی قتل کیا جاتا ہے۔ کوئی بندہ اپنی مرضی سے دوسرے کی جان نہیں لے سکتا اور اگر کوئی ایسا کردار اپنائے کہ اس سے دنیا پہ تباہی آئے، لوگوں کی جان، مال آبرو ہر چیز لٹ جائے لیکن وہ بڑے دعوے کرتا رہے، داڑھی رکھ لے، سجدے دیتا رہے، حج کرتا رہے تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے!

ہم اپنے ملک کا ہی اندازہ کر لیں۔ میرے خیال میں ہر تیسرا بندہ حاجی ہے۔ ایسے خاندانوں کے خاندان ہیں جو ہر سال کئی مرتبہ عمرے کرتے ہیں اور ہر سال حج پر بھی جاتے ہیں۔ آزادی سے لے کر اب تک جو پینسٹھ برس گزرے ہیں، ہر سال لاکھوں لوگ حج پہ جا چکے ہیں۔ اگر ایک لاکھ سالانہ بھی شمار کریں تو پینسٹھ لاکھ حاجی تو یہ ہو گئے۔ عمرہ بھی تو حج ہے، جتنے لوگ عمرے پہ جاتے ہیں ان کو شمار کریں تو میرے خیال میں ہر تیسرا بندہ حاجی نکل آئے گا۔ کیا لوگوں کا مزاج بدلا، لوگوں کا کردار بدلا، لوگوں کی تعلیمات اور لوگوں کے عمل میں کوئی فرق پڑا؟ اگر نہیں پڑا تو اس کا مطلب ہے اس نے حج نہیں کیا۔ ایک دوا کھائی اور صحت نہیں ہوئی تو وہ دوا اصلی نہیں تھی یا بد پرہیزی ہوئی۔ اگر دوا اصلی تھی تو پھر بد پرہیزی ہوئی۔

بات یہ ہے کہ آدمی جب اللہ کے حضور پیش ہو اور حج جیسی سعادت سے بہرہ ور ہو تو اس کا دل صاف ہو جانا چاہیے۔ عظمتِ الٰہی اس پہ ثبت ہو جانی چاہیے۔ صداقتِ پیامبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم اس کا حصہ بن جانی چاہیے۔ باقی زندگی اسے اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلّم کے دین کو پھیلانے میں، نیکی کو پھیلانے میں، امن کو

پھیلانے میں بسر کرنی چاہیے۔ لیکن لوگ ایسے ہیں کہ بظاہر بڑی تقریریں، بڑی باتیں، بڑے دعوے کرتے ہیں لیکن اللہ جانتا ہے کہ ان کے دل نہیں بدلے اور دنیا بھی دیکھ لیتی ہے کہ جب وہ واپس جاتے ہیں تو دین کی مخالفت کرتے ہیں۔ اب یہ ضروری نہیں کہ دین کے خلاف کوئی تقریر ہی کرے تو مخالفت ہے بلکہ جو عملی مخالفت ہوتی ہے وہ سب سے زیادہ موثر اور مخالفت کا انتہائی درجہ ہے۔

وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا ۔۔۔ جب وہ واپس پہنچتے ہیں تو روئے زمین پر فساد کے لیے کوشش کرتے ہیں۔ لوگوں کو آپس میں لڑانے کی کوشش کرتے ہیں اور ان کے اس فساد سے لوگوں کے گھر اجڑتے ہیں، فصلیں تباہ ہوتی ہیں، مویشی مرجاتے ہیں، نسلیں ختم ہوجاتی ہیں۔ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ۝۲۰۵ اور اللہ کو فساد ہرگز پسند نہیں ہے۔ ہر کام کے کرنے کا ایک جائز طریقہ اور ایک سلیقہ ہے اور ہر کام اسی سلیقے کے تحت ہوتا ہے۔ پھر ہر ملک، ہر قوم کے اپنے حالات ہیں۔ اب افغان لڑ رہے ہیں تو ہم کہتے ہیں کہ ان پر غیر ملکی مسلط ہو گئے اور وہ ان کے خلاف لڑ رہے ہیں۔ کشمیری لڑ رہے ہیں تو ہم کہتے ہیں کہ ہندوؤں نے ان پر زبردستی قبضہ جمار کھا ہے اور وہ ان کے خلاف لڑ رہے ہیں۔ عراقی لڑ رہے ہیں تو ہم کہتے ہیں باہر سے امریکہ اور دوسری فوجیں ان پر قابض ہو گئیں اور ان کی آزادی چھین لی، ان کا ملک تباہ کر دیا اور وہ ان کے خلاف لڑ رہے ہیں۔ پاکستان میں روز دھماکے ہوتے ہیں تو یہ کس کے خلاف ہو رہے ہیں؟ یہاں کون سی باہر کی طاقت آ گئی ہے؟ حکمران بھی مسلمان ہیں، صدر سے لے کر وزیر اعظم تک، وزراء تک، وہ بھی یہی کلمہ پڑھتے ہیں۔ وہ بھی یہی نماز پڑھتے ہیں۔ چلو! کوئی ان سے زیادہ پارسا ہوگا اور وہ کم پارسا ہوں گے لیکن مسلمان تو ہیں۔ غیر ملکی بھی نہیں ہیں۔ پھر یہاں مساجد میں دھماکے کیوں ہو رہے ہیں؟ عبادت گاہوں پر گولیاں کیوں چل رہی ہیں؟ بازاروں میں لوگ کیوں قتل ہو رہے ہیں؟ جب ریاست مسلمانوں کی ہے، حکومت مسلمانوں کی ہے اور رعیت بھی مسلمان ہے۔

ہر ایک کو دعویٰ کرتے ہوئے پینسٹھ برس ہو گئے کہ اسلام نافذ کرو، اسلام نافذ کرو۔ چلو الحمدللہ کسی حد تک ہوا، اللہ قبول کرے۔ اس میں ہماری بھی ادنیٰ سی کوشش کو دخل ہے جو بلا سود بنکاری شروع ہو گئی۔ کتنے مسلمان ہیں جنہوں نے سود لینا چھوڑ دیا اور بلا سود بنکاری میں چلے گئے۔ اب بھی اکثریت سود پر ہے۔ اس وقت بھی بلا سودی بنکوں میں بہت تھوڑے لوگ آتے ہیں اور اکثریت سود کھا رہی ہے۔ بظاہر سارے کہتے ہیں اسلام، اسلام، اسلام! لیکن دیکھا گیا ہے کہ بڑے بڑے پارسا سود پہ گزارا کر رہے ہیں، کھا رہے ہیں، مزے کر رہے ہیں۔ بظاہر بڑے پارسا بنے ہوئے ہیں، بڑی بڑی باتیں کرتے ہیں، تہجد اور اشراق اور اوابین بھی قضا نہیں ہونے دیتے، سجدے پہ سجدہ کیے جا رہے ہیں لیکن جب دولت کی بات آتی ہے تو کہتے ہیں جی کیا کریں، مجبوری ہے۔ اللہ نے تو حکم دیا کہ جو

سود نہیں چھوڑتا اسے اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلّم کے ساتھ جنگ کے لیے تیار رہنا چاہیے۔اس کے خلاف اعلانِ جنگ ہے۔ یہاں ایسا کیوں ہوتا ہے کہ یہ لوگ سجدے پہ سجدے دیتے ہیں، لوگ حج کرتے ہیں، لوگ قربانیاں کرتے ہیں، روزے رکھتے ہیں لیکن عملی دنیا میں آتے ہیں تو پھر حرام کھانے، جھوٹ بولنے، قتل کرنے، برائی سے باز نہیں آتے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ دل میں ایمان نہیں ہوتا۔ اگر دل میں نورِ ایمان ہو تو تب جا کر کردار سدھرتا ہے ورنہ محض اچھی اچھی باتیں کرنے اور بڑی بڑی باتیں کرنے سے انسان بدل نہیں جاتا۔ تو اس طرف اشارہ فرمایا جارہا ہے کہ ایسے لوگ جن کے قلوب درست نہ ہوں، ان کی کوئی بھی ادا قابلِ اعتبار نہیں ہوتی۔ بظاہر بڑے خوش بیان ہوتے ہیں لیکن ان کے دلوں میں فساد ہوتا ہے۔ اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی مخالفت کرنے میں یہ لوگ سب سے زیادہ شدید ہیں۔ ان کا سارا عمل خلافِ شریعت ہوتا ہے اور باتوں میں وہ بڑے باشریعت نظر آتے ہیں۔ ان کا کردار لوگوں کی تباہی کا سبب بنتا ہے اور اللہ فساد کو پسند نہیں فرماتے۔ اور پھر ان میں ایسی اکڑ آجاتی ہے کہ وَاِذَا قِيۡلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتۡهُ الۡعِزَّةُ بِالۡاِثۡمِ ۔۔۔۔۔ جب انہیں کہا جائے، کچھ تو خدا کا خوف کرو، کچھ تو حیا کرو، کم از کم تم تو سود نہ کھاؤ، کم از کم تم تو فساد کی بات نہ کرو، تم تو کسی کو مارنے مروانے اور قتل کی باتیں نہ کرو، تم تو دنیا میں امن قائم کرنے کی بات کرو، بھلی بات کرو تو اَخَذَتۡهُ الۡعِزَّةُ ۔۔۔۔۔ اسے غصہ آجاتا ہے۔ وہ کہتا ہے میں اور کروں گا تو میرا کیا کر لے گا! یعنی یہ لوگ اتنے بگڑ جاتے ہیں کہ اگر کوئی انہیں اللہ کا واسطہ دے کر روکنے کی کوشش کرے تو ایسے لوگ گناہ پر اور دلیر ہو جاتے ہیں، کوئی میرا کیا بگاڑ لے گا، میں ایسا ہی کروں گا!

فَحَسۡبُهٗ جَهَنَّمُ ۔۔۔۔ ایسے لوگوں کو دوزخ ہی کافی ہے، ان کا جواب جہنم ہے۔ وَلَبِئۡسَ الۡمِهَادُ۝ اور انہیں پتہ چل جائے گا، جب وہاں پہنچیں گے کہ جہنم کتنی بری جگہ ہے اور کتنی تکلیف دہ جگہ ہے۔

قرآن حکیم کا مقصد محض باتیں کرنا نہیں ہے، انسان کی اصلاح کرنا اور اسے اللہ کی ناراضگی سے بچانا ہے۔ قرآن زندگی کے ہر پہلو کو اس خوبصورتی سے زیرِ بحث لاتا ہے کہ آدمی کو کوئی غلط فہمی نہیں رہتی۔ ہمیں اسے رسماً پڑھنا اور سننا نہیں چاہیے بلکہ دل کے کانوں اور دل کی آنکھوں سے دیکھنا اور سننا چاہیے۔ اللہ ہمارے گناہ معاف فرمائے ہماری توبہ قبول فرمائے اپنی اور اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلّم کی اطاعت نصیب فرمائے اور نیک انجام میسر فرمائے، آمین!

اس سے قبل ان لوگوں کی بات چل رہی تھی جو باتیں تو بہت کرتے ہیں، دعوے بھی بہت کرتے ہیں لیکن عملی زندگی میں کام اپنی پسند سے کرتے ہیں جس کے نتیجے میں اللہ کی نافرمانی ہوتی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی نافرمانی ہوتی ہے، اللہ کی مخلوق کے لیے باعثِ ایذا بنتے ہیں اور اس نافرمانی کے سبب روئے زمین پر فساد پیدا ہوتا ہے۔ یہ ایسے عجیب لوگ ہوتے ہیں کہ انہیں اگر سمجھایا جائے تو اس پر اور زیادہ اکڑتے ہیں اور اپنی بات پہ اور زیادہ اڑ

جاتے ہیں۔اس کے بعد دوسری طرح کے لوگوں کا ذکر ہے۔

دوطرح کے لوگ:

دنیا میں دوطرح کے لوگ ہیں۔ایک وہ ہیں جو دنیا میں اپنی پسند سے رہنا چاہتے ہیں اور ظاہر ہے کہ انسان کی ذاتی پسند اس کی محدود عقل اور اس کے محدود علم کے مطابق ہوتی ہے۔وقتی طور پر جو چیز نظر کے سامنے ہے، وہ اسے ایک حد تک سمجھ سکتا ہے لیکن اس کے نتائج اس کے سامنے نہیں ہوتے۔اللہ جل شانہ، جو حکم دیتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو حکم دیا، اس کے نتائج دنیا و آخرت میں ہر طرح سے انسان کے لیے مفید اور اس کی ضرورت ہیں لیکن جب آدمی اپنی مرضی کرتا ہے تو وہ ان سب باتوں سے بے نیاز ہو کر ایسا کرتا ہے۔ پھر سب سے برے وہ لوگ ہیں جو اس بات پہ ڈٹ جاتے ہیں کہ ہم حق پر ہیں۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ يَّشۡرِىۡ نَفۡسَهُ ابۡتِغَآءَ مَرۡضَاتِ اللّٰهِ۔۔۔۔ دوسری طرف وہ لوگ ہیں کہ اللہ کی رضا کے لیے اگر جان بھی جاتی ہے تو پروا نہیں کرتے۔انسانوں کی دوسری قسم وہ ہے جو اس بات پر اپنے چھوٹے چھوٹے مفادات، چھوٹی چھوٹی خواہشات، تمنائیں اور آرزوئیں ہی نہیں بلکہ اپنا سب کچھ لٹا دینے پہ تیار ہو جاتے ہیں اور لٹا دیتے ہیں کہ اللہ کی رضا حاصل ہو جائے اور اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا دامانِ رحمت ہاتھ سے نہ چھوٹے۔

وَاللّٰهُ رَءُوۡفٌ بِالۡعِبَادِ﴿۲۰۷﴾ اللہ اپنے بندوں پر بہت زیادہ مہربان ہے۔یہ بندے اللہ کی رضا کے لیے اپنی جان بھی لٹا دیتے ہیں لیکن ان پر بظاہر جو تکلیف بھی آئے حقیقتاً وہ رحمتِ الٰہی کا مظہر ہوتی ہے۔صورتیں دو طرح کی ہوتی ہیں۔ایک بظاہر تو بہت خوش گوار نظر آتی ہیں، بہت خوبصورت لگتی ہیں لیکن ان میں انسان بڑی تکلیف میں ہوتا ہے، اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔بظاہر ہمیں ایک شخص دولت مند نظر آتا ہے لیکن ہم یہ نہیں جانتے کہ شاید وہ دولت استعمال بھی کر سکتا ہے یا نہیں۔اسے کوئی ایسا مرض ہو جاتا ہے کہ وہ کھانا صحیح طرح نہیں کھا سکتا، آرام نہیں کر سکتا، اسے نیند نہیں آتی، دکھ ہوتا ہے، تکلیف ہوتی ہے۔اور بے شمار طریقے ہیں جن سے اسے ایذا پہنچتی رہتی ہے۔صرف دولت کو وہ کیا کرے گا! اسی طرح بعض لوگوں کے پاس اقتدار ہوتا ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ یہ بڑے خوشحال ہیں لیکن درحقیقت وہ بڑے پریشان حال ہوتے ہیں۔بعض لوگ بظاہر مصیبت میں ہوتے ہیں لیکن اگر وہ مقبولانِ بارگاہ ہیں تو مصیبت کے اندر بھی ان کے لیے راحت ہوتی ہے۔انہیں ایک خاص سکون نصیب ہوتا ہے، انہیں ایک خاص قرب نصیب ہوتا ہے، اللہ کی رحمت نصیب ہوتی ہے۔

جیسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کے ارشاد کا مفہوم ہے کہ قیامت کے روز اللہ کریم شہداء سے پوچھیں گے کہ بتاؤ تمہیں کیا چاہیے۔ اب شہید ہونا بظاہر بڑا تکلیف دہ عمل ہے۔ کوئی تلوار سے قتل ہوتا ہے، تیر سے ہوتا ہے، گولی سے ہوتا ہے، توپ سے ہوتا ہے، آگ سے ہوتا ہے، جسم پھٹ جاتا ہے اور بظاہر یہ بہت تکلیف دہ کام ہے۔ جان بھی جاتی ہے، جسم کے پرخچے بھی اڑ جاتے ہیں لیکن چونکہ وہ اللہ کی رضا کے لیے ایسا کر رہا ہوتا ہے تو اس تکلیف میں جو بظاہر ہمیں تکلیف نظر آتی ہے، شہید کو وہ لذت نصیب ہوتی ہے کہ جب اللہ کریم شہداء سے میدانِ حشر میں پوچھیں گے کہ بتاؤ تمہاری کوئی خواہش؟ تم کیا چاہتے ہو؟ تو وہ کہیں گے، اللہ! ایک دفعہ پھر سے دنیا آباد کر، ہمیں وہیں بھیج دے اور ایک دفعہ پھر سے تیری راہ میں جان دینے کا مزا آئے اور وہی موت، وہی شہادت نصیب ہو، اسی طرح جسم کے پرخچے اڑیں، اسی طرح خون بہے اور اسی طرح سرتن سے جدا ہو۔ جو لذت اس مرنے میں ہے وہ ہم نے زندگی میں نہیں پائی۔ تو چیزیں یا اعمال وافعال بظاہر جو نظر آتے ہیں، وہ کچھ اور ہوتے ہیں اور بندے پر جو حقیقتاً وارد ہو رہا ہے، وہ کچھ اور ہوتا ہے۔

فرمایا، جو لوگ اللہ کی رضا کے لیے اپنی خواہشات قربان کر دیتے ہیں، اپنی آرزوئیں قربان کر دیتے ہیں، حتیٰ کہ ایسا موقع آجائے کہ وہ سمجھیں کہ اللہ کی رضا کے لیے اب جان بھی جاتی ہے تو وہ جان بھی دے دیتے ہیں لیکن اللہ کی رضا کو ہاتھ سے نہیں چھوڑتے، یاد رکھو! ایسے لوگوں کے ساتھ اللہ کا خاص کرم ہوتا ہے، خاص مہربانی ہوتی ہے، ایک خاص رحمت ہوتی ہے جو بظاہر نظر آنے والی تکلیف کو بھی ان کے لیے راحت بنا دیتی ہے۔

انسان ایک عجیب مخلوق ہے۔ اپنی انا سے نکلنا اس کے لیے دشوار ترین کام ہے۔ صوفیاء بھی کہتے ہیں کہ اللہ اللہ کرنے سے انسان کی حالت بدلتی ہے، اللہ کی اطاعت نصیب ہوتی ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم سے نسبت اور محبت ہو جاتی ہے لیکن سب سے آخر میں انسان کے اندر سے جو چیز نکلتی ہے وہ اس کی اپنی انا ہوتی ہے۔ انسان اپنے آپ کو بہت کچھ سمجھتا ہے حالانکہ درحقیقت اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ باعتبار علم اس کا علم محدود ہے، طاقت کے اعتبار سے اس کی طاقت بڑی تھوڑی اور محدود ہے، کسی بھی پہلو سے سوچا جائے تو وہ محتاج و بے بس ہے۔ کسی دانا نے ہارون الرشید سے کہا کہ آپ کہیں جنگل میں ہوں، بھٹک جائیں، فوج سے الگ ہو جائیں اور آپ کو پیاس ستائے، پانی قریب نہ ہو، جاں بہ لب ہو جائے تو کوئی ایسا آدمی جس کے پاس پانی ہو اور وہ آپ کو پانی مفت نہ دے تو آپ پانی کے ایک گلاس یا چند گھونٹ کی قیمت کہاں تک دیں گے؟ وہ کہنے لگے کہ آدھی سلطنت دے دوں گا۔ انہوں نے فرمایا کہ پینے کے بعد اگر وہ پانی خارج نہ ہو، پیٹ میں رک جائے، کوئی ایسا مرض بن جائے! جواب دیا کہ جان بچانے کے

لیے ساری سلطنت ہی دے دوں گا۔تو دانا نے فرمایا پھر اس سلطنت یا اس ریاست پہ اکڑنا کیسا ہے جس کی قیمت دو گھونٹ پانی، چند قطرے پیشاب ہے۔

انسان جتنی بھی دولت جمع کر لے، جتنا بھی مال اکٹھا کر لے یا اپنی حیثیت بنا لے لیکن تھوڑی سی تکلیف بھی آجائے تو وہ ساری بے حیثیت ہو جاتی ہے۔ پھر موت سارا نقشہ ہی بدل دیتی ہے، سب کچھ مٹا دیتی ہے۔ جو کچھ اس کے پاس ہے وہ کسی اور کا ہو جاتا ہے۔ اس کی بیویاں بھی اس کی نہیں رہتیں، ان پر بھی اس کا حق نہیں رہتا، دولت بھی وارثوں کی ہو جاتی ہے۔ تو ایسی چیز کے لیے جسے بہر حال ضائع ہونا ہے، انسان کے ہاتھ سے نکل جانا ہے، اس دولت، اس مال یا ان آرزوؤں کے لیے اگر انسان دامانِ رحمتِ الٰہی کو چھوڑتا ہے تو کتنی بڑی نادانی ہے!

فرمایا، میرے بندے ایسے بھی ہیں جو کسی بھی حال میں میری رضا کو نہیں چھوڑتے، حتیٰ کہ اگر جان بھی دینی پڑے تو وہ جان بھی دے دیتے ہیں۔ اللہ اپنے بندوں پر بہت زیادہ مہربان ہے، جان بھی دے دیں تو بھی زندگی میں انسان سے ہزار کوتاہیاں، ہزار کمزوریاں رہ جاتی ہیں، وہ اپنی رحمت سے سب پوری فرما دیتا ہے۔

اتباعِ کامل:

یہ دونوں اقسام بیان فرما کر حکم دیا جا رہا ہے اور اس میں خطاب مومنین سے ہے، ان لوگوں سے ہے جو کلمہ پڑھتے ہیں، جو اللہ پر ایمان رکھتے ہیں، اللہ کے دین پر یقین رکھتے ہیں، اللہ کے نبی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر یقین رکھتے ہیں، آخرت پر یقین رکھتے ہیں، ضروریاتِ دین پر یقین رکھتے ہیں اور جو مومن کہلاتے ہیں۔ فرمایا: یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اے ایمان والو! اُدْخُلُوْا فِی السِّلْمِ كَآفَّةً ۔۔۔۔سارے کے سارے اسلام میں داخل ہو جاؤ۔ ایسا کیوں کرتے ہو کہ کچھ اسلام کے اندر چلے گئے، کوئی حصہ باہر رہ گیا۔ اسلام کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کلی طور پر اپنی ساری سوچیں، اپنے سارے اختیار، اپنی ساری پسند و ناپسند اللہ اور اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے رکھ دیتا ہے کہ میرا جو کچھ تھا وہ ختم! اب وہ ہوگا جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرمائیں گے۔

اللہ کریم نے کسی کو کوئی ایسی تکلیف نہیں دی جو اس کے بس میں نہ ہو۔ ارشادِ باری ہے: لَا یُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۔۔۔۔(البقرہ:286) جو شخص کوئی کام نہیں کر سکتا، اس کے کرنے کا وہ مکلف ہی نہیں ہے لیکن جو کر سکتا ہے وہ اسے اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے مطابق کرنا ہوگا۔

کوئی نافرمانی چھوٹی نہیں:

اب یہ نہیں ہے کہ آدمی یہ سمجھے کہ میں نماز پڑھتا ہوں، زکوٰۃ دیتا ہوں، حج کر لیا ہے، روزے رکھتا ہوں تو یہ

چھوٹی چھوٹی باتیں میں اپنی مرضی سے کر لوں تو کیا حرج ہے! نہیں، چھوٹی بات بھی بڑی ہو جاتی ہے۔ اگر یہ دیکھا جائے کہ یہ چھوٹی بات کس کا حکم تھا تو وہ چھوٹی نہیں رہتی۔ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے کسی چھوٹے کام کے لیے بھی کوئی طریقہ بتا دیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کا بتانا بہت بڑی بات ہے۔ وہ کام چھوٹا ہے تو چھوٹا رہے لیکن ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلّم تو بہت بڑی بات ہے۔ اللہ کریم نے حکم دے دیا تو حکم کی نسبت تو اللہ سے ہے۔ اگر کام بظاہر چھوٹا ہے تو ہوا کرے، حکم تو اللہ کا ہے، اللہ کے حبیب صلی اللہ علیہ وسلّم کا ہے۔ فرمایا، مسلمانی یہ ہے کہ سارے کے سارے اسلام کے اندر داخل ہو جاؤ اور اسلام کے باہر جو قدم بھی ہو گا وہ شیطان کے نقشِ قدم پر ہو گا۔

قرآن کی روشنی میں دوسروں کی بجائے خود کو پرکھو:

ہماری مصیبت یہ ہے ہم قرآن کریم پڑھتے ہیں، ترجمہ پڑھتے ہیں، بات سمجھتے ہیں تو ساری بات کا تجزیہ اپنے آپ کو الگ رکھ کے کرتے ہیں کہ لوگ کیا کر رہے ہیں؟ قرآن تو یہ کہتا ہے لوگوں کا معاملہ اللہ کے پاس ہے۔ ہم لوگوں کے لیے بھی دعا کر سکتے ہیں، اچھی خواہش رکھ سکتے ہیں لیکن جوابدہ ہم اپنی ذات کے ہیں۔ جب اللہ کا حکم آتا ہے، اللہ کی کتاب میں ارشاد ہوتا ہے تو دیکھنا یہ چاہیے کہ اللہ کا حکم کیا ہے اور میں کیا کر رہا ہوں۔ ہمیں جواب اپنا دینا ہے، لوگوں کی جواب دہی نہیں کرنی، لوگ اپنا حساب خود دیں گے۔ ہم نے کسی کا حساب کتاب نہیں لینا اور نہ ہماری یہ حیثیت ہے۔ جواب طلبی کرنا یہ اس کا اپنا کام ہے، وہ جانے اس کی مخلوق جانے۔ ایک آدمی کو بظاہر ہم اچھا نہیں سمجھتے لیکن شاید اللہ کے نزدیک وہ کتنا اچھا ہو۔

ایک نوجوان گزرا، لباس بھی فرسودہ، بال الجھے ہوئے، بے روزگاری، بھوک اور افلاس کا شکار تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کی نظر پڑی تو خدمتِ عالی میں جو حضرات موجود تھے ان سے سوال فرمایا، یہ جو نوجوان جا رہا ہے، اس کے بارے لوگوں کی رائے کیا ہے؟ عرب میں آج بھی ہماری طرح کی رسومات ہیں نہ ہماری طرح کی رشتہ داریاں ہیں۔ وہ بڑے سیدھے سادے اور بے تکلف سے مسلمان ہیں۔ رشتہ لینا دینا کوئی ایسا مسئلہ نہیں کہ کسی سے سفارش کراؤ۔ جس نے لینا ہے بے تکلف بات کرتا ہے۔ انہیں پسند ہے دے دیں گے، نہیں پسند تو نہیں دیں گے۔ کثرتِ ازواج کا معمول بھی تھا۔ اسلام سے پہلے تو دس دس کرتے تھے لیکن اسلام کے بعد چار بیویوں تک کی اجازت رہی۔ بڑی عجیب بات سمجھی جاتی تھی کہ سب سے کمزور یا سب سے گیا گزرا بندہ وہ ہے جو کسی سے رشتہ پوچھے اور اسے کوئی رشتہ بھی نہ دے۔ وہ سمجھتے تھے کہ معاشرے کا سب سے گیا گزرا انسان یہ ہے۔ عرض کی، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم! اس کی حیثیت تو یہ ہے کہ ایسا گیا گزرا ہے کہ یہ کسی سے اگر رشتہ بھی مانگے تو اسے کوئی نہیں

دے گا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا لیکن اللہ کے نزدیک اس کا مقام یہ ہے کہ اللہ کے نام پر کوئی وعدہ بھی کر دے، یہ اللہ کی قسم کھا کر کوئی بات کہہ دے تو اللہ وہ پوری کر دے گا۔

یہ ضروری نہیں کہ جو کچھ نظر آتا ہے وہی اندر بھی ہو یا جو بندہ جیسا نظر آتا ہے یا جیسا ہم سمجھتے ہیں، ویسا ہو۔ ہوسکتا ہے ہم ایک آدمی کو اچھا نہیں سمجھتے لیکن اللہ کے نزدیک وہ بہت اچھا ہو اور ہوسکتا ہے ہم ایک آدمی کو بہت پارسا سمجھتے ہوں لیکن اللہ کے نزدیک وہ پارسا نہ ہو یا مقبول نہ ہو۔ یہ ہمارا کام نہیں ہے کہ ہم دوسروں کا مقام متعین کریں کہ یہ کیسا ہے، کیسا تھا یا کیا ہے۔ ہماری حیثیت یہ ہے کہ ہمیں اپنے بارے میں جاننا ہے کہ اللہ کا حکم کیا ہے، ہم کیا سوچ رہے ہیں اور ہم کیا کر رہے ہیں۔ وہ فرماتا ہے:

وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۔۔۔۔شیطان کے نقشِ قدم پر کبھی نہ چلو۔ ہر وہ قدم جو اسلام کے باہر ہوگا وہ شیطان کے نقشِ قدم پر ہوگا۔ کوئی ایسا کام نہ کرو جو شیطان کروانا چاہتا ہے۔ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۲۰۸﴾ یہ بات یاد رکھو کہ وہ تمہارا بڑا کھلا اور واضح دشمن ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ کبھی بھی تمہارے ساتھ بھلائی نہیں کرے گا، جب بھی کرے گا تمہارے ساتھ دشمنی کرے گا، تمہارا نقصان ہی کرے گا۔

فَاِنْ زَلَلْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْكُمُ الْبَيِّنٰتُ ۔۔۔۔جب تمہارے پاس اللہ کا حبیب صلی اللہ علیہ وسلّم، اللہ کا قرآن، رسول صلی اللہ علیہ وسلّم کے معجزات اور اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کے فرامین آچکے ہیں، تو پھر تمہارے متذبذب ہونے کے کیا معنی؟ قرآن بھی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کا ایک بہت بڑا معجزہ ہے۔ اللہ سے قرآن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم نے حاصل کیا اور مخلوق تک پہنچایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی ساری حیاتِ طیبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کا معجزہ ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کا ایک ایک قول آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کا معجزہ ہے۔ جب تمہارے پاس دلائل آچکے ہیں تو اس کے بعد بھی تم لغزش کھاتے رہو اور گھاس کے تنکوں کی طرح کبھی ادھر کبھی ادھر جھولتے رہو۔ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ پھر یہ بات بھی سن لو!

ہر گناہ کچھ نہ کچھ بگاڑ پیدا کرتا ہے:

فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۰۹﴾ اللہ بڑا غالب، قوت والا، زبردست ہے اور وہ حکیم بھی ہے، دانا بھی ہے۔ یہ اس کی حکمت ہے کہ کسی کو مہلت دے دیتا ہے۔ اس پہ نازاں مت ہو کہ ہم نے تو اتنی نافرمانیاں کرلیں، ہمارا کیا بگڑا؟ بہت کچھ بگڑ چکا ہے۔ ہر گناہ کچھ نہ کچھ بگاڑ جاتا ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اللہ کی ناراضگی اور اللہ کے حبیب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی ناراضگی پیدا کرتا ہے۔ اس سے بڑا بگاڑ کیا ہوگا! کوئی ضروری تو نہیں کہ مادّی نقصان ہی ہو۔ فرمایا، جب اللہ کا حکم موجود ہو، پیدا ہونے سے لے کر مرنے تک کا ایک نظام موجود ہو، بات

کرنے کا انداز، لینے دینے کا سلیقہ، مل جل کر رہنے کا طریقہ، محبت و نفرت کے انداز، صلح اور جنگ کے انداز، زندگی کے ہر شعبے کے لیے راہنمائی موجود ہے۔ والدین، اولاد، بیویوں کے حقوق، رزق کمانے اور خرچ کرنے کے طریقے، زندگی کے ہر کام کی جب اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلّم نے وضاحت کر دی ہے تو پھر کتنی جرأت کرتا ہے وہ بندہ کہ خود کو مسلمان بھی کہلواتا ہے اور کام جب کرتا ہے تو اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلّم کی رضا کو چھوڑ کر اپنی پسند سے کرتا ہے۔ یاد رکھو! اللہ غالب ہے، تم اللہ کے دستِ قدرت سے بھاگ سکو گے نہ کوئی بات چھپا سکو گے۔ کسی بات کا پردہ رہے گا نہ کہیں چھپ سکو گے۔ اللہ کی بارگاہ میں حاضر ہونا ہے اور وہاں جواب دینا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی گواہی سے ہر کام کو جانچا جائے گا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم نے ایسا کرنے کا حکم دیا تھا، اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کا حکم نہیں ہے تو پھر شیطان کے نقش قدم پر ہو۔

اپنی اصلاح کے لیے انتظار کس بات کا!

فرمایا: هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَقُضِيَ الْاَمْرُ ۭ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ۝۲۱۰ کس بات کا انتظار کرتے رہتے ہو! جو لوگ لاپروائی کرتے ہیں، جو کہتے ہیں خیر ہے سدھر جائیں گے، کام ہو جائے گا، کر لیں گے، یہ لوگ کس بات پہ نازاں ہیں؟ کیا اس بات کا انتظار ہے کہ قیامت قائم ہو جائے، اللہ جل شانہ، خود نزول فرمائیں، اللہ کے فرشتے حاضر ہوں! وَ قُضِيَ الْاَمْرُ ۔۔۔ اور قصہ پاک کر دیا جائے، تب تم سنبھلو گے؟ فرمایا، تمہارے پاس کیا دلیل ہے کہ ابھی قیامت قائم ہو جائے، تمہارے پاس کون سی دلیل ہے کہ اتنا وقت باقی ہے! ہم روزمرہ دیکھتے ہیں کہ اچھا بھلا بندہ چلتا پھرتا مر جاتا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا: مَنْ مَّاتَ فَقَدْ قَامَتْ قِيَامَتُهٗ (الطبرانی) جو مر گیا اس کی قیامت تو آ گئی۔ اس کا تو حساب کتاب شروع ہو گیا، دنیا سے عمل کا رشتہ منقطع ہو گیا، دنیا سے رخصت ہو گیا، آخرت کا حساب کتاب شروع ہو گیا۔ موت بھی ایک طرح سے قیامت ہی کی آمد ہے اور اس کا بھی کیا بھروسہ کہ اسی لمحے ساری دنیا تباہ ہو جائے اور قیامت اور حشر بپا ہو جائے تو کون اسے روکنے والا ہے! لہٰذا انتظار مت کرو، تمہارے پاس فرصت نہیں ہے کہ کل دیکھیں گے، پرسوں دیکھ لیں گے، اس کو سیدھا کر لیں گے، اپنی اصلاح کر لیں گے۔ نہیں، جیسے ہی اللہ کا حکم پہنچے، اسی وقت قبول کرو اور اسی وقت عمل شروع کر دو کہ تمہارے پاس فرصت نہیں ہے۔ تمہیں کس بات کا انتظار ہے! تب اپنی اصلاح کرو گے جب قیامت قائم ہو جائے گی! تب اصلاح کی کوشش کرو گے جب موت آ جائے گی! اللہ کریم رحم فرمائے اور توفیق عطا فرمائے کہ ہم اس کی اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلّم کی اطاعت کر سکیں۔

آج بھی بارگاہ عالی صلی اللہ علیہ وسلّم میں حضوری ممکن ہے:

ہمارا عہد نافرمانیوں کا عہد ہے۔ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اور ہمارے درمیان صدیوں کا فاصلہ ہے اور یہ زمانے کی دوریاں رشتوں اور محبتوں میں دراڑیں ڈال دیتی ہے۔ حضرت رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اکثر اپنی تقریر میں عربی کی ایک رباعی پڑھا کرتے تھے کُنَّا کَزَوْجِ حَمَامَةَ فِي اَيْكَةٍ مُتَمَتِّعِيْنَ بِصِحَّةٍ وَشَبابٍ کہ ہم تو کبوتروں کے ایک جوڑے کی طرح اپنے گھونسلے میں، اپنے ٹھکانے پر، اپنے گھر میں، جوانی اور صحت سے متمتع ہو رہے تھے کہ دَخَلَ الزَّمَانُ بَيْنَنَا وَفَرَّقَ بَيْنَنَا اِنَّ الزَّمَانَ مُفَرِقُ الْاَحْبَابِ ہمارے درمیان زمانہ آگیا، مدتیں آگئیں اور انہوں نے ہمیں جدا کر دیا، زمانے نے ہمیں دور دور پھینک دیا۔ یقیناً زمانہ دوستوں کو دوستوں سے محروم کر دیتا ہے۔

ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہمیں ان سوا چودہ سو سال نے بارگاہ عالیٰ صلی اللہ علیہ وسلّم سے بہت دور کر دیا ہے۔ وہ رشتے جو اطاعت پہ مجبور کرتے تھے، وہ کمزور ہو گئے ہیں یا ٹوٹ گئے ہیں۔ مسلمانوں کا نام ہم رکھ لیتے ہیں، حلیہ بھی بنا لیتے ہیں، کچھ نہ کچھ اٹھک بیٹھک نمازوں کی بھی کر لیتے ہیں لیکن وہ بات کہ جو اللہ کی اطاعت میں جان دینے پہ مجبور کر دے، جان تک دی جا سکے لیکن دامنِ شریعت نہ چھوٹے، وہ بات نہیں بنتی، وہ بات نہیں بن رہی۔ وہ احساس نہیں رہا، وہ دکھ نہیں ہوتا، وہ چوٹ نہیں لگتی کہ مجھ سے اللہ کا اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلّم کا حکم کیوں چھوٹا! اللہ کریم ہے، وہ درد عطا کر دے تو اس کی عطا کو زمانے اور صدیاں کچھ نہیں کہہ سکتیں۔ زمانہ بھی اس کا، صدیاں بھی اس کی مخلوق ہیں، شب و روز بھی اس کی مخلوق ہیں، فاصلے بھی اس کی مخلوق ہیں، جب وہ چاہے تو سمٹ جاتے ہیں۔ وہ چاہے تو آج بھی حضوری عطا کر سکتا ہے۔ اس کے لیے کچھ مشکل نہیں ہے کہ صدیوں کا فاصلہ سمیٹ کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کی بارگاہ عالی میں روبرو کر دے۔ اس کے لیے کیا مشکل ہے!

مسلمانی اور اسلام یہ ہے کہ آج بھی حضوری میں زندگی بسر کرنا نصیب ہو۔ اللہ کریم ہماری خطاؤں سے درگزر فرمائے اور اپنی اور اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلّم کی اطاعت نصیب فرمائے، محبت اور وہ تعلق نصیب فرمائے جو اطاعت پہ مجبور کر دیتا ہے۔

سورۃ البقرہ رکوع 26 آیات 211 تا 216

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

سَلْ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ کَمْ اٰتَیْنٰھُمْ مِّنْ اٰیَۃٍۭ بَیِّنَۃٍ ؕ وَمَنْ یُّبَدِّلْ نِعْمَۃَ اللّٰہِ
مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْہُ فَاِنَّ اللّٰہَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ ﴿۲۱۱﴾ زُیِّنَ لِلَّذِیْنَ کَفَرُوا الْحَیٰوۃُ
الدُّنْیَا وَیَسْخَرُوْنَ مِنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ۘ وَالَّذِیْنَ اتَّقَوْا فَوْقَھُمْ یَوْمَ
الْقِیٰمَۃِ ؕ وَاللّٰہُ یَرْزُقُ مَنْ یَّشَآءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ ﴿۲۱۲﴾ کَانَ النَّاسُ اُمَّۃً
وَّاحِدَۃً ۫ فَبَعَثَ اللّٰہُ النَّبِیّٖنَ مُبَشِّرِیْنَ وَمُنْذِرِیْنَ ۪ وَاَنْزَلَ مَعَھُمُ
الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ لِیَحْکُمَ بَیْنَ النَّاسِ فِیْمَا اخْتَلَفُوْا فِیْہِ ؕ وَمَا اخْتَلَفَ فِیْہِ
اِلَّا الَّذِیْنَ اُوْتُوْہُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْھُمُ الْبَیِّنٰتُ بَغْیًۢا بَیْنَھُمْ ۚ فَھَدَی اللّٰہُ
الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِیْہِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِہٖ ؕ وَاللّٰہُ یَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ
اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ﴿۲۱۳﴾ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّۃَ وَلَمَّا یَاْتِکُمْ
مَّثَلُ الَّذِیْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِکُمْ ؕ مَسَّتْھُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا
حَتّٰی یَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَہٗ مَتٰی نَصْرُ اللّٰہِ ؕ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰہِ
قَرِیْبٌ ﴿۲۱۴﴾ یَسْـَٔلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ ؕ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَیْرٍ فَلِلْوَالِدَیْنِ
وَالْاَقْرَبِیْنَ وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ ؕ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَیْرٍ
فَاِنَّ اللّٰہَ بِہٖ عَلِیْمٌ ﴿۲۱۵﴾ کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِتَالُ وَھُوَ کُرْہٌ لَّکُمْ ۚ وَعَسٰٓی اَنْ
تَکْرَھُوْا شَیْـًٔا وَّھُوَ خَیْرٌ لَّکُمْ ۚ وَعَسٰٓی اَنْ تُحِبُّوْا شَیْـًٔا وَّھُوَ شَرٌّ لَّکُمْ ؕ
وَاللّٰہُ یَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۱۶﴾

اولاد یعقوبؑ سے پوچھیے کہ ہم نے انہیں کتنی واضح دلیلیں دیں اور جو کوئی اللہ کی نعمت کو اس کے پاس آنے کے بعد بدل دیتا ہے تو یقیناً اللہ سخت عذاب دینے والے ہیں ﴿۲۱۱﴾ دنیا کی زندگی کافروں کے لیے سجادی گئی ہے اور جو ایمان لائے ہیں وہ ان کا مذاق اڑاتے ہیں اور جو لوگ پرہیز گار ہیں وہ قیامت کے روز ان سے بہت بلند ہوں گے اور اللہ جسے چاہتے ہیں بے شمار رزق عطا کرتے ہیں ﴿۲۱۲﴾ لوگ ایک ہی (طرح کی) جماعت تھے پھر اللہ نے انبیاءؑ کو بھیجا جو بشارت دیتے اور (انجام بد سے) ڈراتے تھے اور ان کے ساتھ حق کے ساتھ کتاب نازل فرمائی تا کہ لوگوں میں جو اختلافات ہیں ان کا فیصلہ کریں اور جن کو دلائل دیے گئے تھے انہی لوگوں نے آپس میں سرکشی کرتے ہوئے اختلاف کیا پس اللہ نے اپنے حکم سے ایمان والوں کو حق کی راہ دکھائی جس میں وہ اختلاف رکھتے تھے اور اللہ جس کی چاہیں سیدھی راہ کی طرف راہنمائی فرما دیں ﴿۲۱۳﴾ کیا تم سمجھتے ہو کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ تم کو ان لوگوں کے سے احوال پیش نہیں آئے جو تم سے پہلے ہو گزرے ہیں ان پر تنگی آئی اور بیماری اور وہ ہلا کر رکھ دیے گئے یہاں تک کہ پیغمبر اور ان کے ساتھ ایمان والوں نے کہا اللہ کی مدد کب آئے گی خوب سن لو یقیناً اللہ کی مدد قریب ہے ﴿۲۱۴﴾ آپ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں فرما دیجیے جو کچھ مال تم خرچ کرو تو وہ ماں باپ اور قریبی رشتہ داروں اور یتیموں اور محتاجوں اور مسافروں کے لیے ہے اور جو بھلائی تم کرتے ہو تو یقیناً اللہ اسے خوب جانتے ہیں ﴿۲۱۵﴾ تم پر جہاد (لڑنا) فرض کیا گیا اور وہ طبعاً) تم پر گراں گزرتا ہے اور ہو سکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں ناپسند ہو اور وہ تمہارے لیے بہتر ہو اور ہو سکتا ہے کہ تم ایک چیز کو اچھا سمجھو اور وہ تمہارے لیے بُری ہو۔ اور اللہ جانتے ہیں اور تم نہیں جانتے ہو ﴿۲۱۶﴾

تفسیر و معارف

بعثت آقائے نامدار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے وقت مذہب کے متعلق اگر کچھ علوم تھے تو وہ بنی اسرائیل کے پاس تھے۔ ان میں سے کچھ عیسائیت اختیار کر چکے تھے، کچھ اپنی یہودیت پہ قائم تھے اور یہی لوگ مشرکین کو بھی مختلف اعتراض اور مختلف سوال سکھایا کرتے تھے جو وہ بارگاہ رسالت رسول صلی اللہ علیہ وسلّم میں پیش کرتے۔ ارشاد ہوا: سَلْ بَنِيٓ اِسْرَآءِيْلَ ۔۔۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم بنی اسرائیل کے علماء یہود و نصاریٰ سے یہ پوچھیے كَمْ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ اٰيَةٍۭ بَيِّنَةٍ ۔۔۔ کہ اس قوم کے پاس کتنی واضح دلیلیں اللہ کی طرف سے آ چکیں، ان میں پے بہ پے نبی علیہ السلام اور رسول مبعوث ہوئے، اللہ نے انہیں اس عظمت سے نوازا، واضح دلائل اور کتابیں نازل ہوئیں لیکن ان کا کردار کیا تھا؟

دین اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے:

وَمَنْ يُّبَدِّلْ نِعْمَةَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۲۱۱﴾ انہوں نے اللہ کی نعمتوں کو بدل دیا۔ احکام الٰہی اور وہ دین جو انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام لائے، وہ اللہ کی نعمت تھی، اللہ کا انعام تھا اور دو عالم کی آسائش کا ذریعہ تھا لیکن انہوں نے اس کو بدل دیا۔ یہاں سمجھنے کی بات یہ ہے کہ جب کوئی شخص شریعت کے خلاف چلتا ہے تو وہ اللہ کی نعمتوں کو بدل دینے والا ہوتا ہے۔ اور ایسے لوگوں کے لیے اللہ کی گرفت بہت سخت ہے۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کی ہر ادا نعمت ہے۔ شریعت کا حکم انسان کی ضرورت ہے کہ اس دنیا میں بھی اسے جینا ہے۔ وہ محتاج ہے، اس کی بے شمار احتیاجات اور ضرورتیں ہیں، اسے سانس لینا ہے، اسے غذا چاہیے، اسے دوا چاہیے، اسے ہوا چاہیے، اسے پانی چاہیے، اسے زندگی کی ساری ضرورتیں چاہئیں۔ گھر چاہیے، اولاد چاہیے، رشتہ دار چاہئیں، ایک انسانی معاشرہ چاہیے جس میں وہ مل جل کر جی سکے۔ اس کی ضرورتوں کی یہ اتنی لمبی فہرست ہے کہ وہ خود بھی ساری یکجا نہیں کر سکتا۔ اب ان سب ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے اگر وہ بے مہابا اور شتر بے مہار کی طرح منہ اٹھا کر بھاگنے لگے گا تو پتہ نہیں کیا کیا کرے گا۔

صرف ایک فرد کی ضرورتیں نہیں ہیں، یہ ضرورتیں ہر اس فرد کے ساتھ ہیں جو اللہ کی زمین پر سانس لے رہا ہے اور ساری اللہ کی مخلوق ہے۔ یہ حق اللہ ہی کو حاصل ہے کہ وہ اپنی مخلوق کے درمیان ایسا متوازن راستہ پیدا فرما دے کہ سب کی ضرورتیں پوری ہوں اور کسی ایک کی ضرورت پوری کرنے کے لیے دوسرے کی ضرورت مجروح نہ

ہو۔ یہ حق اس کا ہے جس کی مخلوق ہے اور جس نے ضرورتیں بنائی ہیں۔ یہ حق اس کا ہے جو ضرورتیں پوری فرماتا ہے۔ یہ حق اسی کا ہے جو ہر ایک کی آرزو، تمنا اور خواہش کو جانتا ہے۔ اسی کو یہ حق حاصل ہے جس کا علم اتنا وسیع ہے کہ جس کی کوئی حد نہیں ہے، جو ہر بات سے آن آگاہ ہے، ہر آن جانتا ہے۔ ہر فرد کے لیے ایک ایسا خوبصورت راستہ وہی متعین کرسکتا ہے کہ جس میں ہر فرد کی ضرورتیں بغیر دوسروں کی ضرورتوں کو مجروح کیے ہوئے پوری ہوں، اور وہ راستہ اللہ کا دین ہے، اللہ کی شریعت ہے۔ جہاں سے بھی، کوئی بھی ہم میں سے شریعتِ مطہرہ کو چھوڑتا ہے اور سمجھتا ہے کہ میں اپنی ضرورت پوری کر رہا ہوں تو اس کی اپنی ضرورت تو پوری ہوتی ہے لیکن یہ الگ بات ہے کہ وہ دوسرے بہت سے انسانوں کی ضرورتیں مجروح کر دیتا ہے، دوسرے بہت سے انسانوں کے حقوق پامال کر دیتا ہے، جس کی جوابدہی اللہ کی گرفت کی صورت میں ہوگی۔

بنی اسرائیل نے بھی جب یہ وطیرہ اپنایا کہ دین تو ٹھیک ہے، چلو عبادت دین کے مطابق کرلیں گے لیکن باقی کام ہم اپنی مرضی سے کریں گے تو فرمایا، یہ وہ لوگ ہیں کہ جن میں پے در پے رسول اور نبی علیہ السلام آئے، ان پر کتابیں نازل ہوئیں، اللہ نے انہیں واضح دلائل عطا فرمائے لیکن ان کا طریقہ کیا تھا کہ انہوں نے اللہ کی نعمتوں کو بدل دیا۔ وَمَنْ يُّبَدِّلْ نِعْمَةَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُ ۔۔۔ ایسا شخص جو اللہ کی نعمت کو، جب اس کے پاس پہنچے تو وہ اسے بدل دے تو اسے پھر یہ بھی یاد رکھنا چاہیے۔ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۲۱۱﴾ کہ اللہ کے عذاب بھی بڑے سخت ہوتے ہیں۔ اسے یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اللہ کی گرفت بہت سخت ہے۔

آج کی بات اگر دیکھی جائے، عامۃ المسلمین کی ایک عمومی بات کر رہا ہوں، غیر مسلم کی نہیں۔ عام مسلمان یہ سمجھتا ہے کہ یہ شریعت شاید مجھ پر کوئی بیگار لگا دی گئی ہے۔ پانچ وقت کی نمازوں کا ایک بوجھ ہے، رمضان کا ایک بوجھ ہے، زکوٰۃ دینے کے لیے ایک مصیبت کھڑی ہے اور قدم قدم پر احکامِ شریعت ہیں کہ بات کرو تو شریعت کو مدنظر رکھو، کوئی کام کرو تو شریعت کی قید لگا دی گئی ہے۔ بات ایسی نہیں ہے، شریعت کوئی قید نہیں ہے بلکہ شریعت اللہ کی عطا ہے، اللہ کا انعام ہے۔ دنیا ایک وسیع جنگل ہے اور ایک ایسا عجیب جنگل ہے کہ جس میں بے شمار نعمتیں بھی ہیں، بے شمار لذیذ اور صحت بخش پھل بھی ہیں لیکن اس کے ساتھ اس سے زیادہ خوبصورت زہریلے پھل بھی ہیں۔ ایسے جانور ہیں جنہیں دیکھ کر جی خوش ہوتا ہے لیکن ان میں ایسے خونخوار بھی ہیں جو چیر پھاڑ کر رکھ دیتے ہیں۔ اب اگر اس بے پناہ وسیع جنگل میں کوئی کسی کا ہاتھ پکڑ لے، اسے ہر کانٹے سے بچائے، ہر موذی جانور سے بچائے، ہر تکلیف سے بچا کر اسے یہ جنگل عبور کرا دے تو یہ اس پر بیگار ہے یا اس کے لیے راحت ہے اور نعمت ہے؟ اس خاردار جہان میں شریعتِ مطہرہ وہ راہنما ہے جو ہر خار سے دامن کو بچا کر انسان کو سلامت نکال کر لے جاتی ہے۔ شریعت کا کوئی حکم بیگار نہیں ہے۔ بیگار وہ

چیز ہوتی ہے جو بیگار لینے والے کو فائدہ دے اور بیگار کرنے والے پر مصیبت بنے۔ شریعت کے کسی حکم میں اللہ کریم کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اللہ مجبور نہیں ہے کہ اگر ہم یہ نہیں کریں گے تو اللہ کا نقصان ہو جائے گا۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے شریعت ہمارے لیے اس کی طرف سے انعام ہے۔ اس نے اس وسیع خارزار میں ایک ایک ذرے کے بارے میں بتادیا کہ یہاں پاؤں رکھو تو جم کر رہے گا، وہاں رکھو تو دلدل ہے، دھنس جاؤ گے۔ یہ پھل کھاؤ یہ تمہارے لیے صحت افزا ہے، وہ کھاؤ گے تو وہ زہریلا ہے مر جاؤ گے۔ یہاں سے گزرو گے تو کوئی جھاڑی تمہارے دامن میں نہیں الجھے گی، وہاں سے گزرو گے تو بیسیوں کانٹے دامن میں الجھ جائیں گے۔

کفرانِ نعمت پر عذاب کا آخری درجہ، احساسِ گناہ کا مٹ جانا:

بات بنی اسرائیل کے حوالے سے ہو رہی ہے، فرمایا، ان سے پوچھئے کہ اللہ نے ان پر کتنے انعام کیے، انہیں مسلسل ہدایت سے نوازا، انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام مبعوث فرمائے، رسول بھیجے، کتابیں بھیجیں لیکن یہ ایسے ناشکرے تھے کہ انہوں نے اسے بوجھ سمجھا۔ انہوں نے سمجھا کہ اس بوجھ کو اتار پھینکو، ہم موج کریں گے لیکن وہ اللہ کی نعمت تھی، جب اسے پھینک کر دوسری طرف گئے تو اس طرف عذاب تھا۔ یہ بات بھی یاد رکھو کہ اللہ کا عذاب مذاق نہیں ہے، اس کے عذاب بڑے سخت ہیں۔ وہ بڑا کریم ہے، بڑا رحیم ہے، اس کی نعمتیں بے پناہ و بے شمار ہیں لیکن اس کے عذاب بھی بہت سخت ہیں۔ اس کی طرف سے ایک بہت بڑی سزا، ایک بہت بڑا اور عجیب وغریب عذاب ایسا ہے جو محسوس ہی نہیں ہوتا۔ یہ بالکل ایسا ہے جیسے کسی کو کینسر ہو جائے۔ وہ اسے اندر ہی اندر کھا رہا ہے اور وہ خوش رہے لیکن عین اس لمحے اسے ڈاکٹر بتادے کہ اب سوائے موت کے تمہارے پاس کوئی راستہ نہیں ہے، اب تم سارے علاجوں سے گزر چکے ہو، تمہیں مرنا ہے، ایک دن میں مرتے ہو یا دو دنوں میں مرتے ہو۔ ان کا بالکل یہی حال ہوتا ہے۔

فرمایا: زُيِّنَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ۔۔۔ ایک عذاب کی نوعیت یہ ہے کہ جب کوئی میرے احکام کو چھوڑ دیتا ہے، میری شریعت کو چھوڑ دیتا ہے، میرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نقوشِ کفِ پا سے ہٹ جاتا ہے تو میں خارزارِ کفر کو اس کی نگاہوں میں خوبصورت بنا دیتا ہوں اور یہ سب سے دردناک سزا ہے۔ گناہ کی تکلیف سے بندہ کبھی تو اس سے توبہ بھی کر سکتا ہے۔ گناہ کر کے دل میں حقارت آئے، نفرت آئے، گناہ کر کے دکھ ہو کہ میں نے نافرمانی کی ہے تو توبہ کا سبب بنتی ہے لیکن اگر گناہ کر کے مسرت ملنی شروع ہو جائے! اطباء کہتے ہیں کہ کوئی شخص زہر کھالے اور اگر اسے قے شروع ہو جائے، پیچش شروع ہو جائیں، اسے Diarrhea ہو جائے تو بظاہر وہ بیمار ہو جاتا ہے لیکن اس کی زندگی بچ جاتی ہے، وہ مرنے سے بچ جاتا ہے۔ اگر زہر کھائے اور

اسے کوئی تکلیف نہ ہو، ہضم ہو جائے تو وہ مرے گا، بچ نہیں سکتا۔ یہی بات یہاں اللہ کریم نے فرمائی کہ جب کوئی میرے احکام کو ٹھکرا دیتا ہے تو میں اسے یہ سزا دیتا ہوں کہ وہ گناہوں پہ خوش ہوتا ہے۔

زُیِّنَ لِلَّذِیْنَ كَفَرُوا الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا ۔۔۔ انہیں دنیا کی زندگی اتنا مسحور کر لیتی ہے کہ وَ یَسْخَرُوْنَ مِنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ۔۔۔ پھر وہ میرے اطاعت گزار بندوں کا مذاق اڑاتے ہیں، پھر وہ تمسخر کرتے ہیں، کبھی نمازیوں کے نام طنزاً رکھتے ہیں، کبھی داڑھی رکھنے والوں کا کوئی کارٹون بناتے ہیں، کبھی سجدہ کرنے والوں سے مذاق کرتے ہیں، کبھی عبادت کرنے والوں پر فقرے کستے ہیں۔ نافرمانی میں انہیں اتنی ڈھیل مل رہی ہوتی ہے کہ وہ غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور اپنے آپ کو اتنا بڑا سمجھ لیتے ہیں کہ پھر اللہ کی اطاعت کرنے والوں کو جاہل کہتے ہیں، کبھی کوئی نام دیتے ہیں، کبھی بے وقوف بتاتے ہیں تو یہ بھی عذاب کی ایک بدترین صورت ہے، بڑا سخت عذاب ہے کہ کسی کو احساسِ گناہ ہی نہ رہے اور وہ کفر کی زندگی میں خوش ہو جائے کہ میں شاید بڑی کامیاب زندگی بسر کر رہا ہوں۔ میں نے اتنی دولت جمع کر لی، میں نے اتنا پیسہ لوٹ لیا، مجھے اقتدار بھی مل گیا۔

زُیِّنَ لِلَّذِیْنَ كَفَرُوا الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا وَیَسْخَرُوْنَ مِنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وہ اپنی اس کافرانہ روش پر اتنے خوش ہو جاتے ہیں کہ ایمان والوں کا تمسخر اڑاتے ہیں لیکن یہ بات یاد رکھو! یہ طے شدہ بات ہے وَالَّذِیْنَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ۔۔۔ جب قیامت قائم ہوگی تو انہیں پتہ چلے گا کہ یہ اطاعت گزار بہت بلند مدارج پہ چلے گئے۔

اخروی کامیابی ہی اصل کامیابی ہے:

اللہ کی اطاعت کی عظمت کا اندازہ میدانِ حشر میں ہوگا اگرچہ اس دنیا میں بھی اس کی لذّات ہر لمحہ پہنچتی ہیں۔ یہاں بھی سکون اسی کو میسر ہے جو اللہ کی اطاعت کرتا ہے، عزت اسی کو میسر ہے جو اللہ کی اطاعت کرتا ہے، محبت اسی کو نصیب ہوتی ہے جو اللہ کی اطاعت کرتا ہے، کسی نافرمان کو بہترین کھانا کھا کر بھی وہ سکون نہیں ملتا جو ایک اطاعت گزار کو روکھا سوکھا کھانے سے ملتا ہے۔ اللہ کا اطاعت گزار بندہ پتھروں پہ سو کر وہ خوبصورت اور پیاری نیند حاصل کر لیتا ہے جو نافرمان اعلیٰ بستروں پر اور اعلیٰ محلوں میں سو کر حاصل نہیں کر سکتا۔ اس سب کے باوجود اصل حقیقت تو قیامت کو سامنے آئے گی کہ آج جنہیں تم پاؤں کی ٹھوکروں پہ رکھتے ہو، تم ان کے پاؤں چھونے کو ترسو گے لیکن وہاں وہ تمہاری رسائی سے بہت بلند ہوں گے۔

وَالَّذِیْنَ اتَّقَوْا ۔۔۔ جو اللہ سے رشتہ استوار رکھتے ہیں، جو اللہ سے محبت کرتے ہیں، جو اللہ کی اطاعت

کرتے ہیں، جو اللہ جل شانہ، کی رضا کے لیے زندگی بسر کرتے ہیں، میدانِ حشر میں وہ بڑے بڑے شہنشاہوں سے جو اللہ کے نافرمان ہیں، بہت بلند مرتبے پہ ہوں گے۔

فراوانیء رزق کامیابی کی دلیل نہیں:

وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۲۱۲﴾ اور اللہ جسے چاہتے ہیں بے شمار رزق دیتے ہیں۔ اللہ نافرمان لوگوں کو بھی بے شمار رزق دیتے ہیں۔ لوگوں کے ذہنوں میں سوال اٹھتا ہے کہ اللہ کریم نافرمانوں کو اتنا کیوں دیتے ہیں؟ تو جواب دیا جا رہا ہے کہ یہ اللہ کی مرضی ہے وہ جسے چاہے، جتنا چاہے عطا کر دیتا ہے۔ اگر کوئی نافرمانی کرے اور اس پر وہ اسے اقتدار بھی دے، روزی بھی دے، دولت بھی دے تو اس کا مطلب ہے کہ اس کے لیے اس نے دنیا کا دروازہ کھول دیا کہ اگر بھاگنا چاہتا ہے تو بھاگ کر دیکھ لے، کہاں تک جاتا ہے لیکن آخر تو نے پلٹ کر میری ہی بارگاہ میں آنا ہے۔ تو دنیا کی جتنی نعمتیں بھی ہیں، یہ تب ہی خوش گوار ہیں کہ اللہ کی اطاعت کے ساتھ ہوں۔ دنیا کا رزق بھی، صحت بھی، رزق اس کا ہے، علم اس کا رزق ہے، حکومت و اقتدار اس کا رزق ہے، دولت اس کا رزق ہے، اولاد اس کا رزق ہے، اللہ کی عطا ہے لیکن یہ عطا بھی تب ہی مزا دیتی ہے جب اس کی اطاعت کے ساتھ ہو۔ اگر نافرمانی پر بھی یہ چیزیں مل رہی ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ بندہ مارا گیا، اس کی باگ ڈھیلی چھوڑ دی گئی۔ وہ اس نافرمانی میں آگے بھاگتا ہی چلا جائے گا کہ شاید میں صحیح راستے پر ہوں لیکن جب موت آئے گی، جب ظاہر کی آنکھ بند ہو گی تو باطن کی آنکھ کھلے گی۔ اُس وقت پتہ چلے گا کہ میں کتنی غلط سمت میں نکل گیا۔ اللہ بادشاہ ہے۔ وہ جسے چاہتا ہے، جو چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔ میدانِ حشر میں اپنے اطاعت گزار بندوں کو جو عطا کرے گا وہ انسانی دماغ نہیں سوچ سکتا کہ انہیں کیا کیا نعمتیں دے گا اور کس عظمت پہ، کن بلندیوں پہ، کہاں لے جائے گا۔

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۔۔۔۔۔ جب زمین پہ پہنچے تو سارے لوگ ایک ہی طرح کے تھے۔ ازل میں جب ارواح سے سوال ہوا اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۔۔۔۔۔ کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں؟ تو سب نے کہا قَالُوْا بَلٰى ۔۔۔۔۔ (المومن: 50) بے شک تو ہی ہمارا ربّ ہے۔ فرمایا، پھر اس بات پہ قائم رہنا، دنیا میں جا کے بھول نہ جانا۔ لیکن جب دنیا میں آئے تو سارے بھول بھلیوں میں پڑ گئے۔ كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۔۔۔۔ لوگ سارے ہی ایک جیسے ہو گئے، جو جس سے بن پڑتا وہ کر لیتا۔ پھر میں نے ان پر رحم فرمایا، میں نے انہیں چھوڑ نہیں دیا کہ جو کرتے ہو کرتے رہو، آخر میرے پاس آنا ہے، سب کو سزا ملے گی۔ ایسا نہیں ہے، میں نے ان پر کرم کیا۔ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۔۔۔۔ اللہ نے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام مبعوث فرمائے جنہوں نے

بھلائی، برائی اور اس کے نتائج سے بھی آگاہ کر دیا۔ بشارت بھی دی، خطرے کی خبر بھی دی اور نیکی اور بدی کو الگ الگ کر دیا۔ نیکی کے بہتر نتائج کی خوشخبری بھی سنائی، اور اگر کوئی برائی کرتا ہے تو اس کے جو بھیانک نتائج ہوں گے اس سے بروقت مطلع بھی فرمایا۔

انذار اور ڈرانے میں فرق:

یہاں انذار کا ترجمہ ڈر کر دیا جاتا ہے، ڈرانے والا، یہ انبیاء علیہم السلام کا ڈرانا ہے۔ ڈر کی مختلف قسمیں ہوتی ہیں جیسے کوئی درندہ آ گیا تو ہم ڈر جاتے ہیں، سانپ دیکھا تو ڈر جاتے ہیں، چور اور ڈاکو آ گیا تو ڈر جاتے ہیں، بیماری کا خطرہ محسوس ہوا تو ڈر جاتے ہیں۔ یہ سارے ڈر وہ نہیں ہیں جس کے لیے انبیاء علیہم السلام مبعوث ہوتے ہیں۔ انبیاء علیہم السلام جس بات سے ڈراتے ہیں، اردو ادب کے پاس اس 'انذار' کا متبادل کوئی لفظ نہیں ہے۔ انذار کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آپ جو کچھ کر رہے ہیں، اگر اس کا کوئی غلط نتیجہ نکلنے والا ہے تو کوئی بروقت آپ کو بتا دے۔ جیسے ڈاکٹر آپ کو بتاتا ہے کہ بھئی آپ نے یہ چیزیں نہیں کھانی، آپ چینی نہیں کھائیے گا، سارا جہان کھائے مگر آپ نہ کھائیں، کھائیں گے تو مر جائیں گے۔ یہ انذار ہے کہ اس چیز کے کھانے سے آپ کے خلاف جو نتیجہ نکلے گا، اس سے آپ کو بروقت مطلع کیا جا رہا ہے۔ طبیب منع کرتا ہے کہ اب یہ چیز کھائیں گے تو آپ کی بینائی جاتی رہے گی، دماغ خراب ہو جائے گا یا زبان میں لڑکھڑاہٹ آ جائے گی تو یہ انذار، یہ ڈرانا اس طرح نہیں ہوتا جس طرح عام ڈر ہوتا ہے۔ اس ڈر سے یہ مراد ہے کہ انبیاء علیہم السلام نے انہیں اس دنیا میں، جب ان کے پاس عمل کرنے کا موقع تھا، بھلائی کے اچھے انجام اور برائی کے بعد جو مصیبتیں اور عذاب آتے ہیں ان سے بروقت مطلع کر دیا۔

فرمایا، میں نے ان پر اتنا احسان کیا کہ کسی عام آدمی کو پیغام دے کر نہیں بھیجا، انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو مبعوث فرمایا جو اطاعت اور عمل کا پیکر ہوتے ہیں۔ جن سے خطا کا تصور بھی نہیں ہے۔ دوسروں لوگوں کی طرح انہیں گرمی بھی لگتی تھی، سردی بھی لگتی تھی، بھوک بھی لگتی تھی، پیاس بھی لگتی تھی، ساری انسانی خصوصیات ہوتی تھیں۔ ان کے عزیز و اقارب بھی ہوتے تھے، بہن بھائی بھی ہوتے تھے، رشتہ دار بھی ہوتے تھے اور وہ ساری مجبوریاں جو اُن لوگوں نے اپنے گناہوں کے جواز کا سبب بنا رکھی تھیں، ہر نبی علیہ السلام اور ہر رسول علیہ السلام کے ساتھ بھی ہوتی تھیں۔ ان ساری مجبوریوں میں رہتے ہوئے وہ شریعتِ مطہرہ کا خوبصورت راستہ متعین فرماتے تھے۔ میرا یہ کتنا بڑا احسان ہے کہ انبیاء کے ذریعے دکھا دیا کہ ہر آن ہر آدمی اس طرح زندگی گزار سکتا ہے۔ اسی لیے شریعت کا اتباع بادشاہ سے لے کر فقیر تک سب پر ضروری ہے کہ ہر کوئی اس طرح سے زندگی گزار سکتا ہے۔

اختلافات کا حل:

وَ اَنۡزَلَ مَعَهُمُ الۡكِتٰبَ بِالۡحَقِّ ۔۔۔۔ پھر میں نے ان کے ساتھ حق پر مبنی اپنی کتابیں نازل فرمائیں لِيَحۡكُمَ بَيۡنَ النَّاسِ فِيۡمَا اخۡتَلَفُوۡا فِيۡهِ ۔۔۔۔ کہ لوگوں کو جن باتوں میں اختلافات ہیں، ہم ان کی راہنمائی فرمائیں اور حق کا فیصلہ دیں۔ لوگوں کی مصیبت کیا ہوتی ہے؟ اس مصیبت میں آج کا انسان اور آج کی عالمِ انسانیت بری طرح پھنسی ہوئی ہے۔ ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ جو میں سوچتا ہوں وہی دوسرے کو بھی سوچنا چاہیے، جو میں کرتا ہوں دوسروں کو بھی کرنا چاہیے۔ اقوام پہ جائیں تو ہر قوم یہ سوچتی ہے کہ جو ہم کر رہے ہیں دوسروں کو بھی وہی کرنا چاہیے۔ ممالک پہ جائیں تو ہر ملک یہ چاہتا ہے کہ جو میں سوچتا ہوں سب کو وہی کرنا چاہیے۔ یہ درست نہیں ہے۔ سارے افراد ایک جیسے نہیں؟ اقوام بھی، ممالک بھی ایک جیسے نہیں؟ اب یہ ضروری نہیں کہ جو امریکہ چاہے ساری دنیا وہی کرے۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ جو میں چاہتا ہوں آپ بھی وہی کریں۔ آپ کے پاس اپنا اختیار ہے، میرے پاس اپنا ہے۔ آپ کو اچھا لگے تو آپ ضرور کریں اور اپنی پسند سے کریں۔ اللہ کریم فرماتے ہیں، میں نے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو کتابیں اس لیے عطا فرمائیں کہ فیصلہ لوگوں کی پسند و ناپسند پر نہ ہو بلکہ فیصلہ حق پر ہو۔ وَ اَنۡزَلَ مَعَهُمُ الۡكِتٰبَ بِالۡحَقِّ لِيَحۡكُمَ بَيۡنَ النَّاسِ فِيۡمَا اخۡتَلَفُوۡا فِيۡهِ ۔۔۔۔ کہ لوگوں میں اختلافات کا فیصلہ کتاب کے مطابق ہو جو حق ہے۔ وہ قادر ہے۔ اسے یہ کہنا زیب دیتا تھا کہ جو میں کہتا ہوں، وہ مانو۔ یہ اسے سجتا ہے، یہ اس کو سزاوار ہے اس لیے کہ وہ مالک ہے، وہ ہم سب کا بنانے والا ہے، پالنے والا ہے لیکن اس نے یہ نہیں فرمایا۔ اس نے فرمایا کہ جو حق ہے اس کے مطابق فیصلہ ہو۔ ظاہر ہے حق بھی متعین کرنا اس کی شان ہے اور اسی کو سزاوار ہے اور لوگوں میں جو اختلافات پیدا ہوتے ہیں وہ ان کی اپنی رائے سے ہوتے ہیں۔ ہر کوئی اپنی رائے منوانا چاہتا ہے۔

ہم اپنے ملک کی بات کرتے ہیں۔ مُحرّم الحرام ایک مقدس مہینہ ہے، متبرک مہینہ ہے، عبادت کا مہینہ ہے، محترم مہینہ ہے، اور اسلامی سال کا پہلا مہینہ ہے۔ اس کے آنے سے دس دن پہلے تیاریاں شروع ہو جاتی ہیں۔ پولیس کی Meetings ہو رہی ہیں، ڈسٹرکٹ ایڈمنسٹریشن کی Meetings ہو رہی ہیں حتیٰ کہ اعلیٰ ایوانوں تک ایک شور بپا ہے۔ کیوں؟ جھگڑے ہوں گے، لڑائی ہوگی، فساد ہوں گے، پولیس کہاں کہاں کنٹرول کرے گی، پولیس سے کام بڑھ جائے گا تو فوج آئے گی۔ بھئی! آخر جھگڑا کس بات کا ہے، جھگڑے کیوں ہوں گے؟ جھگڑے اس لیے ہوں گے کہ ہم اپنے اپنے انداز میں مُحرّم کی تقریبات منعقد کرتے ہیں۔ ہر بندہ یہ چاہتا ہے کہ جیسی میں کر رہا ہوں دوسرا بھی

ویسی ہی کرے ورنہ میں اس کا سر پھوڑ دوں گا۔ کمال ہے! دوسرا آپ جیسی کیوں کرے؟ ہوسکتا ہے جسے آپ صحیح سمجھتے ہیں وہ اسے غلط سمجھتا ہو، کسی اور انداز کو صحیح سمجھتا ہو۔

حق بات تو یہ ہے کہ ہم سب کو قرآن سے، حدیث سے، سنّت سے تلاش کرنا چاہیے کہ مُحرم کیسے بسر کیا جائے۔ جھگڑا تب ختم ہوگا لیکن اس طرف آنے کو تو کوئی بھی تیار نہیں۔ اگر اس طرف آنے کو تیار نہیں تو پھر اپنے اپنے طریقے سے کرتے رہو، لیکن اتنا ظلم کیوں کرتے ہو کہ جو میں کرتا ہوں دوسرا بھی وہی کرے ورنہ میں اسے گولی ماردوں گا۔ اب اس گولی کو روکنے کے لیے پورے ملک کو مصیبت پڑی ہوئی ہے۔ کہیں فوج بھاگ رہی ہے، کہیں پولیس بھاگ رہی ہے، کہیں علماء کو بلایا جارہا ہے۔

بنیادی وجہ اختلاف:

ظاہر ہے انسانوں کی آراء مختلف ہوتی ہیں اور جب ہر کوئی اپنی بات دوسرے پہ مسلط کرنا چاہتا ہے تو جنگ ہوتی ہے۔ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کتابیں لے کر مبعوث ہوئے جن کے تحت اختلافات کا فیصلہ حق کے مطابق ہوا۔ یہ اختلافات ہیں کیا اور کن لوگوں نے اختلافات پیدا کیے؟ اللہ کریم فرماتے ہیں: وَمَا اخْتَلَفَ فِيهِ إِلَّا الَّذِينَ أُوتُوهُ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمُ الْبَيِّنَاتُ۔۔۔ اور یہ عجیب بات ہے کہ اختلاف ان لوگوں نے پیدا کیے، جن کے پاس اللہ نے نبیؑ بھیجے، کتاب بھیجی۔ آخر انہوں نے اختلاف کیوں کیے؟ بَغْيًا بَيْنَهُمْ بغاوت کر کے، ایک دوسرے کے ساتھ جھگڑا کر کے اللہ سے بغاوت کرتے ہیں، اللہ کی کتاب سے بغاوت کرتے ہیں، اللہ کے دین سے بغاوت کرتے ہیں اور اپنی بات منوانے کے لیے، اپنا نام بلند کرنے کے لیے جھگڑا کرتے ہیں۔

ہدایت کے لیے انابت ضروری ہے:

فَهَدَى اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا لِمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ مِنَ الْحَقِّ بِإِذْنِهِ۔۔۔ لیکن جن لوگوں نے اللہ کی بات مانی، اللہ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات مانی، اللہ نے انہیں ہدایت دے دی۔ اللہ نے یہ ہدایت انسان کی پسند پہ چھوڑ دی اور اسے اختیار دیا إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِرًا وَإِمَّا كَفُورًا (الدھر:3) تم اپنے دل میں یہ طے کرلو کہ تمہیں میرا اطاعت گزار اور شکر گزار بندہ بننا ہے یا تمہیں میرا ناشکرا اور نافرمان بننا ہے۔ اور اگر بندہ اپنے دل میں یہ فیصلہ کرتا ہے کہ مجھے اللہ کی اطاعت کرنی ہے تو اللہ اس کے لیے اطاعت کے راستے آسان کردیتا ہے۔

وَيَهْدِي إِلَيْهِ مَنْ يُنِيبُ (الشوریٰ:13) جس کے دل میں انابت پیدا ہوتی ہے، ہدایت کی طلب آتی ہے اسے ہدایت عطا کردیتا ہے اور جس کے دل میں انا رہ جاتی ہے اور اپنی پسند کرنے کی بات رہتی ہے، وہ ہمیشہ بھٹکتا

رہتا ہے لہٰذا یہ فیصلہ انسان کی تمنا پہ کیا جاتا ہے کہ جب وہ ہدایت کی تمنا کرتا ہے تو اللہ کریم اس کے لیے ہدایت کے راستے کھول دیتا ہے اور اسے ایسے لوگوں کے پاس پہنچا دیتے ہیں، ایسے ماحول میں پہنچا دیتے ہیں اور ایسی آسانیاں فراہم کر دی جاتی ہیں کہ اسے صحیح راستے کی خبر بھی ہو جاتی ہے اور اس پر چلنا بھی آسان ہو جاتا ہے۔ جو اللہ کا شکر گزار بندہ نہیں بننا چاہتا، اس پر ایسا عذاب پڑتا ہے کہ اسے گمراہی میں ہی لذت آنے لگتی ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ میں بڑی ہستی ہوں، تا آنکہ موت آتی ہے تو سارا پردہ اتر جاتا ہے، تب سمجھ آتی ہے کہ میں نے بہت زیادتی کی لیکن اُس وقت واپسی کا کوئی راستہ نہیں ہوتا۔

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (العنکبوت:6) ارشاد فرمایا کہ جو میرے لیے محنت اور مجاہدہ کرتا ہے جَاهَدُوْا فِيْنَا مجھے پانے کے لیے، میری رضا کے لیے، مجھے راضی رکھنے کے لیے، مجھے خوش کرنے کے لیے اپنا حقِ بندگی ادا کرنے کے لیے جو کوشش کرتا ہے میں اسے کئی راستے عطا کر دیتا ہوں۔ مفسرین کرام اس آیت کے تحت لکھتے ہیں کہ جس بندے کے دل میں ہدایت کی طلب پیدا ہو جاتی ہے، اللہ اسے ایسے بندوں سے ملا دیتے ہیں جو ہدایت یافتہ ہوتے ہیں، اسے بھی ہدایت نصیب ہو جاتی ہے۔ وہ اسے پوری زندگی کا طرزِ عمل سکھا دیتے ہیں، ان کی صحبت سے اس کا دل بدل جاتا ہے، اس پر اطاعت آسان ہو جاتی ہے لیکن اگر کوئی دل سے نہیں چاہتا تو یہ دل کا معاملہ بھی عجیب ہے کہ آپ نیک لوگوں کے ساتھ زندگی بسر کرتے رہیں لیکن کسی وقت دل میں میل آ جائے تو معاملہ الٹ جاتا ہے۔

یہ زندگی کا معاملہ ہے، زندگی بھر کا سودا ہے اور ہر آدمی کو یہ دیکھنا چاہیے کہ میرا تعلق کن لوگوں سے ہے۔ یہاں بھی ہم خانہ پری کر لیتے ہیں کہ میں فلاں پیر صاحب کے پاس بیعت ہوں۔ دیکھنا یہ چاہیے کہ جسے میں نیک سمجھ رہا ہوں، اس کے ساتھ مل کر مجھ میں کوئی نیکی آئی ہے میرے کردار میں کوئی مثبت تبدیلی آئی ہے، میری سوچوں میں کوئی مثبت تبدیلی آئی ہے، پھر اگر ایسا ہے تو ٹھیک ہے۔ اگر میں پہلے سے زیادہ گناہ میں بے فکر ہو گیا ہوں کہ خیر ہے، سب کام پیر صاحب سنبھال لیں گے، میں کرتا رہوں، تو مارا گیا۔

وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿٢١٣﴾ اللہ کریم جب چاہتا ہے، کوئی کتنا بھی بھٹکا ہوا ہو، اسے سیدھا راستہ دکھا دیتا ہے جب بھی اس کے دل میں طلب پیدا ہوتی ہے، جب بھی آرزو پیدا ہوتی ہے، جب بھی وہ حق کی طرف آنا چاہتا ہے، اللہ اس کے لیے حق آسان فرما دیتے ہیں۔

اخروی نجات کے لیے آزمائش کی گھاٹی سے گزرنا ہے:

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَ لَمَّا يَأْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ کیا لوگوں نے یہ سوچ رکھا ہے کہ وہ جنت میں داخل ہو جائیں گے اور ان پر کوئی آزمائش نہیں آئے گی، انہیں کچھ نہیں کرنا پڑے گا، مشکل نہیں آئے گی، اس دنیا میں رہتے ہوئے دنیا کی کوئی تکلیف نہیں آئے گی؟ انسانی تاریخ پر نظر ڈالو، پہلی اُمتوں کو دیکھو۔ جو لوگ تم سے پہلے گزر چکے ان کے پاس بھی انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام تشریف لائے، ان کے پاس بھی ہدایت کے سامان آئے، پھر طاغوتی طاقتوں نے انہیں بھی اس حد تک پریشان کیا مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ۔۔۔ ایسی ایسی تنگی ان پر آئی وَ الضَّرَّآءُ۔۔۔ اور ایسے مسائل اور ایسی سختیاں آئیں وَ زُلْزِلُوْا کہ انہیں ہلا کر رکھ دیا اور نوبت یہاں تک پہنچی حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۔۔۔ کہ اللہ کا نبی علیہ السلام اور اللہ کے نبی علیہ السلام کے ساتھی پکار اٹھے مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ۔۔۔ اللہ کی مدد کہاں ہے؟ اے اللہ! مدد جلدی بھیج، اے اللہ! ہماری استطاعت سے، ہماری قوتِ برداشت سے کام بڑھ رہا ہے۔ جب نوبت یہاں تک پہنچی تو ارشاد ہوا: اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ﴿۲۱۴﴾ اللہ کی مدد تمہارے ساتھ ہی ہے، تو اللہ کریم نے پانسہ پلٹ دیا۔

جنت رضائے باری کی سند:

بنیادی بات یہاں یہ ہے کہ اخروی نجات کو دخولِ جنت سے تشبیہ دی گئی ہے۔ کیا دخولِ جنت مقصد ہے؟ کیا مقصدِ حیات یہی ہے کہ جنت میں داخل ہو جائے؟ یہ مقصدِ حیات نہیں ہو سکتا۔ جنت بھی مخلوق ہے اور مخلوق نے مخلوق کو حاصل کر لیا تو کون سا تیر مار لیا۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ کسی بندے کا جنت میں داخلہ اس بات کی ضمانت ہے کہ اس کو اللہ کا قرب حاصل ہے اور اللہ کریم اس پر راضی ہے۔ جنت دلیل ہے رضائے باری کی، جنت بجائے خود مقصد نہیں ہے۔ جیسے ایک بندہ کسی امتحان میں پاس ہوتا ہے تو اسے سند ملتی ہے، اسی طرح جنت اللہ کی رضا کی سند ہے۔ بات اس انداز سے ارشاد فرمائی گئی کہ کیا تم آسانی سے یہ سند پا لو گے؟ کچھ پڑھنا لکھنا نہیں پڑے گا، کچھ مجاہدہ نہیں کرنا پڑے گا، کوئی محنت نہیں کرنی پڑے گی؟ جنت ان لوگوں کی رہائش گاہ ہے جو اللہ کے مقبول بندے ہوں گے، جن پر اللہ راضی ہوگا، جنہیں اللہ کریم نجات عطا فرمائے گا۔ حسبِ مدارج، انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے اپنے مقامات ہیں، صحابۂ کرامؓ کے اپنے مقامات ہیں، اولیاء اللہ وعلماء وصلحاء کے اپنے مقامات ہیں، شہداء کے اپنے مقامات ہیں۔ ہر ایک کی اپنی جگہ ہے لیکن سارے ہی اہلِ جنت، صاحبِ عزت، معزز، مقبولانِ بارگاہ ہوں گے۔

جس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ گورنر ہاؤس بظاہر اینٹ گارے کی عمارت ہے لیکن بڑی شاندار ہے۔ اس میں

بے شمار سہولتیں ہیں۔ اس میں گاڑیاں بھی سرکاری ہیں، تیل بھی سرکاری ہے، رہائش بھی سرکاری، نوکر چاکر بھی سرکاری ہیں، بہت عزت واحترام ہے۔ اب ہم کہیں کہ ہم گورنر ہاؤس خرید لیں گے، گورنر ہاؤس پر قبضہ کر لیں گے تو کیا یہ سب کچھ مل جائے گا؟ نہیں، گورنر ہاؤس میں رہنے کے لیے ایک شخص کو گورنر بننا ہے۔ جب وہ گورنر بن جائے گا تو اسے خود عزت واحترام سے وہاں لے جائیں گے اور وہ سب کچھ اس کے سپرد کر دیں گے۔ اسی طرح جنت اللہ کریم کے اپنے بندوں کی رہائش گاہ ہے۔ جن پر اللہ کریم راضی ہوں گے انہیں بڑی عزت واحترام سے وہاں لے جایا جائے گا اور اگر رضائے باری کو چھوڑ کر ہم سمجھیں کہ کوئی اور راستہ ہے تو ممکن نہیں۔ دنیا چونکہ دارِ ابتلاء ہے، اس طرح نہیں جا سکتے، آزمائش کی بھٹی سے گزرنا ہوگا۔

تلخیٔ حالات میں استقامت مقصود ہے:

انسان بے حد ضرورت مند ہے۔ ہماری اتنی ضرورتیں ہیں کہ خود ہم کو پتہ نہیں ہے۔ بعض ایسی ضروری چیزیں ہیں جنہیں ہم شمار ہی نہیں کرتے مثلاً ہم تازہ ہوا میں سانس لے رہے ہیں۔ ہم نے کبھی شمار ہی نہیں کیا کہ ہم آکسیجن استعمال کر رہے ہیں لیکن اگر یہی ہوا ہم پر چند لمحے روک دی جائے تو ہم زندہ نہیں رہ سکتے۔ پانی پیتے ہیں۔ تمازتِ آفتاب پر پابندی لگ جائے تو ہم زندہ نہیں رہ سکتے لیکن یہ ساری وہ باتیں ہیں جنہیں کبھی ہم نے شمار ہی نہیں کیا۔ اسی طرح کی بے شمار ایسی ضرورتیں ہیں جن سے ہم واقف ہی نہیں ہیں۔ آپ کاشتکاری میں دیکھ لیں تو بے شمار ایسے کیڑے ہیں جو فصل کھا جاتے ہیں اور بے شمار پرندوں کے لشکر اس نے ایسے بنا دیے جو ان کیڑوں کو کھا جاتے ہیں۔ نہ ہم ان سے واقف ہیں جو ہمارا نقصان کرتے ہیں اور نہ ہمیں ان کا احساس ہے جو بلا تنخواہ، ہمارے کہے بغیر ہماری حفاظت میں لگے ہیں۔ اسی طرح وجود کے اندر منفی مادوں اور جراثیم کی ایک پیہم جنگ ہے جو ہر قطرۂ خون اور ہر رگِ جاں میں جاری ہے۔ جہاں منفی غالب آتا ہے بیمار پڑ جاتے ہیں، جہاں مثبت غالب آتا ہے تومند ہو جاتے ہیں۔ اس سارے نظام کو وہ مالک ہماری درخواست کے بغیر نہایت ہی شفاف طریقے سے چلا رہا ہے۔ اس کے نظام میں غلطی کا کوئی امکان نہیں ہے لیکن کبھی کبھی وہ جان بوجھ کر ان چیزوں میں تھوڑی سی رخصت دے دیتا ہے جو ہمیں نا پسند ہیں۔ بات صرف اتنی سی ہوتی ہے کہ فرماتا ہے، بے شمار نعمتیں میں نے دے رکھی ہیں اور یہ ان میں مگن ہے لیکن ان میں سے اگر کچھ روک دی جائیں تو کیا یہ پھر بھی میرے پاس آتا ہے یا گھبرا کر میرے در کو چھوڑ کر کہیں اور بھاگ جاتا ہے؟ اگر ایک در سے مسلسل انعامات مل رہے ہیں اور آدمی اس کو مسلسل تھامے ہوئے ہے تو یہ آدمی کا کمال تو نہیں ہے۔ اسے تو اس کی ضرورتوں نے باندھ رکھا ہے، اسے اس کے مفادات نے باندھ رکھا ہے لیکن اسی در سے اگر کوئی تلخی

آجاتی ہے تو کیا وہ در چھوڑ دیتا ہے؟

شیخ سعدی نے لوگوں کو سمجھانے کے لیے حکایات لکھی ہیں۔ ایک حکایت میں انہوں نے لکھا ہے کہ کسی سلطان کو ایک کاشتکار نے خربوزے پیش کیے۔ بڑے خوبصورت چھانٹ کر لے گیا، لیکن خربوزہ بعض اوقات کڑوا بھی ہوتا ہے۔ بادشاہ نے ایک خربوزہ اٹھایا اور کہا کہ اس کی پھانکیں بناؤ۔ خربوزہ کاٹا گیا تو اس نے کہا کہ پہلی پھانک وزیرِاعظم کو دے دو۔ بادشاہ نے دوسری پھانک اٹھا کر چکھی تو بہت ترش تھی۔ حیران ہو کر وزیرِاعظم سے کہا کہ آپ نے بتایا ہی نہیں، آپ پوری پھانک مزے لے لے کر کھا گئے اور بتایا نہیں کہ وہ ترش ہے۔ اس نے کہا، بادشاہ سلامت! ساری عمر آپ کے در سے نہایت لذیذ چیزیں کھاتے رہے ہیں، اگر ایک پھانک تلخ آ گئی تو اس پہ ہم منہ بسورنے لگیں! پھر بھی تو اسی در سے کھانا ہے۔ اس حکایت سے شیخ سعدی یہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ جن ضرورتوں سے ہم آگاہ نہیں، جن کی تکمیل کے ذرائع سے آگاہ نہیں، وہ قادرِ مطلق ہماری درخواست کے بغیر سب کو پورا کر رہا ہے لیکن کبھی کبھی وہ تلخ پھانک بھی میں دے دیتا ہے، معاشرے میں مخالفت کا سامنا کرنا پڑ جاتا ہے، گھر میں مخالفت کا سامنا کرنا پڑ جاتا ہے، اقتدار و اختیار کے ساتھ ٹکر آ جاتی ہے، تلخیاں آ جاتی ہیں، کبھی بیماریاں آ جاتی ہیں، وجود کے اندر جراثیم صحت کے خلاف ہیں ان کو غلبہ دے دیتا ہے۔ دیکھنا یہ چاہتا ہے کہ جو بندہ میری نعمتیں گن نہیں سکتا اور جس پر میری نعمتیں ہمیشہ رہی ہیں، اگر ایک تلخ پھانک آ گئی تو وہ صبر و شکر سے کھاتا ہے یا اس پر چیخ اٹھتا ہے۔ فرمایا، یہ خیال نہ کرو، یہ نہ سوچو کہ تم ویسے ہی جنت میں چلے جاؤ گے۔ مشیتِ الٰہی اس طرح نہیں کرتی۔ اگر ایسے ہی جنت میں جانا ہوتا تو پیدا کر کے جنت میں ہی رکھتا، پھر دنیا میں بھیجنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟

معرفتِ باری کی استعداد صرف انسان میں ہے:

دنیا دارِ ابتلاء ہے۔ یہاں تم بھیجے اس لیے گئے ہو کہ خود فیصلہ کرو کہ کیا اللہ کی محبت کا جواب محبت سے دینا ہے؟ پوری کائنات میں انسان ایک ایسی مخلوق ہے جسے معرفتِ ذاتی کی استعداد عطا کر دی۔ ملائکہ مقربین اور حاملینِ عرش حکم سے سروکار رکھتے ہیں، حاکم سے نہیں۔ بڑی سے بڑی مخلوق حکم سے سروکار رکھتی ہے، حاکم کی طرف آنکھ اٹھانے کی نہ کسی کو جرأت ہے نہ کوئی یہ سوچ سکتا ہے کہ حاکم کون ہے، کیسا ہے؟ یہ ان کی استعداد سے بالاتر بات ہے۔ یہ استعداد حضرتِ انسان کو دی گئی اور نبوت جیسا عالی منصب انسانوں کو دیا گیا۔ اللہ سے روبرو گفتگو بھی کی تو انسان نے کی، وحی نازل ہوئی تو انسان پر ہوئی، جمالِ باری کی طلب پیدا کی تو انسان میں کی اور جمالِ باری کی تاب عطا کی تو انسان کو عطا کی۔ سو انسان ایک ایسی مخلوق ہے جس کے دل میں فوراً یہ سوال پیدا ہوتا

ہے کہ اللہ کون ہے، اللہ کیسا ہے، اللہ کہاں ہے؟

اب جسے یہ معرفت، یہ استعداد اور ایسی سوچ عطا کی اور ایسی قوت عطا کی اور ایسی قوتِ برداشت عطا کی کہ ایک مشتِ غبار طالبِ جمال ربّ العالمین بن گیا، جب اسے اتنی فضیلت عطا کی تو اس نے اپنے مقابلے میں اس کے لیے عارضی چمک دمک، عیاشیاں اور عارضی لذتوں کے بھی کئی گھر بنا دیے۔ عارضی اور وقتی آسودگی کے بھی کئی حوالے دے دیے۔

رخِ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں
اُدھر جاتا ہے پروانہ یا دیکھیں اِدھر آتا ہے

تو دنیا میں بھیجنے کا مقصد ہی یہ تھا کہ انسان خود فیصلہ کرے کہ اسے اُدھر جانا ہے یا اِدھر آنا ہے۔ ایسی مخلوق کی تو اللہ کے پاس کوئی کمی نہیں اور انسان انہیں گن بھی نہیں سکتا جو سراپا اطاعت ہے، سراپا عبادت ہے، ہر لحہ اطاعت پر کمر بستہ ہے۔ خود انسان کو دیکھ لو، اس کے وجود کا ذرہ ذرہ اطاعت پہ کمر بستہ ہے۔ اس کے حکم سے پیدا ہوتا ہے، اس کے حکم سے مرجاتا ہے، اس کے حکم سے بیمار ہوتا ہے اور اس کے حکم سے صحت پاتا ہے۔ اُس کی پسند کا حلیہ اس کو ملتا ہے، اپنی مرضی سے بنا نہیں سکتا، اُس کی پسند کی استعداد عقلی بھی ملتی ہے اور روحانی بھی ملتی ہے۔ دل اس کے حکم سے دھڑکتا ہے اور سانس اس کے چلانے سے چلتی ہے۔ دل کیا کرسکتا ہے! سب کچھ تو اسی کی اطاعت کا پابند ہے لیکن جب محبت کرنے کا، پیار کرنے کا، شکر ادا کرنے کا، دل کو نچھاور کرنے کا موقع آتا ہے تو وہاں وہ اپنی قدرتِ کاملہ اٹھا لیتا ہے اور اختیار انسان کو دیتا ہے کہ اگر تُو یہ فیصلہ اپنی پسند سے کرتا ہے کہ تجھے میری بارگاہ میں آنا ہے تو میری بارگاہ کے دروازے کھلے ہیں اور اگر تُو اپنی پسند نہیں آنا چاہتا تو میں تجھے پکڑ کر نہیں لاؤں گا۔ پکڑ کر لائی ہوئی تو میری بے شمار مخلوق ہے جن میں معرفتِ باری کی استعداد نہیں ہے۔ جنہیں ہم پتھر مٹی یا آگ ہوا سمجھتے ہیں، یہ سب اس کی بارگاہ میں دست بستہ حاضر ہیں۔ بے جان ہیں لیکن اُس کے لیے تو اُس کی مخلوق کا ہر ایک فرد ہے، اس کے ساتھ تو سب کا معاملہ یہی ہے۔ اُس سے تو سارے بات کرتے بھی ہیں اور اُس کی بات کرتے بھی ہیں لیکن سب حکم کے پابند ہیں۔

حاکم کے سامنے نگاہ اٹھانے کی جرأت اگر کسی نے کی ہے تو حضرتِ انسان نے کی ہے چونکہ یہ استعداد اس کو ہی دی گئی۔ جب تجھے اتنی بڑی نعمت عطا کی گئی تو اب تو سمجھتا ہے کہ اس نعمت کی قدر بھی نہ کرے! تُو گورنر تو بنتا ہے لیکن کام اپنی پسند کے کرنا چاہتا ہے۔ گورنر ہاؤس سے جیل خانہ زیادہ دور نہیں۔ دنیا میں آپ دیکھتے ہیں کہ حکمرانوں کو جیل میں بھی جانا پڑتا ہے، جب وہ اپنی پسند پہ آجاتے ہیں۔ اسی طرح انسان کو بھی اپنی پسند کا اختیار دیا گیا کہ وہ اسے کس طرح استعمال کرتا ہے۔ ایک دانے سے فصل اُگتی ہے تو اس میں انسان کا کتنا اختیار ہے؟ وہ

اس کو گھٹا سکتا ہے نہ بڑھا سکتا ہے۔ ایک لقمہ چبانے پر اس کا اپنا اختیار نہیں ہے۔ ایک دانت میں درد شروع ہو جائے تو اس کے بس سے کام نکل جاتا ہے۔

اس کو صرف اس فیصلے کا اختیار دیا گیا ہے اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا (الدھر:33) اللہ نے تجھ سے بے پناہ محبت کی، جواب میں تو بھی محبت دے گا یا ناشکری کی طرف جانا چاہتا ہے۔ اگر تو محبت الٰہی کو ٹھکرا دے، اللہ کی ناشکری کا فیصلہ کرتا ہے تو پھر دیکھ لے کہ یہ کتنا بُرا فیصلہ ہے اور اس کا انجام کیا ہوگا!

گزشتہ آیت میں تذکرہ ہوا کہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام اور ان کے ساتھ جو صحابہ کرامؓ تھے، جن لوگوں نے انبیاء کا ساتھ دیا، انہیں کوئی جادو کی چھڑی نہیں دی گئی کہ بس انہوں نے نعرہ مارا اور دنیا فتح ہوگئی۔ اُن لوگوں پر بھی مشکلات آئیں، اُن پر تکلیفیں آئیں، مگر انہوں نے مقابلہ کیا۔ یہ اللہ کا احسان ہے کہ تائید باری ان کے ساتھ تھی، اللہ کی نعمت اُن کے ساتھ تھی لیکن انہوں نے گردنیں کٹوائیں، بھوک پیاس برداشت کی، تکالیف برداشت کیں، دکھ اٹھائے، مقابلہ کیا اور استقامت کا ثبوت دیا تو اللہ کریم نے انہیں منزل آشنا کر دیا۔ بے شمار اللہ کے نبی علیہ السلام اللہ کی راہ میں شہید ہوئے، بے شمار اللہ کے بندوں نے اللہ کی راہ میں جانوں کا نذرانہ پیش کیا، تب جا کر دوسروں کی بہتری کے راستے کھلے، اللہ کریم کی نعمت متوجہ ہوئی اور حق کا غلبہ ہوا۔

اسلام کا معاشی نظام:

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ۔۔۔ آپ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں۔ آدمی کو جان عزیز ہوتی ہے، پھر دوسرا نمبر مال کا ہوتا ہے۔ اسلام نے جو مالی ضابطے بنائے ہیں اس میں بھی اسلام منفرد ہے۔ دنیا کے جتنے مالی نظام ہیں وہ کمانے کے ذرائع متعین کرتے ہیں، جائز اور ناجائز کہ یہ درست ہے، قانون کے مطابق ہے۔ اگر اس طرح لیا جائے، چھینا جائے، چوری کیا جائے تو اس پر سزا ہوگی۔ اس کے بعد دوسرا نمبر آجاتا ہے کہ جو حکومت یا جو ادارہ اس ملک کو چلاتا ہے اس کے اخراجات کے لیے اس میں سے حصہ لیا جائے جیسے مختلف ٹیکس ہیں۔ اب ایک آدمی نے اس ملک کے مروّجہ قوانین کے مطابق مال حاصل کیا، پھر حکومت کے ٹیکس دیے، اس کے بعد وہ آزاد ہے کہ اپنے مال کو جہاں چاہے خرچ کرے، کوئی اسے روکنے والا نہیں۔ اگر وہ جمع کرتا جاتا ہے تو جمع ہو جائے لیکن کوئی ایسا قانون نہیں ہے کہ اس کو واپس اسی چکر میں لائے کہ وہ مال معاشرے میں چلتا پھرتا رہے۔

اسلام چونکہ دینِ حق ہے، اللہ کا بنایا ہوا دین ہے۔ مخلوق بھی اللہ کی ہے، اس کی ضرورتیں بھی اللہ کی ہیں، مال بھی اللہ کا ہے تو اسلام نے حصولِ زر سے لے کر اس کے اخراجات تک راہنمائی فرمائی۔ اسلام کا واحد مالی نظام ہے

جس میں زکوٰۃ فرض کر کے ایک ایسا نظام دے دیا کہ ہر سال اگر آپ چالیسواں حصہ زکوٰۃ میں دیتے ہیں تو وہ رفتہ رفتہ سارا مال معاشرے میں چلا جائے گا۔ جس طرح بدن میں خون گردش کرتا ہے، اسی طرح مال کو بھی معاشرے میں گردش کرنی چاہیے۔ اگر ایک جگہ کھڑا ہو جائے گا تو وہ جگہ تباہ ہو جائے گی۔ آپ ایک جگہ سے انگلی باندھ دیں کہ اس میں جو خون ہے، کافی ہے، اب یہ واپس نہیں جائے تو انگلی پھٹ جائے گی، خراب ہو جائے گی۔ آپ سورج کی کرنوں کو روک دیں کہ آئی ہیں، واپس نہیں جائیں گی تو کائنات تباہ ہو جائے گی۔ آپ دریا کو روک دیں کہ اوپر سے آ رہا ہے، آگے نہیں جائے گا تو اگلا حصہ ویران ہو جائے گا۔ اگر آپ روکیں گے، بند بھی لگائیں گے تو پھر بھی آپ کو نکاسی آب کا ایک راستہ رکھنا پڑے گا کہ ایک خاص مقدار میں پانی جسے آپ سنبھال سکتے ہیں، روک کر باقی آگے جائے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ اسے بالکل روک دیں۔ اسی طرح مال بھی جہاں جمع ہو جائے گا، رک جائے گا، اس کا آگے جانے کا راستہ نہیں ہوگا تو وہ معاشرے کو تباہ کر دے گا۔ دنیا کے جتنے مالی نظام ہیں آپ ان میں دیکھ لیں کہ امیر، امیر تر ہوتے چلے جاتے ہیں اور غریب، غریب تر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ امراء عیاش ہو جاتے ہیں، غرباء چور اور ڈاکو بن جاتے ہیں اور یوں معاشرہ تباہ ہو جاتا ہے۔

اسلام نے حصولِ زر کے طریقے متعین کر دیے ہیں اور وہ معروف ہیں۔ تجارت کرتے ہیں، وہ ایک معروف طریقہ ہے۔ ملازمت معروف طریقہ ہے، کھیتی باڑی معروف طریقہ ہے۔ تجارت میں آپ خرچ کرتے ہیں، ملازمت اور مزدوری میں آپ گھر سے پیسہ نہیں دیتے۔ ملازمت میں آپ اپنی علمی، عقلی قابلیت دیتے ہیں اور اُن کا کام کرتے ہیں تو وہ آپ کو سرمایہ دیتے ہیں۔ مزدوری میں آپ اپنی جسمانی قوت خرچ کرتے ہیں، محنت کرتے ہیں، زمین کھودتے ہیں، دیوار بناتے ہیں تو وہ آپ کو اجرت دیتے ہیں۔ کاشتکاری میں آپ محنت کرتے ہیں، ہل چلاتے ہیں، فصل بوتے ہیں۔ یہ چار معروف ذرائع ہیں۔ آمدن کا کوئی بھی دوسرا غیر معروف ذریعہ حرام ہے، یہ شریعت کا سیدھا سا مسئلہ ہے۔ جیسے کوئی جادو کرتا ہے اسے لوگ پیسے دے جاتے ہیں، کوئی تسبیح پڑھتا ہے لوگ پیسے دے جاتے ہیں، کوئی حصول زر کا چلہ کاٹتا ہے مصلے کے نیچے سے نوٹ نکلتے ہیں، یہ سارے طریقے حرام ہیں۔ غیر معروف ذرائع ہیں۔ معروف ذرائع وہ ہیں جو ہر ایک کے لیے عام ہیں۔ ملازمت، تجارت، کاشتکاری، مزدوری ہر آدمی کے لیے عام ہے، یہ معروف ہیں۔ جو رزق غیر معروف ذرائع سے کمایا جاتا ہے وہ حلال نہیں ہوتا، حرام ہوتا ہے۔ آپ پیسے دے کر سود لیتے ہیں، حرام ہے۔ آپ پیسے دے کر چیز خریدتے ہیں اور منافع پر بیچتے ہیں، حلال ہے۔ اللہ نے بیع کو حلال کیا اور ربا کو حرام کیا۔ تو جتنے غیر معروف طریقے حصولِ رزق کے ہیں وہ ناجائز ہیں۔

اس کے بعد ٹیکس کی باری آتی ہے۔ اللہ کریم نے اس سرمائے پر اڑھائی فیصد ٹیکس لگا دیا جو ایک سال آپ

کے پاس رک جائے۔اسے زکوٰۃ کا نام دیا گیا کہ مال کو پاک رکھنے کے لیے، مال کو صاف رکھنے کے لیے، اس میں چونکہ اللہ مالک ہے تو اُس کا حصہ دیا جائے۔اب اس کی ایک بڑی خوبی تو یہ ہے کہ کسی کے پاس بہت مال جمع ہو گیا اور ہوتا جا رہا ہے، ہر سال وہ چالیسواں حصہ ادا کر دے تو اس کا مطلب ہے کہ چالیس سال میں وہ اربوں روپے معاشرے میں پھیل جائیں گے اور وہ مال ایک جگہ جمع نہیں ہوگا۔ایک دریا بن جائے گا، پانی آ رہا ہے پانی جا رہا ہے۔ ایک جگہ ایک ڈیم بن گیا لیکن وہ مکمل رک نہیں گیا بلکہ جس طرح مال آ رہا ہے، اسی طرح مال جا رہا ہے۔معاشرے میں سب سے پہلے زکوٰۃ جمع کرنا حکومتِ وقت کا حق ہے۔آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کے عہدِ پُرنور میں، خلفائے راشدینؓ کے زمانے میں ساری زکوٰۃ مرکز میں جمع ہوتی تھی۔ جب خلافت گئی تو نظام ختم ہو گیا۔زکوٰۃ کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ حکومت اسے جمع کرے اور اس میں سے اپنے سارے اخراجات پورے کرے۔فوجی ضرورتیں پوری کرے، ہسپتال بنائے، درس وتدریس کے ادارے بنائے، غریبوں کو الاؤنس دے، جو معاشرے کے پسماندہ لوگ ہیں ان کی امداد کرے۔ جتنے مستحقین زکوٰۃ قرآن حکیم نے لکھے ہیں، وہ سارے اس میں آجاتے ہیں۔مفلسوں کی دیکھ بھال کی جائے، بچوں کی مفت تعلیم کا اہتمام زکوٰۃ سے کیا جائے۔ بیماروں کا علاج مفت کیا جائے۔اگر پورے ملک کی زکوٰۃ جمع ہو کر حکومتی اخراجات سے کم پڑتی ہے تو پھر مختلف چیزوں پر حکومت ٹیکس لگا سکتی ہے۔

ٹیکس کس صورت میں؟

ٹیکس دو طرح کے ہیں۔اسلام میں ایک وہ ٹیکس ہے کہ ملک میں باہر سے جو چیز آئے حکومت اس پر ٹیکس لیتی ہے۔شرعاً حکومت اس پر ایک بار ٹیکس لے سکتی ہے، جب وہ ملک میں داخل ہو۔اس کے بعد اس پر کوئی ٹیکس نہیں ہے۔اسی طرح اگر کوئی وقتی ضرورت پڑ جاتی ہے، جنگ ہو جاتی ہے، کوئی وبا ہے، زلزلہ آ گیا تو ضرورت پڑ گئی، ان ضروریات کو پورا کرنے کے لیے حکومتِ اسلامیہ کو اختیار ہوتا ہے کہ وہ کسی خاص چیز پر کوئی ٹیکس لگا دے، جیسے تیل کے ساتھ ٹیکس لگا دیا گیا۔لیکن یہ تب تک ہے جب تک وہ ضرورت پوری نہیں ہوتی۔ضرورت پوری ہو گئی تو ٹیکس ختم، اس کے بعد لوگ آزادی سے کمائیں، زکوٰۃ دیں، کاشتکاری کریں، کارخانے چلائیں اور زکوٰۃ دیں۔اگر اس نظام میں باقاعدگی لائی جائے تو حکومت کے سارے اخراجات پورے ہو جاتے ہیں۔

اسلام کا مالی نظام پیسے کمانے سے لے کر اس پیسہ کو خرچ کرنے تک آدمی کے ساتھ جاتا ہے، راہنمائی کرتا ہے، دستگیری کرتا ہے۔دنیا کا کوئی دوسرا مالی نظام کمانے اور ٹیکس دینے کے بعد ساتھ نہیں دیتا کہ اس کے بعد ٹیکس گزار کیا کرتا ہے، اپنی دولت کہاں لٹا رہا ہے، صحیح خرچ کر رہا ہے، غلط خرچ کر رہا ہے، کوئی نہیں پوچھتا۔

انفاق کے مصارف:

یہاں اس سوال کا جواب دیا گیا۔ انفاق ہوتا ہے، اللہ کے حکم کی حدود کے اندر خرچ کرنا: يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ یہ پوچھتے ہیں کہ ہم کہاں خرچ کریں؟ کس طرح سے کریں؟ فرمایا: قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ۔۔۔ اگر تم نیکی کرنا چاہتے ہو اور مال کو اللہ کے حکم کے مطابق خرچ کرنا چاہتے ہو تو سب سے پہلے تمہارے والدین کا حق ہے جنہوں نے تمہیں پالا پوسا، تم ان کی خدمت کرو۔ والدین کا حق زکوٰۃ سے ادا نہیں ہوتا۔ زکوٰۃ صدقاتِ واجبہ میں سے ہے اور یہ خود فرض ہے اس کی ادائیگی فرض کی ادائیگی ہے لہٰذا زکوٰۃ سے والدین کا حق ادا نہیں ہوگا۔ والدین کا اولاد کے مال پر الگ سے حق ہے۔ بیٹا جو کماتا ہے اس پر پہلا حق والدین کا ہے کہ ان کی خدمت کی جائے، ان کی خبر گیری کی جائے، ان کے لباس، ان کی غذا، ان کے آرام کا خیال رکھا جائے۔ اب جو تم ان پر خلوص اور محبت سے خرچ کرو گے عند اللہ وہ صدقہ شمار ہوگا اور تمہیں اس کا ثواب ملے گا جیسے تم اللہ کی راہ میں خرچ کر رہے ہو۔

وَ الْاَقْرَبِيْنَ۔۔۔ پھر درجہ بدرجہ رشتہ دار ہیں۔ باپ کے بعد چچا، پھر پھوپھیاں، ماموں، خالائیں، پھر ان کے بچے، جس طرح رشتوں کی ترتیب ہے، اس طرح سے جتنا ممکن ہو سکے، جتنی تمہاری استطاعت ہے، ضرورت مندوں کی ضرورت پوری کرو، یہ خرچ اللہ کی راہ میں ہوگا۔ اس کے بعد یتامیٰ آجاتے ہیں جن کا دنیا میں کوئی نہیں۔ والد فوت ہو گئے، بچے نابالغ رہ گئے لیکن یاد رکھیں! یتیم صرف نابالغ ہوتا ہے۔ بالغ پر یتیم کا اطلاق نہیں ہوتا۔ اگر نابالغ بچے کے والد کا سایہ سر سے اٹھ جاتا ہے تو پھر وہ یتیم کہلاتا ہے اور جب بالغ ہو جائے تو یتیم نہیں رہتا۔ جو حقوق یتیم کی نگہداشت کے شریعت نے دیے ہیں، نابالغ بچے ان کے مستحق ہیں۔ وَ الْيَتٰمٰى کے بعد وَ الْمَسٰكِيْنِ۔۔۔ وہ لوگ جو غریب ہیں، مسکین ہیں، جن کے پاس وسائل نہیں ہیں، ذرائع نہیں ہیں، کسی کے پاس صحت نہیں ہے، معاشرے کا محروم طبقہ، ان کی مدد کی جائے۔

وَ ابْنِ السَّبِيْلِ۔۔۔ اور مسافروں کی نگہداشت کی جائے۔ شریعتِ مطہرہ میں ہر مسافر مستحق ہوتا ہے۔ صدقاتِ واجبہ بھی انہیں دیے جاسکتے ہیں۔ قیدی ہو تو انہیں آزاد کرانے میں، ان کی خدمت کرنے میں خواہ ملک کا وزیر اعظم ہی قیدی ہو، آپ اس کی مدد بھی کرتے ہیں تو اس پر زکوٰۃ خرچ ہو سکتی ہے۔ خواہ گھر میں جتنا بھی مال ہو، یہاں تو قید ہے۔ کوئی امیر آدمی ہے، وہ سفر میں ہے تو زکوٰۃ سے اس کی مدد کی جائے کہ امارت اس کی گھر میں ہے۔ یہاں اگر اس کا خرچ، اس کا کرایہ چوری کر لیا گیا، کسی نے جیب کاٹ لی تو وہ امارت اس کے کام نہیں آتی۔ اس کا حق

معاشرے کے ان لوگوں پہ آتا ہے جو خرچ کرتے ہیں۔

وَمَا تَفۡعَلُوۡا مِنۡ خَيۡرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيۡمٌ ﴿۲۱۵﴾ اور یہ یاد رکھیں! عملِ خیر کبھی ضائع نہیں ہوتا۔ یہ فکر نہ کرو کہ میں نے جو خرچ کیا وہ اخبار میں نہیں آیا۔ میں نے جو خرچ کیا لوگوں کو اس کا پتہ نہیں چلا۔ میں نے بتایا نہیں یا میں نے جس پر خرچ کیا، اسے بھی پتہ نہیں کہ میری مدد کس نے کی؟ اللہ کریم فرماتا ہے، اللہ ہر کام کو خود دیکھ رہا ہے۔ ہر بات کو خود جانتا ہے اور اگر تم اللہ کی راہ میں اللہ کی رضا کے لیے خرچ کرتے ہو تو بے فکر ہو جاؤ اس لیے کہ اللہ کو علم ہے کہ کون کیا کر رہا ہے۔ تمہارے خرچ کو وہ جانتا ہے کہ تم اس کی رضا کے لیے اور اس کی راہ میں خرچ کر رہے ہو، پھر اس کی فکر چھوڑ دو۔ اس کا اجر وہ تمہیں عطا فرمائے گا۔

کسی بندے کے پاس سو روپے ہوں اور آپ کہہ دیں کہ اڑھائی روپے یہاں رکھ دو تو اسے وہ اڑھائی بھی مشکل لگتے ہیں۔ یہاں پہلے ہی ایک نوٹ ہے سو کا، اس میں سے ڈھائی تمہیں کیوں دے دوں؟ ایک فطری محبت ہوتی ہے۔ پھر اگر جان دینی پڑ جائے تو بندہ تو سارا کچھ کرتا ہی جان کے لیے ہے اور زندہ رہنے کے لیے ہے۔ بات یہ ہے کہ کائنات اللہ کی ہے۔ اس کی خوبیاں خامیاں اسی کی بنائی ہوئی ہیں، ان کے نتائج اسی کے بنائے ہوئے ہیں۔ وہ ہر چیز کا خالق ہے اور اسی کا علم مکمل ہے۔ مال تو مال ہے، جب وہ کہے تو جان بھی ہار دو۔ بظاہر تمہیں یہ بات کتنی ہی ناپسندیدہ ہو کہ یہ بھی کوئی بات ہے کہ میں مر جاؤں، لیکن فرمایا کہ جہاں اللہ چاہے کہ جان دو، وہاں جان دے دو۔ مال کی تو کوئی حیثیت ہی نہیں، مال تو کئی بار کمایا جا سکتا ہے لیکن جان تو ایک ہی بار دی جا سکتی ہے۔ اللہ ایسا کریم ہے کہ وہ تمہیں جان بھی وہاں دینے کا حکم دے گا جہاں دے کر موت بھی تم سے بھاگ جائے اور تم ہمیشہ کی حیات پا جاؤ گے۔

فرضیتِ قتال:

فرمایا: كُتِبَ عَلَيۡكُمُ الۡقِتَالُ ۔۔۔ تم پر قتال فرض کیا گیا۔ وَهُوَ كُرۡهٌ لَّكُمۡ ۔۔۔ بظاہر وہ ناپسندیدہ سی بات ہے کہ بندہ اٹھ کر تلواروں کی چھاؤں میں چلا جائے، گولیوں کی بارش میں چلا جائے، برستی ہوئی آگ میں چلا جائے اور تڑپ تڑپ کر جان دے دے۔ بظاہر تو بڑا ناپسندیدہ عمل ہے لیکن وَعَسٰٓى اَنۡ تُحِبُّوۡا شَيۡـئًا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمۡ ۔۔۔ عین ممکن ہے کہ ایک چیز کو تم ناپسند کرتے ہو لیکن وہ تمہارے لیے کتنی بہتر ہو کہ تمہاری ساری کاوش وصل الی اللہ کی ہے۔ جہاں وہ کہے کہ جان ہار دو تو وہاں جان ہار کر واصل باللہ ہو جائے تو اس سے بڑی اور کیا بات ہے؟ یہ تو جان ہارنے کے بعد تمہیں پتا چلے گا، لیکن اُسے پہلے سے پتہ ہے کہ کل کیا ہوگا، اس کے نتائج کیا ہوں گے؟ لہٰذا احکام الٰہی میں مال تو مال ہے، جان دینے کا بھی جہاں حکم ہے وہاں جان ہار دینے ہی میں فائدہ ہے۔ اس

لیے کہ ہوسکتا ہے کہ بظاہر تمہیں ایک چیز ناپسند ہو مگر اس میں تمہاری بہتری ہو۔ وَعَسٰۤى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْـًٔا۔۔۔۔ ہوسکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں بڑی پیاری لگے وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ۔۔۔ اور وہ تمہارے لیے نقصان دہ ہو، جیسے کوئی بہت خوبصورت سانپ پڑا ہے۔ اسے کوئی اس کی خوبصورتی پر اٹھالے تو موت ہے، تمہارا علم محدود اور ناقص ہے، تمہاری نگاہ محدود ہے، وہ نتائج جو تم حاصل کرنا چاہتے ہو وہ محدود اور ناقص ہیں لیکن جو اللہ کریم بتاتا ہے وہ کامل اور مکمل ہے، درست ہے۔ لہٰذا تم پر جہاد فرض کیا گیا ہے، اس لیے کہ اسی میں تمہاری بقاء ہے۔ اسی موت میں تمہاری حیات ہے۔

شہید کی جو موت ہے وہ قوم کی حیات ہے

ایک بندہ جان ہارتا ہے اور قوم کی رگِ جاں میں حیات دوڑ جاتی ہے۔ مال تو مال رہا، جہاں جان دینے کی بات آئے تو تامل نہ کرو، سوچو نہیں، اس لیے کہ تمہاری پسند اور ناپسند پہ بات نہیں ہے۔ تمہاری پسند بھی ناقص، ناپسند بھی ناقص لیکن اُس کا علم کامل ہے، جو اُسے پسند ہے، وہی چیز بہترین ہے۔ جو اُسے پسند نہیں وہ بدترین ہے۔ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ۝۲۱۶ اللہ جانتا ہے وہ باتیں جو تم نہیں جانتے۔ تم مخلوق ہو وہ خالق ہے۔ ہر چیز کا خالق ہے، موت کا خالق بھی وہی ہے، حیات کا خالق بھی وہی ہے، تمہارا خالق بھی وہی ہے، کائنات کا خالق بھی وہی ہے۔ کس چیز کو کہاں کیا مقام ملے گا، یہ اس کا کام ہے اور جب اس کا حکم آجاتا ہے تو مال دینے میں گریز کیوں کرتے ہو؟ وہاں تو جان مانگے تو جان دینی چاہیے کہ جان بچانے میں فائدہ نہیں، وہاں جان ہارنے میں فائدہ ہے۔ اس لیے کہ اسلام نورِ ہدایت اور اللہ کی بات ہے۔ سارے فائدے، ساری بہتریاں، ساری بھلائیاں اسی کے اندر ہیں اور جتنا جتنا ہم کہیں کوئی قدم باہر رکھیں گے، اتنا نقصان ہوگا اور اُسی وقت ہوگا۔ اس لیے ہمیں دو باتوں کا خیال رکھنا چاہیے، پوری کوشش اطاعتِ الٰہی کی رہے، اس کے ساتھ روزانہ استغفار بھی پڑھا جائے کہ جہاں بھول چوک، غلطی کمی ہوئی ہے، اللہ کریم معاف فرمادے۔ اللہ وہ باتیں جانتا ہے جو تم لوگ نہیں جانتے ہو۔

سورۃ البقرہ رکوع 27 آیات 217 تا 221

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ ؕ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ ؕ وَصَدٌّ
عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَكُفْرٌۢ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۗ وَاِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ
عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ؕ وَلَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى
يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا ؕ وَمَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ
فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَاُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ
وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿٢١٧﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ
هَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ اُولٰٓئِكَ يَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ
غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٢١٨﴾ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ؕ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ
وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ۡ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ؕ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا
يُنْفِقُوْنَ ۬ قُلِ الْعَفْوَ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ
تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿٢١٩﴾ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ؕ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى ؕ قُلْ اِصْلَاحٌ
لَّهُمْ خَيْرٌ ؕ وَاِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ
الْمُصْلِحِ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَعْنَتَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿٢٢٠﴾ وَلَا تَنْكِحُوا
الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ ؕ وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ ۚ
وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا ؕ وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ
وَّلَوْ اَعْجَبَكُمْ ؕ اُولٰٓئِكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ۖۚ وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلَى الْجَنَّةِ
وَالْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِهٖ ۚ وَيُبَيِّنُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿٢٢١﴾

آپ سے پوچھتے ہیں کہ حرمت والے مہینے میں لڑنا کیسا ہے فرما دیجیے کہ اس میں لڑنا بڑا (گناہ) ہے اور اللہ کی راہ سے روکنا اور اس کے ساتھ کفر کرنا اور مسجد حرام (سے روکنا) اور اس کے رہنے والوں کو اس سے نکال دینا اللہ کے نزدیک اس سے بھی بڑا (گناہ) ہے اور فساد ڈالنا قتل سے بڑا (گناہ) ہے اور یہ تم لوگوں سے لڑائی سے باز نہ آئیں گے یہاں تک کہ اگر ان کا بس چلے تو تمہیں تمہارے دین سے پھیر دیں۔ اور تم میں سے جو کوئی اپنے دین سے پھر گیا پھر کفر پر مر گیا تو ایسے ہی لوگوں کے اعمال دنیا اور آخرت میں ضائع جاتے ہیں اور یہ دوزخ کے رہنے والے ہیں اس میں وہ ہمیشہ رہیں گے ﴿۲۱۷﴾ یقیناً جو لوگ ایمان لائے اور جن لوگوں نے وطن چھوڑا اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا یہی لوگ اللہ کی رحمت کے امیدوار ہیں اور اللہ بخشنے والے مہربان ہیں ﴿۲۱۸﴾ آپ سے شراب اور جوئے کے بارے پوچھتے ہیں فرما دیجیے ان دونوں میں بڑا گناہ ہے اور لوگوں کو کچھ فائدہ بھی ملتا ہے اور ان کا گناہ ان کے نفع سے بڑا ہے اور آپ سے پوچھتے ہیں کہ وہ کیا خرچ کریں؟ فرما دیجیے جو ضرورت سے زائد ہو اللہ اسی طرح تمہارے لیے دلائل بیان فرماتے ہیں تا کہ تم فکر کرو ﴿۲۱۹﴾ دنیا اور آخرت میں۔ اور آپ سے یتیموں کے بارے پوچھتے ہیں فرما دیجیے ان کی مصلحت کا خیال رکھنا بہتر ہے اور اگر تم ان (کے مال) کو ساتھ ملا لو تو وہ تمہارے بھائی ہیں اور اللہ مصلحت کا خیال نہ رکھنے والے (دونوں) کو جانتے ہیں اور اگر اللہ چاہتے تو تمہیں مشقت میں مبتلا کر دیتے یقیناً اللہ غالب ہیں حکمت والے ہیں ﴿۲۲۰﴾ اور مشرک عورتوں سے ان کے ایمان لانے تک نکاح نہ کرو اور مومن لونڈی مشرک عورت سے بہتر ہے خواہ وہ تمہیں اچھی بھی لگے اور مشرکوں سے بھی جب تک ایمان نہ لائیں (اپنی عورتوں کا) نکاح نہ کرو اور غلام مومن مشرک سے بہتر ہے خواہ وہ تمہیں اچھا لگے کہ یہ لوگ دوزخ کی طرف بلاتے (لے جاتے) ہیں اور اللہ اپنے حکم سے جنت اور بخشش کی طرف بلاتے ہیں اور لوگوں کے لیے اپنے دلائل بیان کرتے ہیں تا کہ وہ نصیحت حاصل کریں ﴿۲۲۱﴾

تفسیر و معارف

اشہر حرام میں قتال:

جہاد کی فرضیت کے ساتھ ہی یہ سوال سامنے آیا کہ اگر حرمت والے مہینوں میں لڑنا پڑ جائے؟

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ ؕ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ ؕ وَصَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ كُفْرٌۢ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۗ وَاِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ ۔۔۔۔ اشہر حرام چار مہینے رجب، ذی القعد، ذوالحج اور محرم ہیں جن میں لڑائی کو قبل از اسلام بھی مناسب نہ سمجھا گیا اور اسلام نے بھی ان کی حرمت بحال رکھی۔ اللہ کریم نے ان حرمت والے مہینوں کی بابت یہ ضابطہ مقرر فرما دیا کہ ان میں لڑنا تو بہت بڑا جرم ہے، بہت بڑے گناہ کی بات ہے لیکن اس کے مقابلے میں اللہ کی راہ سے روکنا، اللہ سے کفر کرنا، بیت اللہ میں داخلے سے منع کرنا بلکہ جو لوگ حرم میں ہوں، ان کو وہاں سے نکال دینا، یہ کوئی کم گناہ ہے؟ ہرگز نہیں! وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ۔۔۔۔ اصل بات تو یہ ہے کہ فتنہ فساد قتال سے کہیں بڑھ کر جرم ہے۔ اگر کفار حرمت کے مہینوں میں لڑائی کی ابتداء کریں تو اس حرمت کو پامال کرنے کا گناہ ان کے سر ہے۔ وہ مجرم ہیں، وہ فساد پھیلانے والے ہیں جو اشہر حرام کی حرمت کو پامال کر رہے ہیں اور ان فساد کرنے والوں کی سرکوبی کرنے میں ان مقدس مہینوں کی حرمت مانع نہیں۔ ان کے خلاف جنگ کی جائے کہ فساد قتل سے کہیں بڑا جرم ہے۔ انہیں اس جرم سے روکنے کے لیے جنگ کی جائے۔

ان مفسدین کا تو یہ حال ہے: وَلَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا ۔۔۔۔ اگر ان کا بس چلے تو یہ تمہیں تمہارے دین سے ہی برگشتہ کر دیں، تمہیں کفر میں لوٹا دیں، یہ کفار تمہارے کبھی دوست نہیں ہو سکتے، ہمیشہ تم سے لڑتے رہیں گے کہ تم دینِ حق سے پھر جاؤ لیکن یاد رکھو! وَمَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَاُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۱۷﴾ اگر تم میں سے کوئی دین سے پھر جائے اور کفر پر ہی مر جائے تو اس کے تمام اعمال، اس کی تمام محنت، عمر بھر کی کمائی اکارت گئی۔ یہ اعمال نہ دنیا میں اس کے کام آئیں گے اور نہ ہی آخرت میں اس پر کوئی اجر ملے گا بلکہ ایسے مرتدین کا، دینِ حق سے پھر جانے والوں کا ٹھکانہ تو نارِ جہنم ہے، جہاں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ آگ کے اس عذاب سے انہیں کبھی رہائی نہ ملے گی۔ دنیا میں دینِ اسلام سے کفر پر لوٹ جانے والے کے اعمال اس طرح ضائع ہو جاتے ہیں کہ اس کا نکاح تک باطل ہو جاتا ہے۔ مسلمان کی وراثت سے محروم ہو جاتا ہے، مرجائے

تو اس کا جنازہ پڑھا جائے گا نہ مسلمانوں کے قبرستان میں دفن ہوگا۔ توبہ کر لے تو اس کا معاملہ ایسا ہے گویا از سر نو مسلمان ہوا۔ حنفیہ کے نزدیک اگر پہلے حج کر چکا ہے تو وہ فاسد ہوگا، بشرطِ وسعت دوبارہ کرنا ہوگا۔ امام شافعیؒ کے نزدیک نیک اعمال معلق رہتے ہیں اور اگر پھر سے مسلمان ہو جائے تو پہلے نیک کاموں کا اجر پاتا ہے۔

مسلمانو، یاد رکھو! اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَالَّذِیۡنَ هَاجَرُوۡا وَجٰهَدُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ ۙ اُولٰٓئِكَ یَرۡجُوۡنَ رَحۡمَتَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۲۱۸﴾ کفار کی ہر کوشش جو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ہو، اسے ہر حالت میں روکنا ضروری ہے۔ تم ان کے عزائم سے آگاہ رہو۔ اپنے دین پر ثابت قدم رہو۔ یہ بات پکی ہے کہ جو لوگ اللہ پر ایمان لائے، پھر اللہ کے لیے سارے جہان کو چھوڑ دیا، عزیز و اقارب کو چھوڑا، اپنا گھر بار، وطن، جاہ و مال ہر شے اللہ کے ساتھ اپنے تعلق پہ نثار کر دی اور ساری عمر اللہ کی راہ میں لڑتے ہوئے اور کفر کا مقابلہ کرتے ہوئے گزار دی۔

یہ لوگ رحمتِ باری کے امیدوار ہیں، اللہ ان کی امیدوں کو پورا کرے گا۔ اللہ ہی بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔ وہ ان کی امیدوں کو اپنی عطا کے مطابق پورا فرمائے گا۔ پیچھے انفاق فی سبیل اللہ کی بات چل رہی تھی، اس کے بعد جہاد پہ بات ہوئی۔ اب یہاں اس عہد کے معاشرے کا ایک اور پہلو سامنے لایا جا رہا ہے۔ اگرچہ دنیا بھر کے معاشرے کا یہی عالم تھا لیکن عربوں میں شراب اور قمار بازی کا اتنا رواج تھا جیسے عرب ہی ان برائیوں کا مرکز ہوں۔ قرآن حکیم نے انسانی معاشرے کے ایک ایک پہلو اور جزئیات کو لے کر ان کی اصلاح فرمائی۔ یہاں ارشاد فرمایا کہ لوگ خمر اور قمار بازی کے متعلق سوال کرتے ہیں، خمر یعنی نشہ آور شئے، کوئی بھی ایسی چیز جو انسانی حواس کو مختل کر دے۔ شراب کا لفظی معنیٰ تو پینے کا ہے، کوئی بھی پینے کی چیز، اسے شراب کہتے ہیں۔ لیکن خمر یا نشہ آور اسے کہتے ہیں جو انسانی حواس کو مختل کر دے، نیک و بد کی تمیز نہ رہے۔

یَسۡـَٔلُوۡنَكَ عَنِ الۡخَمۡرِ وَالۡمَیۡسِرِ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے خمر کے بارے پوچھتے ہیں اور قمار یعنی جوئے کے بارے پوچھتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم انہیں یہ ارشاد فرمائیے: قُلۡ فِیۡهِمَاۤ اِثۡمٌ كَبِیۡرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ۔۔۔۔ ان میں بعض لوگوں کو منافع ملتا ہے۔ اب جو لوگ مختلف چیزوں سے شراب بنا کر بیچتے ہیں وہ اس سے کماتے ہیں، یہ ان کا روزگار ہے، یا جوئے میں بھی جو لوگ اڈے بنا لیتے ہیں اور کمیشن لیتے ہیں تو ان کو بھی منافع ملتا ہے لیکن وَاِثۡمُهُمَاۤ اَكۡبَرُ مِنۡ نَّفۡعِهِمَا ان کا گناہ ان کے نفع سے کئی گنا زیادہ ہے۔ اگر ایک آدمی کو نفع ملتا ہے تو لاکھوں انسانوں کا نقصان ہوتا ہے اور لاکھوں زندگیاں تباہ ہوتی ہیں۔

تعبیرِ قرآن صرف حضور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم ہی کا منصب ہے:

ہمارے آج کے بعض دانشوروں نے یہاں سے یہ دلیل لی کہ شراب کو برا تو کہا گیا ہے اور قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ اس کا نقصان بہت زیادہ ہے لیکن یہ تو نہیں کہا گیا کہ نہ پیو۔ چلو کوتاہی ہے، غلط کام ہے لیکن آدمی سے غلطی ہو ہی جاتی ہے۔ ٹیلی ویژن پر ایک دانشور اسی طرز استدلال پر شراب نوشی کے دفاع کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ قرآن حکیم کو سمجھنے کے لیے صرف ایک ہستی ہے جس پر قرآن نازل ہوا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم اور انہیں کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین میں بڑے بڑے صاحب زبان اور بڑے بڑے صاحب دانش، ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسے عظیم انسان آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی خدمت میں موجود ہوتے۔ جب کبھی کوئی آیہء کریمہ نازل ہوتی اور بعض دفعہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم استفسار فرما لیتے کہ آپ لوگوں نے اس آیت سے کیا مطلب سمجھا ہے تو بیک زبان ہو کر ساری مجلس یہ عرض کرتی۔ اللہ ورسولہ اعلم اللہ اور اس کا رسول صلی اللہ علیہ وسلّم بہتر جانتے ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم ہی اس کے مفہوم یا مطلب کی تعین فرماتے۔ اگر عربی لغت اور گرائمر کو لیا جائے اور اس کے زور سے معنی کیے جائیں تو سارے معنی بدل سکتے ہیں جیسے مولا ایک لفظ ہے جس کا معنی مالک بھی ہے اور آزاد کردہ غلام کو بھی مولا کہتے ہیں۔ اب غلام اور مالک ایک دوسرے کی ضد ہیں لیکن دونوں کے لیے ایک لفظ استعمال ہوتا ہے لیکن جب وہ جملے میں استعمال ہوتا ہے تو اس جملے کے اعتبار سے اس کے مفہوم کی سمجھ آتی ہے۔

حضرت ثوبان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے احادیث مروی ہیں اور سارے محدثین لکھتے ہیں، قال ثوبان مولا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم۔ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کے آزاد کردہ غلام تھے اگرچہ مالک کو بھی مولا کہتے ہیں۔ اگر آپ لغت اور اپنے زور سے معنی بنانے لگیں تو پھر قرآن کی دوسری آیہء کریمہ کا انکار ہو جاتا ہے جس میں ارشاد فرمایا گیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کا منصب جلیلہ یہ ہے لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ ۔۔۔۔ (نحل:44) آپ صلی اللہ علیہ وسلّم نے ہی لوگوں کو متعین کر کے، واضح کر کے بیان کرنا ہے کہ جو کچھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا اس کا مفہوم کیا ہے اور اس سے کیا مراد لی جائے۔ لہٰذا قرآن کا مفہوم پوچھنے کے لیے بھی بارگاہ رسالت صلی اللہ علیہ وسلّم سے ہی رجوع کرنا پڑے گا۔ یہ آیہء کریمہ مدنی ہے۔ جب یہ آیہء کریمہ نازل ہوئی تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم نے شراب کی ممانعت فرما دی۔ لوگوں کے گھروں میں شراب کا اتنا ذخیرہ تھا، اتنے بھرے ہوئے مٹکے تھے کہ مدینہ منورّہ کی گلیوں میں شراب بہنے لگی۔ کسی نے یہ نہیں کہا کہ شراب نوشی مدتوں کی عادت تھی، باپ دادا سے آ رہی ہے، آہستہ آہستہ جائے گی۔ کسی کو یہ

اجازت نہ دی گئی بلکہ حکم دیا گیا کہ آج سے شراب نوشی ممنوع ہے اور اسی وقت سے شراب حرام ہے۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلّم نے منادی کرادی تو لوگوں نے اتنی شراب مٹکے اٹھا کر گلیوں میں گرائی کہ گلیاں بہہ نکلیں۔ چھ مہینے تک اگر کبھی بارش ہوتی تو زمین سے جھاگ اٹھتی اور بلبلے بنتے تھے، صرف مدینہ منورہ میں اتنی شراب بہائی گئی۔

کھجور سے ایک رس نکالتے ہیں جو تازہ پیا جائے تو اس میں نشہ نہیں ہوتا لیکن اگر آپ اسے آج نکال کر رکھ دیں اور کل صبح پئیں تو اس میں نشہ ہوتا ہے، اسے نبیذ کہتے ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم نے یہاں تک وضاحت فرما دی کہ نبیذ اگر تازہ ہے تو درست ہے لیکن اگر ایک دن گزر گیا اور باسی ہو گیا تو اس میں نشہ پیدا ہو جاتا ہے، وہ حرام ہے لہٰذا شراب کی حرمت میں کوئی رائی برابر شبہ کی گنجائش باقی نہیں ہے۔ قطعاً حرام ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کے حکم سے حرام ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کا حکم ہی اللہ کا حکم ہے۔ اس آیہ کریمہ کا معنی وہی ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلّم نے سمجھایا اور جس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کے سامنے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے عمل کیا، وہی معنی مقبول ہے۔ آج کے دانشور شراب نوشی کے جواز میں جو چور دروازے ڈھونڈ رہے ہیں، یہ دین کے خلاف اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کی حکم عدولی ہے۔

جُوا، تجارت اور سود میں فرق:

یہی حرمت جوئے پر بھی ہے۔ اقوامِ عالم میں اس کا رواج تھا لیکن عربوں میں جُوا بہت زیادہ تھا۔ فقہاء نے ایک اصول وضع فرمایا کہ جُوا آپ کسے کہیں گے۔ بعض لوگوں نے یہ اعتراض کیا کہ جس طرح ہم خرید و فروخت کرتے ہیں، ایک چیز دس روپے کی لیتے ہیں تو وہ بارہ کی بک جاتی ہے، ایک پچاس کی لیتے ہیں تو وہ ساٹھ کی بک جاتی ہے اور اس کے ساتھ پیسے آجاتے ہیں، یہ لین دین بھی تو ویسا ہی ہے جیسے جوئے میں ہم سو روپے لگاتے ہیں تو پانچ سو آجاتا ہے۔ فرمایا: وَ اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَ حَرَّمَ الرِّبٰوا (البقرہ:275) خرید و فروخت کو اللہ تعالیٰ نے حلال قرار دیا ہے اور ربا اور سود کو حرام قرار دیا ہے۔ تو سود، جُوا اور یہ بیع و شراء، اس میں کیا فرق ہوگا؟ اس کے لیے فقہاء کرام نے، اللہ سب پر کروڑوں رحمتیں فرمائے، ایک بڑا سادہ سا اصول ارشاد فرمایا کہ جس میں نفع یقینی اور نقصان کا اندیشہ ہو، وہ سود ہے۔ آپ کسی کو سو روپے دے کر کہتے ہیں کہ مجھے تم ایک سو دس روپے واپس کرو گے۔ اب اس نے ایک سو دس روپے مجبوراً واپس کرنا ہیں۔ نفع یقینی ہے، اب اس سے آپ پچانوے، نوے، سو نہیں لیں گے بلکہ ایک سو دس ہی لیں گے۔ نقصان کا اندیشہ ہے کہ شاید وہ بندہ مر جائے، شاید وہ پیسے اس کے پاس کبھی نہ آسکیں تو یہ ایک اندیشہ ہے لیکن نفع یقینی ہے۔ نفع یقینی اور نقصان کا اندیشہ ہو تو یہ سود ہے۔ جو شخص جُوا کھیلتا ہے، اسے یقین ہوتا ہے کہ جو رقم داؤ پر لگ رہی ہے

یہ مجھ سے تو گئی لیکن ایک امکان ہوتا ہے کہ شاید میرا داؤ بھی لگ جائے اور مجھے پیسے زیادہ مل جائیں۔ جہاں نقصان یقینی اور نفع موہوم ہو، وہ جُوا ہے۔ جہاں نفع یقینی اور نقصان موہوم ہو، وہ سود ہے اور جہاں نفع نقصان کے برابر امکان ہوں، وہ تجارت ہے، نفع بھی ہوسکتا ہے اور نقصان بھی ہوسکتا ہے۔ آپ ایک چیز خریدتے ہیں، اس کی مارکیٹ میں قیمت گر جاتی ہے تو آپ کا نقصان ہوجاتا ہے لیکن اس کی قیمت زیادہ ہوجاتی ہے تو آپ کو نفع ہوجاتا ہے۔ تو جہاں نفع اور نقصان کا امکان برابر ہو، وہ تجارت ہے۔ جہاں نفع یقینی نقصان موہوم ہو وہ سود ہے، جہاں نقصان یقینی نفع موہوم ہو وہ جُوا ہے۔

لوگوں کو لالچ تو ہوتا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلّم سے شراب اور جوئے کے بارے سوال کرتے ہیں تو انہیں فرما دیجیے کہ ان میں بہت بڑا گناہ ہے۔ فِیْهِمَآ اِثْمٌ كَبِیْرٌ ۔۔۔۔ یہ بہت بڑا جرم ہے۔ یہ ایسا بڑا جرم ہے کہ معاشرے کو تباہ کر دیتا ہے اور اس سے لاکھوں زندگیاں، لاکھوں خاندان اجڑ جاتے ہیں۔ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ ۔۔۔۔ اور کچھ لوگوں کو اس سے نفع بھی ہوتا ہے۔ یقینی بات ہے کہ جو لوگ شراب بنا کر بیچتے ہیں یا جوئے کے اڈے بناتے ہیں تو ایسے چند لوگ اس سے کماتے بھی ہیں لیکن وَ اِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ۔۔۔۔ اس سے جو نقصان ہوتا ہے، جو گناہ ہوتا ہے، جو اللہ کی نافرمانی ہوتی ہے وہ اس منافع کے مقابلے میں کئی گنا بڑی ہے۔

انفاق فی سبیل اللہ:

وَ یَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ ۔۔۔۔ اور یہ سوال بھی کرتے ہیں کہ آخر اللہ کی راہ میں ہم کتنا کچھ خرچ کریں۔ قُلِ الْعَفْوَ ۔۔۔۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم ان سے فرما دیجیے کہ جو آپ کی ضرورت سے زائد ہو، جو آپ آسانی سے خرچ کرسکیں، جسے خرچ کرنے سے آپ کا کاروبار تباہ نہ ہو اور آپ کی روزمرہ کی زندگی خراب نہ ہو۔ جسے خرچ کرنے سے آپ بچوں کا پیٹ پالنے سے محروم ہو جائیں یا گھر کی ضروریات سے محروم ہو جائیں وہ خیرات نہیں ہے۔ اللہ کی راہ میں ضرور خرچ کریں لیکن اس قدر جو آپ کی ضرورت سے زائد ہو اور جو آپ آسانی سے دے سکتے ہوں۔

شریعت کے احکام انسانی مزاج کے عین مطابق ہیں:

كَذٰلِكَ یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰیٰتِ ۔۔۔۔ اس طرح سے اللہ تمام آیات کھول کھول کر بیان فرماتا ہے، چھوٹی چھوٹی چیزیں اور جزئیات واضح طور پر ارشاد فرما دیتا ہے۔ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۱۹﴾ تاکہ تم خود بھی اس پہ تفکر کرو، غور کرو۔ اس کے منافع اور اس کے نقصان کا موازنہ کر کے سوچو تو عقلِ سلیم بھی یہ کہے گی کہ جس میں نفع ایک بندے کو ہوتا ہے اور نقصان لاکھوں کو ہوتا ہے تو اس کے نفع کو دیکھا جائے یا اس کے نقصان کو دیکھا جائے!

شریعتِ اسلامیہ کا کوئی حکم ایسا نہیں جسے صالح مزاج قبول نہ کرے، عقلِ سلیم قبول نہ کرے بلکہ جہاں سے عقل قبول کرنے سے انکار کرتی ہے، وہاں عقل میں فتور آ جاتا ہے۔ احکامِ شریعت عین انسانی مزاج کے مطابق ہیں، اس لیے کہ انسان کا خالق، اس کے مزاج کا خالق اللہ ہے اور اس نظام کو بنانے والا الٰہی قادرِ مطلق ہے اور اس نے یہ عین انسانی مزاج کے مطابق ترتیب دیا ہے۔ اگر کوئی انسان انسانیت سے گر جائے تو بات الگ ہے۔ اس کی سوچیں انسانی مزاج سے گر جائیں، انسانی مقام سے گر جائیں تو یہ الگ بات ہے لیکن احکامِ شرعی عقلِ سلیم بھی قبول کرتی ہے۔ لَعَلَّکُمۡ تَتَفَکَّرُوۡنَ ﴿۲۱۹﴾ تا کہ تم خود بھی اس میں سوچو، تفکر کرو اور دیکھو کہ اس کے نتائج کیا ہیں اور بہتر کیا ہے!

فِی الدُّنۡیَا وَ الۡاٰخِرَۃِ۔۔۔۔ جب سوچتے ہو تو دونوں جہانوں کو سامنے رکھا کرو۔ جب تفکر کرتے ہو تو صرف یہ نہ سوچو کہ جس نے شراب پی وہ تھوڑی دیر مدہوش ہو گیا، اسے دنیا کے غم بھول گئے لیکن کیا اس سے دنیا کے غم خوشی میں بدل جاتے ہیں۔ چند گھنٹوں بعد جب ہوش آئے گا تو وہ سارے دکھ پہلے سے زیادہ ڈراؤنے بن کر پھر سامنے کھڑے ہوں گے، فائدہ کیا ہوا! پھر یہ بھی دیکھو کہ آخرت میں اس کا نتیجہ کیا برآمد ہو گا، صرف یہ نہ دیکھو کہ دنیوی فائدہ ہے۔ جب تفکر کرتے ہو، جب سوچتے ہو تو فِی الدُّنۡیَا وَ الۡاٰخِرَۃِ۔۔۔۔ دنیا اور آخرت، دونوں جہانوں کو سامنے رکھا کرو۔ انسانی اقدار یہ ہیں کہ بندہ دنیا میں باعزت، شریفانہ اور آسانی سے زندگی گزارے اور آخرت میں بھی اللہ کے نزدیک معزز و مکرم ہو، اسے اللہ کی رحمت نصیب ہو۔ اگر کوئی ایسا کام ہے جو دنیا کی دولت دیتا ہے لیکن آخرت کو تباہ کرتا ہے تو یہ بڑا خراب سودا ہے کہ دنیا وقتی اور عارضی ہے اور آخرت کو دوام ہے۔ دائمی زندگی کو وقتی اور لمحاتی لذات کے لیے تباہ کرنا کون سی دانش مندی ہے؟ یعنی اگر تم سوچو تو دنیا و آخرت کو سامنے رکھ کر سوچا کرو۔

یتیموں کی دیکھ بھال:

وَ یَسۡـَٔلُوۡنَکَ عَنِ الۡیَتٰمٰی۔۔۔۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھتے ہیں کہ جو یتیم بچے رہ جاتے ہیں اور ورثاء کی کفالت میں آ جاتے ہیں ان کا کیا کیا جائے۔ قُلۡ اِصۡلَاحٌ لَّہُمۡ خَیۡرٌ۔۔۔۔ فرما دیجیے بھلائی اس میں ہے کہ ان کے ساتھ بہتر سلوک کرو اور انہیں بہتر طریقے کی تربیت دو۔ جس طرح اپنی اولاد کی فکر کرتے ہو، جس طرح اپنی اولاد کو پالتے ہو، اگر بھائی کا، بہن کا، بھتیجے کا، کسی عزیز کا کوئی یتیم بچہ تمہارے گھر میں آ گیا ہے، اس کا مدار تم پر ہے یا اسے اور کوئی سنبھالنے والا نہیں ہے تو فرما دیجیے ان کی مصلحت، ان کی بہتری جس میں ہو، وہ کام کرو، ان سے ویسا رویہ اختیار کرو۔ اگر وہ یتیم مالدار بھی ہے، اس کا والد اس کے لیے جائیداد چھوڑ گیا، مال چھوڑ گیا وَاِنۡ تُخَالِطُوۡہُمۡ فَاِخۡوَانُکُمۡ۔۔۔۔ اور اگر وہ مال تم اپنے مال سے ملا لیتے ہو مل جل کر گزارا کرتے ہو تو وہ تمہارے بھائی ہیں۔

اپنے مال سے بھی اخراجات کرتے ہو، اس کے مال سے بھی کرتے ہو لیکن اصلاح کی بات سامنے رکھو۔ یہ نہ ہو کہ اس کا مال کھانا شروع کر دو اور اپنا بچانا شروع کر دو۔ اصلاح کی بات ذہن میں رہے وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ ۔۔۔۔ اور اللہ کریم فساد کرنے والوں کو بھی جانتے ہیں اور اصلاح کرنے والوں کو بھی، اگر تم اس کا نقصان کرو گے تو یہ فساد ہے۔ اگر اس کا جائز مال بھی اپنے ساتھ ملا کر خرچ کرتے ہو، جتنی ضرورتیں اس کی ہیں اتنی ہماری ہیں، چار بندے ہم ہیں دو بندے یہ ہیں، تو دو حصے ہمارا خرچ ہو اور ایک ان کا ہو جائے تو کوئی حرج نہیں لیکن اگر تم یہ کہو کہ یہ یتیم ہے، چھوٹا بچہ ہے، اسے تو سمجھ نہیں ہے، ہم اس کا مال کھالیں تو یہ فساد ہوگا۔ اصلاح کا عمل سامنے رہے جس میں ان کا مال بھی بچے، ان کی آبرو بھی بنے، انہیں علم بھی حاصل ہو، وہ بہتر انسان اور بہتر مسلمان بن سکیں۔ اور اللہ جانتا ہے کہ کون فساد پیدا کر رہا ہے اور کون اصلاح کی محنت کر رہا ہے۔

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَعْنَتَكُمْ ۔۔۔۔ اللہ قادر ہے، وہ چاہتا تو تمہیں بھی رلا دیتا، تم بھی در بدر کی ٹھوکریں کھا رہے ہوتے۔ آج اگر کوئی یتیم و بے کس تمہارے آسرے پر ہے تو وہ ایسا قادر ہے کہ تمہیں بھی محتاج کر کے در بدر بھٹکنے دیتا۔ اس بات کو یاد رکھو! اس کا تم پر یہ احسان ہے کہ اس نے تمہیں در بدر نہیں کیا، کسی کو تمہارا محتاج کر دیا۔ اللہ کی عظمت کو سامنے رکھتے ہوئے جو کچھ کرو، وہ اس یتیم کی بہتری کے لیے کرو۔ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۲۰﴾ کیونکہ اللہ بہت زبردست ہے، جو چاہے کر سکتا ہے مگر وہ حکیم ہے اور یہ اس کی حکمت کا تقاضا ہے کہ اپنی حکمت کے مطابق ہی امور کو سرانجام دیتا ہے۔

نکاح ایک معاہدہ ہے جو ایک خاتون اور ایک مرد کے درمیان اللہ کے نام پہ کیا جاتا ہے اور یوں وہ دو بندے مل کر ایک نئے خاندان کی بنیاد رکھتے ہیں کہ نسلِ انسانی کی بقاء کے لیے ایک سبب بنے۔ اس لیے اس معاہدے کی اولین شرط یہ ہے کہ ایمان ہو۔ وَ لَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ ۔۔۔۔ مسلمان مردوں کو حکم دیا گیا کہ مشرک عورتوں سے نکاح درست نہیں ہے۔ جہاں ایمان ہی نہیں ہے، وہاں اللہ کے نام کا معاہدہ کیسے ہوگا۔

کیا اہلِ کتاب عورتوں سے نکاح جائز ہے:

یہاں ایک اور بڑا نازک سوال ہے جو اکثر زیرِ بحث رہتا ہے کہ اہلِ کتاب کی خواتین سے نکاح کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ جواب: اہلِ کتاب کا ذبیحہ کھانے کی اجازت ہے، اہلِ کتاب کی عورتوں سے شادی کرنے کی اجازت ہے لیکن شرط یہ ہے کہ وہ اہلِ کتاب ہوں، مشرک نہ ہوں چونکہ مشرک سے تو یہ ابتدا ہی میں منع کر دیا گیا وَ لَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰت ۔۔۔۔ اللہ کریم کی جتنی کتابیں نازل ہوئی ہیں اور جتنے صحیفے نازل ہوئے، جتنے نبی علیہ السلام

مبعوث ہوئے، ہر نبی علیہ السلام نے اور ہر کتاب نے سب سے پہلے توحید باری کی بات کی ہے کہ اللہ وحدہٗ لاشریک ہے۔اب اگر دورِ حاضر کا کوئی یہودی یا عیسائی خود کو اہلِ کتاب کہتا ہے لیکن اس کا عقیدہ یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بیٹے تھے تو وہ اہلِ کتاب تو نہ رہا، وہ تو مشرک ہو گیا۔اسی طرح کوئی یہودی یہ عقیدہ رکھے کہ حضرت عزیر علیہ السلام اللہ کے بیٹے تھے تو وہ اپنی کتاب کا بھی منکر ہو گیا، اہلِ کتاب کیسے رہا! ہر کتاب نے توحید باری کا ہی درس دیا ہے، جس نبی علیہ السلام پہ کتاب نازل ہوئی، اس کی نبوت کی تصدیق کی ہے۔

خلافتِ فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں جب فتوحاتِ اسلامی پھیلیں اور عیسائی ممالک بھی زیرِ نگیں آئے تو بعض مجاہدین نے عیسائی عورتوں سے نکاح کیے کہ اہلِ کتاب سے نکاح جائز ہے۔ یہ بات امیر المومنین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے علم میں لائی گئی تو آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے وہ سارے نکاح باطل قرار دیے اور ساری عورتیں واپس کرا دیں۔ فرمایا: یہ تو مشرک ہیں، ان سے نکاح جائز نہیں۔ وَ لَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ مشرک عورتوں سے نکاح جائز نہیں ہے۔ جب عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا مانتے ہیں تو یہ اہلِ کتاب کہاں رہے، یہ تو مشرک ہیں۔ آج کے عیسائیوں سے نکاح کا بالکل ہی کوئی جواز نہیں ہے۔ کسی کتاب میں شرک کی اجازت نہیں ہے اور کوئی مشرک اہلِ کتاب نہیں کہلا سکتا۔ اب تو وہ کتابیں ہی ناپید ہو گئی ہیں جن کی بناء پر یہ اہلِ کتاب کہلا سکتے تھے۔انہوں نے اتنی تبدیلیاں کیں کہ جو کتابیں نازل ہوئی تھیں، ان کا وجود ہی مشکوک ہو گیا۔اب کلیسا نے مرد کا مرد سے اور عورت کا عورت سے شادی کرنا جائز قرار دے دیا تو یہ کون سی کتاب میں ہے۔انہوں نے اتنی بڑی تبدیلیاں کیں کہ اصل کتابیں رہی ہی نہیں۔ لہٰذا یہ مسئلہ بالکل صاف ہے اور اس میں کسی شبہے کی گنجائش نہیں ہے۔عہدِ حاضر کے یہودی اور عیسائی اہلِ کتاب نہیں، یہ مشرک ہیں اور ان پر وہی احکام وارد ہوں گے جو مشرکین لیے کے ہیں۔

وَ لَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ ۔۔۔ جب تک وہ ایمان نہیں لے آتے، کلمہء اسلام نہیں پڑھ لیتے اور چونکہ کسی مسلمان مرد کا نکاح کسی مشرک یا کافر عورت کے ساتھ درست نہیں، تو وہ نکاح منعقد ہی نہیں ہوتا وَ لَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ اور اگر کوئی کنیز یا لونڈی یا غلامہ ایماندار ہو تو مشرک عورت خواہ اس کا چہرہ آپ کو بڑا دل لبھانے والا لگے وَ لَوْ اَعْجَبَتْكُمْ ۔۔۔ اور تمہیں بہت بھلی معلوم ہوتی ہو تو بھی اس مشرک عورت سے نکاح درست نہیں ہے۔اس سے وہ کنیز یا وہ لونڈی بہتر ہے جو غلامہ تو ہے لیکن مسلمان ہے۔

اسلام کے عہدِ رفتہ میں غلامی کا تصور:

کنیز، لونڈی یا غلامہ کا موضوع بھی زیر بحث رہتا ہے اور اس پہ بڑی لے دے ہوتی ہے۔ ہمارے روشن خیال اس پر بڑے سیخ پا ہوتے ہیں کہ اسلام نے کنیزیں اور لونڈیاں جائز قرار دیں لیکن اس کے پسِ پردہ جو عوامل ہیں اور جو اس کا سبب ہیں وہ اس سے واقف نہیں ہیں۔ قبل از اسلام یہی کچھ ہوتا تھا جو آج اقوامِ مغرب یا آج کے کافر کر رہے ہیں۔ روس نے افغانستان پر قبضہ کیا تو کیا حشر ہوا؟ یہ جاننے والے جانتے ہیں اور اس سے پہلے خود روس میں جب کمیونزم آیا تو جو مسلمان ریاستیں کمیونزم کی لپیٹ میں آئیں، ان کا کیا حشر ہوا؟ یہ بھی جاننے والے جانتے ہیں۔ عیسائیوں نے جو ممالک فتح کیے، یہودی جہاں جہاں پہنچے، وہاں کس طرح عزتیں پامال ہوئیں اور خواتین کا کیا حشر ہوا اور کس بے دردی سے مردوں اور بچوں کو قتل کیا گیا؟ یہ بھی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ عہدِ حاضر میں بھی جہاں جہاں کافر فوجیں قبضہ کرتی ہیں، وہاں کیا حشر ہوتا ہے! یہ سب جانتے ہیں۔

اسلام میں بھی جہاد ہوا اور ممالک مفتوح ہوئے۔ وہ لوگ جو تلوار لے کر میدان میں آتے، لڑتے اور مارے جاتے اور ان کے بیوی بچے رہ جاتے یا اگر کوئی قید ہو جاتا اور اس کے بیوی بچے بھی قید ہو جاتے تو وہ غلام اور اس کی بیوی غلامہ بن جاتی۔ ان کی آزادی تو سلب ہو جاتی تھی لیکن بیوی بچے ساتھ ہی رہتے تھے۔ وہ خواتین جن کے مرد قتل ہو جاتے اور کوئی پرسانِ حال نہ رہتا یا وہ مسلمانوں کی قید میں آتیں تو ان کی آزادی سلب ہو جاتی، وہ کنیزیں بن جاتیں لیکن باقاعدہ طور پر امیرِ لشکر ایک خاتون کسی ایک مرد کے سپرد کرتا جو اس کے کھانے، پینے، لباس، اس کی سہولیات کا ذمہ دار ہوتا اور اس کے لیے وہ بطورِ کنیز بغیر نکاح کے بھی حلال ہوتی۔ چاہتا تو کسی دوسرے مسلمان کے ہاتھ بیچ دیتا لیکن اگر دوسرے کو دے دیتا تو پھر اس کے اپنے لیے حرام ہو جاتی تھی اور اُس دوسرے پر حلال ہوتی تھی جسے دے دی گئی پھر یہ ترغیب بھی دی گئی کہ اگر وہ ایمان لے آئے تو اس سے نکاح کر لو۔ اگر کنیز سے نکاح ہو جاتا تو پھر وہ کنیز نہیں رہتی تھی، اس کا مرتبہ بدل جاتا، پھر وہ بیوی بن جاتی اور اسے بیوی والے سارے اکرام اور اعزازات حاصل ہو جاتے تھے۔ کسی کے پاس بحیثیت کنیز تھی اور اس کی اولاد ہو گئی تو پھر اسے بیچنے کا اختیار ختم ہو جاتا تھا اور اسے ام ولد کہا جاتا تھا کہ یہ بچوں کی ماں ہے اور اب اس کی بقیہ عمر کا ذمہ دار بھی وہ ہے جس کے بچے کی وہ ماں ہے۔

غلام اور کنیز کے لیے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم یہ تھا کہ جیسا خود کھاتے ہو ویسا انہیں کھلاؤ، جیسا خود پہنتے ہو ویسا انہیں پہناؤ اور جو کام یہ نہیں کر سکتے، اس کا انہیں حکم مت دو یعنی کوئی غیر انسانی یا ظالمانہ سلوک ان سے نہ کیا جائے۔ اتنے بڑے جرم کی سزا کہ وہ خلافِ اسلام تلوار لے کر میدان میں لڑیں صرف یہ تھی کہ ان کی آزادی سلب ہو جاتی۔ اسلام نے غلام اور کنیزیں آزاد کرنے کا حکم بطور کفارہ یا بطور خیر بھی دیا۔ غلطی ہو جائے تو ایک غلام آزاد کر دو،

ایک کنیز آزاد کردو۔ انہیں کفارے کے طور پر، صدقے کے طور پر آزاد کرو۔ غلاموں اور کنیزوں کو آزاد کرنے کے لیے اتنی ترغیب دی گئی کہ تاریخی اعتبار سے مسلمانوں نے جو آخری غلام آزاد کیا وہ فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ، کے زمانے میں تھا اور اس کے بعد کوئی کنیز یا کوئی غلام کہیں نظر نہیں آیا۔

یہ تو ایک عہد کی بات تھی کہ جب کوئی مفتوح ہو جاتا اور قید ہو جاتا یا مارا جاتا تو اس کے بیوی بچوں کا کوئی پرسانِ حال نہ ہوتا۔ اسلام نے ان لوگوں کو تحفظ دیا اور انہیں در در کی ٹھوکروں سے بچایا۔ لیکن آج کے فاتح عورتوں کی اجتماعی آبرو ریزی کرتے ہیں، انہیں تباہ کر دیتے ہیں، انہیں برباد کرتے ہیں۔ اسلام نے اسے صرف ایک بندے کے لیے حلال قرار دیا، جسے وہ دی گئی ہو۔ پھر اس کے ساتھ اس کے اعزاز و اکرام اور اس کی آزادی پر بھی اجر کے وعدے فرمائے۔

فرمایا، نکاح کے لیے ایمان شرط ہے، مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو اور مشرک عورت کی بجائے کسی کنیز سے نکاح کر لو اگرچہ وہ مشرک اس سے شکل میں خوبصورت ہی ہو۔ اسی طرح مسلمان عورتیں وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ۔۔۔۔ کسی مشرک مرد سے نکاح نہ کریں جب تک وہ ایمان نہیں لے آتا۔

جہاں تک اہلِ کتاب کا تعلق ہے تو فطرتاً گھر میں مرد بالا دست ہوتا ہے اور عورت اور بچے اسی راستے پہ چلتے ہیں جس پر مرد چلتا ہے۔ اہلِ کتاب کے ساتھ نکاح کی جو رخصت دی گئی وہ یہ تھی کہ اہلِ کتاب کی عورتوں سے مسلمان مرد نکاح کر سکتے ہیں لیکن اہلِ کتاب مردوں سے مسلمان عورت کو نکاح کی اجازت نہیں دی گئی۔ وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكُمْ۔۔۔۔ اگر مشرک مرد خوبصورت بھی ہو تو اس کی بجائے غلام اگر مومن ہو تو وہ اچھا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ نکاح کی یہ مشارکت صرف دنیا کی بات نہیں ہے۔ جب دو بندے ملتے ہیں تو ایک دوسرے کا اثر لیتے ہیں۔ ان کی زندگی ایسے راستے پہ چل پڑتی ہے جس سے آخرت بھی تعمیر ہوتی ہے۔ اگر مشرک مرد یا عورت کے ساتھ نکاح کرو گے تو وہ تمہاری زندگی میں بھی شرک کی خباثتیں بکھیر دے گا۔

اُولٰٓئِكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ مشرک تو دوزخ کے سفیر ہیں، دوزخ کے داعی ہیں، مشرک تمہیں دوزخ کی طرف لے جائیں گے۔ مشرک کے ساتھ نکاح سے منع فرمایا تو اس کی بہت بڑی وجہ جو اللہ کریم نے قرآنِ کریم میں ارشاد فرمادی وہ یہ ہے کہ مشرک کے ساتھ اگر اتنا گہرا رابطہ ہوگا جتنا نکاح کا قرب ہوتا ہے تو پھر خطرہ اس بات کا ہے کہ وہ تو دوزخ کا داعی ہے، تمہیں بھی کھینچ کر کہیں جہنم میں نہ لے جائے۔ دنیوی زندگی مقصود نہیں بلکہ مقصد تو آخرت ہے، آخرت کی کامیابی ہے، رضائے باری ہے اور دنیوی زندگی تو اس کا سبب ہے۔ مشرک خاوند یا بیوی کی صورت اگر ایسا ساتھ مل گیا جو گناہ کی طرف لے جائے تو نتیجہ آخرت کی بربادی ہوگا۔ یہاں سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ بدکاروں کی صحبت اور برے لوگوں کی سنگت بھی درست نہیں ہوتی۔

صالحین اور بدکاروں کی صحبت:

صحبتِ صالح ترا صالح کنند
صحبتِ طالح ترا طالح کنند

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کے فرمان کا ترجمہ ہے: ''اچھے اور بُرے دوست کی مثال مُشک بیچنے والے اور بھٹی دھونکنے والے لوہار کی طرح ہے۔ مُشک بیچنے والے کی صحبت سے تم کو کچھ فائدہ ضرور پہنچے گا مشک خرید لو گے یا مُشک کی خوشبو پالو گے لیکن لوہار کی بھٹی تمہارا گھر یا کپڑے جلائے گی اور اس کی بدبو تو تمہارے دماغ تک پہنچے گی۔ (بخاری)

گویا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کے ارشاد کا مفہوم ہے کہ اگر کسی برے آدمی کے ساتھ بیٹھنا اٹھنا شروع کرو گے تو وہ ایسا ہی ہے جیسے لوہار کی دکان پہ جا بیٹھے۔ خطرہ تو یہ ہے کہ جل جائے یا کوئی جلتا ہوا لوہے کا ٹکڑا اس پر آن گرے لیکن اگر اس سے بچ بھی گیا تو جتنی دیر بیٹھا رہا اتنی دیر تپش اور دھواں تو اسے پہنچتا رہے گا۔ نیک لوگوں کی صحبت ایسی ہے جیسے آپ کسی عطر فروش کی دکان پر جا کر بیٹھتے ہیں۔ ہوسکتا ہے آپ کوئی عطر خرید ہی لیں اور خریدیں نہیں تو بھی، ہوسکتا ہے وہ آپ کو تحفتاً تھوڑا سا لگا دے، کچھ حصہ تو مل جائے۔ اگر ایسا بھی نہ ہو تو جتنی دیر بیٹھے رہیں گے دماغ معطر رہے گا، دل خوش رہے گا، خوشبو تو آتی رہے گی۔ صالحین کی صحبت عطر فروش کی دکان ہے، بدکاروں کی صحبت لوہار کی دکان ہے۔

اگر وقتی طور پر جو مجلس ہے، ملنا جلنا یا بیٹھنا اٹھنا ہے، اس میں احتیاط ضروری ہے تو ایک دائمی رفاقت، عمر بھر کی رفاقت اور ایسی پختہ رفاقت جو آخرت میں بھی نہیں ٹوٹے گی، جس کے بارے میں پوچھا جائے گا اور وہ رشتہ ہمیشہ قائم رہے گا، تو اس میں مشرک اور مومن کس طرح شریک ہوسکتے ہیں؟ لہٰذا نکاح کی بنیادی شرط ایمان ہے۔

اُولٰٓئِكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ۔۔۔ اس لیے کہ مشرک تو دوزخ کے داعی ہیں، خود بھی دوزخ کی طرف جا رہے ہیں اور جو ساتھ ملے گا، اسے بھی اسی طرف بلائیں گے۔ وَ اللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلَى الْجَنَّةِ وَ الْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِهٖ ۔۔۔ اور اللہ جنت کی طرف بلاتا ہے اور بخشش کی طرف بلاتا ہے۔ اب یہاں دیکھیں کیسی باریک بات ارشاد فرمائی ہے کہ دوزخ کی دعوت کو مشرکین کے ذمے لگایا ہے کہ یہ دوزخ کی طرف بلاتے ہیں لیکن کسی نیک کی سنگت ملتی ہے، کسی نیک سے نکاح ہوتا ہے تو وہ اسے جنت کی طرف بلاتا ہے لیکن اس بلانے کی نسبت ربّ کریم نے اپنی طرف دی ہے۔ وَ اللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلَى الْجَنَّةِ ۔۔۔ کہ اس کا بلانا میرا بلانا ہے، میرے بندے کا بلانا اس کی ذات کے لیے تو نہیں ہے، وہ اپنے کسی فائدے کے لیے تو نہیں بلا رہا، وہ اپنے کسی مقصد کے لیے تو نہیں بلا رہا، وہ میری رضا کے لیے،

میرے قرب کے لیے بلا رہا ہے۔ اس لیے اس کی دعوت ایسے ہے جیسے اللہ کریم دعوت دے رہے ہوں۔

وَاللّٰهُ يَدْعُوٓا اِلَى الْجَنَّةِ ۔۔۔۔اللہ تو اپنے بندوں کو جنت کی طرف دعوت دیتا ہے وَالْمَغْفِرَةِ۔۔۔۔ اور بخشش کی طرف دعوت دیتا ہے۔ بندہ مومن جب آپ کو نیکی، اللہ کی رضا، اللہ کی بخشش اور اللہ کی جنت کی دعوت دیتا ہے تو اس کی عظمت یہ ہے جیسے خود اللہ کریم آپ کو دعوت دے رہے ہوں۔

وَيُبَيِّنُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۲۱﴾ اللہ کریم نے کسی بات میں کوئی ابہام نہیں رکھا۔ تمام باتیں بڑی وضاحت کے ساتھ اور بڑی کھول کر بتلا دی ہیں تا کہ لوگ نصیحت حاصل کریں۔ لوگوں کو عقل دی ہے، شعور دیا ہے، وہ خود سوچیں، اپنی حیاتِ عارضی اور ابدی زندگی کے متعلق سوچیں، اپنی زندگی اور اپنی موت کے بارے فکر کریں اور اپنا تجزیہ کریں۔ یہ ایک اصولی بات ہے جسے ہم بھولے رہتے ہیں۔

سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ، فرمایا کرتے تھے کہ اپنا محاسبہ کرو، اپنا حساب کتاب خود کیا کرو اس سے پہلے کہ تم سے حساب کتاب لیا جائے۔ آج اگر ہم اپنا تجزیہ کریں گے تو ہمارے پاس فرصت ہے کہ جہاں غلطی ہو رہی ہے اس کی اصلاح کریں۔ جہاں سے ہم غلط جا رہے ہیں وہاں سے واپس آجائیں لیکن کل میدانِ حشر میں پرسش ہوگی۔ جب پوچھا جائے گا تو یہ فرصت نہیں ہوگی کہ اب اصلاح کر سکیں۔ اس آیہ کریمہ کا مفہوم بھی یہی ہے لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۲۱﴾ تا کہ لوگ نصیحت حاصل کریں۔ اپنا احتساب کریں، اپنا محاسبہ کریں، اپنا جائزہ لیں کہ میری سوچیں، میری فکر، میرا کردار، میرے اعمال مجھے کس طرف لے کر جا رہے ہیں!

کفار اور مشرکین اپنے آپ کو اہلِ کتاب کہتے ہیں لیکن واقعتاً مشرک ہیں چونکہ کوئی بھی اہلِ کتاب کسی بھی نبی علیہ السلام کی توہین نہیں کرتا۔ ایمان لانا یا نہ لانا، ایک اور بات ہے لیکن کسی نبی علیہ السلام کی توہین کرنے کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ مسلمانوں کا تو عقیدہ یہ ہے کہ اللہ کے ہر نبیؑ پر ایمان لانا اتنا ہی ضروری ہے جتنا آقائے نامدار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا ضروری ہے۔ ہر نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام، جسے بھی اللہ نے مبعوث فرمایا، خواہ ہم جانتے ہیں یا نہیں جانتے، ہم برحق مانتے ہیں۔ جب نبی علیہ السلام مانتے ہیں تو پھر کسی گستاخی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ اہل کتاب جن کا اپنی کتاب پر ایمان تھا، وہ اگرچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر ایمان نہ لائے لیکن نبوت پر اعتراض اور بہتان تراشی نہیں کرتے تھے۔ چونکہ آج کے اہلِ کتاب مشرک ہیں، اس لیے ایسا کرتے ہیں۔

شانِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم میں گستاخی کا جواب کیسے دیا جائے:

بعثتِ عالی سے لے کر آج تک اس بہتان تراشی کی بھی ایک لمبی تاریخ ہے۔ زمانہ عہد رسالت صلی اللہ علیہ وسلم میں بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا پہنچائی گئی، تکلیفیں دی گئیں، بہتان تراشی کی گئی، طعن و تشنیع کی گئی اور تب سے اب تک دنیا کے سب سے بدترین، بدنصیب ترین لوگ وہ ہیں جو اس مرض میں مبتلا ہوتے ہیں اور اللہ کریم جنہیں رسوا کرنا چاہتا ہے۔

چوں خدا خواہد کہ پردہ کس درد
میکش اندر طعنِ نیکاں کند

جب اللہ کسی کو رسوا کرنا چاہتا ہے تو اس کی زبان پر نیک لوگوں کے لیے برے الفاظ جاری ہوتے ہیں، طعن و تشنیع جاری ہو جاتی ہے۔ یہ بھی عذاب کی ایک قسم ہے لیکن الحمدللہ جہاں کوئی علمی بات ہوئی مسلمانوں نے اس کا علم سے جواب دیا۔ جہاں تلوار کی ضرورت پیش آئی، مسلمانوں نے تلوار سے جواب دیا، جہاد سے جواب دیا اور تب سے اب تک شانِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم میں گستاخی کے مرتکب بے شمار ایسے لوگ مسلمانوں کے ہاتھوں واصل جہنم ہوتے چلے آئے۔ خود برصغیر کی تاریخ میں ایسے لوگ موجود ہیں جنہوں نے گستاخان رسول کو تہہ تیغ کیا اور اپنی جان نچھاور کر دی، پھانسی قبول کر لی۔ آج اگر کسی مشرک نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر کوئی طعن کیا تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہے لیکن آج تک یہ ہوتا رہا کہ اس کا جواب اگر علمی تھا تو مسلمان علم سے دیتے رہے، تلوار کی ضرورت پیش آئی تو تلوار سے جواب دیتے رہے، جان کی ضرورت پیش آئی تو جان پر کھیل کر دیتے رہے۔ اب اس میں ایک نئی روش یہ آگئی ہے کہ مشرکین نے گستاخی کی ہے تو بازار میں نکلو، شور کرو، مسلمانوں کی دکانیں جلا دو، مسلمانوں کی بسیں جلا دو، مسلمانوں کو قتل کر دو۔ یہ کون سا جوب ہے! یہ کیسی قوم ہے، یہ کیسے لیڈر ہیں، ان کی سوچ کیا ہے اور یہ کیا چاہتے ہیں؟

ایک کافر گستاخی کرتا ہے تو آپ سیخ پا ہو جاتے ہیں۔ لیکن ہم اپنا جائزہ لیں کہ صبح سے شام تک ہمارے کردار میں کہاں کہاں شانِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم میں گستاخی کا پہلو نکلتا ہے! کیا حکم عدولی کو آپ گستاخی نہیں سمجھتے؟ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رحمت اللعالمین جیسی ہستی حکم دے اور بندہ نہ مانے، کیا یہ گستاخی نہیں ہے؟ مشرکین کو بھی جرأت اس لیے ہو رہی ہے کہ خود مسلمان اس کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ پھر انہیں سے کیا لینا دینا، جو جی چاہے کریں لیکن کاش! ہم اپنا جائزہ لیتے۔ ہماری زندگی میں کتنے مواقع آتے ہیں، بیاہ شادیاں ہوتی ہیں۔ اگر کسی کو کہا جائے کہ سنّت کے مطابق کرو اور یہ فضولیات نہ کرو تو وہ کہتا ہے، بات تو ٹھیک ہے لیکن ناک کٹ جائے گی۔ خاندان میں ہماری

عزت نہیں رہے گی۔ اب جو حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کے حکم ماننے کو اپنی توہین سمجھتا ہے، کیا یہ کفر نہیں ہے؟ میں سمجھتا ہوں کہ جو بندہ یہ کہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم نے جو حکم دیا اسے ماننا میری توہین ہے، وہ کافر ہے۔ یہ میرا ایمان ہے۔ میں نہیں جانتا کہ فتویٰ کیا ہے لیکن میرا یہ ایمان ہے۔ اگر کوئی یہ کہے کہ میں اس حکم کی تعمیل نہیں کر سکتا لیکن حق وہی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا اور جو میں کر رہا ہوں، یہ غلط ہے تو وہ گناہ گار ہے لیکن جو یہ کہے کہ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا اس میں میری توہین ہے تو وہ کافر ہے۔ یہ شادی، جنازے کی رسمیں ہی دیکھ لو! لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم نے اگر بہت بڑی دعوت نہ کی تو ہماری توہین ہوگی۔ سنت کے مطابق جنازے کو دفن کرنا پسند نہیں کیا جاتا کہ اس میں ہماری توہین کا پہلو ہے۔ ہم تو بڑے لوگ ہیں، ہمیں تو وہ رسمیں ادا کرنی ہیں جو بادشاہوں اور شہنشاہوں کے ساتھ ہوتی ہیں۔

تو کافر پہ اتنے سیخ پا ہونے والے مسلمان کبھی اپنی زندگی کا جائزہ بھی لیتے ہیں یہ ہماری بدنصیبی ہے کہ ہم اتباعِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلّم سے اتنے دور ہو گئے کہ آج کافر کو گستاخی کی جرأت ہو رہی ہے کہ یہ تو خود نہیں مانتے، یہ ہمارا کیا کریں گے؟ پھر ہمارا ردعمل کیا ہے، دکانیں لوٹ لیں، گاڑیاں جلا دیں، ایک غریب مسلمان کو برباد کر دیا، ایک کو قتل کر دیا، یہ کیا ردعمل ہے!

میرے بھائی! قرآن نصیحت ہے، ارشاداتِ عالی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نصیحت ہیں اور دعوتِ فکر دیتے ہیں کہ سب سے پہلے اپنے آپ کو تلاش کرو کہ میں کہاں ہوں! دوسرے کا بھلا تو وہ کر سکے گا جو خود اپنا بھلا کر سکے، خود کو راہ ہدایت پہ لے آئے، خود کو اتباعِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلّم پر لے آئے، خود کو حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کی غلامی کا اسیر بنا لے، تب وہ دوسرے کے لیے بھی کوئی بہتری کر سکے گا۔ جو خود راہ گم کردہ ہے وہ دوسرے کی راہنمائی کیسے کر سکے گا! اگرچہ معاشرت کے مسائل چل رہے ہیں، قرآن نے یہاں دعوتِ فکر بھی دی ہے۔ مسلمان کی معیشت ہو یا معاشرت ہو یا سیاست ہو، سارا ہی دین ہے۔ مسلمان کی دنیا بھی دین ہے، اس لیے کہ وہ دنیا کا بھی ہر کام اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلّم کے حکم سے کرتا ہے، اطاعت سے کرتا ہے اور اطاعت ہی دین ہے۔ تو مسلمان کی دنیاداری بھی دین بن جاتی ہے اور کافر کا دین بھی دنیا ہے کہ وہ دنیا کے لالچ کے لیے مختلف رسومات کی پابندی کرتا ہے، یہ کروں گا تو مجھے دنیا میں یہ مل جائے گا یہ کروں تو یہ مل جائے گا، لہٰذا، کافر کا دین بھی دنیا ہوتا ہے اور مومن کی دنیا بھی دین ہے۔ اللہ کریم ہمیں توفیق دے کہ ہم اپنے آپ کو تلاش کریں اور خود کو محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کے نقوشِ پا پہ کھڑا کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔ آمین!

سورۃ البقرہ رکوع 28 آیات 222 تا 228

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ ط قُلْ هُوَ اَذًى لا فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِي
الْمَحِيْضِ لا وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ ج فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَاْتُوْهُنَّ مِنْ
حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ ط اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ ﴿۲۲۲﴾
نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ ص فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ ز وَقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ ط
وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ ط وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۲۲۳﴾ وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ
عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْا وَتَتَّقُوْا وَتُصْلِحُوْا بَيْنَ النَّاسِ ط وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ
عَلِيْمٌ ﴿۲۲۴﴾ لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا
كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ ط وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۲۲۵﴾ لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ
تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ ج فَاِنْ فَآءُوْ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۲۶﴾ وَاِنْ عَزَمُوا
الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۲۷﴾ وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ
قُرُوْٓءٍ ط وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْٓ اَرْحَامِهِنَّ اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ
بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ط وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا
اِصْلَاحًا ط وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ص وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ
دَرَجَةٌ ط وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۲۸﴾

اور آپ سے حیض کے بارے پوچھتے ہیں فرما دیجیے وہ ناپاکی ہے لہٰذا حیض میں
عورتوں سے کنارہ کش رہو اور جب تک پاک نہ ہو جائیں ان سے مقاربت نہ کرو

پھر جب پاک ہو جائیں تو ان کے پاس جاؤ جس طریقے سے اللہ نے تم کو اجازت دی ہے یقیناً اللہ توبہ کرنے والوں کو دوست رکھتے ہیں اور پاک رہنے والوں کو دوست رکھتے ہیں ﴿۲۲۲﴾ تمہاری بیویاں تمہارے لیے کھیتیاں ہیں سو اپنی کھیتی میں جس طرح چاہو آؤ اور اپنے لیے آگے بھیجتے رہو اور اللہ سے ڈرو اور جان لو کہ تمہیں اس کے روبرو پیش ہونا ہے اور ایمان والوں کو خوشخبری دیجیے ﴿۲۲۳﴾ اور اللہ (کے نام) کو اس بات کا حیلہ نہ بناؤ کہ تم قسمیں کھا کر نیکی اور پرہیزگاری اور لوگوں کے درمیان اصلاح کا کام نہ کرو اور اللہ سننے والے جاننے والے ہیں۔ اللہ تمہاری فضول قسموں پر گرفت نہ کریں گے اور لیکن جو کچھ تم نے اپنے دل سے کیا اس پر گرفت ہو گی اور اللہ بخشنے والے، بردبار ہیں ﴿۲۲۵﴾ جو لوگ بیویوں (کے پاس جانے) سے قسم کھا بیٹھتے ہیں ان کے لیے چار مہینے کی مہلت ہے پس اگر (قسم توڑ کر) واپس آ جائیں تو یقیناً اللہ بخشنے والے مہربان ہیں ﴿۲۲۶﴾ اور اگر چھوڑ ہی دینے کا ارادہ کر لیں تو یقیناً اللہ سننے والے جاننے والے ہیں ﴿۲۲۷﴾ اور طلاق یافتہ عورتیں اپنے آپ کو تین حیض تک (نکاح سے) روکے رکھیں اور ان کے لیے جائز (حلال) نہیں ہے کہ اللہ نے جو کچھ ان کے رحموں میں پیدا کیا ہے اس کو چھپائیں اگر وہ اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتی ہیں تو۔ اور ان کے شوہر ان کو لوٹا لینے کے زیادہ حقدار ہیں اگر اس بارے میں ان کا ارادہ اصلاح کا ہو اور عورتوں کے حقوق بھی ہیں جیسے ان کے ذمے حقوق ہیں دستور کے مطابق۔ اور ان کے مقابل مردوں کا درجہ ایک طرح سے زیادہ ہے اور اللہ غالب حکمت والے ہیں ﴿۲۲۸﴾

تفسیر و معارف

ایامِ ماہواری میں اختلاط:

ایک اور بڑا مسئلہ ماہواری کا تھا۔ مختلف خواتین کی عادت مختلف ہوتی ہے۔ کسی کی سات دن، کسی کی دس دن، دس دن سے زیادہ ہو تو بیماری ہے جسے استحاضہ کہتے ہیں۔ اس میں اس خاتون پر نماز بھی معاف نہیں ہوتی۔ اور

سارے فرائض بھی اسی طرح ہوتے ہیں لیکن ہر مہینے جو عادت ہوتی ہے، ان دنوں اس پر نماز معاف ہوتی ہے، روزہ قضا کرتی ہے، روزہ رکھتی نہیں لیکن معاف نہیں ہوتا، رمضان شریف کے بعد خاتون کو وہ روزے قضا کرنے ہوتے ہیں۔ اس کے متعلق سوال یہ تھا کہ کیا میاں بیوی جمع ہو سکتے ہیں۔ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم سے حائضہ عورت کے بارے سوال کرتے ہیں۔ قُلْ هُوَ اَذًى۔۔۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ایک تکلیف دہ امر ہے، یہ ایک مرض ہے۔ فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِي الْمَحِيْضِ اور ایام حیض میں عورتوں سے الگ رہو۔ وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ اور جب تک وہ پاک نہ ہو جائیں، تب تک ان کے قریب مت جاؤ۔ پاک ہونے میں بھی علماء کی دو آراء ہیں۔ جو حضرات احتیاط کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ حیض سے پاک ہو کر جب تک عورت غسل نہ کر لے تب تک میاں بیوی کو ہم بستر نہیں ہونا چاہیے لیکن اکثر علماء فرماتے ہیں کہ جب حیض سے پاک ہو جائے تو جائز ہے خواہ وہ غسل نہ بھی کرے، حیض تو ختم ہو گیا لیکن احتیاط یا پاکیزگی کا تقاضا یہی ہے کہ حیض سے پاک ہو کر غسل کر لے تو میاں بیوی جمع ہوں۔

فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَاْتُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ اور جب خاتون پاک ہو جائے تو میاں بیوی جمع ہوں لیکن اس طریقے سے جس طرح سے اللہ کریم نے حکم دیا ہے۔ اپنی بیوی سے بھی غیر فطری فعل جائز نہیں ہے۔ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ جیسا فطرت کا اصول ہے، جس طرح سے اللہ نے حکم دیا ہے، اس طرح سے، اس لیے کہ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ ﴿۲۲۲﴾ اللہ توبہ کرنے والوں سے محبت کرتا ہے اور اللہ پاک رہنے والوں سے بھی محبت کرتا ہے۔

متطہرین:

مُتَطَهِّرِيْنَ کی ایک بڑی خوبصورت وضاحت یہ بھی ہے کہ مسجد قباء کے بارے جب آیہ کریمہ نازل ہوئی تو اللہ کریم نے اہل قباء کو مُتَطَهِّرِيْنَ قرار دیا اور فرمایا کہ اللہ ایسے لوگوں سے محبت کرتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم نے ان پر سوال کیا کہ تمہارا کون سا عمل ہے کہ اللہ نے تمہیں مُتَطَهِّرِيْنَ میں شامل فرمایا ہے۔ انہوں نے عرض کی، یا رسول صلی اللہ علیہ وسلّم! ہم جب بھی رفع حاجت سے آتے ہیں تو پانی سے پاکیزگی ضرور حاصل کرتے ہیں۔ یوں تو استنجا مٹی کے ڈھیلے سے بھی ہو جاتا ہے۔ جس کے لیے شرط یہ ہوتی ہے کہ کسی جگہ بدن پر غلاظت کا کوئی اثر نہ رہے، اچھی طرح صاف کر دیا جائے۔ جسم پر باہر غلاظت نہ لگی رہ جائے تو آدمی پاک ہو جاتا ہے، استنجا ہو جاتا ہے لیکن اس صفائی کے بعد پانی سے آب دست کر لیا جائے، استنجا کر لیا جائے تو زیادہ پاکیزگی ہوتی ہے۔ اہل قباء نے عرض کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم! ہم

ہر بار پانی کے ساتھ ضرور طہارت کرتے ہیں۔ اللہ کریم نے ان کے بارے فرمایا: وَیُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِیْنَ انہیں پاک رہنے والے قرار دیا۔

میاں بیوی کے جمع ہونے کے فعل میں بھی اللہ کریم نے طہارت اور رجوع الی اللہ، دو باتوں کو لازمی قرار دیا ہے۔ اگرچہ میاں بیوی کا ملنا ایک شرعی اور حلال فعل ہے تو یہاں توبہ کی ضرورت کیوں پیش آ گئی، بات تو میاں بیوی کی ہو رہی ہے۔ فَأْتُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ ۔۔۔۔جیسے اللہ نے حکم دیا ہے اس طرح سے ان سے مجامعت کرو، پھر ساتھ ہی یہ کیوں فرمادیا اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ ۔۔۔۔اللہ توبہ کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔

یاد رکھیں! دنیا میں انسان جتنے افعال کرتا ہے، کھانا پینا، کمانا خرچ کرنا، زندگی کے جتنے افعال ہیں، آدمی کسی کام میں بھی مشغول ہو تو غفلت آجاتی ہے۔ جب ایک طرف پوری توجہ ہوتی ہے تو دوسری طرف کمی آجاتی ہے۔ یادِ الٰہی میں غفلت آجاتی ہے اس لیے قرآنِ حکیم نے قلبی ذکر پر زور دیا ہے کہ قلب ذاکر ہو جائے، وجود ذاکر ہو جائے۔ ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُوْدُهُمْ وَقُلُوْبُهُمْ اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ (الزمر:23) کہ کھال سے لے کر نہاں خانۂ دل تک ذاکر ہو جائے۔ جب ذکر کی یہ کیفیت نصیب ہو جائے تو پھر توجہ دوسری طرف جاسکتی ہے لیکن ذکر قلبی منقطع نہیں ہوتا، ذکر جاری رہتا ہے۔ اگر ذکر قلبی نصیب ہو جائے، وجود ذاکر ہو جائے، کھال ذاکر ہو جائے، خون ہڈیاں ذاکر ہو جائیں تو اگرچہ آدمی کی زیادہ توجہ دوسری طرف بھی ہو جائے لیکن یہ ذکر جاری رہتا ہے۔ وہ غفلت نہیں آتی جو غیر ذاکر پہ آتی ہے۔ ان سب امور میں جنسی فعل ایک ایسا فعل ہے جو سب سے زیادہ توجہ کو سلب کر لیتا ہے۔ فطرتاً اس فعل میں آدمی ایسا مشغول ہوتا ہے کہ اسے کچھ یاد نہیں رہتا۔ اس لیے فرمایا: اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ کہ وہ جو حلال کام میں مصروف ہونے سے غفلت آئی، جیسے ہی فارغ ہو تو فوراً رجوع الی اللہ کرو۔ اللہ کو یاد کرو اور توبہ کرو کہ میرے یہ چند لمحے غفلت میں گزرے۔ اللہ کے ذکر کی طرف میری توجہ کم رہی۔

اسلام دراصل زندگی کے ہر فعل کو آخرت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ بارگاہِ الوہیت میں اس پہ کیا اجر مرتب ہوگا، اس نظر سے دیکھتا ہے۔ زندگی کے ہر فعل کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے عکس میں دیکھتا ہے۔ ہر کام کے ساتھ رجوع الی اللہ اور طہارت مراد ہے۔ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ﴿۲۲۲﴾ فارغ ہونے کے بعد فوراً طہارت حاصل کرے۔ غسل کرلے تو یہ بہتر ہے۔

کچھ مسائل ایسے بھی ہیں جو ان حالات میں پیش آتے ہیں، مثلاً خاتون کا بچہ ہے تو کیا اسے دودھ پلائے گی یا نہیں، طہارت کے بعد، ہاتھ وغیرہ دھونے کے بعد دودھ پلاسکتی ہے۔ اگر مجبوری بن گئی ہے، جیسے رمضان شریف تھا اور سحری کا وقت ہو گیا تو طہارت کر کے غسل سے پہلے کھانا بنا سکتی ہے، وہ کھانا پاک ہوگا اور کھایا جاسکتا ہے۔ ان

حالات میں رعایت ہے لیکن بہترین عمل یہ ہے کہ مرد بھی، عورت بھی، جیسے ہی فارغ ہوں تو غسل کر لیں۔

نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَأْتُوا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ ۔۔۔۔معاشرے میں نکاح سے خاندان کی بنیاد رکھی جاتی ہے اور ایک مرد اور ایک خاتون اللہ کے نام پر اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت کے مطابق یکجا ہوتے ہیں۔ ان کا ایک نیا تعلق بنتا ہے اور اس سے مراد محض شہوت رانی نہیں ہوتی بلکہ اس سے مراد اللہ کریم سے نیک اولاد کی طلب ہوتی ہے۔ اگر اس نیت اور ارادے میں خلوص ہو تو یہ وجہ ثواب بن جاتا ہے۔ تمہاری بیویاں تمہارے لیے انسانی نسل کی بقا کے لیے بمنزلہ کھیت ہیں۔ فَأْتُوا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ ۔۔۔۔ جس طرح چاہو، اپنے کھیت میں آؤ لیکن کھیت سے مراد وہی ہوگی کہ اس طرح سے ملو، جس طرح سے بقائے نسل کی ضرورت ہے، اس کے علاوہ جائز نہیں ہے۔

معینہ مدت کے لیے نکاح (متعہ) حرام ہے:

قبل از اسلام عربوں میں ایک رسم تھی۔ چونکہ یہ لوگ تاجر پیشہ تھے، ہمیشہ سفر میں رہتے۔ جہاں جاتے، اگر وہاں مہینہ رہنا ہے، پندرہ دن رہنا ہے، دو مہینے رہنا ہے، چار دن رہنا ہے تو وہاں اس مدت کے لیے نکاح کر لیتے۔ اس کا نام انہوں نے متعہ رکھا ہوا تھا کہ عورت کو کچھ پیسے دے دیتے۔ عورت کا فائدہ ہو جاتا اور مرد کو اتنا عرصہ ایک بیوی مل جاتی۔ جتنا عرصہ وہاں رہتا وہ بیوی کی طرح سارے گھر کے کام بھی کرتی اور اس کے ساتھ رہتی۔ اسلام نے جب نکاح پر شرط لگا دی کہ نکاح زندگی گزارنے کے لیے ہو مُسٰفِحِيْنَ محض شہوت رانی کے لیے نہ ہو تو متعہ از خود حرام ہو گیا، باطل ہو گیا، لہٰذا اسلام میں اس کی کوئی گنجائش نہیں۔

قرآن حکیم میں آگے آئے گا کہ نکاح کوئی وقتی معاہدہ نہیں ہوتا۔ فقہا نے لکھا ہے کہ جو نکاح وقت کے اعتبار سے محدود ہو وہ منعقد ہی نہیں ہوتا۔ ''اَلنِّكَاحُ لِلْمُوَقَّتِ بَاطِلٌ'' ایسا نکاح جس میں وقت کا تعین ہو کہ دو دن کے لیے نکاح، چار دن کے لیے کر لیا تو وہ نکاح منعقد ہی نہیں ہوتا۔ نکاح کی شرط ہی یہ ہے کہ وہ عمر بسر کرنے کے لیے کیا جائے۔ یہ الگ بات ہے کہ بعد میں ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ میاں بیوی اکٹھے نہ رہ سکیں لیکن بنیادی طور پر نکاح عمر گزارنے کے لیے کیا جائے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر مرد اور عورت کا یہ ملاپ سنّت کے مطابق ہو، اس میں شرم وحیا اور خلوص کا خیال رکھا جائے، ایک دوسرے کے حقوق کا خیال رکھا جائے تو یہ بھی من جملہ عبادات کے ہے۔

ایک بات یاد رکھو! وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ۔۔۔۔ تقویٰ کا خاص خیال رہے، قربِ الٰہی کا خاص خیال رہے اور جنسی فعل میں بھی کوئی ایسی حرکت سرزد نہ ہو جو تقویٰ کے خلاف ہو، جو اللہ کی بارگاہ میں جرم قرار پائے یا برائی قرار

پائے۔ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ۔۔۔۔اور یہ بات یاد رکھو کہ بہر حال تمہیں اس کی بارگاہ میں حاضر ہونا ہے، اس سے نہیں بچ سکتے۔ ہر ایک کو اس کے حضور میں پیش ہونا ہے۔ اس فعل میں بھی اپنی اس حاضری کو ضرور یاد رکھو۔ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ﴿۲۲۳﴾ اور اے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم! ایمان والوں کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم بشارت دیجئے کہ ان کا پیش ہونا ان کے لیے باعثِ صد مسرت ہوگا، باعث انبساط ہوگا۔ ان کا بارگاہِ الوہیت میں حاضر ہونا ان کے لیے بڑی خوشی کا سبب ہوگا۔ وہ اپنے اللہ کو روبرو دیکھیں گے، دیدارِ باری سے سرفراز ہوں گے، انعاماتِ الٰہی سے سرفراز ہوں گے لیکن شرط یہ ہے کہ دنیا سے اپنا ایمان سلامت لے جائیں۔

اللہ کے سوا کسی کی قسم کھانا جائز نہیں:

وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ۔۔۔۔اپنی قسموں کے ذریعے اللہ کریم کے اسم کو، اللہ کی ذات کو دنیوی امور کے لیے کھیل مت بناؤ، ڈھال مت بناؤ کہ ہر بہانہ بنانے کے لیے تم اللہ کی قسم کھانے بیٹھ جاؤ۔ اللہ کی عظمت کو پیش نظر رکھو۔ شرعاً اللہ کے علاوہ کسی کی قسم کھانا جائز نہیں ہے۔ برصغیر میں چونکہ ہندوؤں کے ساتھ ہمارا اختلاط رہا تو ان سے یہ جملے سیکھ لیے گئے اور رواج پا گئے کہ ''تیری جان کی قسم، تمہارے سر کی قسم، اس بچے کی قسم''، میرے بیٹے کی قسم، یہ سب حرام ہے۔ اس لیے کہ جس کی قسم دی جاتی ہے وہ بطور گواہ پیش کیا جاتا ہے کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں یہ سچ ہے اور جس کی قسم دے رہا ہوں وہ اس سچ سے واقف ہے۔ اب آپ کسی کے سر کی قسم کھاتے ہیں تو اس کے سر کو کیا پتا، یا کسی پیر بزرگ کی قسم کھاتے ہیں تو اس کا اس سے کیا تعلق، یا بچے کی قسم کھاتے ہیں تو اس کا اس سے کیا تعلق! قسم تو اس کی کھائی جائے کہ جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں وہ حرف بحرف سچ ہے اور جس کی قسم کھائی جا رہی ہے وہ اس کے ظاہر و باطن سے پوری طرح واقف ہے کہ ظاہراً عمل کیا تھا اور باطن میں ارادہ اور نیت کیا تھی اور وہ کیسے ہوا تو جب آپ قسم کے ساتھ بیان کرتے ہیں تو صرف اللہ کی قسم کھائی جائے گی، باقی قسمیں باطل ہوں گی، ناجائز ہوں گی، حرام ہوں گی۔ اللہ کی قسم کو مذاق نہ بنایا جائے کہ بات بات پر آپ اللہ کی قسم کھانے بیٹھ جائیں۔ کوئی اہم معاملہ ہو، کسی کی زندگی موت کا مسئلہ ہو، کہیں کسی کے نفع ونقصان کا مسئلہ ہو، کوئی ایسی اہم بات ہو اور اگر آپ سچے ہیں تو ضرور اللہ کی قسم کھائیں لیکن یہ دیکھ لیں کہ آپ کتنی بڑی ذات کی قسم کھا رہے ہیں اور معاملہ کیا ہے!

اَنْ تَبَرُّوْا وَتَتَّقُوْا وَتُصْلِحُوْا بَيْنَ النَّاسِ۔۔۔۔اللہ کریم کی رضا تو اس میں ہے کہ تم نیکی کا کام کرو، تقویٰ کا کام کرو اور اللہ کے بندوں میں اصلاح کا کام کرو۔ ہاں، کسی کو برائی سے بچانے کے لیے، نیکی کی بقاء کے لیے قسم کھانی پڑتی ہے تو بڑا کام ہے، ضرور کھاؤ۔ کسی کو غلط روش سے بچانے کے لیے، تقویٰ کے لیے، نیکی پر لانے

کے لیے یا لوگوں میں اصلاح کرنے کے لیے، کسی کو فساد سے بچانے کے لیے اگر تم اللہ کے نام کا آسرا لیتے ہو تو یہ درست ہے۔ وَاللّٰهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿۲۲۴﴾ اور یاد رکھو! اللہ سن بھی رہا ہے اور ہر طرح کا علم بھی رکھتا ہے۔ اسے پتہ ہے کہ تم کیا کہہ رہے ہو اور تمہارے دل میں کیا ہے۔ اسے پتہ ہے کہ واقعہ کیا ہوا، اسے تم کس طرح پیش کر رہے ہو، اس واقعہ میں تمہاری نیت اور ارادہ کیا تھا اور اب تم کیا کہہ رہے ہو۔ اس لیے بڑی احتیاط سے، پورے خلوصِ نیت کے ساتھ، پوری سچائی پر اللہ کی قسم کھاؤ اور اس کا سبب کوئی نیکی، تقویٰ یا لوگوں کے درمیان اصلاح ہو۔

قسموں پر مواخذہ ہوگا:

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۲۲۵﴾ بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے، ان کی زبان سے قسم کا لفظ نکل جاتا ہے۔ یہ لغو ہے، فضول ہے۔ اللہ تعالیٰ کریم ہے کہ آخرت میں اس کو معاف فرما دے لیکن احتیاط ضروری ہے۔ بات بات پر قسم نہ کھائی جائے، اس سے احتیاط کی جائے لیکن تم اپنے قلب سے اور اپنے پورے ارادے سے جو قسم کھاؤ گے، اس کا مواخذہ بھی ہوگا کہ جس بات پر قسم دی تھی کیا وہ سچی تھی؟ کسی آنے والے واقع پر آپ نے قسم دی تھی کہ میں ضرور ایسا کروں گا تو کیا پھر ایسا کیا؟ اس کا مواخذہ بھی ہوگا۔ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۲۲۵﴾ اور جو لوگ بے خیالی میں قسم کھا جاتے ہیں تو اللہ معاف کرنے والا ہے، اللہ بردبار ہے، معاف فرما دے گا لیکن یہ مناسب نہیں ہے، انہیں احتیاط کرنی چاہیے۔

لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ ۚ فَاِنْ فَآءُوْ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۲۶﴾ بعض لوگ خواتین سے ناراض ہو کر طلاق تو نہیں دیتے لیکن اس بات کی سزا دیتے ہیں کہ میں تمہارے قریب نہیں آؤں گا۔ اب تو خیر اس کی نوبت ہی نہیں آتی۔ کھانا ٹھنڈا ہو جائے تو طلاق پہلے دیتے ہیں اور ایک اور دو تین ہی نہیں، جو دیتا ہے سات طلاقیں دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے میاں بیوی کے رشتہ کو تو ایک دوسرے کے لیے لباس سے تعبیر کیا ہے۔ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ۔۔۔۔۔ وہ تمہارا لباس ہیں تم ان کا لباس ہو۔ لباس ستر پوشی بھی کرتا ہے، زینت کا سبب بھی ہے اور گرم و سرد سے بھی بچاتا ہے۔ یعنی خاتون بھی ہر طرح سے مرد کی خبر گیری کرے اور مرد بھی ہر طرح سے خاتون کی خبر گیری کرے، اسے گرم و سرد سے بچائے۔ اس سے غلطی ہو جائے تو اس کا ڈھنڈورا نہ پیٹے، اس کی ستر پوشی کرے اور حتی الامکان زندگی کو چلانے کی کوشش کی جائے۔ طلاق اگرچہ جائز ہے لیکن اس وقت جب اختلافات اتنے شدید ہو جائیں اور گزارے کی کوئی باہمی صورت باقی نہ رہے۔

طلاق کے بارے میں ایک انتباہ:

ایسا تیزی کا زمانہ آگیا ہے کہ بات بات پہ طلاق ہوتی ہے اور پھر جواز ڈھونڈتے پھرتے ہیں کہ میرا مطلب یہ نہیں تھا، میرا مقصد یہ نہیں تھا، میری مراد یہ نہیں تھی۔ فقہ میں ایسی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ میری نیت یہ نہیں تھی یا مراد یہ نہیں تھی۔ طلاق کا مطلب طلاق ہے اور اگر کوئی مذاق میں بھی طلاق دیتا ہے تو طلاق واقع ہوجائے گی، غصے میں دیتا ہے تو طلاق واقع ہو جائے گی۔ طلاق کا مطلب طلاق ہے، جیسے آپ کسی کو گولی مارتے ہیں تو گولی اسے پھاڑ ڈالے گی۔ یہ نہیں پوچھے گی کہ آپ کی نیت کیا ہے، آپ اسے صرف ڈرانا چاہتے ہیں یا اسے گولی سے پھاڑنا چاہتے ہیں۔ اب آپ کی نیت کیا ہے، آپ نے غصے میں چلا دی یا دھمکانے کے لیے چلادی، گولی لگے گی اور وہ پھٹ جائے گا، گولی معاف نہیں کرے گی۔ طلاق بھی گولی کی طرح ہے۔ جب کوئی مذاق میں بھی طلاق دے گا تو ہوجائے گی۔ فقہاء نے یہاں تک لکھا ہے کہ کسی کو گرا کر اس کی گردن پہ کوئی چھری رکھ دے اور جان کے خوف سے طلاق دے دے تو اس سے طلاق لینے والے کو ظلم کا گناہ ہوگا لیکن طلاق واقع ہوجائے گی۔ بعض لوگوں کی بیویاں ان سے طاقتور ہوتی ہیں، گرا کر سینے پہ بیٹھ جاتی ہیں کہ طلاق دو اور وہ دے دیتے ہیں۔ لینے والے کو ظلماً طلاق لینے کا گناہ ہوگا لیکن اس نے اگرچہ جان کے خوف سے طلاق دی مگر طلاق واقع ہوگئی۔ ڈرانے کے لیے طلاق دی، طلاق واقع ہوگئی، مذاق میں طلاق دی، طلاق واقع ہوگئی۔ طلاق کا مطلب طلاق ہے یہ نہیں پوچھا جاتا کہ اس کی نیت میں مذاق تھا۔ نیت کا تو اللہ مالک ہے، اس کا آخرت میں فیصلہ ہوگا۔ بظاہر جب منہ سے لفظ طلاق نکلا تو طلاق واقع ہو گئی۔ یہاں اس لیے زیادہ تشریح کردی کہ آج کل لوگ بات بات پر طلاق دیتے ہیں اور پھر کہتے ہیں اس کے لیے کوئی گنجائش نکالیں۔ اسلام میں تو گنجائش نہیں، اگر کوئی حیلے بہانے سے جواز پیدا کر لیتا ہے تو آخرت میں تو عذاب میں گرفتار ہوگا، اللہ کریم تو سزا دیں گے، اولاد جو ہوگی وہ مجہول النسب ہوگی اور جتنی مجامعت کروگے وہ سارا زنا شمار ہوگا۔ لوگوں میں طلاق دینے کی بھی جلدی ہوتی ہے اور بڑی جلدی افسوس بھی لگ جاتا ہے۔

طلاق سے متعلقہ ایک اہم اصول:

طلاق کے مسائل میں ایک اور بات یاد رکھنی چاہیے کہ اگر کوئی ایک طلاق دے کر صلح کر لیتا ہے تو واپسی تو ہو گئی، صلح تو ہوگئی لیکن وہ طلاق واقع ہوجاتی ہے۔ اس کے بعد اس کے پاس دو طلاقوں کا حق رہتا ہے، تین کا نہیں۔ جو

طلاق دی جائے وہ واقع ہو جاتی ہے اور اپنی جگہ قائم رہتی ہے۔ اسی طرح اگر دو طلاقوں کے بعد کسی نے صلح کی تو پھر اس کے پاس ایک حق باقی رہتا ہے۔ وہ دو واقع ہو جاتی ہیں، اپنی جگہ ختم نہیں ہوتیں۔

طلاق کی ایک اور صورت:

فرمایا: لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ ۔۔۔۔۔ اگر کوئی یہ قسم کھالے کہ میں بیوی سے صحبت نہیں کروں گا، اس سے ناراض ہوں تو ان کے لیے چار مہینے کی مہلت ہے، اگر چار مہینے کے اندر وہ قسم توڑ کر عورت سے رجوع کر لیں۔ فَاِنْ فَآءُوْ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۲۶﴾ تو اللہ معاف کرنے والا ہے، رحم کرنے والا ہے، معاملہ درست ہو جائے گا۔

وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۲۷﴾ اور اگر ان کا ارادہ بالکل ہی چھوڑ دینے کا ہے اور چار مہینے گزر گئے تو طلاق ہو جائے گی۔ یہ چار مہینے کی پابندی قسم کھانے پر ہے، ویسے نہیں کہ کوئی تجارت کے لیے گیا اور سال بھر واپس نہیں آیا یا ملازمت پر گیا اور سال بھر واپس نہیں آیا۔ لوگوں میں ایک یہ بھی مخمصہ ہے کہ شوہر چھ مہینے بیوی سے نہیں ملا تو طلاق ہو گئی۔ جب ایک آدمی کام سے گیا ہے اور سال بعد لوٹا، نہیں مل سکا تو یہ طلاق نہیں ہوگی۔ کوئی شخص یہ قسم کھالے کہ میں تیرے نزدیک نہیں جاؤں گا، میں تیرے ساتھ میاں بیوی والا رشتہ نہیں رکھوں گا، ایسی صورت میں اگر چار مہینے کے اندر وہ رجوع کر لیتا ہے اور اپنی بات پہ واپس آ جاتا ہے تو نکاح برقرار رہے گا اور اگر چار مہینے مجامعت نہیں کرتا اور اپنی بات پہ اڑا رہتا ہے تو چار مہینے بعد طلاق ہو جائے گی۔

طلاق اور عدت:

وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ۔۔۔۔ اور جسے طلاق ہوتی ہے اسے تین حیض تک اپنے وجود کو، اپنے آپ کو روک کر رکھنا ہوگا، اس کی یہ عدت ہے۔ جب تک عدت پوری نہ ہو جائے، کوئی اسے نکاح کی دعوت دے یا وہ کسی سے نکاح کرنے کی گفتگو کرے تو یہ بھی حرام ہے چہ جائیکہ حلالہ کے لیے عدت میں نکاح کیا جائے۔ وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْٓ اَرْحَامِهِنَّ اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۔۔۔۔ اگر عورت کو طلاق ہو جائے اور اسے حمل ہو چکا ہے تو اسے وہ حمل نہ گرانا چاہیے اور نہ چھپانا چاہیے چونکہ وہ اللہ کی مخلوق ہے اگر اس کی ناراضگی میاں کے ساتھ ہے تو اس ناراضگی کی وجہ سے وہ یہ بات چھپالے اور حمل کو ضائع کرا دے تو یہ قتل شمار ہوگا۔ ان کے لیے یہ حلال

نہیں کہ اللہ نے جو ان کے رحم میں پیدا کر دیا وہ اس کو چھپائیں ۔ اگر ان کا اللہ کے ساتھ اور آخرت پر ایمان ہے تو وہ اس بات کو ظاہر کرے، پھر عدت بچے کی ولادت تک ہو گی ۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ دورانِ حمل طلاق نہیں ہوتی، ایسی بات نہیں ہے۔ حاملہ عورت کو بھی طلاق ہوتی ہے۔ اس کی عدت پھر تین مہینے یا چار مہینے نہیں رہتی بلکہ اس کی عدت ولادت تک ہوتی ہے۔ قریبی حمل تھا تو نو ماہ بعد بچہ پیدا ہوا، تب عدت ختم ہو گی، تب وہ نکاحِ ثانی کی بات کر سکتی ہے لیکن دورانِ عدت نہیں کر سکتی۔ وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِیْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا ۔۔۔۔ اور اگر اصلاح چاہتی ہے اور گنجائش ہے، ایک طلاق ہوئی ہے یا دو طلاقیں ہوئی ہیں تو پھر جس خاوند کا بچہ ہے، وہ زیادہ مستحق ہے کہ اس کے ساتھ صلح کر لے۔ معاشرتی طور پر، معاشرے میں رہنے کے لیے، ماحول، برادریوں اور خاندانوں میں پھوٹ نہ ڈالنے کے لیے اگر وہ صلح کر لے تو یہ بہتر راستہ ہے لیکن یہ ان کی مرضی پر ہے۔ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا ۔۔۔۔ اگر وہ اصلاح چاہتے ہیں تو اللہ کریم ان کی خطائیں معاف فرمائے گا اور ان پر اس بات سے راضی ہو گا کہ انہوں نے اصلاح کا عمل کیا۔

مرد کو سربراہ مقرر فرمایا:

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۔۔۔۔ اور عورتوں کو بھی ایسے ہی حقوق ہیں جیسے مردوں کے ہیں۔ وَلِلرِّجَالِ عَلَیْهِنَّ دَرَجَةٌ ۔۔۔۔ یہ الگ بات ہے کہ مرد کو ایک درجہ فضیلت حاصل ہے کہ وہ خاندان کا سربراہ ہوتا ہے۔ سربراہی کا جو درجہ اللہ نے اسے دیا یہ مرد کو خاتون پر ایک گونہ فضیلت ہے۔ اس کے علاوہ کھانا پینا، لباس، رہن سہن، جیسے مرد کے خاتون پر حقوق ہیں ویسے ہی خاتون کے حقوق مرد پر بھی ہیں۔ ہاں، سربراہی کا حق اللہ نے مردوں کو دیا ہے اور یہ اس کا احسان ہے۔ اس نے مردوں کو ایک درجہ فضیلت دی ہے۔

وَاللّٰهُ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ ﴿۲۲۸﴾ انہیں کیوں فضیلت دی ہے، کیوں یہ درجہ بندی کی ہے! فرمایا، وہ غالب بھی ہے اور حکیم بھی ہے، اس کی حکمت کا تقاضا تھا کہ سربراہی کا معاملہ مردوں پر چھوڑا جائے۔ یہیں سے فقہاء نے لیا ہے کہ ملک کی سربراہ بھی خاتون نہیں ہونی چاہیے۔ علماء یہی دلیل دیتے ہیں کہ سربراہی کا حق اللہ نے مردوں کو سونپا ہے۔

عورت کی امامت:

اب تو خیر زمانہ کچھ نئی کروٹیں لے رہا ہے اور خواتین کو امامت کا، خطابت کا بھی چسکا پڑ رہا ہے لیکن یاد رکھیں! یہ حتمی بات ہے کہ کوئی خاتون امامت نہیں کروا سکتی اور شرعاً اس کی اپنی نماز ہوتی ہے نہ ان کی نماز ہوتی ہے جو اس کے پیچھے نماز پڑھتی ہیں۔

ہمارے ہاں ایک اور رواج ہے۔ خواتین صف بنا لیتی ہیں اور ایک خاتون اُسی صف میں درمیان میں کھڑی ہو جاتی ہے۔ کرتی امامت ہے، پڑھتی بھی امام کی طرح ہے اور رکوع سجود بھی اسی کے کہنے پہ ہوتا ہے لیکن وہ آگے جائے نماز پہ کھڑی نہیں ہوتی، صف میں کھڑی ہو جاتی ہے۔ کہتی ہے میں امامت تو نہیں کرا رہی لیکن عملاً تو امامت کرا رہی ہے، صرف پیچھے کھڑے ہونے سے کیا ہو گا؟ یہ ساری صورتیں ناجائز ہیں۔ جو خاتون امامت کراتی ہے اس کی اپنی نماز نہیں ہوتی، پیچھے کھڑے ہونے والیوں کی کیا نماز ہو گی! عموماً رمضان میں یہ امامت شروع کر دیتی ہیں۔ نمازِ تسبیح میں، نوافل میں، اکثر تراویح میں کہ بعض خواتین کو تراویح پڑھانے کا بڑا شوق ہے اور امامت کا بھی شوق ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے ہر بندے کو حج کا شوق ہے۔ کیا جو باتیں اس پر فرض ہیں وہ پوری کر چکا! بیت اللہ سے محبت اپنی جگہ، روضہء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت اپنی جگہ اور یہ طلب اپنی جگہ کہ اللہ مجھے بھی وہ جگہ دکھا دے۔ یہ تو محبت کا تقاضا ہے لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ جو اس پر فرض نہیں اس کے لیے کوشش کی بجائے جو فرض ہے اور جسے وہ چھوڑ کر بیٹھا ہوا ہے، اسے ادا کرے۔

سورۃ البقرہ رکوع 29 آیات 229 تا 231

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۪ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ ؕ وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ
اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّاۤ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْــًٔا اِلَّاۤ اَنْ يَّخَافَاۤ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ
خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۙ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ ؕ تِلْكَ
حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا ۚ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ
الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۲۹﴾ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ؕ
فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَاۤ اَنْ يَّتَرَاجَعَاۤ اِنْ ظَنَّاۤ اَنْ يُّقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ
وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۰﴾ وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ
اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ ۪ وَلَا تُمْسِكُوْهُنَّ
ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ؕ وَلَا تَتَّخِذُوْۤا اٰيٰتِ
اللّٰهِ هُزُوًا ؗ وَّاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمَاۤ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ
وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهٖ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَىْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۳۱﴾

طلاق دو بار ہے پھر (اس کے بعد) اچھے طریقے سے رکھ لے یا بہتر طریقے سے رخصت کر دے اور جو (مال) تم نے ان کو دیا ہے اس میں سے کچھ بھی واپس لینا تمہارے لیے حلال نہیں سوائے اس کے کہ دونوں (میاں بیوی) کو ڈر ہو کہ اللہ کی حدود قائم نہ رکھ سکیں گے پس اگر تم ڈرو کہ وہ دونوں اللہ کی حدود قائم نہ رکھ سکیں گے تو اگر عورت رہائی پانے کے بدلے کچھ دے ڈالے تو دونوں پر کچھ گناہ نہیں یہ اللہ کی

حدیں ہیں پس ان سے مت گزرو اور جو اللہ کی حدوں سے گزر جائے پس ایسے ہی لوگ غلط کار ہیں ﴿۲۲۹﴾ پس اگر اس کو (تیسری) طلاق دے دی تو اس کے بعد اس کے لیے حلال نہ ہوگی حتیٰ کہ اس کے علاوہ وہ دوسرے خاوند سے (بعد عدت) نکاح کرے پس اگر وہ (دوسرا خاوند) بھی اسے طلاق دے دے تو ان دونوں پر اس میں کوئی گناہ نہیں کہ دونوں پھر مل جائیں اگر وہ یہ سمجھیں کہ اللہ کی حدود کو قائم رکھ سکیں گے اور یہ اللہ کی حدود ہیں جنہیں اس قوم کے لیے بیان فرماتے ہیں جو جانتی ہے ﴿۲۳۰﴾ اور جب تم عورتوں کو (دوبار) طلاق دو پھر وہ اپنے وقت کو پہنچیں تو انہیں مناسب طریقے سے رکھ لو یا بہتر طریقے سے فارغ کر دو اور انہیں ایذا دینے کے لیے نہ روکو کہ ان پر زیادتی کرو اور جس نے ایسا کیا تو اس نے یقیناً اپنے آپ پر ظلم کیا اور اللہ کی آیات کا مذاق نہ اڑاؤ اور تم پر جو اللہ کی نعمت ہے اسے یاد کرو اور جو اس نے تم پر کتاب اتاری اور حکمت وہ اس سے تم کو نصیحت کرتے ہیں اور اللہ سے ڈرو اور جان رکھو کہ اللہ ہر چیز کے جاننے والے ہیں ﴿۲۳۱﴾

تفسیر ومعارف

طلاق کی صورت میں بھی حسنِ سلوک کی تلقین:

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ ۔۔۔۔ طلاق میں واپسی کی گنجائش دوبار تک ہے۔ طلاق دینے کا شرعی طریقہ یہ ہے کہ ایک طلاق دی جائے اور پھر ایک مدت تک، ایک مہینے تک یا جب تک وہ ماہواری سے فارغ نہیں ہوتی، تب تک انتظار کیا جائے۔ دوسرے مہینے دوسری طلاق دی جائے، پھر ایک مہینہ انتظار کیا جائے۔ اس میں ایک مصلحت یہ بھی ہے کہ شاید ان میں صلح کا کوئی امکان ہو جائے۔ پہلی یا دوسری طلاق کی صورت میں اگر عدت کے دوران صلح ہو جائے تو نکاح کی ضرورت نہیں لیکن عدت گزر جانے کے بعد تجدید نکاح ضروری ہے۔ اگر تین طلاقیں دے دی جائیں تو اس کے بعد واپسی کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔ اگر بیوی کو واپس رکھنا ہے، دوبارہ صلح کرنی ہے فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ ۔۔۔ تو اس میں کوئی ساز باز یا کوئی بات پوشیدہ نہیں ہونی چاہیے۔

معروف طریقے سے اور صحیح، اللہ کے بندوں کی طرح صلح کرو اور اسے اچھی طرح سے پاس رکھو اَوْ تَسْرِیْحٌۢ بِاِحْسَانٍ۔۔۔۔۔ یا اسے اچھے طریقے سے الگ کر دو۔ اگر طلاق دے کر الگ ہی ہونا ہے تو اس میں فساد کی ضرورت نہیں ہے۔ تم نے اگر اسے کچھ چیزیں دے دی ہیں، کوئی زیور بنوا دیے ہیں، اس کے نام پہ کچھ پیسے جمع کرا دیے ہیں تو کوئی بات نہیں۔ جتنی رعایت کر سکتے ہو وہ کرو۔ اگر سارے اسی کو دے دو تو اچھی بات ہے، اس سے اختلاف نہیں بڑھے گا، دو خاندانوں میں دشمنی نہیں بنے گی۔ اس پر احسان کرو۔

وَلَا یَحِلُّ لَکُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَیْتُمُوْھُنَّ شَیْـًٔا اِلَّآ اَنْ یَّخَافَآ اَلَّا یُقِیْمَا حُدُوْدَ اللّٰہِ۔۔۔۔۔ اور اگر تم نے انہیں کچھ مال و دولت دے ہی دیا ہے تو تم پر حلال نہیں ہے کہ اسے چھینو۔ طلاق دے دی ہے تو سب کچھ واپس کر دو۔ ہاں، اگر یہ ڈر ہو کہ میں نے اسے اتنی دولت دی ہے کہ اگر یہ ساری اس کے پاس رہی تو یہ دین سے بھی جائے گی، بگڑ جائے گی، بدکار ہو جائے گی، عیاش ہو جائے گی تو پھر اچھے اور معروف طریقے سے ایک حصہ واپس لے سکتے ہو لیکن پھر بھی ایسا نہ ہو کہ تم ایک برائی کی بنیاد رکھو۔ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْھِمَا فِیْمَا افْتَدَتْ بِہٖ۔۔۔۔ ہاں، اگر یہ ہو کہ وہ حدودِ الٰہی قائم نہیں رکھ سکے گی تو پھر دونوں کو کوئی گناہ نہیں ہے کہ عورت بھی کچھ حصہ مال کا دے کر گلوخلاصی کرا لے اور مرد بھی ایک معقول حصہ واپس لے لے۔ اس میں دونوں کو گناہ نہیں ہے۔ تِلْکَ حُدُوْدُ اللّٰہِ۔۔۔۔ اللہ کی مقرر کی ہوئی حدیں ہیں فَلَا تَعْتَدُوْھَا۔۔۔۔ سو اللہ کی حدود سے تجاوز نہ کرو۔ وَمَنْ یَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰہِ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ﴿۲۲۹﴾ اور جو اللہ کی حدود سے تجاوز کرے گا، اس کا شمار ظالموں میں ہو گا، زیادتی کرنے والوں میں ہو گا۔

کیا تین طلاق کے بعد رجوع ممکن ہے؟

فَاِنْ طَلَّقَھَا۔۔۔۔ اگر طلاق دے ہی دی، تین طلاقیں ہو گئیں اور الگ کر دی فَلَا تَحِلُّ لَہٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰی تَنْکِحَ زَوْجًا غَیْرَہٗ۔۔۔۔ پھر وہ اس پر حلال نہیں ہو گی، یہاں تک کہ وہ اس کی عدت گزارے اور پھر دوسرے مرد سے نکاح کرے فَاِنْ طَلَّقَھَا فَلَا جُنَاحَ عَلَیْھِمَآ اَنْ یَّتَرَاجَعَآ۔۔۔۔ پھر دوسرا خاوند اگر اسے کسی وجہ سے طلاق دے دیتا ہے تو پھر اس کی عدت گزارنے کے بعد پہلے خاوند سے نکاح کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے لیکن اس میں یہ قید لگا دی کہ پھر بھی سوچ لیں اَنْ یُّقِیْمَا حُدُوْدَ اللّٰہِ۔۔۔۔ کہ اگر پہلے خاوند سے اس ساری افتاد کے بعد نکاح کر لیا تو پھر ایک دفعہ وہ اس نکاح کو توڑ چکے ہیں، پھر بھی اچھی طرح سے دیکھ لیں۔ اگر قائم نہ رکھ سکنے کا اندیشہ ہو تو نہ کریں اور اگر کریں تو پھر اللہ کی حدود کو قائم رکھنے کی پوری کوشش کریں۔ جہلاء نے جو ایک طریقہ بنایا ہے

کہ تین طلاقیں ہوگئیں تو کسی ایک سے نکاح کردو اور پھر صبح طلاق دے دو۔ نہ پہلے خاوند کی عدت گزارے اور نہ ہی دوسرے خاوند کی عدت گزارے۔ اس میں دو قباحتیں آگئیں۔ ایک تو عدت میں نکاح نہیں ہوتا، دوسرا ایک رات کے لیے نکاح منعقد نہیں ہوتا۔ یہ محض خباثت ہے جسے علماءِ سُو اور بے دین لوگوں نے پیسے بٹورنے کے لیے رائج کیا ہے۔ اسلام سے اس کا کوئی تعلق نہیں وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿٢٣٠﴾ اور یہ اللہ کی حدود ہیں اور جاننے والوں کے لیے کھول کر واضح طور پر بیان کر دیں۔

اسلامی اور غیر اسلامی معاشرے میں فرق:

انسانی معاشرت میں عورت اور مرد کے ملاپ کی سب سے زیادہ اہمیت ہے۔ یہی چیز اگر اچھے طریقے سے ہو تو مختلف خاندانوں کو باہم شیر و شکر کر دیتی ہے اور یہی اگر ناجائز یا ناروا طریقے سے ہو تو خاندانوں میں قتل و غارت گری شروع ہو جاتی ہے، انسانوں میں دشمنیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اس میں اگر اللہ کا نام ہو تو انسانی معاشرہ پھلتا پھولتا ہے، اچھے اور شریف انسان پیدا ہوتے ہیں۔ یہی تعلق اگر بغیر اللہ کے نام کے ہو تو اولاد مجہول النسب ہوتی ہے، اچھے انسان نہیں بلکہ جانور پیدا ہوتے ہیں جو بعد میں والدین کی عزت بھی نہیں کرتے۔ اب آپ مغرب کے معاشرے کو دیکھ لیں۔ یوں تو وہاں مادر پدر آزادی ہے لیکن نسلیں تباہ ہوگئیں، کوئی کسی کا کچھ نہیں لگتا۔ جو کوئی خاندانی تعلق تھا، جو محبتیں تھیں، جو احترام و ادب تھا، وہ جاتا رہا۔

کراچی دارالعلوم میں ایک سویڈن کا نوجوان اسلام قبول کرنے کے بعد زیرِ تعلیم تھا۔ اس سے ملنے کا اتفاق ہوا تو میں نے اس سے پوچھ لیا کہ تمہارے والدین کہاں ہیں؟ وہ کہنے لگا، میں نہیں جانتا، جس دن میں بالغ ہوا تو انہوں نے مجھے دھکے دے کر گھر سے نکال دیا۔ اس کے الفاظ تھے۔ They Just kicked me out مغرب میں یہی ہے کہ بچہ پیدا ہوتا ہے تو حکومت اس کا وظیفہ لگا دیتی ہے۔ جب بالغ ہوتا ہے تو وظیفہ ختم ہو جاتا ہے۔ اس نے کہا، جس دن وظیفہ ختم ہوا تو انہوں نے مجھے گھر سے باہر پھینک دیا۔ اس کے بعد نہ میں انہیں جانتا ہوں اور نہ وہ مجھے جانتے ہیں۔ یہ مغرب کی آزادی کا ثمر ہے بلکہ میں نے وہاں دیکھا ہے کہ نوجوان بیٹیاں بھی جب بالغ ہو جاتی ہیں اور وظیفہ ختم ہو جائے تو کہہ دیتے ہیں کہ اگر گھر میں رہنا ہے تو اتنا کھانے کا خرچ ہے، اتنا کمرے کا کرایہ ہے۔ کہاں سے لاؤ گی یہ ہمیں نہیں پتہ، اتنے پیسے دو اور رہو اور اگر پیسے نہیں ہیں تو جاؤ جہاں سینگ سماتے ہیں۔ یہ اس لیے ہے کہ انہوں نے اپنی مرضی سے وہ معاشرت بنا رکھی ہے اور اگر یہ اللہ کے قانون اور اللہ کی حدود کے مطابق ہو تو والدین محبت کا سرچشمہ ہوتے ہیں، اولاد ان کے بڑھاپے کا سہارا بنتی ہے اور یوں خاندان اور انسانی معاشرہ بنتا ہے، پھلتا اور

پھولتا ہے، ایک دوسرے کے نام سے جانے اور پہچانے جاتے ہیں، فلاں فلاں کا بیٹا ہے، فلاں فلاں کا باپ یا چچا ہے، ایک دوسرے کے لیے باعثِ تفاخر اور باعثِ عزت بنتے ہیں۔

وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ ۪ وَلَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ؕ وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا ۚ وَّاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمَآ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهٖ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۳۱﴾ جب کسی عورت کو طلاق دے دیتے ہو کہ گزارا نہیں ہو سکا، اختلافات بڑھ گئے اور اب آپ نے وہ معاہدہ جو اللہ کے نام پر قائم ہوا تھا، اسے توڑنے کا عہد کر لیا اور اسے توڑ رہے ہو، تو جس بات پر آپ کا جھگڑا تھا وہ بات ختم ہو گئی۔ اب اس کے ساتھ دشمنی پیدا نہ کرو کہ میں نے اسے طلاق دے دی، اب جتنا ہو سکے میں اسے رسوا کروں یا میں اسے ایذا پہنچاؤں۔ فرمایا، اگر طلاق ہی دے دی ہے اور رجوع کی گنجائش ہے تو معروف طریقے سے، اچھے طریقے سے، عزت واحترام سے کرو یا پھر انہیں قاعدے کے مطابق الگ کر دو۔ عزت واحترام بحال رکھو، اس پر ناجائز الزامات نہ لگاؤ، اسے پریشان کرنے کی کوشش نہ کرو۔ طلاق کو معلق نہ رکھو مثلاً میں تمہیں طلاق دے دوں گا یا گھر سے نکال دو اور پھر طلاق نہ دو تا کہ معاملہ لٹکا رہے، اس کا خرچہ بھی نہیں دوں گا، اسے گھر میں بھی نہیں گھسنے دوں گا۔ فرمایا: وَلَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا ۔۔۔۔ کسی کو ایذا دینے کے لیے اس پر زیادتی مت کرو اور اسے نکاح میں پھنسائے مت رکھو۔ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ۔۔۔۔ جو اس طرح سے کرے گا وہ اپنے آپ پر ظلم کر رہا ہے۔ کل اسے اللہ کے حضور پیش ہونا ہے اور اس ساری بات کی جوابدہی ہو گی۔ خاتون چونکہ اللہ کے نام پر حلال ہوئی تھی، اللہ کی آیات کو مذاق مت بناؤ۔ وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا ۔۔۔۔ اللہ کی آیات کا مذاق مت بناؤ اور اللہ کے انعامات، جو اس نے تم پر کیے ہیں یاد رکھو۔ تمہاری کیا حیثیت تھی، اس نے تم پر کتاب نازل فرمائی۔ تم کیا شئے تھے اس نے تمہاری طرف اپنا اولوالعزم رسول اور اپنا عالی شان رسول، ختم الرسل اور امام الانبیاء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث فرمایا جس نے حکمت کے موتی پرو دیے۔ زندگی کے سارے راز، موت اور بعد الموت، جنت و دوزخ کی باتیں ذہن نشین کرا دیں۔ اللہ اپنی کتاب اور اپنے حبیب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سے تمہیں نصیحت فرماتا ہے۔ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۔۔۔۔ اللہ کی عظمت کو ہمیشہ دھیان میں رکھو۔ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۳۱﴾ اور یہ بات یاد رکھو! اللہ ہر چیز سے واقف ہے۔

سورۃ البقرہ رکوع 30 آیات 232 تا 235

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ
اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ ذٰلِكَ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ
مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ وَاَطْهَرُ ؕ وَاللّٰهُ
يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۲﴾ وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ
كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ ؕ وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ
وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا ۚ لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌ
بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ ۗ وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ ۚ فَاِنْ اَرَادَا
فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا ؕ وَاِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ
تَسْتَرْضِعُوْٓا اَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّآ اٰتَيْتُمْ
بِالْمَعْرُوْفِ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۲۳۳﴾ وَالَّذِيْنَ
يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ
وَّعَشْرًا ۚ فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ
بِالْمَعْرُوْفِ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۲۳۴﴾ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا عَرَّضْتُمْ
بِهٖ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَآءِ اَوْ اَكْنَنْتُمْ فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ؕ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ
سَتَذْكُرُوْنَهُنَّ وَلٰكِنْ لَّا تُوَاعِدُوْهُنَّ سِرًّا اِلَّآ اَنْ تَقُوْلُوْا قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۬ؕ
وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ ؕ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ

يَعۡلَمُ مَا فِيٓ أَنفُسِكُمۡ فَٱحۡذَرُوهُۚ وَٱعۡلَمُوٓاْ أَنَّ ٱللَّهَ غَفُورٌ حَلِيمٞ ﴿٢٣٥﴾

اور جب تم عورتوں کو طلاق دو پھر ان کی عدت پوری ہو جائے تو انہیں اپنے (دوسرے) شوہروں سے نکاح کرنے سے نہ روکو جب وہ معروف طریقے سے آپس میں راضی ہوں۔ اس طرح سے تم میں سے جو اللہ اور یوم آخرت کے ساتھ ایمان رکھتا ہے اس کو نصیحت کی جاتی ہے یہ تمہارے لیے بہت زیادہ صفائی اور پاکی کی بات ہے اور اللہ جانتے ہیں اور تم نہیں جانتے ﴿۲۳۲﴾ اور مائیں اپنے بچوں کو پورے دو سال دودھ پلایا کریں یہ اس کے لیے ہے جو مدتِ رضاعت پوری کرنا چاہے اور جس کا بچہ ہے اس (والد) کے ذمہ معروف طریقے سے ان کا کھانا اور لباس (ضروریات زندگی) ہے کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دی جاتی۔ نہ ماں کو اس کے بچے کی وجہ سے نقصان پہنچایا جائے اور نہ باپ کو اس کے بچے کی وجہ سے اور اسی طرح (نان ونفقہ) بچے کے وارث کے ذمہ ہے پھر اگر آپس میں رضامندی اور مشورے سے دودھ چھڑانا چاہیں تو ان پر کوئی گناہ نہیں اور اگر تم اپنی اولاد کو دودھ پلوانا چاہو تو تم پر کوئی گناہ نہیں جب تم (دودھ پلانے والیوں کو) جو طے کیا ہے وہ دستور کے مطابق دے دو اور اللہ سے ڈرو اور جان لو کہ جو تم کرتے ہو اللہ اسے دیکھ رہے ہیں ﴿۲۳۳﴾ اور تم میں سے جو لوگ مر جاتے ہیں اور بیویاں چھوڑ جاتے ہیں تو وہ اپنے آپ کو چار ماہ دس دن تک روک کر رکھیں پھر جب وہ یہ عرصہ پورا کر لیں تو اپنے لیے جو بہتر جانیں (نکاح) دستور کے مطابق کر لیں تو تم پر کوئی گناہ نہیں اور جو تم کرتے ہو اللہ اس کی خبر رکھتے ہیں ﴿۲۳۴﴾ اور تم پر کوئی گناہ نہیں کہ تم ان عورتوں کو پیغام (نکاح) دینے کے بارے کوئی بات اشارۃً کہو یا اپنے دل میں پوشیدہ رکھو اللہ جانتے ہیں کہ عنقریب تم ان کا ذکر کرو گے اور لیکن ان سے خفیہ وعدہ مت کرو سوائے اس کے کہ تم اچھے طریقے سے بات کرو اور جب تک (اللہ کا) لکھا (عدت) پورا نہ ہو جائے نکاح کا ارادہ نہ کرو اور جان لو کہ جو تمہارے دلوں

میں ہے اللہ اسے جانتے ہیں سو اس سے ڈرتے رہو اور خوب جان لو کہ اللہ بخشنے
والے بردبار ہیں ﴿۲۳۵﴾

تفسیر و معارف

عبادات کو معاملاتِ دنیا سے جوڑنا:

ایک بنیادی بات یاد رہے! دینِ اسلام زندگی کے ہر فعل کو، خواہ وہ چھوٹا ہے یا بڑا، آخرت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ یہ بنیادی بات ہے لیکن آج ہم اس بات سے بھی بڑی حد تک دور ہو چکے ہیں۔ برصغیر میں ہمارا میل جول ہندوؤں سے رہا جو اکثریت میں تھے۔ پھر مسلمانوں میں بھی کچھ حکمران ایسے گزرے جنہوں نے اپنی سیاسی ضروریات کے لیے ہندوؤں کے ساتھ میل جول بڑھانے کے لیے اسلام اور کفر میں تمیز ختم کرنے کی کوشش کی، جیسے جلال الدین اکبر جیسے لوگوں کا یہ نظریہ کہ سب خدا ہی کو یاد کرتے ہیں، سب ایک ہو جائیں۔ دوسری طرف کم و بیش آٹھ نو سو سال یا لگ بھگ ایک ہزار سال مسلمانوں کی حکومت رہی لیکن ہندو اپنی ہندومت میں اتنا پختہ رہا کہ کسی مسلمان کے کپڑے کے ساتھ اس کا کپڑا لگ جاتا تو وہ کپڑا اجلا دیتے، کسی کا ہاتھ لگ جاتا تو وہ ہاتھ کو گائے کے گوبر یا پیشاب سے پاک کرتے۔ ان کے کھانے پینے کی جگہ پر اگر کسی مسلمان کا پاؤں پڑ جاتا تو اسے گائے کے گوبر سے صاف کرتے اسے کہتے ہیں امرت پی لو اور امرت گائے کا پیشاب ہوتا ہے۔ آج اس میں بھی زیادہ کٹر مذہبی ہندو یا ان کے مذہبی رہنما ایک چھوٹی سی بوتل میں گائے کا پیشاب جیب میں لیے پھرتے ہیں اور کہیں مسلمان سے ہاتھ ملانا پڑے یا کپڑے لگ جائیں تو انہیں پاک کرنے کے لیے تھوڑا تھوڑا اسپرے کر لیتے ہیں۔

ہندو تو اپنے ہندومت میں اور کٹر رہا کہ اس نے کوئی اسلامی رسم تو دور کی بات ہے، مسلمانوں کے ساتھ مس ہونا یا ان کے ساتھ لگنا بھی مناسب نہ سمجھا لیکن مسلمانوں کی بدقسمتی یہ ہے کہ حق سے ہٹتے گئے اور ہندوؤں کی رسومات اپناتے چلے گئے۔ ہماری شادی بیاہ کی رسمیں دیکھیں، موت کی رسمیں دیکھیں اور عام میلے ٹھیلے دیکھیں تو اکثریت میں آپ کو ہندوازم غالب نظر آئے گا۔ اسلام کے علاوہ جتنے مذاہبِ باطلہ ہیں ان کا فلسفہ یہ ہے کہ کون سی عبادت کی جائے تو اس میں دنیا کا کیا فائدہ ہوگا، چونکہ مذاہب باطلہ کے پاس آخرت کا تصور ہی نہیں۔ اگر کوئی ٹوٹا پھوٹا تصور باقی ہے تو اہلِ کتاب، یہود و نصاریٰ کے پاس ہے۔ ان دو کے پاس بھی صحیح تصور نہیں ہے اس لیے کہ انہوں نے اپنی کتابیں مسخ کر دیں، عقیدے برباد کر دیے لیکن ان کے علاوہ جتنے مذاہب ہیں ان میں آخرت کا تصور ہی نہیں ہے۔ جو کچھ وہ

کرتے ہیں دنیوی فائدے کے لیے کرتے ہیں کہ یہ کام کریں گے تو یہ مرض ٹھیک ہوجائے گا، یہ عبادت کریں گے تو روزی زیادہ ملے گی، یہ پوجا کریں گے تو فلاں کام ہوجائے گا۔

ہماری بدنصیبی یہ ہے کہ ہم نے یہ سوچ ہندوؤں سے لے لی اور یہ ہمارے اندر تک چلی گئی ہے۔ مجھے کئی خطوط آتے ہیں کہ میں نماز پنجگانہ پڑھتا ہوں، صبح وشام ذکر بھی کرتا ہوں، تلاوت بھی کرتا ہوں، تسبیحات بھی پڑھتا ہوں لیکن پھر بھی میں بیمار ہوگیا۔ بھئی! بیمار ہونا یا صحت مند ہونا ایک الگ بات ہے۔ اللہ کریم نے دنیا کا ایک نظام بنا دیا ہے۔ بندہ بیمار بھی ہوتا ہے، صحت مند بھی ہوتا ہے، اللہ کا ایک نظام ہے جو چل رہا ہے اور چلتا رہے گا، جب تک دنیا قائم ہے۔ تمہیں جو توفیقِ عبادت ہے، یہ اللہ کے ساتھ تمہارا تعلق استوار رکھنے کے لیے ہے، اللہ کی رضا کے لیے ہے، اللہ کی محبت کے لیے ہے، اللہ کے حبیب صلی اللہ علیہ وسلّم کے اتباع کے لیے ہے اور اللہ کے دین کے اتباع کے لیے ہے۔ یہ تو ایک الگ نعمت ہے جس سے تمہاری ابدی زندگی سنور رہی ہے۔

دنیا میں بے سکونی عذابِ آخرت کا پرتو ہے:

ایک اور بات یاد رکھیں! عبادات سے آخرت بنتی ہے تو جس بندے کی آخرت بہتر ہوتی ہے، اس کی دنیوی زندگی بھی بہتر ہوجاتی ہے چونکہ دنیا آخرت کا ایک پرتو ہے۔ اگر انسان میں سمجھ ہو، شعور ہو تو جو برائی کرتا ہے، ظلم کرتا ہے، اس کے پاس کتنی بھی دولت ہو، کتنا اقتدار و اختیار ہو، اسے سکون نصیب نہیں ہوتا۔ وہ بے قرار رہتا ہے، تڑپتا رہتا ہے، خوف زدہ رہتا ہے، آخر کیوں؟ اس لیے کہ اس کے ظلم کی وجہ سے اس کی آخرت برباد ہورہی ہے، وہاں اس کے لیے طرح طرح کے عذاب بن رہے ہیں اور آخرت چونکہ حقیقی زندگی ہے اور دنیوی زندگی عارضی ہے، اس عارضی زندگی پہ اس حقیقی زندگی کا عکس پڑتا ہے۔ آدمی کو اور کچھ نہ بھی ہو تو اسے سکون نہیں ملتا، اسے سمجھ نہیں آتی کہ میں کیوں ڈرتا ہوں، میں کس سے خوف زدہ ہوں؟ اپنے گرد ہزاروں پہرے لگاتا ہے، لگاتا چلا جائے گا لیکن پھر بھی ڈرتا رہے گا، اسے محلوں میں نیند نہیں آئے گی، کیوں؟ چونکہ آخرت برباد ہورہی ہے، اور جس کی آخرت بن رہی ہے وہ روکھا سوکھا کھا کے بھی خوش رہے گا، زمین پر لیٹ جائے گا تو بھی سکون سے سوجائے گا۔ اس کے لیے آخرت میں اللہ کے نزدیک جو اجر بن رہا ہے، اس کا پرتَو یا اس کی شعاعیں اسے اس دنیا میں بھی محسوس ہوتی ہیں۔

آدمی کو سوچنا یہ چاہیے کہ اگر بیماری بھی آگئی ہے تو آخرت سدھر رہی ہے۔ اس بیماری میں وہ جزع وفزع نہیں کرے گا اور اسے وہ پریشانی نہیں ہوگی جو کسی دوسرے بیمار کو ہوتی ہے اور وہ جزع فزع کرتا ہے۔ ایک وقت رزق میں تنگی آجاتی ہے، اللہ قادر ہے، دوسرے وقت اضافہ ہوجاتا ہے۔ دونوں طرح یہ دیکھا جاتا ہے کہ کم رزق میں

کیا میری بارگاہ میں ہی رہتا ہے یا حصولِ رزق کے لیے دوسروں کے دروازے پہ چلا جاتا ہے؟ زیادہ رزق دے کر بھی یہ دیکھا جاتا ہے کہ میری اطاعت کرتا ہے یا رزق کے بل بوتے پر پھر کر فرعون بن جاتا ہے اور من مانیاں کرنے لگتا ہے۔ لہٰذا عبادات کو معاملاتِ دنیا سے جوڑنا درست نہیں بلکہ عبادت اللہ کا ایک الگ انعام ہے، اس کا احسان ہے کہ توفیقِ عبادت دی۔ یہ بہت بڑا احسان ہے کہ اس نے ایمان عطا فرمایا۔

اللہ کی سب سے بڑی نعمت، بعثتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلّم:

وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا (النحل: 18) اگر تم گننا چاہو تو اللہ کی نعمتوں کو شمار نہیں کر سکتے۔ ان بے پناہ نعمتوں میں سے اس نے جس احسان کو گنوایا ہے، وہ ہے۔ لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا۔۔۔ (ال عمران: 164) اللہ نے مومنوں پہ احسان کیا ہے اور ایسا بے مثال احسان کیا ہے کہ ان میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کو مبعوث فرمایا۔ اب یہ احسان کیا کم ہے کہ بیمار سہی لیکن دامانِ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے تو وابستہ ہیں۔ اس پر ہمیں فخر ہونا چاہیے چہ جائیکہ ہم یہ لے بیٹھیں کہ دیکھو حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کا کلمہ پڑھتا ہوں اور بیمار ہو گیا ہوں۔ اگر کلمہ نہ پڑھتے تو ہو سکتا ہے کہ اس سے زیادہ بیمار ہو گئے ہوتے۔

مومن کی تکالیف تلافیٔ مافات اور ترقیٔ درجات کا ذریعہ ہیں:

اس کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے۔ ایک شخص دوا بھی لیتا ہے لیکن اس کی بیماری باقی رہتی ہے تو اسے سوچنا یہ چاہیے کہ اگر میں دوا نہ لیتا تو کیا حال ہوتا۔ یعنی اگر عبادات کے بعد بھی تکلیف ہے تو ممکن ہے کوئی تلافیٔ مافات ہو رہی ہو، کچھ خطائیں ایسی ہو گئی ہوں جن پر بجائے اس کے کہ اللہ آخرت میں بندۂ مومن کو شرمندہ کرے، اس نے تلافی کے لیے یہاں تھوڑی سی مصیبت بھیج دی۔ یہاں کی مصیبت جتنی بھی ہو، تھوڑی ہوگی، آخرت کی تھوڑی بھی عظیم ہوگی۔ اہل اللہ کو جو تکلیفیں آتی ہیں، انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو آتی ہیں، وہ ترقیٔ درجات کے لیے ہوتی ہیں۔ قربِ الٰہی کی منازل بھی ایسی ہیں جن کے ساتھ مصیبتیں ضروری ہیں، مجاہدہ ضروری ہے۔ اسے علماء حق نے مجاہدۂ اضطراری کہا ہے یعنی جو مجبوراً کیا جاتا ہے، جیسے شہادت قربِ الٰہی کی ایک منزل ہے۔ شہید ہونے والا موت سے بھی بالاتر ہو جاتا ہے، مر کے بھی زندہ رہتا ہے لیکن اس کے لیے قتل ہونا پڑتا ہے۔ اب شہید کہے کہ میں اللہ کے میدان میں بھی نکلا، میرا ایمان بھی بڑا اچھا تھا، میں عبادت بھی کرتا تھا، میں قتل کیوں ہو گیا؟ بھئی قتل نہ ہوتے تو شہید کیسے ہوتے۔ بندۂ مومن پر جو تکلیفیں آتی ہیں، کچھ تلافیٔ مافات کے لیے ہوتی ہیں، کچھ ترقیٔ درجات کے لیے ہوتی ہیں۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کا ارشادِ عالی ہے جس کا مفہوم ہے کہ مومن کے پاؤں میں کانٹا بھی چبھ جائے

تو اس کے گناہ معاف ہوتے ہیں، اور اسے اس کا اجر بھی ملتا ہے۔ کوئی ادنیٰ سی تکلیف بھی آئے تو گناہوں کی معافی کا سبب بھی بنتی ہے اور ثواب کا سبب بھی بنتی ہے لہٰذا اس چیز کو اس سے جوڑنا کہ میں نماز باقاعدہ پڑھتا ہوں، میں اللہ اللہ کرتا ہوں، اس لیے مجھے دنیا کی کوئی تکلیف نہ آئے، میرا بچہ بیمار نہ ہو، میرے بیٹوں کو روزگار مل جائے، مجھ پر روپوں کی بارش ہو جائے، یہ ہم نے ہندوؤں سے لے لیا ہے، یہ اسلام کا نظریہ نہیں ہے۔

کچھ بھی ہو جائے، آسمان پھٹ پڑے یا زمین پھٹ جائے لیکن دامانِ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم ہاتھ سے نہ چھوٹے تو کچھ بھی نہیں بگڑا، اور اگر ساری دنیا کی حکومت مل جائے لیکن دامانِ رسالت پناہی صلی اللہ علیہ وسلّم ہاتھ سے چھوٹ جائے تو بچا کچھ بھی نہیں۔ اسلام دنیوی مصائب اور معاملات کو اس نظر سے دیکھتا ہے اور یہی سوچ ہماری معاشرتی زندگی پر بھی حاوی ہونی چاہیے۔

یہاں چونکہ معاشرت، طلاق و نکاح کے مسائل چل رہے ہیں تو اس میں یہ بھی ہوتا ہے کہ اگر کسی وجہ سے کوئی بندہ طلاق کہہ بیٹھتا ہے تو اس سے فوراً ناراضگی ناچاقی شروع ہو جاتی ہے، بندوقیں نکل آتی ہیں۔ بھئی یہ ایک معاشرتی مسئلہ ہے، دو بندے اللہ کے نام پر جمع ہوئے۔ پہلے تو انہیں ضروری ہے کہ وہ اپنے اس جمع ہونے کو آخرت کی نظر سے دیکھیں کہ اللہ کے نام پر ہم ایک دوسرے پر حلال ہوئے ہیں تو ہمیں اس معاہدے کو بہر حال نبھانا چاہیے۔ خامیاں خوبیاں ہر انسان میں ہوتی ہیں۔ اگر نباہ ممکن نہیں تو علیحدگی بھی شریعت کے تقاضوں کے مطابق ہو لیکن اللہ کا خوف ہر حال میں دامن گیر رہے۔

دوسری شادی:

مجھ سے ایک دوست نے مشورہ کیا کہ میں چاہتا ہوں کہ بیوی کو طلاق دے دوں اور ایک اور شادی کر لوں۔ میں نے کہا بہت اچھی بات ہے، اگر گزارا نہیں ہو سکتا تو طلاق دے دو لیکن دوسری شادی کسی عورت سے نہ کرنا۔ کہنے لگا آپ نے عجیب بات کی، شادی عورت سے نہیں کروں گا تو کس سے کروں گا۔ میں نے کہا عورت سے کرو گے تو وہ بھی ایسی ہی ہوگی۔ اس کی جس بات سے خفا ہو شاید اس میں یہ نہیں ہوگی لیکن اس میں کوئی اور کمزوری ہوگی اور تمہیں زیادہ پریشان کرے گی۔ بجائے اس کے کہ ایک نیا تجربہ کرو، ایک نیا ساتھی بناؤ جس میں پتا نہیں کیا کمزوریاں ہوں، اس کی بجائے جس کی سمجھ آ گئی ہے اس کے ساتھ گزارا کر لو تو فائدے میں رہو گے۔ عورت آخر عورت ہے، انسان آخر انسان ہے۔ مردوں میں بھی خوبیاں خامیاں ہوتی ہیں، عورتوں میں بھی خوبیاں خامیاں ہوتی ہیں۔ ہمارے کتنے دوست احباب ہمارے ساتھ ذکر کرتے ہیں، ان میں ہمیں خامیاں بھی نظر آتی ہیں تو کیا انہیں

ذکر سے روک دیں؟ انسان ہیں، ان میں خوبیاں بھی ہوتی ہیں، خامیاں بھی ہوتی ہیں۔ ذکر ایک دوا ہے اور اگر تھوڑی دوا سے ٹھیک نہیں ہوا تو ان شاء اللہ زیادہ دوا سے ٹھیک ہو جائے گا۔ کم از کم صحت کے لیے علاج تو کر رہا ہے، اللہ یہی قبول کر لے گا اور آخرت میں اسے معاف کر دے گا۔ اگر اس چیز کا احساس کیا جائے اور میاں بیوی دونوں احساس کریں تو وہ کمزوریاں بھی رفع ہونے لگ جاتی ہیں۔

اسلام نے دوسری شادی کی جو اجازت دی ہے وہ اس لیے نہیں دی کہ تماشا بنایا کرو بلکہ اتنی سخت شرط عائد کی ہے فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ۔۔۔۔ تمہیں جو پسند ہوں، دو عورتوں سے شادی کرو، تین سے کرو، چار سے بیک وقت کر سکتے ہو لیکن اگر تمہیں یہ ڈر ہو فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا۔۔۔۔ اگر خطرہ یہ ہو کہ ان دو میں برابر انصاف نہیں کر سکوں گا فَوَاحِدَةً۔۔۔۔ تو پھر ایک ہی کافی ہے، پھر دوسری کی اجازت منسوخ ہو گئی۔

سمجھانے کے لیے کوئی معقول بات کہے تو اس کے خلاف ہو جاتے ہیں۔ ایک دفعہ ڈاکٹر غلام جیلانی برق نے اس موضوع پہ لکھا تھا کہ یہ آیت دوسری شادی کی اجازت کو منع کر دیتی ہے تو مولویوں نے بڑا شور کیا اور اس کے پیچھے کیا کچھ الزام لگائے لیکن حق یہ ہے کہ قرآن واضح بتا رہا ہے کہ اگر تمہیں اپنے آپ پر یہ بھروسہ ہو کہ تم دونوں میں برابر انصاف کر سکو گے، دونوں کو برابر روزی فراہم کر سکو گے، دونوں کو برابر تحفظ فراہم کر سکو گے، دونوں کو برابر لباس اور جو زندگی کی ضروریات مرد کے ذمے ہیں، جو سلوک مرد کے ذمے ہے، وہ دونوں سے برابر کر سکو گے تب دوسری کی اجازت ہے اور اگر یہ خطرہ ہو کہ میں دونوں کے ساتھ برابر کا سلوک نہیں کر سکتا یا ایک کو چھوڑ کر میں نے دوسری کرنی ہے تو قرآن کے مطابق اس کی اجازت نہیں ہے۔ قرآن تو کہتا ہے فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً۔۔۔۔ (النسا:3) کہ اگر یہ خطرہ ہو کہ دونوں میں عدل نہیں کر سکو گے تو ایک ہی شادی کی اجازت ہے، پھر ایک ہی رکھو۔ اگر دو کرتے ہو اور وہ آپس میں سلوک رکھیں یا نہ رکھیں، لیکن تمہارے ذمے ہے کہ ایک کو جیسا گھر دیا ہے دوسری کو بھی ویسا گھر دو، ایک کو جیسا کھانا دیتے ہو دوسری کو ویسا کھانا دو، ایک کو جیسے اخراجات دیتے ہو دوسری کو ویسے اخراجات دو اور ایک کے پاس جو سہولتیں ہیں وہ دوسری کے پاس بھی ہوں تو درست ہے، دو کر لو، تین کر لو، چار کر لو لیکن اگر عدل نہیں کر سکتے، فَاِنْ خِفْتُمْ۔۔۔۔ تمہیں اس بات کا خوف ہے کہ مجھ سے عدل نہیں ہو سکے گا تو پھر تمہیں ایک ہی شادی کی اجازت ہے۔ اسی بات پر لوگ ناراض بھی ہو جاتے ہیں۔ شرعی قاعدے کی پروا نہیں کرتے۔ پہلی بیوی کی ذمہ داری پوری نہیں کرتے اور دوسری کو لیتے ہیں، پھر اسے بھی اسی طرح لاوارث چھوڑ کر تیسری کر لیتے ہیں۔ نہ طلاق دیتے ہیں نہ رکھنے کا حق ادا کرتے ہیں۔

ایک مسئلہ اور اس کا حل:

ایک اور مسئلہ کھڑا ہو جاتا ہے کہ میاں بیوی میں نا چاقی ہو گئی، آپس میں گزارا نہ ہو سکا اور طلاق ہو گئی۔ اب ایک طلاق رجعی ہوتی ہے کہ اگر عدت کے اندر ان کی آپس میں صلح ہو جائے تو نکاح کی ضرورت بھی نہیں ہوتی۔ لیکن عدت گزر جانے پر نکاح ختم ہو جائے گا اور بعد میں اگر ان کی صلح ہو جائے تو نکاح کرنا پڑتا ہے۔ یہی اصول دو طلاقوں کا ہے۔ تین طلاقیں ہو جائیں تو قصہ ختم ہو جاتا ہے لیکن طلاق کا نام آتے ہی لڑکی کے میکے والے بندوقیں نکال لیتے ہیں اور عزت کا مسئلہ درمیان میں آ جاتا ہے۔ قرآن کریم فرماتا ہے: وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ ۔۔۔۔ اگر تم کسی خاتون کو طلاق دیتے ہو۔ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ اور اس کی عدت بھی گزر جاتی ہے، یہ دو طلاق تک ہے۔ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ ۔۔۔۔ اور اگر میاں بیوی کی صلح ہوتی ہے اور وہ آپس میں نکاح کرنا چاہتے ہیں تو اسے آن کا مسئلہ نہ بناؤ۔ لیکن ہوتا یہ ہے کہ لڑکی کے بھائی، اس کے کنبے یا اس کے خاندان والے درمیان میں رکاوٹ بن جاتے ہیں کہ کل اس نے طلاق دی، آج تم ہماری ناک کاٹتی ہو۔

ہماری عزت اتباعِ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم اور اسلام سے ہے:

اللہ فرماتا ہے، تمہاری ناک اللہ کے دین سے اہم نہیں ہے، تمہاری ناک کیا ہے! تمہاری آن کیا ہے! تمہاری عزت تمہاری آبرو کیا ہے! تمہاری آبرو اللہ کا دین ہے۔ عہدِ فاروقی میں مسلمانوں نے بیت المقدس کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ عیسائی اندر تھے، جب انہوں نے سمجھا کہ ہمارے پاس راشن پانی ختم ہو رہا ہے تو انہوں نے اپنے سرداروں اور علماء کو جمع کیا کہ اب کیا کیا جائے، لڑیں گے تو مارے جائیں گے، ہم ان کا مقابلہ بھی نہیں کر سکتے اور لڑتے نہیں ہیں تو اب اندر رہ نہیں سکتے۔ ان کے ایک عالم نے کہا کہ ہمارے پاس جو کتابیں ہیں ان میں بھی موجود ہے کہ اللہ کا آخری نبی علیہ السلام مبعوث ہوگا اور اس کا دوسرا خلیفہ اس شہر کو فتح کرے گا۔ ہماری کتابوں میں اس کا حلیہ تک دیا ہوا ہے۔ خلیفہ یہاں تشریف لے آئے اور ہم اسے ایک نظر دیکھ لیں تو آپ کو بتا سکیں گے کہ اس سے لڑو یا نہ لڑو۔ یہ گزارش دار الخلافہ میں پہنچی کہ امیر المومنین تشریف لائیں تو ہزاروں جانیں بچ سکتی ہیں، عیسائی غیر مشروط طور پر شہر حوالے کرنے پہ تیار ہیں۔ بیت المال سے ایک اونٹ لیا گیا اور ہمراہی کے لیے ایک غلام، کوئی گارڈ نہیں، اپنی تلوار کمر سے بندھی ہوئی ہے اور آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا لباس بھی پھٹا ہوتا تھا۔ راستے میں غلام سے کہا، بھائی میں اتنے کوس اونٹ پر بیٹھا ہوں اور تم پیدل چلے ہو، اب تم بیٹھ جاؤ، تمہارا بھی حق ہے۔ اس نے کہا، اگر اصرار کرتے ہیں تو آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ آگے بیٹھ جائیں اور مجھے پیچھے بٹھا لیں، تھوڑی دیر میں بھی سواری کر لوں گا، فرمایا یہ بھی جانور

ہے، ہماری طرح یہ بھی تھکتا ہے۔ یہ صحیح نہیں کہ ہم دونوں اس پر بیٹھ جائیں اور یہ اکیلا تھکتا رہے۔ جتنی دیر میں نے سواری کی، اتنی دیر اب تم کرو گے اور میں آگے آگے چلوں گا۔ بیت المقدس کے قریب پہنچے تو سواری کی باری غلام کی تھی۔ اوپر سے بارش آگئی، جوتے کیچڑ سے بھر گئے تو جوتوں سے جو کیچڑ اڑتا وہ لباس عالی پر بھی پڑتا۔ امیر المومنین رضی اللہ تعالیٰ عنہ، نے مہار تھامی ہوئی ہے، غلام اوپر ہے۔ آگے پوری عیسائی دنیا کے علماء جمع ہیں۔

امیرِ لشکر نے بڑھ کر استقبال کیا، خوبصورت سا لباس بھی لے گیا، اچھا گھوڑا بھی لے گیا اور عرض کیا آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس طرح جائیں گے یہ اسلام کی سبکی ہے، یہ لباس تبدیل کرلیں، اس گھوڑے پر بیٹھیں اور شان سے جائیں۔ سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے لباس تبدیل فرمایا گھوڑے پر بیٹھے لیکن اتر گئے۔ فرمایا، میرا لباس لے آؤ، اپنی یہ پوشاک اور اپنا گھوڑا لے جاؤ۔ عرض کی، امیر المومنین رضی اللہ تعالیٰ عنہ، کیا وجہ ہے۔ فرمایا، میں اس گھوڑے پہ بیٹھا تو میرے دل میں اکڑ سی آگئی۔ ہماری عزت اگر گھوڑوں سے ہوتی تو عربوں کے پاس نسل در نسل بے شمار گھوڑے تھے، اگر لباس سے ہوتی تو لوگ بڑے اچھے اچھے لباس پہنا کرتے تھے۔ ہماری عزت نہ گھوڑوں سے ہے نہ لباس سے، ہماری عزت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام سے ہے۔ میرا عمل محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے کے مطابق تھا، تم نے یہ مداخلت کردی، میں اسی طرح جاؤں گا۔ چنانچہ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اونٹ کی مہار تھامی اور چل پڑے۔

عیسائیوں کو اطلاع ہوئی کہ امیر المومنین رضی اللہ تعالیٰ عنہ آگئے ہیں۔ انہوں نے دیکھا کہ ایک بندہ ہے، اس طرح کا اس کا لباس ہے، کیچڑ میں لت پت ہے، اونٹ کی رسی پکڑی ہوئی ہے اور غلام کو اوپر بٹھایا ہوا ہے۔ ان علماء نے دیکھ کر کہا ہماری کتابوں میں امیر المومنینؓ کا یہی حلیہ ہے، اس سے لڑنا ہمارے بس کی بات نہیں، شہر مسلمانوں کے سپرد کردو۔

مسئلہ اور اس کے حل کے بارے بات ہو رہی ہے کہ ہماری ناک اور ہماری عزت کیا ہے؟ ہماری عزت ہے اتباعِ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ اگر طلاق ہوگئی ہے تو وہ بھی تمہارا برخوردار تھا۔ میاں بیوی میں ناچاقی ہوئی، طلاق ہوگئی لیکن اب انہیں سمجھ آگئی ہے، میاں بھی پشیمان ہے، بچی بھی پشیمان ہے تو اپنی ناک درمیان میں مت لاؤ، اللہ کریم فرماتا ہے: فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ۔۔۔ اگر وہ آپس میں نکاح کرنا چاہتے ہیں تو انہیں روکو مت کہ جو ایک رخنہ پڑا ہے اگر وہ شرعی طریقے سے درست ہو جاتا ہے تو اسے ناک کا معاملہ نہ بناؤ، مسئلہ ناک کا نہیں ہے، مسئلہ اللہ کی رضا کا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کا اور آخرت کا ہے۔ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ۔۔۔ ہاں شرعی طریقے سے جب وہ دونوں آپس میں رضامند ہوں، اگر شریعت اجازت نہ دے پھر تو

بات ہی الگ ہے لیکن جہاں شریعت اجازت دیتی ہے، وہاں اپنی انا کو درمیان میں نہ لاؤ بلکہ انہیں اس طرح سے درست کر لینے دو۔

ذٰلِكَ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ۔۔۔۔اللہ تمہیں اس کی نصیحت کر رہا ہے لیکن نصیحت ان کے لیے ہے مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ تم میں سے جس کا اللہ پر یقین ہے وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ۔۔۔۔اور جسے قیامت کا یقین ہے کہ مجھے اللہ کے روبرو پیش ہونا ہے، اس کے لیے تو اللہ کریم نصیحت فرما رہا ہے۔

ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ وَاَطْهَرُ۔۔۔۔اور یہی نہیں کہ اس میں صرف آخرت کا فائدہ ہے، یہ دنیا میں بھی تمہارے لیے بہترین اصلاح کا طریقہ ہے، پاکیزہ ہے اور صاف ستھرا ہے۔

وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ۝۲۳۲ اللہ کریم جانتے ہیں جو باتیں تم نہیں جانتے۔ اللہ کے حکم کی اطاعت یا شریعت کے حکم کی اطاعت اس لیے کرنی ہے کہ یہ اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلّم کا حکم ہے، خواہ تمہاری سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔ اس لیے کہ اللہ کا علم وسیع تر ہے، اللہ کا نبی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم جانتا ہے جو اللہ نے اسے بتایا لیکن تم نہیں جانتے۔ تم نے ایمان لا کر، کلمہ طیبہ پڑھ کر اپنا اختیار ان کے قدموں میں ڈھیر کر دیا۔ اب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی مرضی وہ کیا حکم دیتے ہیں لیکن جو حکم وہ دیتے ہیں اس میں تمہاری عزت ہے۔ اتباعِ شریعت میں عزت ہے، شریعت کے خلاف رسومات میں عزت نہیں۔

بڑی عجیب بات ہے! آپ دیکھ لیجیے کہ آج تک جتنی رسومات ہم کرتے ہیں، اپنے دل میں تو خوش ہوتے رہتے ہیں لیکن جن کو بلاتے ہیں وہ گالیاں ہی دیتے جاتے ہیں۔ میں نے کبھی کوئی بندہ بدعات یا رسومات پر راضی جاتے نہیں دیکھا خواہ وہ شادی ہو یا کوئی اور رسم ہو، جاتے ہوئے گالیاں ہی دے کر جاتے ہیں کہ ہمیں خراب کیا، کھانا ٹھنڈا دیا، کچھ نہ کچھ سب کو اعتراض ہوتا ہے اگرچہ رسومات کرنے والے اخراجات بھی کرتے ہیں اور اپنے دل میں سمجھتے ہیں کہ ہم بہت بڑے بن جائیں گے۔

اسلام کے نزدیک ساری عزت اس کام میں ہے اللہ جس کا حکم دے، اللہ کا رسول صلی اللہ علیہ وسلّم حکم دے، ساری عزت اتباعِ رسالت رسول صلی اللہ علیہ وسلّم میں ہے، دین میں ہے لیکن یہ ساری بات سمجھ میں تب آتی ہے۔ جب ایمانِ کامل نصیب ہو۔ فرمایا: مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ اللہ پہ یقین کامل نصیب ہو آخرت پہ ایمان نصیب ہو تو یہ باتیں سمجھ آتی ہیں۔

اسلام دین کامل ہے اور زندگی کے ہر شعبے کی ہر باریکی کو بیان فرماتا ہے۔ زندگی کا کوئی ایسا راستہ نہیں ہے جس پر نقوشِ کفِ پائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم موجود نہ ہوں اور یہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کا ایک بے مثال معجزہ ہے۔ دنیا میں اس سے پہلے بھی تہذیبیں بنتی رہیں، آئین و دستور بھی بنتے رہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کے بعد بھی نئی نئی تہذیبوں نے جنم لیا، نئے نئے آئین و دستور بنے۔ بڑی عجیب بات یہ ہے کہ کسی ایک قوم، ایک ملک، ایک خطے کے چنے ہوئے لوگ اس خطے کے لیے دستور بناتے ہیں۔ لیکن جب اس کے نفاذ کی باری آتی ہے تو پھر انہیں سوچنا پڑتا ہے، سر جوڑ کر بیٹھنا پڑتا ہے اس میں تبدیلیاں آتی ہیں، Ammendments آتی ہیں اور اس میں کتنی خرابیوں کا پتہ اس وقت چلتا ہے جب اسے عملی طور پر نافذ کیا جاتا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ وہ ہمیشہ بدلتا رہتا ہے اس لیے کہ وقت کے ساتھ ساتھ لوگوں کی ضروریات بدلتی ہیں، ضروریات کی تکمیل کے ذرائع بدلتے ہیں اور ضروریات اور ذرائع کی یہ تبدیلی لوگوں کی فکر اور سوچ کو تبدیل کر دیتی ہے۔ سوچنے کے انداز بدلتے ہیں اور جو قانون بنایا گیا تھا وہ ان تبدیلیوں کا ساتھ نہیں دیتا، لہٰذا اسے بھی بدلنا پڑتا ہے۔

اسلام کی عالمگیریت، آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کا معجزہ:

یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کا معجزہ ہے کہ آج سے سوا چودہ سو برس پہلے جو مکمل دستورِ حیات حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم نے دیا، وہ اپنی قوم کے لیے نہیں تھا، اہلِ عرب کے لیے نہیں تھا، کسی ایک نسل کے لیے نہیں تھا، کسی ایک خطے کے لیے نہیں تھا بلکہ روئے زمین پر بسنے والی اولادِ آدم کے لیے تھا۔ سب سے عجیب بات تو یہ ہے کہ اہلِ مغرب کے بنائے ہوئے قوانین اہلِ مشرق کو راس نہیں آتے اور شمال کے لوگوں کے بنائے ہوئے قوانین پر جنوب کے لوگوں کے لیے عمل ممکن نہیں۔ ایک ایسا دستورِ حیات ممکن نہیں جو موسموں کی تبدیلی، خوراک، افراد کی تبدیلی، ان کی سوچوں کی تبدیلی، ان کی رسومات کی تبدیلی سے متاثر ہوئے بغیر ہر جگہ، ہر قوم اور ہر ملک کے لیے یکساں قابلِ عمل ہو۔ یہاں گرمی ہے تو جنوب میں سردی ہے، یہاں شدید گرمی ہوگی تو وہاں برف باری شروع ہو جائے گی۔ اس وقت بھی بعض ممالک میں شدت سے گرمی پڑ رہی ہے تو بعض ممالک میں شدید برف باری ہو رہی ہے۔ لوگوں کے رنگ مختلف ہیں، نسلیں مختلف ہیں، غذائیں مختلف ہیں، سوچ کے انداز مختلف ہیں لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے جو دستور دیا وہ ایک ہے اور پوری زندگی کا ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ جہاں جہاں، دنیا کے جس ملک میں جس نے دینِ اسلام قبول کیا، اس کے لیے اس پر عمل آسان ہے اور کوئی کمیٹی نہیں بنی جو اس میں تبدیلی کرے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اس کی تشریح کی تو آئمہ کرام نے بھی انہی ارشاداتِ عالیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی تشریح اور وضاحت کی۔ دنیا میں نئے پیدا ہونے والے مسائل کے

لیے ضرورت کے مطابق ان احکام سے جواب تلاش کیا لیکن تلاش اسی لفظ سے کیا جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادات فرمایا تھا۔ کہیں باہر سے کوئی نئی چیز نہ اس میں آسکتی ہے، نہ اس میں سے کوئی چیز گھٹائی جاسکتی ہے۔

اسلام آسان ترین طرزِ حیات ہے:

اسلام دین ہے۔ جو دستورِ حیات اسلام نے دیا، زندگی کو آسان کرتا ہے۔ ایک قاعدہ ہے کہ آپ دو نقطے ملانا چاہتے ہیں تو جتنی لائنیں کھینچیں گے، ساری لمبی ہوں گی، ٹیڑھی میڑھی ہوں گی لیکن جو لائن سب سے مختصر ہوگی، سیدھی بھی ہوگی، اسے خطِ مستقیم کہا جاتا ہے۔ اسلامی طرز حیات خطِ مستقیم کی طرح ہے۔ اس کے علاوہ جتنی تہذیبیں ہیں، ان میں ایچ پیچ اور تکلیفیں زیادہ ہیں اور زندگی کی آسانیاں کم ہیں۔ کسی کام کو کرنے کا جو بھی صحیح طریقہ ہوتا ہے، وہ ہمیشہ آسان ہوتا ہے۔

ہر کہ دانا کند کند ناداں
لیک بعد از خرابی بسیار

یعنی جو کچھ بھی دانشور کرتا ہے، کرتا بے وقوف بھی وہی ہے لیکن وہ بڑی خرابی کے بعد کرتا ہے۔ بہت سی چیزیں ضائع کرنے کے بعد وہ کام کرتا ہے جو دانا شروع میں ہی کر لیتا ہے۔ دینِ اسلام یا طریقِ حیات جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا، یہ دانش ہے، دانائی ہے اس لیے قرآن نے اسے حکمت کہا ہے۔ **وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ** کتاب تو قرآن کریم ہے۔ اس کی جو تشریحات حدیث شریف میں حضور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمائیں وہ حکمت ہے اور زندگی کا آسان ترین راستہ ہے اور خدانخواستہ جتنا ہم اسلام سے ہٹیں گے، اتنی ہمیں تکالیف ہوں گی، مشکلات آئیں گی، پریشانیاں ہوں گی۔ پھر دوسری مزے کی بات یہ ہے کہ اسلامی طرزِ حیات محض دستورِ حیات نہیں، یہ دین ہے۔

مذہب اور دین میں فرق:

مذہب اور دین دو الگ چیزیں ہیں۔ ہم اسلام کو بھی مذہب کہہ دیتے ہیں لیکن اسلام محض مذہب نہیں ہے۔ مذہب سے مراد کوئی بھی راہ جسے کوئی اختیار کرلے، کوئی تہذیب، کوئی اندازِ فکر، جس طرح کوئی جینا شروع کر دے، زندگی گزارنے کا کوئی راستہ اپنا لے تو اسے مذہب کہیں گے۔ اسلام دین ہے یعنی اس پر عمل کرنے سے صرف زندگی آسان نہیں ہوتی بلکہ اس کا ہر عمل اللہ کی عبادت ہے۔ سنّت کے مطابق کمانا عبادت ہے، سنّت کے مطابق جنگ عبادت ہے، سنّت کے مطابق قتل کرنا عبادت ہے، سنّت کے مطابق قتل ہو جانا عبادت ہے۔ یہ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کا سب سے بڑا معجزہ ہے جسے زمانے کی روِش گہنا نہ سکی۔ جسے صدیاں پرانا نہ کر سکیں، جس میں انسانی ضرورتوں میں تبدیلیوں کے باوجود تبدیلی کی ضرورت محسوس نہیں کی جا سکی۔ کتنے زمانے بدلے، کتنی صدیاں بدلیں، لوگوں کے لباس بدل گئے، لوگوں کے کھانے کے انداز بدل گئے، لوگوں کے سفر کے طور طریقے بدل گئے لیکن احکامِ شریعت میں تبدیلی کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ کسی چھوٹے سے چھوٹے مسئلے کو چھوڑا بھی نہیں گیا۔

مسائلِ رضاعت:

نکاح اور طلاق کے معاشرتی مسائل چل رہے تھے۔ ظاہر ہے جب نکاح ہوگا تو اولاد ہوگی، اولاد کے مسائل ہوں گی۔ فرمایا: وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ۔۔۔۔ جب ماں یہ چاہتی ہے کہ بچہ کی مدتِ رضاعت پوری کرے تو وہ بچے کو دو سال مکمل دودھ پلائے۔ مائیں اپنے بچوں کو کامل دو سال دودھ پلائیں اگر ان کا یہ ارادہ ہے کہ وہ رضاعت خود مکمل کریں۔ یہ کوئی مجبوری نہیں ہے، ان کے ارادے پہ منحصر ہے۔

گزشتہ آیات سے طلاق کا مسئلہ چل رہا تھا، اب احکامِ رضاعت بیان ہو رہے ہیں کہ ایک خاتون کو طلاق ہوگئی لیکن اس کا بچہ بھی ہے۔ اب جس نے طلاق دی وہ تو اس سے فارغ ہو گیا۔ اگر اس کا بچہ ہے اور وہ اسے دو سال دودھ پلاتی ہے تو وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَ كِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ۔۔۔۔ پھر جو معروف، یعنی جو اُن کا مرتبہ ہے، جو اُن کا معیارِ زندگی ہے، جیسا وہ کھاتے اور پہنتے ہیں، اس طرح کا رزق، کپڑا اور ان کی ضروریات پورا کرنا بچے کے باپ کے ذمے ہے۔ وہ اس کے گھر میں ہے تو بھی اس کے ذمے ہے اور اگر خدانخواستہ ان میں طلاق ہوگئی ہے اور علیحدگی ہوگئی ہے، تو جب تک بچہ دودھ پیتا رہے گا تب تک خاتون کی روٹی، کپڑا اور بچے کی ضروریات باپ کے ذمے ہوں گی اور معروف طریقے سے ہوں گی۔

ہر آدمی کا ایک معیار ہوتا ہے۔ اس کے مطابق وہ کھاتا ہے، پہنتا ہے، اگر وہ طبقہ امراء سے تعلق رکھتے ہیں تو اسی طرح ان کی ضرورت پوری کرے گا، متوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہیں تو اسی طرح ان کی ضرورت پوری کرے گا، غریب طبقے سے تعلق رکھتے ہیں تو اسی طرح سے ان کی ضرورتیں پوری کرے گا لیکن ماں اور بچے کی ساری ضرورتوں کا ذمہ دار باپ ہوگا۔ بِالْمَعْرُوْفِ ۔۔۔۔ معروف طریقے سے، اسی طرح جیسا اس سے پہلے ان کا معیار ہے۔ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا ۔۔۔۔ اللہ کسی کو اس کی ہمت سے بڑھ کر کوئی تکلیف نہیں

دیتا، وہی حکم دیتا ہے جتنی اس میں قوت ہے۔ جو کام وہ نہیں کر سکتا اس کا کوئی بندہ مکلف نہیں ہے۔ اس لیے ارشاد فرمایا کہ معروف طریقے سے، جو اُن کا اپنا معیار ہے، اس کے مطابق دے۔ اس لیے کہ اللہ کریم کسی کو وہ حکم نہیں دیتا جس کے کرنے کی اس میں استطاعت نہ ہو۔

لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌۢ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ۔۔۔۔اب اگر نااتفاقی بھی ہوگئی ہے تو اس بچے کو ذریعہ اذیت نہ بنایا جائے، نہ ماں کے لیے نہ باپ کے لیے۔ اب یہ نہ ہو کہ باپ بچہ چھین لے اور ماں کو بھگا دے۔ یہ بھی درست نہیں ہے کہ باپ کے لیے بچہ وجہء اذیت بن جائے یا سسرال والے بچہ چھین کر لے جائیں اور وہ عدالتوں کے چکر لگاتا رہے، یہ دونوں حرام ہیں۔ دیکھ لو! ہمارے معاشرے میں یہ دونوں کام آج کتنے عام ہیں۔ عدالتوں میں اکثر خاندانی مقدمات میں یہ ہے کہ بیوی بچہ لے گئی، مجھے نہیں دیتی، بیوی کہتی ہے کہ میاں نے چھین لیا مجھے نہیں دیتا۔ فرمایا، جب تک بچہ دودھ پیتا ہے تب تک والدہ کے ساتھ رہے گا اور اخراجات والد دے گا۔ نہ والدہ اسے بچے کے بہانے تنگ کرے اور نہ وہ بچے کو ذریعہ بنا کر اس خاتون کو تنگ کرے۔ وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ۔۔۔۔اور اگر وہ بندہ فوت ہو جاتا ہے تو بچے اور ماں کی ضروریات پوری کرنے کا یہ حکم اس کے وارث، اس کے جانشین کے لیے ہوگا، یہی بات اسے پوری کرنا پڑے گی۔

فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ۔۔۔۔ہاں وہ خاتون اور وہ بندہ مل کر مشورے سے اور اپنی رضا مندی سے اس کا دودھ چھڑانا چاہتے ہیں تو فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا۔۔۔۔ایک دوسرے کو تنگ کرنے کے لیے نہیں، وہ آپس میں مشاورت کریں۔ وہ کہتا ہے میں اس کے دودھ کا کہیں اور انتظام کر لیتا ہوں، اجرت پر اسے دودھ پلوالوں گا، ڈبے کا دودھ پلا کے پال لوں گا اور وہ کہتی ہے کہ پھر مجھے اتنا خرچہ دے دو، میں الگ ہو جاتی ہوں۔ آپس میں مشورہ کر کے معروف طریقے سے وہ اس بات پہ راضی ہو جاتے ہیں کہ دودھ چھڑوائیں۔ اسی طرح دونوں میاں بیوی ایک گھر میں ہیں، بچہ پیدا ہو گیا ہے اور ابھی میاں بیوی کی علیحدگی نہیں ہوئی۔ پھر بھی نہ آپ عورت کو مجبور کر سکتے ہیں کہ وہ دو سال ہی دودھ پلائے اور نہ یہ مجبور کر سکتے ہیں کہ چھ مہینے میں چھڑا دے۔ بعض عورتیں بیمار ہوتی ہیں اور ڈاکٹر کہتا ہے کہ آپ بچے کو دودھ نہ پلائیں تو اب میاں بیوی آپس میں مشورہ کریں۔ بعض عورتیں صحت مند ہوتی ہیں لیکن وہ چاہتی ہیں کہ بچہ کہیں اور یا دوسرے دودھ سے پالا جائے تو دودھ چھڑانے میں کوئی حرج نہیں لیکن ایک کی مرضی نہیں چلے گی۔ چونکہ زندگی کے دونوں حصہ دار ہیں، دونوں مشورہ بھی کریں اور دونوں اس بات پہ متفق بھی ہوں، تب جائز ہوگا۔

وَاِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْٓا۔۔۔۔ایک اور طریقہ بھی ہے کہ میاں بیوی راضی ہو جائیں کہ وہ بچے کو کسی دوسری خاتون سے دودھ پلوانا چاہتے ہیں، رضاعت پر دینا چاہتے ہیں۔ یہ قدیم عرب میں رواج بھی

تھا کہ عرب سرداروں کے گھروں میں بچوں کو دودھ نہیں پلایا جاتا تھا۔ جب بچہ پیدا ہوتا تو دیہات سے خواتین آجاتی تھیں۔ انہی دنوں میں ان خواتین کی اپنی اولاد بھی ہوتی تھی۔ وہ سرداروں سے ان کے نوزائیدہ بچے لے جاتیں، اپنے بچے کو بھی اپنے دودھ پہ پالتیں اور اس بچے کو بھی اپنے دودھ پہ پالتیں۔ جب وہ بچہ دو سال یا تین سال کا ہوجاتا اور کبھی ان کی مرضی کے مطابق چار پانچ سال کا ہوجاتا، عموماً جب مدتِ رضاعت گزر جاتی تو وہ بچہ پھر لا کر پیش کر دیتیں اور عرب سردار انہیں انعام و اکرام دیا کرتے تھے۔ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کی رضاعت و پرورش کے لیے دائی حلیمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا نام معروف ہے۔

یہ رضاعت بھی، تربیت بھی تب ہے کہ خاندان کے دونوں ستون راضی ہوں اور متفقہ فیصلے سے بچہ رضاعت کے لیے دینا چاہیں تو کوئی گناہ نہیں ہے۔ اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّآ اٰتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ۔۔۔ جب تم یہ طے کرلو کہ انہیں دینا کیا ہے، معروف طریقے سے اپنی حیثیت کے مطابق اس کی اجرت طے کرلو تو انہیں باقاعدگی سے ادا کرو اور وہ بچے کو دودھ پلائیں، اس کی تربیت کریں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کی ولادت پر بھی دیہات سے خواتین مکہ مکرمہ آئیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کے ساتھ شہر میں سرداروں کے ہاں جو بچے تھے، سب نے ایک ایک لے لیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کے والدِ گرامی کا وصال ہوچکا تھا اور مالی حالات ایسے نہیں تھے کہ کوئی خاتون آتی۔ دائی حلیمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا خود بھی غریب تھیں، اپنی غربت کا اظہار بھی کر رہی تھیں۔ انہیں کسی نے بچہ دینا گوارا نہ کیا لیکن ان کی خوش نصیبی کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کی رضاعت کی سعادت ان کے حصے میں آئی۔ سیرت میں موجود ہے کہ جب وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کو گود میں لے کر سانڈنی پر بیٹھیں تو ان کی سانڈنی سب سے آگے تھی اور سارا قافلہ پیچھے چھوڑے جارہی تھی جبکہ آتے ہوئے سارا قافلہ آگے ہوتا اور ان کی سانڈنی پیچھے رہ جاتی تھی۔ سانڈنی کے دودھ نہیں تھا لیکن دودھ بھی اتر آیا۔ مائی حلیمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا دودھ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کے رضاعی بھائی، جو مائی حلیمہ سعدیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی اولاد تھی، سے بھی ختم نہیں ہوتا تھا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کو بھی کافی ہوتا۔ حضور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے وہیں تربیت پائی۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلّم واپس آئے۔

اعلان نبوت چالیس سال کی عمر میں ہوا۔ تیرہ برس بعد حضور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے ہجرت فرمائی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم مدینہ منورہ میں تھے تو فتوحات شروع ہوئیں اور قبائل اسلام میں شامل ہونا شروع ہوئے۔ مائی حلیمہ سعدیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے قبیلے پر بھی فتح نصیب ہوئی اور اس کے لوگ قیدی بنائے گئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کی

ایک دودھ شریک بہن زندہ تھی، وہ بھی جب حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کے سامنے لائی گئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلّم نے پہچان لیا اور دوش مبارک سے اپنی چادر مبارک اتار کر بچھادی کہ یہ تو میری بہن ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم نے بڑی تکریم کی اور چادر پر بٹھایا۔ جتنا کنبہ قید ہو کر غلام بن گیا تھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کا ان کے ساتھ رشتہ بنتا تھا۔ اسلام قبول کریں نہ کریں لیکن ان کو غلام نہیں رکھ سکتے تھے۔ وہ سارا قبیلہ آزاد بھی ہو گیا اور سب نے اسلام بھی قبول کر لیا۔

رضاعی بہن بھائی:

بچہ جس ماں کا دودھ پیتا ہے، اس خاتون کی ساری اولاد اس کے بہن بھائی ہو جاتے ہیں۔ اسے رضاعی بھائی اور رضاعی بہن کہتے ہیں اور صرف اسی بچے کا اور ان بچیوں کا جو اس خاتون کی ہیں، آپس میں نکاح جائز نہیں ہے۔ اس بچے کے دوسرے بہن بھائی جنہوں نے اس خاتون کا دودھ نہیں پیا، وہ بھائی بہن نہیں بنتے۔ ان کا آپس میں نکاح جائز ہے لیکن جو دودھ شریک بہن بھائی ہیں، وہ حقیقی بہن بھائیوں کی طرح ہیں اور ان کا آپس میں نکاح نہیں ہوتا۔

شاباش کی امید صرف اللہ سے رکھو:

وَاتَّقُوا اللّٰہَ۔۔۔ یہ نرے معاملاتِ دنیا نہیں ہیں۔ آپ بچے کو دودھ پلواتے ہیں تو بظاہر یہ ایک دنیوی کام ہے۔ آپ نے پیسے دے دیے، اس نے دودھ پلا دیا، بات ختم ہو گئی لیکن اسلام میں ایسا نہیں ہے۔ اللہ کے حکم کے مطابق بچے والے بھی پورے خلوص سے اس میں شامل ہوں، جو رضاعت کے لیے لے کر گئی ہے وہ بھی پورے خلوص سے اس کی تربیت کرے، اس لیے کہ دونوں کو اللہ دیکھ رہا ہے۔ جب ہم سے کوئی اچھا کام ہو جاتا ہے تو ہم سمجھتے ہیں کہ ہمارے اردگرد کے لوگ یا ہم سے اوپر والے لوگ ہمیں بڑی شاباش دیں گے۔ اسلام نے ایک بڑا خوبصورت اصول رکھا ہے کہ جب آپ دیانت سے کام کرتے ہیں تو شاباش کی امید صرف اللہ سے رکھو۔

وَاتَّقُوا اللّٰہَ ۔۔۔ جس کے لیے کر رہے ہو وہ تمہاری حمایت کرے گا، وہ تمہیں شاباش دے گا، وہ تمہیں عزت دے گا، وہ تمہیں دشمنوں سے بچائے گا، وہ تمہاری تکلیفیں دور کرے گا۔ اس لیے کہ تم جو کام کر رہے ہو وہ کسی بندے کی خوشی کے لیے نہیں، الٰہ العالمین کی خوشی کے لیے کر رہے ہو، اس کے نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کی سنّت کے مطابق کر رہے ہو۔ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کے حکم کے مطابق اپنی ذمہ داری دیانت داری سے ادا کر رہے ہو تو یہ دیانت وامانت جس کا حکم ہے، اسی سے نفع کی امید بھی رکھو۔ لوگوں کا کیا ہے! لوگوں کو تو دھوکا بھی دیا جا سکتا ہے۔ جو دل کے حال سے واقف ہے، جو جانتا ہے کہ کس خلوص اور کس نیت سے آپ یہ کام کر رہے ہو۔ اگر خلوص سے کر رہے ہو تو پھر اس کی رضا کے لیے کرو، اس لیے کہ وہی بہترین اجر دینے والا ہے۔ آپ کو دینے والا بندہ کوئی نہیں ملے

گا، لینے والے بندے ملیں گے۔ بندے کی فطرت میں احتیاج ہے اور یہ کبھی نہیں نکلتی۔ احتیاج بڑھتی جاتی ہے، ملک کا حکمران بن جاتا ہے لیکن اس کی محتاجی نہیں جاتی۔

استغنا صرف اللہ کو زیبا ہے، وہ غنی ہے۔ محتاج سے محتاج کیا امید رکھے گا! آپ نے کبھی ان گداگروں کو دیکھا ہے جو خانہ بدوش ہوتے ہیں۔ ان کا ایک خاص style ہوتا ہے۔ شام کا کھانا نہیں ہے، سٹائل مانگ کر لانا تھا لیکن بیوی بیمار ہوگئی، مانگنے کے لیے نہیں جا سکے۔ شام کو کچھ بھی نہیں ہے تو فاقہ کر لیں گے۔ دوسرے گداگر کے پاس لینے نہیں جائیں گے۔ سارے گاؤں سے مانگیں گے، بندے بندے سے مانگیں گے، جھاڑیں کھائیں گے، ہر دروازے پہ جائیں گے لیکن گداگر کے دروازے پہ نہیں جائیں گے۔ میں نے ایک گداگر سے پوچھا یہ کیا فلاسفی ہے؟ کہنے لگے! جو خود مانگ کر لاتا ہے وہ آگے کیا دے گا! اس سے بھوکا سو لینا بہتر ہے، صبح خود مانگ لیں گے، گدا کر لیں گے۔

ہر بندہ ہی گداگر ہے، ہر بندہ مانگنے والا ہے۔ ہم مانگنے والوں سے کیوں مانگیں؟ دینے والے سے مانگنا چاہیے لہٰذا کسی گداگر کے دروازے پر گدا کرنے کے لیے مت جاؤ۔ یہاں تو ہر بندہ محتاج ہے، صحت میں محتاج ہے، سوچ اور فکر میں محتاج ہے، کان اور آنکھوں میں محتاج ہے، رزق میں محتاج ہے اور وہ شہنشاہوں کو کھانا نہ کھانے دے تو وہ دس دس دن بھوکے بیٹھے رہتے ہیں۔ وہ صحت کے لیے کھاتے ہیں تو بیمار ہو جاتے ہیں۔

لہٰذا اسلام یہ ہے کہ بیوی سے معاملہ ہو، بچوں سے معاملہ ہو، رشتہ داروں سے معاملہ ہو، دوستوں سے دشمنوں سے ہو، رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق کرو۔ کام آسان بھی ہوگا، اللہ کریم اس کی قدر بھی فرمائیں گے، دنیا میں بھی آسانی ہوگی۔ اسلام صرف مذہب نہیں، اسلام دین ہے۔ دین کا مطلب یہ ہے کہ آپ کو اس کام کا اجر دونوں عالم میں، یہاں بھی اور وہاں بھی ملے گا۔

یاد رکھو! مزدوری کرنا ہمارے ذمے ہے، اجر دینا اُس کے ذمے ہے۔ خلوص سے کرو گے تو آپ کا کام بھی عبادت شمار ہوگا، اس کا اجر دنیا میں بھی ملے گا، آخرت میں بھی ملے گا۔ لوگوں کی خوشی کے لیے کرو گے لیکن لوگ اور ناراض ہو جائیں گے۔

تقویٰ، محبت کے رشتے کی معراج:

وَاتَّقُوا اللّٰہَ۔۔۔ تقویٰ کا مفہوم ڈر لکھ دینا، اردو کی تنگ دامنی ہے۔ ہمارے پاس اردو کا کوئی اور لفظ نہیں جو "ڈر" کی جگہ لکھیں ورنہ یہ ڈر تقویٰ کا مطلب نہیں ہے۔ ڈر کی اقسام ہوتی ہیں۔ ایک ڈر ہے جسے عربی میں خوف کہتے ہیں۔ جیسے اپنی جان کے چلے جانے کا، اپنا نقصان ہونے کا، کسی سے کوئی تکلیف پہنچنے کا خوف۔ ایک ڈر

کسی چور اچکے کا ہوتا ہے، کسی ڈاکو کا ڈر ہوتا ہے، کسی حاکم کا ڈر کہ میں یہ کام کر رہا ہوں، حکومت مجھے پکڑ لے گی۔ یہ مختلف قسم کے ڈر ہیں۔ ایک انوکھا سا ڈر اور بھی ہوتا ہے۔ ہمارا ایک بیٹا ہے، بھائی ہے، دوست ہے، ہم یہاں بیٹھے ہیں اور وہ کہیں امریکہ میں یا برطانیہ میں بیٹھا ہے۔ کوئی برادری کی بات آجاتی ہے، الیکشن آجاتے ہیں تو ہم کہتے ہیں، اس سے مشورہ ضرور کریں گے ورنہ وہ خفا ہو جائے گا۔ ایک اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں وہ خفا نہ ہو جائے، یہ بھی ڈر ہے۔ اب ایمان اور اسلام کے حوالے سے اللہ کے ساتھ ایسا تعلق ہے کہ جب کام کرتے ہو تو تمہیں اندیشہ لاحق ہو جائے کہ غلط کروں گا تو کہیں اللہ خفا نہ ہو جائے، یہ تقویٰ ہے۔ یعنی تقویٰ یہ ہے کہ عمل کرتے وقت یہ اندیشہ پیشِ نظر ہو کہ میرے کام کرنے کے انداز سے اللہ کریم روٹھ نہ جائے۔ یہ محبت کے رشتے کی ایک معراج ہے، تعلق کی ایک بلندی ہوتی ہے۔ اب تقویٰ کا ترجمہ کرتے ہوئے اردو میں ڈر لکھ دیتے ہیں تو اس ڈر سے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ شاید اللہ کریم کہیں تاک میں بیٹھے ہیں کہ بندہ قابو آئے اور وہ اسے سزا دیں۔ ڈرا ڈرا کے لوگوں سے اللہ کا نام بھی چھڑا دیا کہ اللہ کا نام نہ لو بھئی، اللہ سے ڈرتے رہو۔

اللہ تو اپنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سراپا محبت بنا کر مبعوث فرماتا ہے اور اتنی محبتیں بانٹیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ زندگی کا کوئی شعبہ محبوبِ ربّ العالمین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے محبتوں سے خالی نہیں چھوڑا۔ فرمایا: كُنْتُمْ اَعْدَآءً ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ قومیں قوموں کی، خاندان خاندانوں کے، باپ بیٹوں کے، بھائی بھائیوں کے دشمن تھے۔ فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ۔۔۔۔ (آل عمران:103) محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمہارے دلوں میں لبالب الفت بھر دی، محبتیں تقسیم فرمائیں اور ایسے فرمائیں کہ ایک دوسرے کے قاتل، ایک دوسرے کے دشمن، ایک دوسرے کے پہرے دار اور جاں نثار بن گئے، ایک دوسرے پر جان لٹانے والے بن گئے۔ یہ تو سارا محبت کا کھیل ہے۔ اسلام تو اوّل و آخر ہے ہی محبت، یہاں بھی بات محبت کی ہے کہ اللہ سے آپ کو ایسی محبت ہے کہ آپ چاہتے ہیں اس میں کہیں تو کوئی بال نہ آجائے، کہیں کوئی کمی نہ آجائے۔

ان احکامات پر عمل کرنا محض اس لیے نہیں ہے کہ اس میں دنیوی آسانیاں ہوں۔ وَاتَّقُوا اللّٰهَ معاملہ تو میاں بیوی کا اور بچوں کا، ان کے دودھ پلانے کا چل رہا ہے لیکن فرمایا، اللہ سے محبت اور پیار والی بات درمیان میں ہے۔ آپ نے وہ سلوک بیوی سے، اولاد سے، بیوی نے میاں سے، بچوں نے والدین سے اس طرح اور اس احتیاط سے کرنا ہے کہ اللہ کی محبت میں کہیں بال نہ آجائے، کوئی کمی نہ آجائے۔

وَاعْلَمُوْٓا۔۔۔ اور بڑے واضح طریقے سے یہ بات جان لو اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿٢٣٣﴾ تمہاری

ہر حرکت وسکون اللہ ملاحظہ فرما رہا ہے۔تم تاریکی میں ہو، اندھیرے میں ہو، تم کسی گہرے غار میں یا تاریک کمروں میں ہو، وہ دیکھ رہا ہے۔ اکیلے ہو یا تمہارے ساتھ کوئی ہے، تم جو کچھ بھی کر رہے ہو، وہ دیکھ رہا ہے۔ یہ قانون یاد رکھو اور پھر عمل کرو۔ ہماری مصیبت یہ ہے ہم انسان ہیں، ہم سے خطا ہو جاتی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی نے اجازت چاہی کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم میں خواہشِ نفس کا بڑا اسیر ہوں، میں عورتوں سے ملنے سے رک نہیں سکتا، میرے لیے اسلام میں یہ استثنا فرما دیا جائے کہ میں جس عورت سے چاہوں ملتا رہوں، مجھے کچھ نہ کہا جائے۔ باقی سارے اعمال جو آپ صلی اللہ علیہ وسلّم فرمائیں گے کروں گا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم نے کچھ دیر کے بعد ارشاد فرمایا کہ یہ اجازت تم اپنی بیوی، بیٹیوں کو، بہوؤں کو دو گے، بہنوں کو دو گے کہ وہ جس مرد سے چاہیں آزادانہ ملتی رہیں؟ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم میری غیرت یہ گوارا نہیں کرتی۔ فرمایا، پھر اللہ سب سے غیور ہے، اس کے بعد اس کا رسول صلی اللہ علیہ وسلّم، اس کے بعد اللہ کے بندے، تو کیا ان کی غیرت گوارا کرتی ہے کہ تم ان کی بچیوں اور بیویوں کے ساتھ آزادانہ ملو؟ پھر اس ضمن میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب کوئی بدکاری کرتا ہے یا زنا کرتا ہے تو اسے یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اللہ کی ایک بندی سے اللہ کے روبرو کر رہا ہے۔ یہ بات یاد رکھے، یہ مت بھولے کہ جو وہ کر رہا ہے، اللہ کی ایک بندی سے کر رہا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم نے مثال میں فرمایا جیسے تم کسی بہت بڑے سردار کی کنیز کو اس کے سامنے پکڑ لو، کیا ایسا کر سکتے ہو؟ سردار تو تمہاری جیسی مخلوق ہے، اللہ کی عظمت کو سامنے رکھو۔ وہ ہر وقت تمہارے ساتھ ہے اور پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ زانی جب زنا کرتا ہے تو ان لمحات میں اس کا ایمان اس سے خارج ہو جاتا ہے۔ اسے یہ یقین نہیں رہتا کہ اللہ دیکھ رہا ہے ورنہ وہ ایسا کام نہیں کر سکتا۔ بعد میں بے شک اس کا ایمان لوٹ آئے لیکن وہ لمحے جو ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلّم فرماتے ہیں، اس کے ساتھ ایمان نہیں ہوتا۔ اس کا یقین نہیں ہوتا، اگر ہوتا تو وہ کر نہیں سکتا تھا۔

اب یہ کلیہ زندگی کے ہر فعل پہ استعمال ہوتا ہے۔ ہم گناہ تب کرتے ہیں جب ہمیں حضورِ حق کا خیال نہیں رہتا۔ وہ کریم ہے، وہ فرماتا ہے غلطی ہو گئی تو احساس تو یہ ہو۔ میرے پاس لوٹ آؤ، اس کا مداوا میرے پاس ہے۔ آئندہ بس کر دو، میں معاف کر دوں گا۔ صدورِ ذنب تو ممکن ہے، گناہ کا ہو جانا تو ممکن ہے لیکن اصرار علی الذنب وہاں مقبول نہیں۔ اُس گناہ کو بار بار کرنا بہت بڑی گستاخی ہے۔ خطا کا ہو جانا ایک اور بات ہے لیکن خطا کو زندگی کا وطیرہ بنا لینا، یہ دوسری بات ہے۔

فرمایا، اگرچہ یہ مسائل خاندانی ہیں، گھر کے ہیں، میاں بیوی کے ہیں، باپ بیٹے کے ہیں، ماں بیٹے کے ہیں لیکن وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۔۔۔ ان پر عمل کرنے کے لیے یہ یاد رکھو، تمہیں اللہ سے محبت ہے اور اللہ تم سے محبت کرتا ہے۔ تم

اللہ کے طالب بھی ہو اور اللہ کے محبوب بھی ہو۔ کہیں اس درجے سے گر نہ جانا۔ محبوب سے مغضوب نہ بن جانا وَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِيۡرٌ ﴿۲۳۳﴾ اور یہ یاد رکھو! جو کچھ کرتے ہو اللہ بنفس نفیس، ذاتی طور پر اس کا مشاہدہ فرمارہا ہے۔ کراماً کاتبین لکھیں گے، فرشتے بتائیں گے، یہ ساری باتیں درست لیکن یہ بات یقینی طور پر جان لو کہ اللہ کریم خود سب کچھ دیکھ رہے ہیں۔

بیوہ کے حقوق:

معاشرتی مسائل میں نکاح اور طلاق سے متعلقہ اس آیہ کریمہ میں ایک اور صورت کا تذکرہ ہے وَالَّذِيۡنَ يُتَوَفَّوۡنَ مِنۡكُمۡ وَيَذَرُوۡنَ اَزۡوَاجًا يَّتَرَبَّصۡنَ بِاَنۡفُسِهِنَّ اَرۡبَعَةَ اَشۡهُرٍ وَّعَشۡرًا ۚ فَاِذَا بَلَغۡنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيۡكُمۡ فِيۡمَا فَعَلۡنَ فِىۡٓ اَنۡفُسِهِنَّ بِالۡمَعۡرُوۡفِ‌ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِيۡرٌ ﴿۲۳۴﴾ کہ جو لوگ فوت ہو جاتے ہیں اور ان کی بیویاں پیچھے رہ جاتی ہیں تو ان کے لیے چار مہینے اور دس دن عدت ہے۔ جس عورت کا خاوند فوت ہو جائے تو بیوی کے لیے اس کی وفات سے لے کر چار مہینے دس دن عدت ہے۔ ان چار مہینے دس دن عدت میں وہ خاوند کے گھر میں رہے گی، عام آدمیوں سے ملے جلے گی نہیں، کوئی خاص بناؤ سنگھار نہیں کرے گی لیکن جب یہ مدت پوری ہو جاتی ہے فَاِذَا بَلَغۡنَ اَجَلَهُنَّ ۔۔۔ جب وہ یہ مدت پوری کر لے تو فَلَا جُنَاحَ عَلَيۡكُمۡ فِيۡمَا فَعَلۡنَ فِىۡٓ اَنۡفُسِهِنَّ بِالۡمَعۡرُوۡفِ ۔۔۔ اس کے بعد ضروری نہیں ہے کہ اس خاتون کو رسومات کا قیدی بنا کر رکھا جائے اور نہ یہ کوئی فرضِ عین ہے کہ اس کا ضرور نکاح ثانی کیا جائے۔

ہر گھر کے، ہر خاندان کے، ہر قبیلے کے مختلف حالات ہوتے ہیں، مختلف صورتیں ہوتی ہیں۔ بعض خواتین کو ہم نے دیکھا ہے کہ ان کی اولاد بھی نہیں تھی، شادی ہوئی اور کچھ ہی دنوں بعد بیوہ ہو گئیں تو انہوں نے اپنی عمر اُس گھر میں پاکدامنی کے ساتھ بسر کر دی۔ شاید ان کا قلبی لگاؤ اس طرح کا ہو گا، ان کا اپنا ایثار ہے۔ اپنی مرضی سے کریں تو ٹھیک ہے لیکن عمومی قاعدہ یہ ہے کہ خلافِ فطرت زندگی بسر کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ انسان کی فطرت میں ہے کہ خاتون اور مرد مل کر رہتے ہیں اور یوں سلسلہ آگے چلتا ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ اگر کوئی عورت بیوہ ہو جائے تو اسے خاندانی غیرت بنا لیا جائے، اپنی عزت کا مسئلہ بنا لیا جائے کہ اب یہ نکاح ثانی کرے گی تو ہماری بے عزتی ہو گی۔ ایسی کوئی بات نہیں بلکہ فرمایا، اس بات میں کچھ حرج نہیں کہ وہ معروف طریقے سے اپنا کوئی راستہ نکالے۔ یعنی عورت پر بھی یہ ہے کہ کوئی غیر شرعی یا بے حیائی کا طریقہ اختیار نہ کرے، معروف طریقے سے، شرعی طریقے سے گھر میں ہی کوئی مناسب آدمی ہے اور اس سے نکاح ہو جاتا ہے یا باہر کسی شریف آدمی سے بیوہ کا نکاح ثانی کر لینا قابلِ مذمت نہیں

ہے بلکہ اچھی بات ہے۔ ہمارے جو معاشرتی مسائل ہیں ان میں ایک بڑی عجیب بات ہے کہ آدمی بدکاری کرتا رہے، گناہ کرتا رہے تو اسے کوئی نہیں پوچھتا۔ نکاح کرے تو شور مچ جاتا ہے کہ دیکھو فلاں کی بیوہ نے نکاح کر لیا یا فلاں بندے نے دوسری شادی کر لی۔ نکاح نہ کرے تو ناجائز طریقے سے لوگ جو کرتے ہیں، انہیں کوئی نہیں پوچھتا، کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ اس میں نہ کسی کی ناک کٹتی ہے نہ کوئی غیرت کا مسئلہ بیچ میں آتا ہے۔

قرآن کریم نے اس مسئلے میں بھی راہنمائی فرمائی ہے کہ جو عورت بیوہ ہو جائے تو یہ ضروری نہیں کہ اسے آپ غیرت کا مسئلہ بنالیں اور اسے قیدی بنالیں بلکہ جو بھی ہو، بالمعروف یعنی معروف طریقے سے ہو، مناسب ہو۔ مناسب رشتہ ہو اور مناسب طریقے سے ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۲۳۴﴾ شریعت کے ہر حکم کے ساتھ یہ قید لگائی گئی ہے کہ عمل بالشریعت کے لیے ایمان باللہ کا مضبوط ہونا ضروری ہے۔ یہاں بھی اس یقین کا ہونا ضروری ہے کہ جو کچھ تم کر رہے ہو، اللہ کریم اس سے باخبر ہے۔ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۲۳۴﴾ جو عمل بھی تم کر رہے ہو، اللہ کریم اس عمل کو جانتا ہے۔ وہ تمہاری نیتوں اور ارادوں سے واقف ہے کہ جو عمل کر رہے ہو اس کے پیچھے نیت کیا ہے، اس کے پیچھے ارادہ اور سوچ کیا ہے۔ تو زندگی گزارنے کا صحیح قاعدہ یہ ہے کہ نیت بھی اللہ کی رضا کی ہو۔ بعض چیزوں میں ضمنی فوائد ہوتے ہیں۔ بعض عورتیں امیر ہوتی ہیں، ان کے نام جائیداد ہوتی ہے، زمینیں ہوتی ہیں اور اس پر لڑائیاں ہوتی ہیں کہ میری شادی ہو جائے تو جائیداد مل جائے گی۔ یہ کوئی نہیں سوچتا کہ جس کے ساتھ اس کی پہلی شادی تھی اس نے اس جائیداد سے کیا حاصل کیا؟ وہ تو قبر میں چلا گیا، آپ بھی کل جا سکتے ہیں۔ یا فلاں کے ساتھ ہماری رنجش ہے، اس کی بیٹی سے شادی کر لوں گا تو اس کی توہین ہو جائے گی۔ فرمایا، یہ ساری خرافات ہیں۔ کسی کو نیچا دکھانے کے لیے یا کسی لالچ کے لیے نہیں بلکہ جو کام بھی کرتے ہو، اس میں یہ بات مدنظر رہے کہ اللہ کا حکم ہے، ایک جائز طریقہ ہے اور جو میں کر رہا ہوں اللہ اس سے واقف ہے۔ اس سے اللہ کی رضامندی نصیب ہوگی، میری زندگی بہتر ہوگی اور ایک بیوہ خاتون کو بھی سہارا مل جائے گا۔

وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا عَرَّضْتُمْ بِهٖ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَآءِ اَوْ اَكْنَنْتُمْ فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ۔۔۔۔ ایسی خواتین سے جو نکاح کے قابل ہوں یا بیوہ ہوں تو اشارتاً یا کنایۃً نکاح کے لیے بات کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ اچھی خاتون کو دیکھتے ہیں یا جانتے ہیں یا واقفیت ہے، پھر تمہارا ارادہ بنتا ہے کہ اس سے نکاح کروں تو جو ارادہ تمہارے دل میں ہے، اللہ کریم اس سے واقف ہے۔ کسی پر تم ظاہر کرتے ہو یا نہیں کرتے ہو لیکن اللہ کریم کے تو علم میں ہے۔ جب تمہارے دل میں ہے تو وہ جانتا ہے لیکن تم سے خفا نہیں ہے۔ اب اگر کسی مناسب طریقے سے اس کا اظہار کرو گے، اس کے کسی وارث

سے بات کرتے ہو، اس کے کسی رشتہ دار سے بات کرتے ہو، کسی ملنے جلنے والے سے بات کرتے ہو، جو خود مختار خواتین ہیں اگر ان سے اشارۃً کنایۃً بات کرتے ہو تو اللہ کریم جانتا ہے۔ جب یہ تمہارے دل میں تھا تو وہ واقف تھا، جب تم نے ظاہر کر دیا تو کوئی حرج نہیں، اس کی اس نے اجازت دی ہے۔

عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ سَتَذْكُرُوْنَهُنَّ وَلٰكِنْ لَّا تُوَاعِدُوْهُنَّ سِرًّا اِلَّآ اَنْ تَقُوْلُوْا قَوْلًا مَّعْرُوْفًا۔۔۔۔ لیکن یہ بات صحیح نہیں ہے کہ تم چھپ چھپا کر کوئی ایسی بات کرو جو حیا کے تقاضے پورے نہ کرتی ہو یا کوئی ایسا تعلق قائم کرنے کی کوشش کرو جو معاشرے میں معروف نہ ہو، اس کی اجازت نہیں ہے۔ نکاح کا پیغام دینے میں تو حرج نہیں لیکن خفیہ تعلقات بنانا اللہ کے حکم کی خلاف ورزی ہے۔ یہ نہ ہو کہ لوگوں سے چھپ کر ان سے کوئی رابطہ پیدا کر لیں، اس کی اجازت نہیں ہے۔ ہاں! جو بات ہے صاف ہونی چاہیے اور وہ بزرگوں کے سامنے ہونی چاہیے، معاشرے کے سامنے ہونی چاہیے لیکن ایسی گفتگو جو خفیہ تعلقات بنا لے، وہ نہیں اِلَّآ اَنْ تَقُوْلُوْا قَوْلًا مَّعْرُوْفًا۔۔۔۔ ہاں! معروف بات کہو۔ ایسی بات کہو جو تم سب کے سامنے کہہ سکتے ہو۔ معروف وہ ہوتی ہے جس سے ہر کوئی واقف ہوتا ہے، جسے ہر کوئی جانتا ہے۔ ظاہر ہے کہ بیوہ خاتون ہے، اسے نکاح کرنے کی اجازت ہے۔ ہر ایک کو پتہ ہے۔ اب اگر کوئی تجویز کرتا ہے تو ظاہر ہے وہ چوری چھپے تو اس سے گفتگو نہیں کرے گا۔ اس کے کسی وارث یا کسی ملنے والے سے یا اس کی کسی رشتہ دار بزرگ خاتون سے بات کرے گا یا کوئی نہ کوئی طریقہ نکالے گا، تو اس میں تو کوئی حرج نہیں۔ لیکن اگر تم خفیہ تعلقات بناؤ گے یا لوگوں سے چھپ چھپا کر کوئی بات کرو گے تو اس میں گناہ کا اندیشہ ہے، اس لیے اس کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔

وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ۔۔۔۔ اور جب تک بیوہ عورت کی عدت پوری نہیں ہو جاتی اس کے ساتھ نکاح کا سوچو بھی نہیں، ارادہ بھی نہ کرو۔ اللہ نے جو ضابطہء حیات دیا ہے، اس کی پابندی کرو اور جب تک عدت پوری نہیں ہو جاتی تب تک پیغام دینا تو دور کی بات ہے، سوچنا بھی درست نہیں ہے کہ اس سے نکاح کیا جائے۔ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوْهُ ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۲۳۵﴾ اور یہ بات بڑے واضح طریقے سے جان لو کہ جو کچھ تمہارے دل میں خیال آتا ہے، اللہ اس سے بھی واقف ہے۔ اس احساس کو زندہ رکھو کہ میں کبھی بھی، کسی وقت بھی اکیلا نہیں ہوں۔

ہر آن اللہ کے روبرو ہونے کا احساس:

قرآنِ حکیم کی ان آیات میں ہر حکم کے بعد ایمان کا ایک کلیہ دیا گیا ہے۔ پہلا حکم گزرا تو اس کے ساتھ یہی بات تھی، دوسرا حکم آیا، اس کے ساتھ جتنے احکام پیچھے گزرے ہیں، ایک ایک حکم کے ساتھ اس کا اعادہ ہوا۔ کسی کے ساتھ تاکید ہوئی کہ بات دل کے معاملے کی ہے وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۔۔۔ کسی کے ساتھ یہ کہ ایمان رکھو، اللہ دلوں کے بھید جانتا ہے، کسی کے ساتھ یہ کہ اللہ کو اپنے ساتھ حاضر مانو۔ اب یہاں ارشاد ہوا وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ۔۔۔ ایک بات بڑی پکی جان لو! جو بھی تمہارے دل میں ہے، اللہ جانتا ہے۔

ہمارے شیخ حضرت مولانا اللہ یار خان رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ سارے قرآن کا جو مفہوم ہے، خلاصہ ہے وہ سورۃ الفاتحہ کی سات آیتوں میں موجود ہے یعنی قرآن کا جو دیباچہ ہے، جسے الفاتحہ کہتے ہیں، یہ سات آیات قرآنِ حکیم کے تمام مضامین کو سموئے ہوئے ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ نے سورۃ الفاتحہ کی تفسیر لکھی ہے جو بہت ضخیم کتاب ہے۔ اس میں بے پناہ حوالہ جات ہیں، تقریباً سارے قرآن کی تفسیر بھی آ گئی ہے اور بے شمار احادیث کا ذخیرہ ہے لیکن ساری تفسیر سورۃ الفاتحہ کی ہے۔ تو حضرت رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ سورۃ الفاتحہ سارے قرآن کا خلاصہ ہے، اس میں اجمالی طور پر سارا قرآن موجود ہے اور سورۃ الفاتحہ کا خلاصہ بسم اللہ الرحمن الرحیم میں موجود ہے۔ یہ ایک آیت سارے مفاہیم کو جامع ہے اور بسم اللہ شریف کا خلاصہ اس کی پہلی ''ب'' میں موجود ہے۔ بسم اللہ کی ''با'' موصولہ ہے، یا متصلہ ہے، واصلہ ہے اور دین کا حاصل یہ ہے کہ بندے کو اللہ سے واصل کیا جائے۔ تو یہ ''با'' واصل کرتی ہے اللہ کے ساتھ، بِسْمِ اللّٰهِ اسم الٰہی کے ساتھ جوڑتی ہے۔ تو سارا اسلام یہ ہے کہ بندے کو اللہ کے ساتھ واصل کیا جائے، جوڑ دیا جائے۔ اطاعت بھی تب ہوگی جب حضورِ حق نصیب ہوگا۔ ایمان کا تقاضا بھی یہی ہے کہ حضورِ حق نصیب ہو۔ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ۔۔۔ یہاں پھر اسی حضورِ حق کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ شریعت پہ عمل کرو، نکاح کرو، علیحدگی ہوتی ہے، زندگی کے مسائل ہیں، کاروبار ہے، لین دین ہے، جو کرو لیکن ایک بات یاد رکھو! اللہ تمہارے ساتھ ہے اور جو کچھ تمہارے نہاں خانۂ دل میں ہے، وہ جانتا ہے۔ فَاحْذَرُوْهُ ۔۔۔ اس لیے اس بات کا احساس زندہ رکھو کہ میں اکیلا نہیں ہوں! ہاں! ناامید ہونے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۲۳۵﴾ اور اللہ بڑا حلیم، بڑا مہربان ہے اور معاف کرنے والا ہے۔ تم سے بتقاضائے بشریت جو بھول چوک ہو جاتی ہے، وہ معاف فرما دیتا ہے لیکن شرط یہ ہے کہ حضورِ حق کو زندہ رکھو۔ وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ (الحدید: 4) تم جہاں ہو جس حال میں ہو تمہارا اللہ تمہارے ساتھ موجود ہے۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی غلامی:

کچھ لوگوں نے یہ سمجھا کہ شاید دنیا کے کاروبار چھوڑ دیے جائیں، لوگوں سے ملنا جلنا چھوڑ دیا جائے، غاروں میں پناہ لی جائے، جنگلوں میں بیٹھ کے اللہ اللہ کی جائے تو یہ بڑا اسلام ہے۔ نہیں! یہ اسلام سے دوری کا سبب ہے۔ سارا اسلام یہ ہے کہ معاشرے میں آپ بھرپور زندگی گزاریں، جس طرح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے گزاری ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم نے شادیاں کیں اور بڑے بڑے معروف قبائل میں کیں۔ بڑی بڑی سربرآوردہ خواتین اور معروف شخصیات جن کے میکے بڑے بھاری، بڑے طاقتور اور بڑے پھیلے ہوئے خاندان تھے۔ آپ کیا سمجھتے ہیں کہ امہات المومنین رضی اللہ تعالیٰ عنھن میں سے ہر ایک کے پیچھے کتنی بڑی طاقت تھی۔ اتنے خانوادوں سے ان کے معیار اور مرتبے کے مطابق نباہ کرنا، کیا آسان کام ہے؟ اسی طرح ہر طرف کفر کا غلبہ تھا، شر تھا، فساد تھا۔ اس شر، فساد اور تاریکی میں اسلامی ریاست کی بنیاد رکھی اور تیئس برسوں کے مختصر عرصے میں ایک بڑی اسلامی ریاست سامنے آگئی۔ وہ صرف ریاست نہیں تھی جامع ریاستی نظام تھا۔ نظامِ عدل تھا، نظامِ سیاست تھا، قوانین تھے، لین دین کی بات تھی، زندگی کے سارے شعبوں کے مکمل ادارے وجود میں آگئے۔ اسی کام میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کو زخموں کے وار سہنا پڑے، دندان مبارک شہید ہوئے، رخِ انور رسول صلی اللہ علیہ وسلّم زخمی ہوا، احباب اور خدام شہید ہوئے۔ اپنے ہاتھوں سے لاشیں اٹھائیں، خود جنازے پڑھائے اور قبروں میں اتارے، قربانیاں دیں، تکلیفیں سہیں، فاقے جھیلے، سفر فرمائے اور پورے جزیرہ نما عرب کو آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کے قدموں نے منور کر دیا۔ ایک ایک میدانِ جنگ میں جانا پڑا۔ آپ دنیا کا کوئی دانشور تلاش کریں جو اتنے سارے امور کو ان تیئس برسوں میں سمو کر دکھا دے! یہ بجائے خود ایک بڑا معجزہ ہے۔

تیئس برس ہوتے کیا ہیں! تیئس برس میں تو بچہ سکول سے فارغ نہیں ہوتا۔ جس بچے کو آپ سکول میں داخل کراتے ہیں، وہ کوئی بڑا با کمال ہوگا جو تیئس برس کی عمر میں فارغ ہو۔ دو دہائیوں کی کیا حیثیت ہے، ہم کتنی دہائیاں گزار چکے، کون سا تیر مار لیا ہم نے؟ ہم میں سے ہر ایک یہ سمجھتا ہے کہ میں بڑا مصروف ہوں۔ کسی کے پاس بات کرنے کی فرصت نہیں ہے لیکن ہماری مصروفیات نے کیا کیا، کسی کا کیا فائدہ ہوا، کسی دوسرے کو ہم سے کیا ملا؟ اپنی زندگی تو جانور بھی بسر کر جاتے ہیں، پرندے بسر کر جاتے ہیں، اپنی زندگی تو ہر کوئی بسر کر جاتا ہے۔ اگر ہم نے بھی اپنی زندگی بسر کر لی، گھر بنا لیا، اولاد ہو گئی تو کون سا تیر مارا ہے! زندگی تو وہ ہے جس نے دوسروں کے لیے راہیں کھول دی ہوں، جس نے زخمی دلوں پہ مرہم رکھا ہو، جس نے دکھی انسانیت کی دوا کی ہو، جس نے شر اور فساد سے بندوں کو بچا کر

امن کا پیغام دیا ہو، جس نے بے حیائی سے بچا کر لوگوں کو فرشتہ سیرت بنا دیا ہو اور یہ سب کیسے ممکن ہے! محمد صلی اللہ علیہ وسلّم نے کر کے دکھا دیا۔ صرف اور صرف آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی غلامی سے ممکن ہے۔ ایک طبیب کسی کو ایک مفرح شربت دیتا ہے، گرمیاں ہیں، آپ کو یہ بہت مفید ہوگا۔ دن میں جب گرمی ہو تو پی لینا۔ اگر اسی طرح ہی پئیں تو یقیناً مفرح ہے، وہ دل کو تقویت دے گا، پیاس کم ہوگی، صحت ٹھیک ہوگی لیکن اگر آپ اس میں اپنی طرف سے بھی کچھ دوائیں ملانا شروع کر دیں، کچھ تھوڑی سی اس میں اجوائن ڈال دو، اس سے پیٹ خراب نہیں ہوگا۔ اس میں چند دانے سونف ڈال دو، یہ آنکھوں کو طاقت دیتے ہیں۔ اس میں تھوڑی سے خشخاس ملا دو، یہ دماغ کو طاقت دیتی ہے۔ آپ بیشک اچھی چیزیں ملاتے جائیں، وہ شربت مفرح نہیں رہے گا۔

ہمارا رویہ بھی کچھ اس طرح کا ہو گیا ہے کہ ہم نے احکامِ شریعت اور سنتِ آقائے نامدار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم میں اپنی طرف سے اچھی اچھی چیزیں ملانا شروع کر دی ہیں، جنہیں ہم اچھا سمجھتے ہیں کہ یہ میلاد مبارک منانا ہے۔ بڑی بات ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کا ذکرِ خیر ہو اور مومن کی زبان ہو، اس سے تو کبھی خالی نہیں رہنی چاہیے۔ ایمان کا تقاضا ہی یہ ہے کہ ہر وقت زبان ذکرِ حبیب صلی اللہ علیہ وسلّم سے تر رہے، ہر وقت دل یادِ حبیب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم میں ڈوبا رہے، ہر وقت سینہ انوارات نبی صلی اللہ علیہ وسلّم سے منور رہے۔ یہی ایمان ہے اور یہی اسلام ہے۔

لیکن ہم کیا کرتے ہیں! اس میں پھر اپنی طرف سے چیزیں ملانا شروع کر دیتے ہیں۔ اب اس میلاد کے جلسے سے جلوس بن گیا۔ ایک زمانے میں عید میلاد ہوتی تھی۔ عید تو ایک شرعی طریقہ ہے، اس پہ قاعدے ضابطے ہوتے ہیں۔ پھر جلسے، پھر جلوس اور آج کل جشن ہو گیا، جشنِ میلاد! جشن میں تو کھلی چھٹی ہوتی ہے، جشن کا مطلب ہی خوشی کا اظہار ہے، جیسا جس کا جی چاہے، اس طرح کرے۔ کوئی پٹاخے چلاتا ہے، کوئی اچھلتا کودتا ہے، کوئی گاتا بجاتا ہے تو وہ جشن ہوتا ہے۔ اب ہم کہاں سے چلے، کہاں آ گئے! اسے ہم نے جشن بنا دیا، بالکل اسی طرح جس طرح اُس طبیب کے مفرح شربت میں ہم نے بہت سی پسندیدہ چیزیں تو ملا لیں لیکن وہ شربت، شربت نہ رہا، وہ صحت کے لیے مضر ہو گیا۔ اسی طرح ہم نے حضور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے ذکرِ خیر میں اپنی پسند کی ایسی چیزیں ملا لیں جو حضور اکرم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کو ناپسند ہیں۔

ارشادِ نبوی علیہ الصلوٰۃ والسلام ہے لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى اَكُوْنَ اَحَبَّ اِلَيْهِ مِنْ وَّالِدِهٖ وَوَلَدِهٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ (بخاری) اوکما قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم دیکھیں! نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کی محبت ہی ایمان ہے اور اس کا باقاعدہ حکم دیا گیا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کا ارشادِ گرامی ہے کہ تم میں سے کوئی بندہ ایمان

والانہیں ہوسکتا جب تک ماں باپ سے، اولاد سے، ساری انسانیت سے زیادہ محبت میرے ساتھ نہ کرے۔

یہ دربار ایسا ہے کہ عشق بھی یہاں کے آداب کا پابند ہے۔ محبت اور عشق کو بھی آقائے نامدار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے چشمِ ابرو کا اشارہ دیکھ کر چلنا ہوگا ورنہ محبت تو ایک جذبہ ہے، بندے کو پاگل کر دیتا ہے اور وہ جس طرح چاہے اظہار کرتا ہے۔ لیکن وہ محبتیں اور ہوتی ہیں جو قواعد وضوابط سے ماورٰی ہوتی ہیں۔ وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی محبت نہیں ہوتی۔ یہاں تو محبت کے لیے بھی حدِ ادب ہے۔

طبیعت مبارک بہت زیادہ کمزور تھی، نقاہت تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم پانی میں ہاتھ ڈبو کر چہرۂ اقدس پر پھیر رہے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی پیاری بیٹی حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا پاس موجود تھیں۔ گلی سے کسی نے حجرہ مبارک میں داخل ہونے کی اجازت چاہی۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے جھڑک دیا کہ ایسے وقت میں، جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کی طبیعت اتنی پریشان ہے، تم کون ہو جو اندر آنے کی اجازت چاہتے ہو؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا، ٹھہر جا بیٹا، یہ تیرے باپ کا دروازہ ہے ورنہ یہ اجازت چاہنے والا ملک الموت ہے۔ اس نے کبھی کسی سے اجازت نہیں مانگی۔ یہ اللہ کے حکم سے آتا ہے اور جہاں آتا ہے وہاں اسے اجازت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ تیرے باپ کا دروازہ ہے کہ ملک الموت بھی باہر کھڑا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم اجازت فرمائیں تو اندر حاضر ہوں۔

ادب گاہ ہیست زیر آسمان از عرش نازک تر

یہ ایک ایسی ادب گاہ ہے کہ یہاں اونچا سانس لینا بھی زندگی بھر کے اعمال کو ضائع کر دینے کے لیے کافی ہے۔ لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ (الحجرات:2) خبردار! زندگی بھر کبھی تمہاری آواز حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کی آواز سے اونچی نہ ہو۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی غلامی ایمان کی شرط اوّل ہے۔

محمد (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم) کی غلامی دینِ حق کی شرطِ اوّل ہے
اس میں ہے اگر خامی تو سب کچھ نامکمل ہے

سورۃ البقرہ رکوع 31 آیات 236 تا 242

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

لَا جُنَاحَ عَلَیْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ اَوْ تَفْرِضُوْا لَهُنَّ
فَرِیْضَةً ۖۚ وَّمَتِّعُوْهُنَّ ۚ عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ ۚ مَتَاعًاۢ
بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۲۳۶﴾ وَاِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ
تَمَسُّوْهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِیْضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ اِلَّاۤ اَنْ یَّعْفُوْنَ
اَوْ یَعْفُوَا الَّذِیْ بِیَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ۚ وَاَنْ تَعْفُوْۤا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۚ وَلَا
تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَیْنَكُمْ ۚ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ﴿۲۳۷﴾ حٰفِظُوْا عَلَى
الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ۚ وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِیْنَ ﴿۲۳۸﴾ فَاِنْ خِفْتُمْ
فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا ۚ فَاِذَاۤ اَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ
تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۹﴾ وَالَّذِیْنَ یُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَیَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا ۖۚ وَّصِیَّةً
لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَیْرَ اِخْرَاجٍ ۚ فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ
عَلَیْكُمْ فِیْ مَا فَعَلْنَ فِیْۤ اَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوْفٍ ۚ وَاللّٰهُ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ﴿۲۴۰﴾
وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِیْنَ ﴿۲۴۱﴾ كَذٰلِكَ یُبَیِّنُ اللّٰهُ
لَكُمْ اٰیٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۲۴۲﴾

تم پر گناہ نہیں ہے اگر تم عورتوں کو طلاق دے دو جنہیں تم نے چھوا نہیں ہے یا نہ ان کے لیے مہر مقرر کیا ہے اور ان کو کچھ نہ کچھ دے دو۔ امیر کے لیے اس کی حیثیت کے مطابق اور غریب کے لیے اس کی حیثیت کے مطابق، دستور کے مطابق دینا

کہ یہ نیک لوگوں (پرہیزگاروں) پر واجب ہے۔ ﴿۲۳۶﴾ اور اگر تم انہیں طلاق دے دو اس سے پہلے کہ تم ان کو ہاتھ لگاؤ اور تم نے ان کے لیے کچھ مہر مقرر کر دیا ہو تو آدھا ہوگا مقرر شدہ کا سوائے اس کے کہ وہ معاف کر دیں یا وہ شخص معاف کر دے جس کے ہاتھ میں نکاح کا تعلق ہے اور یہ کہ تمہارا معاف کر دینا پرہیزگاری کے زیادہ قریب ہے اور آپس میں احسان کرنے سے غفلت نہ کرو یقیناً جو تم کرتے ہو اللہ اسے دیکھنے والے ہیں ﴿۲۳۷﴾ حفاظت کرو تمام نمازوں کی اور درمیان والی نماز کی اور اللہ کے سامنے عاجزی کے ساتھ کھڑے ہو ﴿۲۳۸﴾ پھر اگر تم خطرہ محسوس کرو تو پیادہ یا سوار (اللہ کو یاد کرو) پھر جب امن میں آجاؤ تو اللہ کو یاد کرو جیسے تمہیں سکھایا ہے جو تم نہیں جانتے تھے ﴿۲۳۹﴾ اور تم میں سے جو مر جاتے ہیں اور بیویاں چھوڑ جاتے ہیں وہ سال بھر کے لیے اپنی بیویوں کے لیے نان ونفقہ کی وصیت کر جائیں کہ انہیں (گھر سے) نکالا نہ جائے پھر اگر وہ خود نکل جائیں تو جو وہ دستور کے مطابق اپنے لیے کریں اس میں تم پر گناہ نہیں اور اللہ غالب ہیں حکمت والے ہیں ﴿۲۴۰﴾ اور طلاق والیوں کو دستور کے مطابق فائدہ دینا پرہیزگاروں پر لازم ہے ﴿۲۴۱﴾ اسی طرح اللہ تمہارے لیے اپنی دلیلیں بیان فرماتے ہیں تاکہ تم سمجھ سکو ﴿۲۴۲﴾

تفسیر ومعارف

طلاق کی ایک اور صورت:

سورۃ البقرہ کے ان حصوں میں وہی معاشرتی مسائل چل رہے ہیں۔ پہلے نکاح کی صورتیں گزریں پھر طلاق کی۔ کس کس طرح کے حالات ہوتے ہیں اور انہیں کس کس طرح سے نپٹا جائے، اس کے مختلف پہلو سامنے آئے۔ پھر بچہ اور اس کی رضاعت کے سارے پہلو سامنے آئے۔ اب ایک آخری پہلو رہ گیا ہے کہ بعض دفعہ نکاح ہو جاتا ہے لیکن رخصتی نہیں ہوتی۔ بعد کے حالات کچھ ایسے پیدا ہو جاتے ہیں کہ رخصتی ہو ہی نہیں پاتی بلکہ نوبت طلاق

تک پہنچ جاتی ہے۔ ایسی صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں کہ دونوں خاندان اس رشتے پر متفق نہیں ہو پاتے اور علیحدگی کی صورت بن جاتی ہے۔

اسلام میں کہیں بھی جبر نہیں ہے۔ اسلام دینِ فطرت ہے اور انسانی مزاج کے تقاضوں کے عین مطابق ہے۔ کہیں بھی بندے کو اس طرح سے مجبور نہیں کیا گیا کہ جو کام اس سے نہیں ہو سکتا وہ ضرور کرے بلکہ ایک اصول بتا دیا گیا ہے۔ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (البقرہ: 286) کوئی شخص جو کام نہیں کر سکتا، اس کا حکم ہی نہیں دیا جاتا، وہ اس کا مکلف ہی نہیں ہے۔

خلوت صحیحہ سے قبل طلاق جبکہ مہر مقرر نہ ہو:

فرمایا، اگر ایسی صورت سامنے آجائے۔ لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ ۔۔۔۔ ایسی بیبیاں جن کے ساتھ خلوت صحیحہ نہیں ہوئی، جن کے ساتھ خاوند کو خلوت نصیب نہیں ہوئی۔ نکاح کے بعد اگر میاں بیوی کو علیحدگی میں کچھ وقت مل جائے تو وہ خلوت صحیحہ تصور ہوتی ہے اور اس پہ احکام بدل جاتے ہیں لیکن اگر رخصتی نہیں ہوئی یا خلوت صحیحہ نہیں ہوئی، مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ ۔۔۔۔ جنہیں تم نے چھوا نہیں ہے۔ اگر ان کے مزاج نہیں ملتے، بچہ انکار کرتا ہے یا بچی انکار کر دیتی ہے کہ میرا نباہ نہیں ہو سکے گا، تو طلاق دینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ پھر اگر طلاق ہو جاتی ہے تو یہ ایک باہمی فیصلہ ہے۔ خاتون کو آزادی ہے کہ وہ اپنی عمر، اپنا مستقبل، اپنی آخرت دیکھے۔ اس کے پاس یہ اختیار ہے کہ جہاں وہ سمجھے کہ یہاں رہ کر میری دنیوی زندگی مشکل میں ہوگی، یا دنیوی زندگی میں مجھے شاید دولت دنیا مل جائے لیکن میری آخرت تباہ ہو جائے گی تو وہ انکار کر سکتی ہے۔ نکاح سے پہلے بھی انکار کر سکتی ہے اور اگر وہ خاتون اجازت نہ دے تو نکاح منعقد ہی نہیں ہوتا۔ اگر نکاح کے بعد اس پر بعض چیزیں کھلتی ہیں اور رخصتی نہیں ہوئی، یا بچے کو بعض چیزوں کا پتہ چلتا ہے اور رخصتی ابھی نہیں ہوئی تو ان میں سے کوئی بھی انکار کر سکتا ہے، یا دونوں خاندانوں میں کوئی ایسی بات آجاتی ہے کہ وہ آپس میں سمجھے ہیں کہ ہم گزارا نہیں کر سکتے، لہٰذا بچوں میں علیحدگی ہونی چاہیے تو کوئی حرج نہیں کہ طلاق ہو جائے۔

اَوْ تَفْرِضُوْا لَهُنَّ فَرِيْضَةً ۔۔۔۔ اس میں بھی دو صورتیں ہوتی ہیں، ایک تو یہ کہ وقتِ نکاح مہر مقرر ہو گیا، یا دوسری صورت میں نکاح کر دیا جاتا ہے اور مہر کو چھوڑ دیا جاتا ہے کہ رخصتی کے وقت مہر مقرر کر دیا جائے گا یا ادا کر دیا جائے گا۔ وَمَتِّعُوْهُنَّ تو پھر ان کو کچھ نہ کچھ ضرور دو، مہر تو مقرر نہیں تھا۔ اگر مقرر ہوتا تو اس کے مسائل دوسرے ہوتے لیکن یہ وہ صورت ہے جب مہر وقتِ رخصتی مقرر کرنا تھا۔ مقرر تھا ہی نہیں اور طلاق ہو گئی تو پھر کچھ نہ کچھ ضرور دو۔

عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ امیر پر اس کی اپنی حیثیت کے مطابق اور غریب پر اس کی اپنی حیثیت کے مطابق، جو تمہاری مالی حیثیت ہے، تم جتنا کچھ دے سکتے ہو۔ چونکہ اس کے ساتھ نکاح ہوا تھا لیکن پھر خلوت صحیحہ نہ ہوئی، رخصتی نہ ہوئی اور کسی وجہ سے طلاق ہو گئی تو اس بچی کو بھی آدمی اپنی حیثیت کے مطابق دو جوڑے کپڑے دیتا ہے، ایک جوڑا کپڑا دے دیتا ہے یا اپنی پسند سے کچھ اور چیزیں دیتا ہے، جتنا آسانی سے دے سکتا ہے لیکن اس کا حق بنتا ہے کہ اسے کچھ نہ کچھ دیا جائے۔ دشمنی کی بنیاد نہ رکھی جائے، ایک دوسرے کو تنگ نہ کیا جائے بلکہ علیحدگی بھی اچھے طریقے سے ہو۔ اگر علیحدگی ہی مجبوری ہے تو وہ بھی اچھے طریقے سے ہو اور صاحبِ حیثیت اپنی حیثیت کے مطابق دے، غریب اپنی حیثیت کے مطابق دے۔ مَتَاعًا بِالْمَعْرُوْفِ ۔۔۔۔ کچھ نہ کچھ دینا معروف طریقے سے، معروف وہ طریقہ ہوتا ہے جسے عام آدمی بھی سمجھ رہا ہو کہ یہ ٹھیک ہے۔ جسے معاشرہ، تمہارے رشتہ دار، تمہارے اردگرد بسنے والے لوگ مناسب خیال کریں کہ اس نے اچھا کیا، بہتر کیا۔ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۲۳۶﴾ یہ ضروری ہے ان لوگوں کے لیے جن کے دلوں میں اللہ نے اپنے لیے، اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے، اپنے دین کے لیے خلوص پیدا فرمایا۔ مخلصین کے لیے، محسنین کے لیے یہ واجب ہے کہ وہ ایسا کریں۔ اگر زندگی مل کر نہیں گزار سکتے تو اسے کسی دشمنی یا رنجش کی بنیاد نہیں بننے دینا چاہیے۔ حسنِ اخلاق سے تعلقات پھر بھی قائم رہ سکتے ہیں۔ زندگی کے دوسرے امور میں، دینی امور میں، معاملات میں، کاروبار میں، تجارت میں پھر بھی ایک دوسرے کے ساتھ کوئی رشتہ تو رہ سکتا ہے، لہٰذا بگاڑ پیدا نہ کیا جائے۔ مقصد یہ ہے کہ اگر طلاق بھی ہوتی ہے تو وہ کسی دشمنی کا سبب نہ بنے بلکہ دو خاندانوں میں تعلق، رشتہ داری اور میل جول چلتا رہے اور جنہیں اللہ نے خلوص دیا ہے ان کے لیے یہ ضروری ہے۔

خلوت صحیحہ سے قبل طلاق جب مہر طے ہو:

دوسری صورت یہ ہے: وَاِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً ۔۔۔ تم نے نکاح کیا اور اس وقت حق مہر مقرر کر دیا لیکن رخصتی نہیں ہوئی، خلوت صحیحہ نہیں ہوئی اور اس سے پہلے طلاق کی نوبت آ گئی تو جو مہر مقرر تھا فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ ۔۔۔۔ اس کا نصف دینا ضروری ہوگا۔ اگر مہر مقرر نہیں تھا تو پھر اپنی طرف سے حسنِ اخلاق کے طور پر کچھ اس طرح سے دیں جیسی آپ کی حیثیت ہے، جسے لوگ کہیں کہ اس نے بہتر کیا ہے۔ کوئی ایک جوڑا دے دیتا ہے، کوئی ساتھ ایک زیور دے دیتا ہے، کوئی نقد دے دیتا ہے لیکن اگر خلوت صحیحہ سے پہلے طلاق ہو گئی اور مہر مقرر تھا تو جو مقرر تھا اس کا نصف دینا ضروری ہے۔ پھر آپ نے کوئی احسان نہیں کرنا، یہ آپ کے ذمے ہے، نصف مہر ادا کر دیں۔

إِلَّآ أَنْ يَّعْفُوْنَ أَوْ يَعْفُوَا الَّذِيْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ۔۔۔۔ یہ الگ بات ہے کہ آپس میں مل کر بیٹھ کر اگر بچی والے یا خود بچی اس کا کچھ حصہ معاف کر دیتی ہے، یا اس کا ولی جو نکاح کا ذمہ دار تھا، وہ مہر کا کچھ حصہ معاف کر دے اور یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ دو بچوں کو ان کی مرضی کے خلاف مل کر زندگی گزارنے پر مجبور نہیں کیا گیا، انہیں اختیار دیا گیا ہے۔

فرمایا، اگر اس رشتے کو تم برقرار رکھنا چاہتے ہو تو اس کا مدار تمہارے اعمال و کردار پر ہے۔ دوستی تو دوستی جہاں دشمنی کا امکان ہے، وہاں بھی ایسی خوبصورت حدود و قیود عطا فرمائیں کہ میری مخلوق ہے، میرے بندوں سے دوستی کرو، دشمنی نہ کرو۔ معاشرے میں امن کے علمبردار بنو، تباہی کے ذمہ دار نہ بنو۔ ہر طرف سکون بانٹو، بے چینیاں اور بے قراریاں مت بانٹو۔ راہوں میں پھول بچھاؤ، کانٹے مت بچھاؤ۔ کسی کی بچی سے رشتہ کرنا اور رخصتی سے پہلے اسے طلاق دے دینا، یہ اتنا ناپسندیدہ عمل ہے کہ آپس میں ٹھن جاتی ہے کہ پھر تم کہیں اور شادی کر کے دیکھنا۔ اگر میری بچی کو طلاق ہو گئی تو تیرے بچے کی زندگی باقی نہیں رہے گی، قتل کر دیں گے، یہ ہو جائے گا، وہ ہو جائے گا۔ فرمایا، ایسی بات نہیں ہے۔ اللہ کے دو بندے ہیں، دونوں مکلّف ہیں اور دنیوی زندگی پر آخرت کا بھی مدار ہے۔ ان میں سے کوئی ایک بھی سمجھتا ہے کہ ہم مل کر اس زندگی کو سنوار نہیں سکیں گے، یا مل کر آخرت نہیں بنا سکیں گے تو علیحدہ ہونے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے اور یہ کوئی دشمنی کی بات نہیں بلکہ علیحدگی بھی اچھے اور معروف طریقے سے کرو۔ اگر مہر مقرر نہیں ہے تو اپنی حیثیت کے مطابق بچی کو اعزاز کے ساتھ، اکرام کے ساتھ کچھ دے دو۔ مہر مقرر ہے تو نصف اس کا حق ہے۔ اگر وہ معاف کرتی ہے تو احسان کرتی ہے کہ آئندہ تعلقات رہیں۔ وَأَنْ تَعْفُوْٓا أَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى۔۔۔۔ اور اگر وہ معاف کرتی ہے تو یہ زیادہ پرہیزگاری کے قریب ہے کہ آئندہ تعلقات میں کشیدگی نہ آئے۔ وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ۔۔۔۔ اور آپس میں ایک دوسرے سے بھلائی کرنے میں غفلت نہ کرو۔ یعنی کسی بھی مقام پر کسی بھی بات کو وجہء دشمنی بنا لینا، یہ کمالِ اسلام نہیں ہے۔ اب ان دو بچوں کی زندگی ہے، اگر وہ سمجھتے ہیں کہ مل کر نہیں گزار سکتے تو علیحدہ ہو جائیں لیکن دو خاندان اسے وجہء دشمنی نہ بنائیں بلکہ ایک دوسرے پر احسان کریں اور اس میں بھی ایک دوسرے کی عزت کو ملحوظ خاطر رکھیں۔ علیحدگی بھی مناسب اور معزز طریقے سے ہو اور ایک دوسرے پر احسان کرنا، یہی پرہیزگاری ہے۔

وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ ۭ إِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۲۳۷﴾ ایک دوسرے کے ساتھ بھلائی سے پیش آنا نہ بھولو، اس لیے کہ اللہ تمہارے ہر عمل کا مشاہدہ فرما رہا ہے۔ تم جو کچھ کر رہے ہو اللہ ذاتی طور پر اسے ملاحظہ فرما رہا ہے۔ بندے کی نیت میں کتنا بھی کھوٹ ہو، چار شریف آدمیوں میں بیٹھا ہو تو کوئی غلط بات منہ سے

نکالنے سے اعراض کرتا ہے کہ اتنے لوگ سن رہے ہیں، یہ کیا سوچیں گے! اگر چار شریف آدمیوں کے پاس ہونے کا اتنا احساس ہے تو اس احساس کے ساتھ کہ میرا اللہ ہر جگہ، ہر وقت ہر حال میں میرے پاس ہے اور خود میری بات سن رہا ہے، خود میرے کردار کو ملاحظہ فرما رہا ہے، اسے کتنا محتاط ہو کر بات کرنی چاہیے! کتنا محتاط ہو کر قدم اٹھانا چاہیے اور کتنا محتاط ہو کر فیصلہ کرنا چاہیے اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ﴿۲۳۷﴾ جو عمل تم کرتے ہو اللہ تبارک وتعالیٰ اسے ذاتی طور پر ملاحظہ فرما رہا ہے۔

معاملاتِ زندگی میں، نکاح وطلاق، بیع وشراء اور حسن معاشرت میں بھی بنیادی بات اللہ اور اللہ کے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلق ہے اور باقی ساری چیزیں اس کے گرد گھومتی ہیں۔ اس تعلق کو، اس رشتے کو قائم رکھو۔ زندگی کے کسی موڑ پر کوئی ایسی حرکت نہ کرو کہ اس رشتے پہ حرف آئے۔ اس تعلق کو، اس رشتے کو قائم رکھو۔ زندگی کے کسی موڑ پر کوئی ایسی حرکت نہ کرو کہ اس رشتے پہ حرف آئے، اس تعلق میں کوئی دراڑ آئے۔ اللہ کریم ہمیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی برکات سے مستفید فرمائے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاداتِ عالیہ کو اپنا حسنِ عمل بنانے کی توفیق عطا فرمائے۔

نکاح وطلاق میں جبر نہیں:

انگریزی کے دو تین جملے عموماً پچانوے فیصد شادی کارڈوں پر لکھے ہوئے ہوتے ہیں کہ Decided in the Heaven شادیاں تو آسمانوں میں طے ہوتی ہیں Celebrated on Earth منائی زمین پہ جاتی ہیں۔ کسی انگریز نے لکھا ہوگا اور ہم چونکہ انگریز کے پیچھے چلنا بڑا فخر سمجھتے ہیں تو پھر سب نے اپنا لیا۔ اگر شادیاں آسمانوں پہ طے ہو جاتی ہیں تو پھر بچی کے پاس ہاں یا نہ کا اختیار کیوں ہے؟ وہ تو طے شدہ بات تھی۔ اللہ نے کہیں نوعِ انسانی کو مجبور و بے بس نہیں کیا، اختیار دیا ہے، بچے کے پاس بھی اختیار ہے، بچی کے پاس بھی اختیار ہے کہ وہ پھر سے اس بات کا جائزہ لیں کہ ہمیں مل کر ایک خاندان کی بنیاد رکھنی ہے، ایک ایسا خاندان جو معاشرے کے لیے مفید ہو، جو نوعِ انسانی کے لیے مفید ہو، جو دین کے لیے کام کرنے والا ہو۔ اور اگر وہ سمجھتے ہیں کہ ہم مل کر دینی فرائض ادا نہیں کر سکیں گے، ہم مل کر کوئی اچھا خاندان نہیں بنا سکیں گے، ہم مل کر کوئی اچھی مثال پیش نہیں کر سکیں گے تو ان کے پاس اختیار ہے کہ وہ علیحدہ ہو جائیں۔ پھر اگر جوڑے آسمانوں پر طے تھے تو پھر ان کے پاس اختیار کہاں سے آ گیا؟ یہ جملے لکھتے وقت بھی احتیاط کرنی چاہیے اور یہ خلافِ شرع جملے نہیں لکھنے چاہئیں۔ اللہ کی بڑائی اس میں نہیں ہے کہ دو بندوں کو مجبورِ محض کرے، اللہ کی بڑائی اس میں ہے کہ اس نے بندوں کو اختیار دیا ہے۔

ایمان لانے کو بندے کے اختیار پر چھوڑا:

اللہ نے بندوں کو یہاں تک اختیار دیا ہے کہ میری ذات پر بھی ایمان لاتے ہو تو اس کا میں نے مکمل اہتمام کر دیا۔ مسلسل رسول و انبیاء بھیجے، کتابیں بھیجیں، آخر میں اپنا حبیب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھیجا اور اپنی کتاب بھیجی۔ اگر ایمان نہیں لاتے ہو تو جبر یہاں بھی کوئی نہیں۔ کائنات تمہارے سامنے ہے، میری قدرت کے مظاہر تمہارے سامنے ہیں، میرا احسان تم پر جاری ہے، مال و دولت دیا ہے، زندگی دی ہے، کھانے پینے کی نعمتیں دے رہا ہوں، کھانے کی توفیق دے رہا ہوں، صحت دے رکھی ہے، اولاد دے رکھی ہے، عزت دے رکھی ہے، حکومت و اختیار دے رکھا ہے لیکن اگر تم میری بات نہیں ماننا چاہتے تو میں جبراً تم سے منوانا بھی نہیں چاہتا۔ چونکہ اللہ کی مخلوق میں انسان ایک ایسی اکائی ہے جسے اللہ نے ایک عجیب شعور بخشا ہے جو انسان کے علاوہ کسی دوسری مخلوق میں نہیں ہے، نہ کسی مخلوق کی جرأت ہے۔ حتیٰ کہ حاملینِ عرش فرشتے بھی یہ سوال کر ہی نہیں سکتے، سوچ ہی نہیں سکتے کہ اللہ کون ہے، اللہ کہاں ہے، اللہ کیسا ہے! کائنات کا بنانے والا کون ہے، کیسا ہے، کہاں ہے! یہ شعور صرف انسانی مزاج کو بخشا گیا ہے۔ اس کا جواب دینے کے لیے انبیاء و رسل مبعوث فرمائے گئے، کتابیں عطا فرمائی گئیں اور ہر نبی نے بنیادی طور پر معرفتِ الٰہی کا درس دیا۔ ہر نبی علیہ السلام نے کہا "لا الٰہ الا اللہ" اور ساتھ اپنی نبوت کا اعلان فرمایا کہ میں اللہ کی طرف سے بھیجا ہوا اس کا نبی علیہ السلام ہوں اور میں تمہیں یہی بتانے آیا ہوں۔ حتیٰ کہ آقائے نامدار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو کسی نئے نبی کی گنجائش باقی نہ رہی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت بعثتِ عالی سے لے کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اللہ کے بندوں کی رہنمائی کے لیے موجود، اس کی برکات جاری و ساری، اس کے انعامات دائمی، اس کے اثرات ہمیشہ ہمیشہ کائنات پر محیط رہیں گے۔ جتنا جو چاہے وہ جھولیاں بھر لے، دامن بھر لے، جتنا چاہے وہ حاصل کر لے۔ إِنَّمَآ اَنَا قَاسِمٌ وَّاللّٰهُ يُعْطِيْ (بخاری) او کما قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عطا رب کی ہے، تقسیم میں کر رہا ہوں۔ نہ ربّ کے خزانے میں کمی آتی ہے، نہ اس کا نبی ءرحمت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تقسیم کرتے ہوئے تھکتا ہے اور جتنی جس کے دامن میں وسعت ہے، جتنی جرأت ہے، جتنا دل وسیع ہے جتنی محبت و الفت ہے، جتنی طلب ہے، وہ حاصل کر لے۔ یہ نظام ہمیشہ جاری و ساری رہا اور رہے گا کہ جب انسان کے ذہن میں، دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ کون ہے؟ تو بتا دیا جائے کہ اللہ وہ ہے جس نے تجھے پیدا کیا، جو تجھے زندگی دے رہا ہے۔ وہ کیسا ہے؟ وہ واحد ہے، لاشریک ہے، ہر چیز پر قادر ہے۔ وہ کہاں ہے؟ وہ ہر جگہ موجود ہے، تو اپنے دل کو صاف کر کے اسے اپنے دل میں، اپنے سینے میں تلاش کر، تو دور کیوں جاتا ہے؟ اس نے اپنے منوانے میں جبر نہیں کیا، اپنے نبی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان

لانے میں جبر نہیں کیا تو اور کسی کام میں جبر اسے زیب ہی نہیں دیتا۔

جہاں کام تکوینی طور پر اس کے حکم سے ہوتے ہیں، وہاں کسی کو دم مارنے کی گنجائش نہیں ہے۔ پیدا اس کے حکم سے ہوتا ہے، وہ کوئی مشورہ نہیں کرتا، کسی سے نہیں پوچھتا۔ شکل اپنی پسند سے بناتا ہے، کسی سے نہیں پوچھتا۔ قد کاٹھ اپنی پسند سے بناتا ہے، عقل وشعور، فہم وفراست اپنی پسند سے دیتا ہے۔ کوئی اس کا کیا کر سکتا ہے، کبھی کسی کو کوئی خیال آیا ہے، لوگ جو نہیں کر سکتے وہ سوچتے بھی نہیں۔ انسانی مزاج ایسا ہے کہ جہاں وہ کچھ کر نہیں سکتا ان باتوں کو وہ سوچتا بھی نہیں۔ کوئی نہیں سوچتا کہ میرا قد بڑا ہوتا، میرا قد چھوٹا ہوتا۔ دونوں آنکھیں سامنے ہیں، ایک آنکھ پیچھے بھی ہوتی، تین ہو جاتیں، کوئی نہیں سوچتا۔ اس طرح کوئی سوچتا ہی نہیں تو پھر یہ کیوں سوچتا ہے کہ اللہ کون ہے؟ اللہ کہاں ہے؟ اس کا مطلب ہے کہ یہ کام وہ کر سکتا ہے وہ اللہ کو تلاش کر سکتا ہے، اللہ کو پا سکتا ہے۔ یہ استعداد اس میں ہے، اس لیے وہ سوچتا ہے اور جب سوچتا ہے تو اللہ کے نبی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جواب بھی پاتا ہے۔ پھر اللہ سے واصل بھی ہوتا ہے۔ پھر اللہ سے دن بھر باتیں کرتا ہے۔

دن میں پانچ دفعہ تو اللہ نے فرض کر دیا ہے کہ مجھ سے بات کرو۔ دن کو شروع کرنے سے پہلے مجھ سے بات کرو، کام کاج سے تھکتے ہو، دوپہر کو ستانے لگتے ہو تو مجھ سے بات کرو، کام ختم کر کے سونے جارہے ہو تو مجھ سے بات کرو۔ اللہ نے پانچ وقت تو اپنی ملاقات کے لیے طلب فرمایا۔ یہ بارگاہِ رسالت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہرکارے ہیں جنہیں آپ مؤذن کہتے ہیں، یہ دربارِ الوہیت کے ہرکارے ہیں۔ جس طرح عدالتوں کے ہرکارے آواز دیتے ہیں کہ فلاں، فلاں حاضر ہو جاؤ، یہ بھی اسی طرح آواز دیتے ہیں کہ اس کی بارگاہ کی حاضری کا وقت ہو گیا ہے۔

حیَّ علی الصلوٰۃ اللہ کی بارگاہ میں حضوری کے لیے جلدی جلدی آؤ۔ حی علی الفلاح اس میں بہتری ہے، بھاگو اس کی طرف۔ بلانے والا کون ہے۔ اشھد ان لا الہ الا اللّٰہُ واشھد ان محمد رسول اللہ میں تو غلام ہوں، اس بارگاہ کا، میں اللہ کی توحید کا اقرار کرتا ہوں، میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا گواہ ہوں، مجھے حکم ہو رہا ہے کہ تمہیں اللہ کی طرف بلاؤں۔ حضور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادِ عالی کا مفہوم ہے کہ قیامت کو جہاں تک مؤذن کی آواز جاتی ہے، وہاں کے سنگریزے بھی اس کے حق میں گواہی دیں گے کہ اے اللہ! یہ بندوں کو تیری طرف بلاتا تھا۔

پانچ ملاقاتیں تو اس نے فرض کر دیں اور باقی سارے اوقات کے لیے اس نے فرمایا کہ سب کچھ بھول جاؤ

لیکن میرا نام لینا کبھی نہ بھولو۔ اللہ اللہ کرتے رہو، مجھے یاد کرتے رہو۔ سارا جہان بھول جاؤ، دو جہان بھول جاؤ لیکن میری یادمت بھولو، کبھی نہ بھولو، ہر لمحہ ہر آن مجھے یاد رکھو۔

جسے وصالِ الٰہی نصیب ہو:

اب کسی آدمی کو کوئی ایسی دولت مل جائے جو بے مثال ہو۔ ہمارے ملک کی تاریخ میں کوہ نور ہیرے کا بڑا چرچا ہے اور دنیا میں جتنے ہیرے پائے گئے ہیں آج تک ان میں سب سے بڑا، سب سے روشن، سب سے اعلیٰ ہیرا تھا۔ حجم میں بھی بڑا اور ہیرے کے جو اوصاف ہوتے ہیں ان میں بھی سب سے اعلیٰ تھا۔ وہ مغلوں سے رنجیت سنگھ نے لیا، پنجاب فتح ہوا تو انگریز نے تاج برطانیہ میں سجایا۔ اگر کسی کو آج کوہ نور ہیرا مل جائے تو اس پر کوئی لمحہ ایسا نہیں آئے گا کہ وہ بھول جائے کہ میرے پاس ہیرا ہے۔ ہے کوئی ایسا امکان کہ کبھی وہ فراموش کردے کہ میرے پاس کوہ نور بھی ہے؟ نہیں بھولے گا، سوتے جاگتے اس کے دل میں یہ احساس موجود رہے گا۔

جسے اللہ کا جمال مل جائے بھلا وہ کیوں بھولے! جسے برکاتِ نبوت کی روشنی سے وصالِ الٰہی نصیب ہو جائے، جمالِ الٰہی نصیب ہو جائے، تجلیاتِ باری نصیب ہو جائیں تو بھلا وہ بھول سکتا ہے، ہے کوئی دوسری ایسی دولت کہ وہ بھول جائے، یا کوئی دوسری ایسی نعمت جو اسے مشغول کر لے؟

اسلام تمام امور کو ابدی اور دائمی زندگی اور آخرت کے حوالے سے دیکھتا ہے۔ اگرچہ ان آیات میں نکاح وطلاق، بیوہ خواتین اور ان کے حقوق کے مسائل کا تذکرہ ہے لیکن یہ مدنظر رہے کہ ہر جگہ، ہر آیہء کریمہ کے خاتمے پر یاد دلایا گیا ہے کہ یہ سب کچھ آپ کو عظمتِ الٰہی کو سامنے رکھ کر، اللہ کی رضا کو سامنے رکھ کر اور آخرت کو سامنے رکھ کر کرنا ہے۔ پھر درمیان میں یہ بات ارشاد فرما دی: حٰفِظُوْا عَلَی الصَّلَوٰتِ ۔۔۔ نمازوں کی حفاظت کرو، نمازوں کے محافظ بن جاؤ۔

نماز کی حفاظت سے مراد ارا کینِ نماز کی حفاظت ہے:

اسلام میں نماز کا اپنا ایک فلسفہ ہے اور دنیا کے تقریباً تمام مذاہب نے خواہ وہ بتوں کے پجاری ہیں یا جانوروں کے پجاری ہیں یا عقائد باطلہ رکھتے ہیں، انہوں نے جو بھی کوئی معبود مقرر کیا ہے، اس کی عبادت کے لیے کچھ اوقات یا کچھ خاص دین یا کوئی طریقہ ایسا مقرر کرتے ہیں کہ اس کے سامنے حاضر ہو کر اپنی نیازمندی، عاجزی اور اپنی حاجات کا اظہار کریں۔ اسلام نے بندے کو رب العالمین کے روبرو کر دیا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مشت غبار کو یہ اعزاز بخشا کہ جس نے بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت قبول کی، جسے یہ سعادت نصیب ہوئی، اسے اللہ کریم

کے روبرو کھڑا کر دیا۔ اس کے لیے ربّ العالمین نے دن میں پانچ اوقات مقرر فرمائے اور ان کا پورا طریقہ کار نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے وضاحت کے ساتھ ارشاد فرما دیا اور خود اس پر عمل فرمایا۔

آقائے نامدار حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلّم خالق اور مخلوق کے درمیان واسطہ ہیں اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ساری امت اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کے درمیان واسطہ ہیں۔ دین ہمیں وراثت میں ملا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم سے صحابہ کرامؓ کو، صحابہ کرامؓ سے تابعین کو، ان سے تبع تابعین کو سینہ بسینہ تواتر سے ملا ہے اور یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ جو چاہے اس میں اضافہ کر لے، جو چاہے اس میں کوئی کمی کر لے۔ اس میں سب سے بڑی نعمت، سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ہر وہ فرد جسے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلّم نصیب ہوتا ہے، وہ دن شروع کرتے وقت بھی اللہ کے حضور پیش ہو اور اس کی عبادات، دعائیں، تسبیحات خود اللہ کریم نے مقرر فرما دیں۔ قرآن کریم نے اجمالاً اور نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بالوضاحت تمام اوقات کی نمازیں، ان کے طریقے اور وضو کے طریقے نہ صرف ارشاد فرمائے بلکہ خود ان پر عمل فرما کر دکھا بھی دیا۔ فرمایا، جس طرح میں نماز پڑھتا ہوں اس طرح تم بھی نماز پڑھو اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کے سامنے اس پر عمل کر کے حضور صلی اللہ علیہ وسلّم سے تائید حاصل کی۔

عبادات کا طریقہ بھی اللہ کا مقرر کردہ ہے:

ادیانِ باطلہ میں تو لوگوں نے معبود بھی خود مقرر کیے اور ان کی حاضری کے اوقات بھی خود مقرر کیے اور اس کا طریقہ کار بھی خود مقرر کیا لیکن معبودِ برحق نے اپنی بارگاہ میں حاضری حکماً نافذ کر دی۔ اس نے اپنے بندوں کو اتنا نوازا کہ وہ پانچ بار اس کی بارگاہ میں حاضر ہوں اور اس طریقے سے حاضری دیں جو اس کے حبیب صلی اللہ علیہ وسلّم کا مقرر کردہ ہے۔ یہ جو صلوٰۃ کے ارکان ہیں، وضو کا طریقہ، نماز کا وقت، نماز کے لیے کپڑوں کا پاکیزہ ہونا، وجود کا پاکیزہ ہونا، قبلہ رو ہونا، یہ سب مقرر کر دیا گیا۔ نماز باجماعت مل جائے تو بہت بڑی سعادت ہے، اور حکم دیا جا رہا ہے: حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ۔۔۔ نمازوں کی محافظت کرو یعنی ایک ایک رکن کی حفاظت کرو اور کوشش کرو کہ ان میں سے کوئی بھی چھوٹنے نہ پائے۔ صرف یہ نہیں کہ نماز ادا کرو بلکہ حکم یہ ہو رہا ہے کہ اس کی حفاظت کرو، اس کا کوئی رکن چھوٹنے نہ پائے۔ نماز بروقت اور سنّت کے مطابق ادا کرو۔

مسلمان کے لیے یہ اتنی بڑی سعادت ہے کہ وہ مرد ہو یا خاتون، اللہ کے روبرو ہو کر، اللہ کریم کی سکھائی ہوئی ثناء حمد اور اپنے لیے دعا کرتا ہے۔ معبودِ برحق نے اوقات بھی عطا فرمائے اور اپنی تسبیحات کا سلیقہ بھی سکھایا، اپنی

حمد کا طریقہ بھی سکھایا اور بندے کے لیے جو مفید ترین دعا ہو سکتی ہے وہ بھی سکھائی۔

سیرت کی کتابوں میں موجود ہے کہ جب سورۃ الفاتحہ نازل ہوئی تو شیطان ریت پر لیٹتا تھا، سر میں ریت ڈالتا تھا اور پیٹتا تھا کہ جو لوگ دن میں پانچ مرتبہ نماز کی ہر رکعت میں یہ دعا کریں گے، ان پر میرا کیا بس چلے گا۔ ہماری بدنصیبی یہ ہے کہ ہم نے اسے ایک سزا کے طور پر لیا ہے کہ شاید ہمیں مسلمان ہونے کی یہ سزا دی جا رہی ہے کہ ہم پر اتنی نمازیں فرض ہو گئی ہیں، روزے فرض ہو گئے ہیں۔ اللہ کریم کو ہماری نمازوں کی کوئی ضرورت نہیں ہے، اللہ کریم کو ہمارے روزوں کی ضرورت نہیں ہے، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یہ ہماری ضرورت ہے کہ کس طرح رضائے باری حاصل ہو اور اس کا طریقہ بھی خود معبودِ برحق نے سکھا دیا ہے۔ سب سے پہلے اپنی ثنا، پھر اللہ کے ساتھ وعدہ کہ تیری ہی مدد چاہتا ہوں، تیری ہی عبادت کرتا ہوں۔ پھر دعا کہ مجھے نیک لوگوں کے راستے پر، صراطِ مستقیم پر رکھ اور وہ لوگ جو گمراہ ہو گئے یا تیرے غضب کا شکار ہوئے یا جن پر تیرا عذاب ہوا، ان کے اعمال سے مجھے بچا اور ان کے راستے پر چلنے سے میری حفاظت فرما۔

ہر مذہب نے کوئی نہ کوئی طریقہ مقرر کیا ہے۔ کوئی ہاتھ باندھ کے کھڑا ہوگا، سیدھا سجدے میں چلا جائے گا، پھر کوئی دو سجدے کرتا ہے، کوئی تین کرتا ہے اور کوئی ایک کرتا ہے۔ اوقات کی کوئی قید نہیں ہے، جب جس کا جی چاہا وہ چلا گیا۔ پاکیزگی، طہارت کی بھی کوئی قید نہیں ہے۔ کوئی قاعدہ ضابطہ نہیں ہے۔ کیا کہنا ہے، کیا نہیں کہنا، ہر کوئی اپنی اپنی ہانک رہا ہے۔ جو جس کے جی میں آتا ہے وہ اپنے طور پر لگا ہوا ہے اور سامنے کوئی تصور ہے یا تصویر ہے، یا بت ہے یا اس طرح کی کوئی اور چیز ہے۔

اسلام کتنا خوبصورت مذہب ہے کہ اس قادرِ مطلق نے جو ساری کائنات کا واحد خالق، مالک اور معبودِ برحق ہے، اپنی بارگاہ میں حاضری کے اوقات عطا فرمائے، ان کا طریقہ اور سلیقہ عطا فرمایا۔ ان میں اللہ کی حمد کس طرح سے کرنی ہے اور اس کی پاکیزگی، اس کی تسبیحات کس طرح سے بیان کرنی ہیں، وہ بھی مقرر فرما دیں۔ اپنے لیے ہمیں کیا مانگنا چاہیے، وہ بھی مقرر فرما دیا اور اتنا جامع کہ دنیا و آخرت کی ہر بھلائی اس میں سما جاتی ہے۔ ایک ایک جملے میں دو عالم کی ہر بھلائی سما جاتی ہے۔

احکامِ شریعت پر عمل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ عظمتِ الٰہی سے ہمارے دل سرشار ہوں۔ ہمارا ایمان مضبوط ہو، ہمیں اللہ پر اعتماد ہو اور اس کی عظمت پر یقینِ کامل ہو۔ ہمیں آخرت پر پورا پورا یقین ہو اور ہمیں یہ یاد ہو کہ ہمیں اللہ کے روبرو جواب دہی کے لیے پیش ہونا ہے اور ہم اپنی ہمیشہ کی زندگی کی تیاری کریں۔

عبادات موت کی تیاری ہے:

ہمیں ہمیشہ موت کا خوف مسلط رہتا ہے اور ہم بھاگتے رہتے ہیں لیکن موت ہمیں چھوڑتی نہیں ہے۔ جہاں بھی کوئی ہو، جب وقت آتا ہے، اس کی موت آجاتی ہے۔ اسلام نے بھاگتے رہنے کا کوئی سلیقہ نہیں سکھایا بلکہ یہ طریقہ سکھایا ہے کہ موت کی تیاری کرو۔ مومن کی موت انتقال ہے، ایک عالم سے دوسرے عالم میں منتقل ہونا ہے۔ ایک قول ہے: ''اولیاء اللہ لا یموتون بل ینتقلون من المکان الی المکان'' اللہ کے بندے مرتے نہیں ہیں بلکہ ایک مقام سے، ایک عالم سے دوسرے عالم میں منتقل ہوجاتے ہیں۔ ایک دائمی اور ابدی زندگی کی ابتدا ہوجاتی ہے اور فانی زندگی وقتی اور لمحاتی زندگی کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔ یہ جو وقتی زندگی ہے، یہ امتحان اور آزمائش میں گزرتی ہے۔ دنیا کی زندگی کسی کے پاس سو سال ہے، کسی کے پاس پچاس، جتنی بھی ہے یہ عرصہ ءامتحان ہے اور پوری زندگی ایک مجاہدہ ہے، ایک محنت ہے۔ ایک طرف اپنا نفس بھی ہے، اپنے نفس کی خواہشات بھی ہیں۔ ساتھ ابلیس بھی لگا ہوا ہے، شیطان کے حملے بھی ہیں۔ اس کے ساتھ ہماری مادی اور جسمانی ضرورتوں نے گھیر رکھا ہے۔ اس سارے طوفانِ بلا میں اللہ کریم کا دستِ قدرت بھی ہے کہ تم اس طوفان میں تھپیڑے نہ کھاتے رہو، میرا دستِ قدرت تھام لو، میرا دامن تھام لو، میرے دروازے پہ آجاؤ، میری پناہ چاہو اور مجھ سے اپنا تعلق استوار کرو۔

احکام تو فقہی چل رہے تھے، درمیان میں بات عبادت کی آگئی۔ اس لیے کہ عبادت ہی وہ ذریعہ ہے جو ایمان کو پختہ کرتی ہے، عبادت ہی وہ ذریعہ ہے جو اللہ کے ساتھ تعلق کو مضبوط کرتی ہے، عبادت ہی وہ ذریعہ ہے جو انسان کو رحمتِ الٰہی کے زیرِ سایہ لے جاتی ہے۔ جتنا ایمان مضبوط ہوتا ہے، اتنا ہی شریعت پر عمل سہل ہوتا جاتا ہے، اتنا ہی جی چاہتا ہے کہ میں خلافِ شریعت نہ جاؤں۔ گناہ کی کڑواہٹ اور تلخی محسوس ہوتی ہے۔ اگر گناہ صادر ہوجائے تو آدمی بدمزہ ہوجاتا ہے۔ اسے گناہ میں لطف نہیں آتا بلکہ گناہ کی تلخی محسوس کرتا ہے۔ اس سے توبہ کرتا ہے، رجوع کرتا ہے، اللہ کریم سے معافی چاہتا ہے اور آئندہ اس سے بچنے کی بھرپور کوشش کرتا ہے۔

عبادت کا حقیقی لطف حضورِ حق میں ہے:

مکالمہ ءالٰہی جسے نصیب ہوجائے، اللہ سے بات کرنا جسے نصیب ہوجائے تو عبادات میں لطف نصیب ہوتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد عالی ہے: اَنْ تَعْبُدَ اللّٰہَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ وَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ (بخاری) اوکما قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عبادت کا لطف یہ ہے کہ جب تُو اللہ اکبر کہہ کر دست بستہ کھڑا ہو تو پھر عالم یہ ہو کہ جیسے تُو اللہ کو روبرو دیکھ رہا ہے اور اگر اتنی ہمت نہیں ہے تو کم از کم یہ یقین ضرور ہو کہ میرا اللہ مجھے دیکھ رہا ہے۔ اگر

یہ بھی نہیں ہے تو پھر تیری نماز ورزش رہ جائے گی، عبادت تو نہیں ہوگی۔ آج معاشرے میں ہمارا جو مقام ہے اس کی ایک بنیادی وجہ یہ بھی ہے کہ ہم اس نعمتِ عظمیٰ سے، اس بنیاد سے دور جاچکے ہیں۔ بیشتر لوگ تو وہ ہیں جنہیں نماز نصیب نہیں ہوتی اور جنہیں نصیب ہوتی ہے ان میں سے اکثریت ان کی ہے جو محض اٹھک بیٹھک کرتے ہیں، حضوری نصیب نہیں ہوتی۔ مسجد میں بھی ہوتے ہیں تو دل بازار میں ہوتا ہے، وضو کر رہے ہوتے ہیں تو خیال نہیں ہوتا کہ ایک دفعہ ہاتھ دھویا ہے یا دو دفعہ دھویا ہے۔ بازو آدھا گیلا ہے یا آدھا خشک رہ گیا ہے، یا پاؤں صحیح دھویا ہے یا خشک رہ گیا ہے۔ جلدی جلدی Total پورا کیا اور نماز کے لیے کھڑے ہو گئے۔ رکوع میں گئے تو واپس قیام نہیں کیا، وہیں سے سجدے میں گرے۔ سجدے میں گر گئے تو واپس جلسے میں نہیں آئے۔ وہیں سے دو ٹھونگیں ماریں تو ایسے جیسے کوئی لٹھ لے کے پیچھے لگا ہوا ہے اور ہمیں بھاگنا ہے۔ بڑی بے دھیانی سے وہ Total پورا کر کے ہم بھاگ گئے۔ اگر یہ یقین، اتنی قوت نہ ہو کہ میں اللہ کو دیکھ رہا ہوں تو کم از کم یہ یقین ہو کہ میرا اللہ مجھے دیکھ رہا ہے۔ اس یقین کے ساتھ نماز ادا ہو تو آدمی اس طرح بھاگم دوڑ نہیں کرتا۔

چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں لیکن بہت بڑا اثر رکھتی ہیں۔ مساجد میں دیکھیں تو بان کے پٹھوں کی ٹوپیاں پڑی ہوتی ہیں، کوئی میلی ہو کر کالی ہوگئی ہے، کوئی ٹوٹی ہوئی، کوئی کیسی ہے۔ نماز پڑھنے کے لیے وہ سر پر رکھ لی، دو دفعہ اٹھے بیٹھے، ٹوپی اتار کر پھینکی اور چلے گئے۔ پھر آئے تو پہن لی۔ حکم یہ ہے کہ جو لباس پہن کر آپ کسی سے ملنا پسند نہیں کرتے، اس لباس میں نماز صحیح نہیں ہوتی۔ بلکہ کراہت آجاتی ہے۔ کم از کم ایسا لباس ہو جس میں آپ کسی سے ملنا تو پسند کرتے ہیں۔ اللہ کے حضور پیش ہو رہے ہیں تو کم از کم ایسا لباس تو ہو۔ اس طرح کی ردی ٹوپی پہننے کی بجائے سر ننگا رکھ لیں تو اس میں کراہت نہیں آئے گی، پھر اس کی کیا ضرورت ہے؟ ایک رومال باندھ لیں گے، کبھی کسی دفتر میں کسی آدمی سے ملنے کسی کے گھر میں جاتے ہوئے آپ نے رومال سے سر ڈھانکا ہے، اسے آپ خلاف تہذیب سمجھتے ہیں۔ وہ کہے گا یہ کیا مذاق کر رہے ہو، یہ کوئی لباس ہے کہ جیب سے رومال نکالا اور سر پر رکھ لیا! یہ کوئی لباس کا حصہ تو نہیں۔ اس سے تو آپ برہنہ سر ملنا پسند کریں گے۔ اچھا ہے سر ڈھانپ کر نماز پڑھیں لیکن سر سلیقے سے ڈھانپئے۔ قاعدے کی ٹوپی پہنیں جو ٹوپی پہن کر آپ کہیں جاسکتے ہیں، کسی سے مل سکتے ہیں، وہی ٹوپی وہی لباس پہنیں۔ اگر آپ لوگوں سے ملنے کے لیے اہتمام کرتے ہیں کہ کسی شریف آدمی سے ملنا ہے تو قمیص ایسی ہو، شلوار ایسی ہو۔ اسی طرح اللہ کے حضور جاتے ہیں تو اس کا بھی تو اہتمام ہونا چاہیے۔ یہ ہے حفاظتِ صلوٰۃ اور اس میں ایک عظمت ہے کہ ہر بندے کا اللہ کریم سے ذاتی تعلق قائم ہو جاتا ہے۔ پھر مولوی صاحب کے کہنے پر اللہ کی اطاعت نہیں کرتا یا کسی پیر صاحب کے کہنے پر اللہ کی اطاعت نہیں کرتا۔ اللہ کے ساتھ اس کا اپنا ذاتی تعلق ہوتا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس کا اپنا تعلق بن

جاتا ہے اور وہ اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلّم کی اطاعت اس تعلق کی نسبت سے کرتا ہے۔

تفرقہ بازی کا علاج اطاعتِ الٰہی میں ہے:

آج کل ہم جس تفرقہ بازی اور تفریق کا شکار ہیں، بے شمار فرقے بن گئے ہیں اور ہر فرقہ اپنے نظریات پہ زور دے رہا ہے اور جو نہیں مانتا اسے گولی سے اڑا دیتا ہے، تو یہ کیوں ہے؟ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہمارا تعلق اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلّم سے کمزور ہو کر افراد سے بن گیا ہے۔ ہم ایک فرد کے پیچھے چل پڑے ہیں کہ جو وہ کہتا ہے وہی کریں گے۔ بھئی اس فرد سے آپ نے کیا لینا ہے؟ آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے ساتھ اللہ کی بارگاہ میں حاضری دینی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم نے کسی سے یہ نہیں فرمایا کہ میری عبادت کرو۔ خود بھی اللہ کی عبادت فرمائی اور اُسے بھی اپنے ساتھ کھڑا کر دیا کہ آپ بھی اللہ کے حضور رکوع و سجود کرو، اللہ کی عبادت کرو۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلّم نے جو حکم دیا، اپنی مرضی سے کوئی ایک ادنیٰ سا حکم بھی ارشاد نہیں فرمایا۔ وَمَا يَنۡطِقُ عَنِ الۡهَوٰى ؕ﴿۳﴾ اِنۡ هُوَ اِلَّا وَحۡىٌ يُّوۡحٰى ۙ﴿۴﴾ (النجم: 3,4) میرا حبیب صلی اللہ علیہ وسلّم اپنی پسند سے کوئی چھوٹی سی بات بھی نہیں کہتا، آپ تک وہ پہنچا تا ہے جو اللہ کی طرف سے وحی ہو۔ آج بھی اگر ہم نماز ہی کو خلوص سے ادا کرنا شروع کر دیں، اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلّم کی اطاعت شروع کر دیں تو یہ تفرقہ بازی ختم ہو سکتی ہے۔ ہر بندہ جب اللہ کی رضا کا طالب ہو جائے تو یہ فرقے ختم ہو جائیں گے، ان کے وجود ختم ہو جائیں گے۔ یہ فوج سے، بندوقوں سے، حکومت سے، پولیس کے چالان کرنے سے، جیلوں میں ڈال دینے سے ختم نہیں ہوتے۔ ان کی طاقت اگر ٹوٹے گی تو اس کا ایک ہی طریقہ ہے کہ ہر بندے کا تعلق اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلّم کے ساتھ ہو۔ علماء کے ساتھ اُس کا تعلق ہے اور اللہ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی بات پوچھنے کے لیے ہو، نہ کہ مولوی صاحب کی ذاتی رائے جاننے کے لیے۔ پیر صاحب کے ساتھ تعلق ہے تو پیر صاحب کے پاس علم ہونا چاہیے کہ وہ اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلّم کی بات پہنچائیں اور ہم ان سے اللہ اور اللہ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی بات پوچھیں، ان کی اپنی رائے سے ہمیں کیا لینا دینا!

اہمیتِ صلٰوۃ العصر:

حٰفِظُوۡا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الۡوُسۡطٰى ۔۔۔ تو فرمایا،: تمہیں یہ نعمت عظمیٰ، صلٰوۃ عطا کی گئی ہے، اپنی نمازوں کی حفاظت کرو۔ نیت اور ارادے سے لے کر ادائیگی تک، ارکانِ صلٰوۃ تک ایک ایک چیز کی اور بالخصوص درمیانی نماز کی حفاظت کرو۔ درمیان والی نماز کو اکثر مفسرین کرام نے عصر کی نماز لکھا ہے۔ عصر کی نماز کا

وقت بڑا عجیب ہوتا ہے۔ تقریباً ہر شخص کی مصروفیت کا وقت ہے، دفاتر سے لے کر چرواہوں تک اور مزدور سے لے کر کاشتکار تک، ہر شخص اپنے دن بھر کی کارکردگی کو ختم کرنے کی تیاری کر رہا ہوتا ہے۔ مزدور بھی چھٹی کی تیاری کر رہا ہے، دفتر والا بھی چھٹی کی تیاری کر رہا ہے، چرواہا بھی اپنا ریوڑ اکٹھا کر رہا ہے کہ واپسی کا سفر اختیار کرے۔ خواتین گھر میں ہانڈی روٹی اور شام کے کھانے کی تیاری میں مصروف ہیں، دفتر سے لوگ آ گئے تو انہوں نے چائے پینی ہے۔ بچے سکول سے آ گئے، ان کو سنبھالنا ہے۔ یہ عصر کا وقت ایسا ہے کہ اہلِ خانہ سے لے کر بازار اور دفاتر کے لوگوں تک، چرواہوں، گڈریوں، کسانوں تک ہر شخص مصروف ہوتا ہے۔ اس صلوٰۃ کی خصوصی تاکید فرمائی کہ جیسے ہی اس کا وقت ہو جائے، اسے پورے اہتمام کے ساتھ ادا کرو۔ ایک نکتہ اس میں یہ بھی ہے کہ یہ نماز جو بھیڑ بھاڑ اور بھاگ دوڑ کے وقت میں ہے، اس کا پورا اہتمام کرو گے تو پھر دوسری نمازوں کا اہتمام نسبتاً آسان ہوگا۔

وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ﴿۲۳۸﴾ اپنی عاجزی اور نیازمندی کے ساتھ اللہ کی بارگاہ میں کھڑے ہو کر اللہ سے ملاقات کرو۔ اللہ کریم سے روبرو بات کرو۔ زبانی بھی اس کی بڑائی کا اقرار کرو، عمل سے بھی، رکوع کر کے بھی، سجدہ کر کے بھی، تسبیحات پڑھ کے بھی اس کی عظمت کا اقرار کرو اور اپنی کمزوریوں کا اعتراف کرو۔ اپنی ضرورتیں اس کی بارگاہ میں پیش کرو۔ وہ مسبب الاسباب ہے تمہاری ضرورتوں کی تکمیل کے ذرائع اور اسباب پیدا فرما دے گا۔ **وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ﴿۲۳۸﴾** اور اللہ کریم کے روبرو نہایت عاجزی سے کھڑے ہو جاؤ۔

حالتِ خوف واضطرار میں نماز کی ادائیگی:

فَاِنْ خِفْتُمْ ۔۔۔۔ ہاں! ایک موقع اور بھی آ جاتا ہے، کہیں تم عرصۂ جنگ میں ہو، کہیں دشمنوں کا خوف آ جاتا ہے، کہیں لڑائی چھڑ جاتی ہے، کہیں کوئی مصیبت آ جاتی ہے **فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا** ۔۔۔۔ تو کیا اس میں نماز کی چھٹی مل جائے گی؟ فرمایا نہیں۔ یہ چھوڑو گے تو موت ہو جائے گی۔ جیسے سانس لینا ہماری زندگی ہے اور اگر کوئی لڑائی میں ہو، جنگ میں ہو تو کیا سانس لینا چھوڑ دے گا؟ سانس لینا چھوڑ دے گا تو خود مر جائے گا۔ اسی طرح صلوٰۃ ہے اسے چھوڑو گے تو یہ تمہاری موت ہے، اسے مت چھوڑو۔ ہاں! یہ الگ بات ہے کہ لڑتے ہوئے تم رکوع سجود نہیں کر سکتے تو فرمایا، لڑتے رہو، کھڑے کھڑے نماز بھی ادا کرتے رہو، **رُكْبَانًا** ۔۔۔۔ سواری پر ہو تو سواری پر نماز ادا کرتے رہو، فرائض ہی ادا کر لو۔ سواری پر ادائیگیِ صلوٰۃ کے لیے علماء نے یہ شرط لکھی ہے کہ نماز کی نیت کرتے وقت منہ قبلہ رخ ہو پھر سواری جدھر گھومتی ہے، پھرتی ہے، چلتی رہے۔ جنگ میں بھی یہ جواز ہے کہ معرکہ میں، جنگ میں، میدانِ کارزار میں جدھر منہ ہے، وہاں نیت کر لو۔

فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ۔۔۔۔ اللہ ہر جگہ موجود ہے۔ سفر میں ہو، ریل میں ہو، جہاز میں ہو، بس

میں ہو، جب قبلے کی طرف منہ ہوتو نماز کی نیت کر لو اور پھر پڑھتے رہو۔ جدھر سواری، جہاز، گھوڑا، ریل مڑتی جائے، کوئی فرق نہیں لیکن چھوڑ دینے کی اجازت نہیں ہے۔ اس لیے کہ اس کا چھوڑ دینا تمہاری موت ہے۔ یہ روح کی غذا بھی ہے، روح کی دوا بھی ہے اور جس طرح جسم کو زندہ رکھنے کے لیے سانس کی آمد و شد ضروری ہے، اسی طرح روح کی حیات کے لیے نماز کا قائم رہنا ضروری ہے۔

فَاِنۡ خِفۡتُمۡ فَرِجَالًا اَوۡ رُكۡبَانًا ۔۔۔ اگر تم کو اندیشہ ہو، کوئی خوف ہو یا بیماری ہو یا تم اٹھ نہیں سکتے تو جہاں لیٹے ہو وہاں لیٹے لیٹے ادا کر لو۔ وضو نہیں کر سکتے تو تیمم کر لو۔ قبلہ رخ ہو سکتے ہو تو ٹھیک ہے، نہیں ہو سکتے تو جہاں ہو وہاں ادا کر لو۔ رکوع سجود نہیں کر سکتے تو اشارے سے کر لو لیکن چھٹی نہیں۔ جب تک حواس قائم ہیں چھوڑ نہیں سکتے۔ مت چھوڑو اس لیے کہ یہ تمہاری زندگی ہے۔ یہ تمہارے ایمان کی بنیاد ہے، اللہ کے ساتھ تعلق کی بنیاد ہے۔

ذکر اللہ کی تاکید:

فَاِذَاۤ اَمِنۡتُمۡ فَاذۡكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمۡ مَّا لَمۡ تَكُوۡنُوۡا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۲۳۹﴾ اور جب حالتِ امن میں ہو تو اس طرح اللہ کا ذکر کرو، اس طرح عبادات کرو جس طرح اللہ نے تمہیں تعلیم فرمائی کیونکہ تم اللہ کے بتانے سے پہلے نہیں جانتے تھے۔ یہ عبادات تم نے ایجاد نہیں کیں، کسی بندے نے ایجاد نہیں کیں، یہ تمہاری کاوش نہیں ہے۔ ربّ العالمین نے تمہیں یہ تسبیحات، یہ دعائیں تعلیم فرمائی ہیں اور وہ تمہیں تاکید فرما رہا ہے کہ ان کے اوقات کی، ان کے ارکان کی محافظت کرو، حفاظت کرو۔ اس لیے کہ یہ تمہارے ایمان کی بنیاد ہے، تمہاری دینی زندگی کی بنیاد ہے اور تمہاری روح کی حیات ہے۔

فَاذۡكُرُوا اللّٰهَ ۔۔۔ یہاں عبادات کو ذکرِ الٰہی کہا۔ یہ ذکرِ الٰہی بندے اور اللہ کے تعلق کی بنیاد ہے۔ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی برکات کا یہ عالم ہوتا تھا کہ نبی علیہ السلام کے وجود کے ساتھ کوئی چیز مس کر جاتی تو وہ ذاکر ہو جاتی۔ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کا لباس ذاکر ہوتا تھا، نعلین مبارک ذاکر ہوتے تھے۔ جس زمین پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کے قدوم مبارک پڑے وہ ذرات ذاکر ہو گئے، اس کے باوجود ذکر کی تلقین انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو بھی کی گئی۔ سورۃ المزمل میں موجود ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کو فرمایا گیا کہ راتوں کو اٹھئے، اللہ کا ذکر کیجئے۔ یہ اس لیے ہے کہ امت کے ہر فرد کو یہ احساس ہو جائے کہ اللہ کی یاد کتنی ضروری ہے۔ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کو فرعون کے پاس بھیجا اور فرمایا، بات مزے سے کرنا، وہ کل قیامت کو یہ نہ کہے کہ آپ کے انبیاء علیہما السلام نے بات ہی ایسی کی تھی کہ مجھے غصہ آ گیا اور میں بات پر غور نہیں کر سکا۔ فَقُوۡلَا لَهٗ قَوۡلًا لَّيِّنًا (طٰہٰ: 44) آپ علیہما السلام

دونوں بڑے مزے سے اس سے بات کرنا لیکن فرمایا: وَلَا تَنِيَا فِيْ ذِكْرِيْ ٥ (طٰہٰ:42) سامنے فرعون ہے، دعوت الی اللہ دے رہے ہو۔ جو خود خدائی کا دعویدار ہے، اسے اللہ پر ایمان لانے کی دعوت دے رہے ہو۔ کتنی خطرناک صورتحال ہے کہ صرف دو بندے ہیں اور ایک مطلق العنان شہنشاہ ہے جو لوگوں سے اپنی پوجا کرواتا ہے اور خود کو خدا منواتا ہے۔ اس کے باوجود فرمایا، دھیان میرے ذکر میں ہو وَلَا تَنِيَا فِيْ ذِكْرِيْ ﴿۴۲﴾ ذکر میں عدم توجہی نہ ہو، ذکر میں پوری توجہ رہے۔

صلوٰۃ بھی ذکر ہے، ہر نیک عمل جو ہم کرتے ہیں وہ ذکر ہے، اس میں اللہ کی یاد موجود ہے۔ جس میں اللہ اور اللہ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی اطاعت ہے وہ عملاً ذکر ہے۔ صلوٰۃ عملاً ذکر بھی ہے، لسانی ذکر بھی ہے تو جو تسبیحات، تلاوت، جو اللہ اللہ ہم زبانی کرتے ہیں، وہ بھی ذکر ہے لیکن ذکر کا حق تب ادا ہوتا ہے جب قلب ذاکر ہو اور قلب ذاکر ہو کر پورے وجود کو ذاکر کر دے۔ ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُوْدُهُمْ وَقُلُوْبُهُمْ اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ (الزمر:23) جب کھال سے لے کر نہاں خانۂ دل تک ہر ذرہ وجود ذاکر ہو جائے۔ ہڈیاں، خون، رگ وریشے۔ ایک ایک جزو بدن سے اللہ اللہ کی آواز سنیں۔ یہی وہ کمال ہے جو برکاتِ نبوت رسول صلی اللہ علیہ وسلّم سے نصیب ہوتا ہے۔ احکامِ شریعت تعلیماتِ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم ہیں، اور یہ کیفیات برکاتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلّم ہیں۔ کامل اسلام یہ ہے کہ تعلیمات پر عمل ہو اور برکاتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلّم سے سینہ پُرنور ہو۔ اللہ کریم ہمیں اپنی اطاعت کی توفیق دے اور اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلّم کی برکات سے نوازے۔

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا ـــــ تم میں سے جو لوگ فوت ہو جاتے ہیں اور ان کے پیچھے بیویاں رہ جاتی ہیں وَصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ ـــــ تو انہیں بیویوں کے حق میں، ان کے نان ونفقہ، کھانے پینے، اخراجات کے بارے میں وصیت کرنا چاہیے اور کم از کم ایک سال انہیں گھر میں رہنے دیا جائے، نکالا نہ جائے۔ فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْ مَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوْفٍ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۴۰﴾ اگر وہ اپنی مرضی سے گھر چھوڑتی ہیں تو پھر تم پر کوئی جرم نہیں لیکن انہیں گھر معروف طریقے سے چھوڑنا چاہیے۔ آوارہ گردی میں یا کسی ناجائز طریقے سے نہیں بلکہ معروف طریقے سے، جیسے عدت کے بعد نکاح کر لیتی ہیں۔ یہ حکم تب تک تھا جب تک جائیداد میں وراثت کے احکام نازل نہیں ہوئے تھے۔ جب وراثت کے احکام نازل ہو گئے تو پھر اس حکم کی افادیت جاتی رہی لیکن تلاوت باقی رکھی گئی۔ آیات جو منسوخ ہوئی ہیں ان میں ایک تو وہ ہیں جن کی تلاوت باقی ہے، احکام منسوخ ہو گئے اور ایک ایسی آیات ہیں جن کے احکام باقی ہیں آیت منسوخ ہو گئی، جیسے رجم کا حکم باقی ہے لیکن رجم کی آیت منسوخ ہو چکی ہے۔

وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ۔۔۔۔ بہر حال حاصلِ کلام یہ ہے کہ خاتون کا بھی ایک حق ہوتا ہے، اللہ کریم نے اسے بھی حقوق دیے ہیں اور کسی بھی صورت میں اس کے ساتھ کوئی غیر معروف برتاؤ نہ کیا جائے۔ کوئی ایسا طریقہ نہ کیا جائے جو نامناسب ہو۔ اسی طرح جنہیں طلاق ہوجاتی ہے، ان کا بھی حق بنتا ہے کہ انہیں قاعدے کے مطابق کچھ نہ کچھ دیا جائے۔

حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ﴿۲۴۱﴾ اللہ کے نیک بندوں پر یہ حق ہے۔ قرآن حکیم زندگی کو اللہ کی رضا کے حوالے سے اور آخرت کے حوالے سے زیرِ بحث لاتا ہے۔ اس لیے ارشاد ہوتا ہے کہ دنیا کا کوئی کام بھی کرو، وہ خوشی کا ہو یا ناخوشی کا، بہرحال اس میں اللہ اور اللہ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشنودی پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔

اہلِ دانش کون ہیں؟

كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۲۴۲﴾ اللہ اس طرح سے اپنی آیات تم پر کھول کھول کر بیان فرماتا ہے تاکہ تم سمجھداری سے اور عقل کی زندگی بسر کرسکو۔ قرآن حکیم کے مطابق سب سے بڑا دانشور، سب سے بڑا عقلمند وہ ہے جو عظمتِ الٰہی کو جانتا ہو اور اپنی زندگی کو اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کے مطابق ڈھال لیتا ہے۔ اللہ سے بغاوت، احکامِ الٰہی سے بغاوت، اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کی پیروی نہ کرنا، یہ سب سے بڑی بے وقوفی اور سب سے بڑی جہالت ہے۔ اب تو حالات ہی ایسے ہو گئے ہیں کہ شعراء میں جو کوئی گستاخانہ شعر کہتا ہے وہ بڑا شاعر کہلاتا ہے۔ ادیبوں میں جو مذہب پر تنقید کرتا ہے وہ بڑا ادیب کہلاتا ہے اور دانشوروں میں جو انسانیت کو گمراہ کرنے کی نئی نئی پخیں نکالتا ہے وہ بڑا دانشور کہلاتا ہے۔ لیکن حق وہی ہے جو اللہ جل شانہٗ نے ارشاد فرمایا۔ اللہ کی کتاب میں موجود ہے کہ عقل مند اور دانش مند وہ ہے جو عظمتِ الٰہی کو اور اپنی کمزوری کو پالیتا ہے اور اطاعتِ الٰہی اختیار کرتا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی اختیار کرتا ہے وہ عقل مند ہے اور جو جتنا اللہ اور اس کے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم سے دور ہے وہ اتنا ہی بے وقوف ہے۔ قرآن حکیم پہلی امتوں کے واقعات سے اس کی مثالیں بھی دیتا ہے۔

سورۃ البقرہ رکوع 32 آیات 243 تا 248

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ ۪ فَقَالَ
لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ۣ ثُمَّ اَحْيَاهُمْ ط اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ
اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ﴿٢٤٣﴾ وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ
سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿٢٤٤﴾ مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗٓ
اَضْعَافًا كَثِيْرَةً ط وَاللّٰهُ يَقْبِضُ وَيَبْصُۜطُ ۪ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿٢٤٥﴾ اَلَمْ تَرَ اِلَى
الْمَلَاِ مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى ۘ اِذْ قَالُوْا لِنَبِيٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا
مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ط قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ
الْقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوْا ط قَالُوْا وَمَا لَنَآ اَلَّا نُقَاتِلَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَدْ
اُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَاَبْنَآئِنَا ط فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا اِلَّا
قَلِيْلًا مِّنْهُمْ ط وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿٢٤٦﴾ وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ
بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا ط قَالُوْٓا اَنّٰى يَكُوْنُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ اَحَقُّ
بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ ط قَالَ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ عَلَيْكُمْ
وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِى الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ط وَاللّٰهُ يُؤْتِيْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَآءُ ط وَاللّٰهُ
وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿٢٤٧﴾ وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اٰيَةَ مُلْكِهٖٓ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ التَّابُوْتُ
فِيْهِ سَكِيْنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى وَاٰلُ هٰرُوْنَ تَحْمِلُهُ
الْمَلٰٓئِكَةُ ط اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿٢٤٨﴾

کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو موت کے ڈر سے ہزاروں کی تعداد میں اپنے گھروں سے نکلے تو اللہ نے انہیں فرمایا کہ مر جاؤ پھر انہیں زندہ کر دیا یقیناً اللہ لوگوں پر بہت مہربان ہیں مگر اکثر لوگ شکر نہیں کرتے ﴿۲۴۳﴾ اور اللہ کی راہ میں لڑو اور جان لو کہ اللہ سننے والے جاننے والے ہیں ﴿۲۴۴﴾ کون ہے جو اللہ کو قرض دے اچھے طور پر پھر وہ اس کو اس کے لیے کئی گنا زیادہ کر دیں اور اللہ ہی (روزی کو) تنگ کرتے ہیں اور کشادہ اور تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے ﴿۲۴۵﴾ کیا آپ نے بنی اسرائیل کے سرداروں کی طرف نہیں دیکھا موسیٰ (علیہ السلام) کے بعد جب انہوں نے اپنے نبی علیہ السلام سے کہا کہ ہمارے لیے بادشاہ مقرر کر دیجیے تاکہ ہم اللہ کی راہ میں لڑیں فرمایا ایسا نہ ہو کہ اگر تمہیں قتال کا حکم دیا جائے تو تم نہ لڑو وہ کہنے لگے ہم اللہ کی راہ میں کیوں نہ لڑیں گے کہ جب ہمیں ہمارے گھروں سے اور ہمارے بیٹوں (اپنوں) سے نکال دیا گیا پھر جب ان پر لڑنا فرض کیا گیا تو پھر گئے سوائے ان میں سے تھوڑے (لوگوں کے) اور اللہ ظالموں کو جانتے ہیں ﴿۲۴۶﴾ اور ان کے نبی علیہ السلام نے انہیں فرمایا کہ یقیناً اللہ نے طالوت کو تمہارے لیے بادشاہ مقرر فرمایا ہے کہنے لگے اس کے لیے ہم پر بادشاہی کیسے ہو سکتی ہے اور ہم اس کی نسبت بادشاہی کے زیادہ حقدار ہیں اور اسے تو مال میں زیادہ کشائش نہیں دی گئی فرمایا یقیناً اللہ نے انہیں تم پر پسند فرمایا ہے اور انہیں علم اور جسم میں زیادہ کشادگی دی گئی ہے اور اللہ جسے چاہتے ہیں ملک عطا کرتے ہیں اور اللہ کشائش والے جاننے والے ہیں ﴿۲۴۷﴾ اور اللہ کے نبی علیہ السلام نے انہیں فرمایا بے شک اس کی بادشاہی کی نشانی یہ ہے کہ تمہارے پاس صندوق آئے گا جس میں تمہارے پروردگار کی طرف سے تسکین ہے اور وہ چیزیں ہیں جو موسیٰ اور ہارون (علیہما السلام) کی قوم نے چھوڑیں اس کو فرشتے اٹھا لائیں گے یقیناً اس میں تمہارے لیے دلیل ہے اگر تم ایمان والے ہو تو ﴿۲۴۸﴾

تفسیر و معارف

حیات بعد الموت کا ثبوت:

اَلَمۡ تَرَ اِلَی الَّذِیۡنَ خَرَجُوۡا مِنۡ دِیَارِہِمۡ وَہُمۡ اُلُوۡفٌ حَذَرَ الۡمَوۡتِ ۔۔۔۔ یہ بنی اسرائیل کا ایک واقعہ ہے جس کی طرف اشارہ فرمایا جارہا ہے۔ اے حبیب صلی اللہ علیہ وسلّم! آپ صلی اللہ علیہ وسلّم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو ہزاروں کی تعداد میں تھے اور موت کے خوف سے اپنی آبادی سے بھاگ نکلے۔ مفسرینِ کرام نے یہ واقعہ یوں لکھا ہے کہ بنی اسرائیل کی بعض بستیوں میں کوئی وبا پھیل گئی تو لوگوں نے اپنی عقل و دانش پر اعتبار کر کے یہ طریقہ اختیار کیا کہ لاکھوں لوگ وہاں سے نکل بھاگے۔ حکمِ شرعی آج بھی یہ ہے کہ اگر کسی شہر میں، کسی بستی میں وبا پھوٹتی ہے تو اس کے مکین وہ شہر چھوڑ کر نہ بھاگیں۔ زندگی اور موت اللہ کے اختیار میں ہے، بیماروں کی خبر گیری کریں، مرنے والوں کا کفن دفن کریں اور وہیں رہیں۔ ہاں! اگر کوئی اس بستی سے دور ہے، باہر ہے اور وہاں وبا نہیں ہے تو بے شک اس بستی میں جانے کی کوشش نہ کرے، اس کی اجازت ہے۔ وہ اپنے آپ کو وہاں سے دور رکھے بلکہ یہ مستحسن ہے کہ خواہ مخواہ اپنے آپ کو مصیبت میں نہ ڈالے لیکن اگر کسی بستی پہ کوئی وبا آ گئی ہے تو جو لوگ موجود ہیں، وہ موت کے ڈر سے وہاں سے نہ بھاگیں۔ ان لوگوں نے اللہ کے اس حکم پر اپنی عقل کو ترجیح دی اور بیماروں، کمزوروں اور مجبوروں کو چھوڑ کر یہ لاکھوں لوگ وہاں سے نکل بھاگے۔ کتنے ایسے ہوں گے جو سفر کے قابل نہ ہوں گے، کتنی خواتین اور بچے ایسے ہوں گے جو صحت مند تو ہوں گے لیکن شاید وہ ان کے ساتھ نکل نہ سکے ہوں اور کتنے ایسے ہوں گے جو بیمار ہوں گے۔ کتنے ایسے ہوں گے جو مر چکے ہوں گے اور کوئی کفن دفن والا نہیں ہوگا۔

فَقَالَ لَہُمُ اللّٰہُ مُوۡتُوۡا ۔۔۔۔ اور جب آبادی سے دور ویرانے میں پہنچے تو اللہ کا حکم ہوا کہ مر جاؤ اور سارے مر گئے۔ مفسرینِ کرام نے لکھا ہے کہ ان کے ساتھ جو مویشی یا بار برداری کے جانور وغیرہ تھے، وہ بھی مر گئے اور کوئی چیز زندہ نہ بچی۔ وہ بھاگے تو موت ہی سے تھے لیکن جن کو چھوڑ کر آئے تھے، ان میں سے کتنے بچ گئے ہوں گے۔ کوئی ضروری تو نہیں کہ سارے ہی مر گئے ہوں اور یہ جو چھوڑ کر بھاگے تھے وہ سارے مر گئے۔ جو لاکھوں کی تعداد میں انسان، جانور ڈھیر ہو گئے تو اتنوں کا کفن دفن کون کرتا؟ لوگوں کو پتہ چلا تو انہوں نے ان کے گرداگرد بلند دیوار بنا دی اور انہیں چھوڑ دیا۔ بڑا عرصہ گزرنے کے بعد وہاں سے اللہ جل شانہٗ کے کسی نبی علیہ السلام کا گزر ہوا تو انہوں نے ہڈیوں کے انبار دیکھے۔ پتہ چلا کہ یہ لوگ گھروں سے بھاگے تھے، اللہ نے بطور سزا ان پر موت مسلط کر

دی۔ انہوں نے دعا کی، بارالہا! تو غفور اور رحیم ہے، تو ان کی خطا معاف فرما دے۔ ثُمَّ اَحۡیَاھُمۡ ۔۔۔۔ اللہ کریم نے انہیں دوبارہ زندہ کر دیا۔

قضائے مبرم، قضائے معلّق:

موت دو طرح کی ہوتی ہے۔ قضائے مبرم وہ موت ہے جو اللہ ایک کی طرف سے مقرر ہے، بندہ اپنی عمرِ طبعی پوری کر کے فوت ہوتا ہے اور اس میں لمحے بھر کی تقدیم و تاخیر نہیں ہوتی۔ نہ وہ لمحہ پہلے آتی ہے نہ ایک لمحہ اس میں تاخیر ہوتی ہے۔ دوسری قضائے معلّق ہے جسے انگریزی میں hanging Decision کہتے ہیں۔ ایسے فیصلے جو معلق ہوتے ہیں، اللہ جب چاہے وہ مسلط کر دیتا ہے۔ عموماً جو قومیں تباہ ہوئیں اور غرق ہوئیں تو یہ قضائے معلق تھی جو ان کے گناہوں کے بدلے ان پر مسلط کر دی گئی لیکن ان کی موت اللہ کے علم میں تھی، اس نے انہیں دوبارہ زندہ کرنا تھا اور اپنی قدرتِ کاملہ کا اظہار منظور تھا۔ یوم النشور اور حشر کا ثبوت مہیا کرنا منظور تھا کہ لوگ آنکھوں سے دیکھ لیں کہ مرنے کے بعد بھی زندہ ہو سکتا ہے۔

یہ موت اُس طرح کی تھی جس طرح حضرت عزیر علیہ السلام کی تھی۔ حضرت عزیر علیہ السلام ایک بستی سے گزرے جو ویران ہو چکی تھی تو انہوں نے حیرت سے کہا کہ اب اللہ مالک ہے، وہ اسے کیسے زندہ کرے گا، یہ وہی جانتا ہے۔ خود آرام کرنے کے لیے لیٹے تو صدی بیت گئی۔ موت وارد ہو گئی اور وہیں ایک لمبی مدت کے بعد کم و بیش ایک صدی کے بعد اللہ کریم نے ان کی آنکھ کھولی۔ اٹھے تو ارشاد ہوا۔ کَمۡ لَبِثۡتَ ۔۔۔۔ کتنی دیر آپ لیٹے رہے۔ قَالَ لَبِثۡتُ یَوۡمًا اَوۡ بَعۡضَ یَوۡمٍ ۔۔۔۔ دن بھر یا دن کا کچھ حصہ۔ فرمایا، نہیں تم پر تو ایک صدی بیت گئی اور دیکھو! تمہارے پاس کھانا پانی بھی تھا۔ لَمۡ یَتَسَنَّہۡ ۔۔۔۔ (البقرہ:259) اپنے کھانے کو دیکھو، میں نے اسے باسی نہیں ہونے دیا، ویسے کا ویسا تازہ ہے جیسا آپ لائے تھے لیکن آپ کی سواری کا جو گدھا تھا، وہ خاک میں مل گیا ہے۔ اب میں آپ کے سامنے اسے دوبارہ زندہ کرتا ہوں اور دیکھو! کس طرح سے ہڈیاں جڑتی ہیں، ان پر پٹھے چڑھتے ہیں اور ان پر کس طرح سے گوشت آ کر بنتا ہے۔ چنانچہ ہوا میں ذرات اوپر سے اڑ اڑ کر آ رہے تھے، ان کے سامنے دیکھتے ہی دیکھتے گدھے کا وجود مکمل ہو گیا اور وہ زندہ ہو کر کھڑا ہو گیا۔ انہوں نے کہا، یا اللہ! میرا ایمان و یقین تو تھا کہ تُو ہر چیز پہ قادر ہے، مجھے تو صرف یہ حیرت ہوئی تھی کہ یہ ہوتا کس طریقے سے ہے؟ فرمایا، میں نے تجھے دکھا دیا کہ اس طرح ہوگا۔ حضرت عزیر علیہ السلام کی جو موت تھی اس میں وہ برزخ میں رہے نہ دنیا میں رہے۔ ایک طرح کی ایسی گہری نیند تھی جس نے دنیا و مافیہا سے بے خبر کر دیا۔ وہ چونکہ نبی علیہ السلام تھے اور انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے وجود سلامت

رہتے ہیں، گلتے سڑتے نہیں ہیں لیکن یہ تو سارے غیر نبی تھے۔ان کے وجود گل سڑ گئے، ہڈیوں کے ڈھانچے بن گئے لیکن برزخ میں داخل نہیں ہوئے۔ برزخ منکشف نہیں ہوا،زندگی اور موت کے درمیان رہے اور جب اللہ کے نبی علیہ السلام نے دعا کی تو دوبارہ زندہ ہو گئے۔ان لوگوں کے بارے میں مفسرینِ کرام لکھتے ہیں کہ یہ پھر زندہ رہے اور اپنی طبعی عمریں پوری کر کے فوت ہوئے۔

ایسے بھی مردے زندہ کیے گئے جو عمرِ طبعی پوری کر کے فوت ہو گئے۔اللہ کی قدرت دکھانے کے لیے زندہ ہوئے اور فوت ہو گئے۔چونکہ ان کے پاس عمر باقی نہیں تھی، وہ دنیا میں نہیں رہے۔

اللہ کا فضل ادائیگی شکر سے مشروط ہے:

اِنَّ اللّٰہَ لَذُوۡ فَضۡلٍ عَلَی النَّاسِ وَلٰکِنَّ اَکۡثَرَ النَّاسِ لَا یَشۡکُرُوۡنَ﴿۲۴۳﴾ بے شک اللہ لوگوں پر بہت ہی زیادہ کرم کرنے والا ہے لیکن لوگوں کی اکثریت ایسی ہے جو اللہ کا شکرادا نہیں کرتی۔ایک بات بہت عام ہے کہ ہم جو کچھ بھی کرتے ہیں، کہتے ہیں اللہ بڑا کریم ہے، اللہ فضل فرمائے گا، اللہ کرم فرمائے گا۔اس آیہءکریمہ نے یہ واضح کر دیا کہ بے شک اللہ بڑا فضل کرنے والا ہے، اللہ سب سے بڑا رحم کرنے والا ہے، اللہ سب سے بڑا کریم ہے اور اس کی رحمت بے انتہا وسیع ہے۔اس کی وسعت ساری مخلوق سے بڑھ کر ہے کیونکہ وہ اللہ کی صفت ہے اور مخلوق تو مخلوق ہے لیکن اس کے ساتھ ہی فرمایا، میری رحمت، میرے فضل، میرے کرم کا تعلق شکر کے ساتھ ہے۔اِنَّ اللّٰہَ لَذُوۡ فَضۡلٍ عَلَی النَّاسِ ۔۔۔اللہ تو لوگوں پر بہت ہی کرم فرمانے والا ہے۔ وَلٰکِنَّ اَکۡثَرَ النَّاسِ لَا یَشۡکُرُوۡنَ﴿۲۴۳﴾ لیکن اکثر لوگ اللہ کا شکرادا نہیں کرتے اس لیے اس کے کرم سے محروم رہتے ہیں۔یعنی اللہ کی نافرمانی اس کی رحمت سے دوری کا سبب بنتی ہے اور اللہ کی اطاعت اس کی رحمت کا سبب ہے۔

حصولِ رحمت ایمان واطاعت سے مشروط ہے:

بے شک اللہ بڑا رحیم ہے، اس کی رحمت کی کوئی حد نہیں ہے لیکن اس کی رحمت اور اس کے فضل کو پانے کے لیے اس کی اطاعت اور فرمانبرداری ضروری ہے۔اس پر ایمان اور اس کی عظمت کا اقرار ضروری ہے۔ضروریاتِ دین پر ایمان ضروری ہے اور اللہ کو ویسا ماننا ضروری ہے جیسا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ماننے کا حکم دیتے ہیں۔اپنی طرف سے کوئی تصور گھڑ لینا درست نہیں ہے بلکہ اللہ کو ویسا مانا جائے جیسا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم منواتے ہیں۔اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا برحق اور آخری نبی علیہ السلام مانا جائے چونکہ اللہ کو ماننے کا ذریعہ نبوت کی صداقت ہے۔ اللہ کی ذات اور اس کی صفات کی خبر اکیلی ہستی نے دی، رسول صلی اللہ علیہ وسلم ۔کوئی دوسرا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے

ساتھ وحی سننے میں شریک نہیں۔آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کے ساتھ معرفتِ الٰہی میں شریک نہیں ہے۔آپ صلی اللہ علیہ وسلّم یک وتنہا اور یگانہ روزگار ہیں۔اللہ کا ایک بندہ رسول صلی اللہ علیہ وسلّم اللہ کے بارے خبر دیتا ہے۔اب اگر اس ہستی پر ہی ایمان مضبوط نہ ہوتو اللہ کے ماننے کی کوئی دلیل باقی نہیں رہتی،لہٰذا ضرویات دین پر ایمان شکر کی بنیاد ہے اور اس ایمان کے بعد انسان کا عمل نتائج لانے کا ذمہ دار بنتا ہے۔

اللہ کریم نے اشیاء میں خصوصیات رکھ دی ہیں۔اب اگر کوئی زہر کھاتا ہے اور لمبی عمر کی دعا مانگتا ہے تو دعا مانگنا ایک زبانی کام ہے، ایک زبانی قول ہے،لیکن عملاً تو وہ زہر کھا رہا ہے۔نتیجہ تو عمل پر ہوگا۔وہ دعا مانگتا رہے لیکن زہر کھانے سے اس کی موت واقع ہو جائے گی، اس کا عمل اپنا نتیجہ لائے گا۔اسی طرح رحمت الٰہی کو پانے کے لیے اللہ کی اطاعت شرط ہے۔بشری کمزوریاں الگ بات ہیں۔انسان سے خطا ہو جاتی ہے اور خطا پر بھی احساسِ ندامت ہو تو بعض اوقات خطا بھی ثواب کا سبب بن جاتی ہے لیکن یہ تب ہوتا ہے جب ایک بھول ہو جائے، ایک خطا ہو جائے تو اس پر شرمندگی ہو، ندامت ہو اور اللہ کریم کے حضور توبہ کرے اور آئندہ گناہ کرنے سے باز آجائے۔ایسی توبہ جو گناہ کے سبب ہوئی، وہ باقی زندگی کے گناہوں کو بخشوانے کا بھی سبب بن جاتی ہے بلکہ گناہوں کے بدلے نیکیاں نصیب ہو جاتی ہیں۔یُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ (الفرقان: 70) ہم ان کے گناہوں کو، خطاؤں کو نیکیوں میں بدل دیتے ہیں لیکن یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جنہیں اپنے قصور کا، اپنی غلطی کا، اپنے گناہ کا احساس ہو جاتا ہے۔ اللہ کی بارگاہ میں توبہ کرتے ہیں، آئندہ گناہ سے باز آجاتے ہیں اور دامانِ رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلّم کو مضبوطی سے تھام لیتے ہیں۔اللہ کی بارگاہ کے سارے دروازے بند ہو چکے ہیں لیکن ایک دروازہ ہے جو ہمیشہ کھلا ہے، وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی ذاتِ والا صفات پر ایمان ویقین اور آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی غلامی کا ہے۔جس نے زندگی میں حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کی غلامی کرلی، اللہ کریم فرماتے ہیں وہ بڑا عقلمند ہے، بڑا دانشور ہے اور یہ اللہ کے کرم کو پانے والا ہے۔جس نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کی پیروی اور اتباع کو چھوڑ دیا، اس نے گویا اللہ کی رحمت کو چھوڑ دیا، اللہ کے کرم کو چھوڑ دیا اور خود کو محروم کرلیا۔

قتال صرف رضائے الٰہی کے لیے ہو:

وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿٢٤٤﴾ چھوٹی چھوٹی باتوں کا تو ذکر ہی کیا، روزمرہ کے معمولات تو کوئی بڑی بات نہیں کہ آپ نے کاروبار دیانت داری سے کرلیا، آپ نے حلال کھانا کھالیا، آپ نے سچ بول لیا لیکن ایک وقت آجاتا ہے کہ جب قتال کرنا پڑتا ہے، جان دینی پڑتی ہے، کسی کی جان لینی پڑتی ہے اور

یہ کوئی آسان کام نہیں ہے۔ یہ انتہائی اقدام ہے جو انسان اس دارِ دنیا میں کرتا ہے۔ جب ایسا وقت آ جائے وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۔۔۔۔ تو اللہ کی راہ میں قتال سے بھی گریز نہ کرو۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ بندۂ مومن ہر وقت تلوار ہاتھ میں اٹھائے کسی کی گردن کاٹنے کے درپے ہو، بات یہ نہیں ہے۔ حکم یہ ہے کہ جہاں اللہ حکم دے اور جان ہارنی پڑے تو جان ہار دو۔ عقل مندی یہ ہے کہ اللہ کی اطاعت کو ہاتھ سے نہ جانے دو، جان جاتی ہے تو جائے۔ جب حکمِ الٰہی کے مقابلے میں ہماری جان کی بھی کوئی قیمت نہیں ہے تو پھر ان چھوٹی چھوٹی باتوں میں ہم اطاعت الٰہی کیسے چھوڑ سکتے ہیں؟ اور یہ بات یاد رکھو! کبھی مت بھولو کہ اللہ کریم سنتا بھی ہے، جو کچھ ہم کرتے ہیں، دیکھتا بھی ہے۔ فرشتوں کا لکھنا بجا، اعمال کے دفتر میں ان کا لکھا جانا درست لیکن اس کا یہ مطلب نہیں، (معاذ اللہ) کہ اللہ فرشتوں کا یا اس لکھے کا محتاج ہے، وہ خود سنتا ہے، وہ خود دیکھتا ہے۔

مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ (ق:18) جو لفظ منہ سے، زبان سے نکلتا ہے، فرشتہ وہ لکھتا ہے لیکن اللہ کے تو ایسے بندے بھی ہیں جن کے بدن کا ایک ایک ذرہ اللہ اللہ کرتا ہے، جن کا دل اللہ اللہ کرتا ہے، جن کا خون اللہ اللہ کرتا ہے، جن کی رگ و ریشے تک اللہ اللہ کرتے ہیں، جن کے وجود کی نس نس اللہ اللہ کرتی ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ روزِ حشر جب حساب ہوگا اور فرشتے عرض کریں گے کہ یا اللہ! اس بندے کے سارے اعمال ہم نے ترازو میں رکھ دیے تو ارشاد ہوگا، اس کا بہت سا مال میرے پاس بھی ہے جو تمہارے علم میں نہیں ہے۔ تم نے تو وہ لکھا جو اس نے کیا، تم نے وہ لکھا جو اس کی زبان سے نکلا، لیکن جو زبان سے نہیں نکلا، اس کا دل اللہ اللہ کرتا رہا، اس کا خون اور رگ و ریشے اللہ اللہ کرتے رہے، اس کے وجود کا ذرہ ذرہ اللہ اللہ کرتا رہا۔ وہ تمہاری تحریر میں نہیں ہے۔ میں تو سن بھی رہا تھا، دیکھ بھی رہا تھا، میرے پاس وہ محفوظ ہے۔ اسے بھی اس کی نیکیوں کے پلڑے میں رکھو۔ اس وقت احساس ہوگا کہ اللہ کی یاد، اللہ کا نام کتنا قیمتی ہے اور یہ کیسی دولت ہے اور کیسے وقت پر کام آتی ہے۔ فرمایا، عمل کرتے وقت یہ بات ذہن میں رکھو۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم جہاد میں ایک یہودی سے نبرد آزما تھے۔ لڑتے لڑتے دست بدست لڑائی پر آ گئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اسے گرا دیا، اس کے سینے پر سوار ہو گئے اور اسے مارنے کے لیے خنجر نکالا تو اس نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ کے چہرہ مبارک پر تھوک دیا۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اسے چھوڑ کر کھڑے ہو گئے تو وہ حیران ہو گیا کہ میں نے تو آپ (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کی توہین کی تھی اور میں نے آپ (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کو غصہ دلایا تھا لیکن آپ (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) نے مجھے بالکل چھوڑ دیا۔ فرمایا، میں تیرے ساتھ اپنے لیے نہیں لڑ رہا تھا، میں اللہ کے حکم سے تیرے ساتھ لڑ رہا تھا۔ اللہ کے حکم سے، اللہ کی رضا کی خاطر تو میں تیرا سر تن سے جدا کر دیتا لیکن جب

تُو نے میرے منہ پر تھوکا تو مجھے غصہ بھی آیا۔ اب اگر میں تمہیں قتل کرتا تو اس میں میرا ذاتی انتقام شامل ہو جاتا، جو غصہ تُو نے مجھے دلایا وہ بھی شامل ہو جاتا۔ تو میں اپنی پسند سے بندے کو قتل نہیں کر سکتا۔ یہ میری جرأت نہیں ہے۔ میں تو اللہ کی رضا کے لیے تمہارے ساتھ لڑ رہا تھا۔ تُو بھی توبہ کر لے، تُو بھی اللہ کا بندہ بن جا، تُو بھی اللہ کی رضا کے لیے لڑنا شروع کر دے۔

قتال میں بھی یہ ہے کہ ہم جس سے ذاتی طور پر خفا ہوں، اس پر فتویٰ دے دیں کہ اسے گولی مار دی جائے، یہ درست نہیں ہے۔ قتال کے لیے بھی وہ طریقہ ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عطا فرمایا کہ منظم ادارہ ہو، حکومت ہو اور وہ حق کی خاطر کام کرے اور اس کے راستے میں رکاوٹ آئے تو اللہ کے حکم کے نفاذ کے لیے جہاد کا، قتال کا حکم دے۔

وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۴۴﴾ اللہ کی راہ میں قتل سے بھی گریز نہ کرو۔ جان ہارنی پڑے تو جان ہار جاؤ۔ ان معمولی باتوں کی تو کوئی حیثیت ہی نہیں، اور یہ یاد رکھو! اللہ خود دیکھتا ہے، سن رہا ہے، اگر تم غلط کر رہے ہو تو بھی کسی کو شکایت کی ضرورت نہیں، وہ خود ملاحظہ فرما رہا ہے۔ اگر اس کی رضا پر چل رہے ہو تو تمہاری کوئی چیز ضائع نہیں ہوگی۔

اللہ کی راہ میں خرچ اللہ کو قرض دینا ہے:

مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا ۔۔۔۔ اللہ تو ایسا کریم ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ تم اسے قرض دے رہے ہو حالانکہ ہر چیز اس کی دی ہوئی ہے۔ اسی کی دی ہوئی قوت، اسی کی دی ہوئی بصارت، اسی کی دی ہوئی سماعت، اس کی دی ہوئی زبان، اسی کا دیا ہوا علم اور اسی کی دی ہوئی جان بھی اگر پیش کر دی جائے تو حق ادا نہ ہوگا۔ اسی کی دی ہوئی چیز اگر ہم اس کی خدمت میں پیش کرتے ہیں تو ہم نے کون سا کمال کیا! اس کے باوجود وہ ایسا کریم ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ تمہارے سجدے، تمہارا ذکر اذکار، تمہاری نیکی، تمہارے اعمال، تمہارا حسنِ کردار اور اتباعِ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو تم کر رہے ہو، یہ اللہ پر تمہارا قرض ہے۔ فرمایا، ایسا کون ہے جو اللہ کو قرض دے! جو تم کرتے ہو اللہ کریم اسے اپنی طرف سے قرض گردانتے ہیں قَرْضًا حَسَنًا ۔۔۔۔ اور خوبصورت قرض ہے۔
فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗٓ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً ۔۔۔۔ پھر وہ اسے اپنی شان کے مطابق کئی گنا بڑھا کر اس کا بدلہ دیتا ہے۔

حضرت عبداللہ ابن مبارک ایک ولی اللہ تھے، امیر آدمی تھے۔ ایک دن ایک خاتون ان کے پاس حاضر ہوئی اور عرض کی کہ میرا بچہ بیمار ہے، طبیب نے شہد سے دوائی دینے کو کہا لیکن خریدنے کی سکت نہیں۔ آپ کے توشہ خانہ میں شہد ضرور ہوگا، مجھے ایک چھوٹی سی پیالی شہد کی عطا کر دیجیے۔ آپ نے ملازم کی طرف دیکھا اور فرمایا، اندر سے

شہد کا ایک مشکیزہ لے آؤ اور مائی کو عطا کر دو۔ ملازم نے حیرت سے کہا کہ اسے تو ایک پیالی چاہیے تھا، آپ نے مشکیزہ عطا کر دیا۔ فرمایا، وہ اپنی حیثیت کے مطابق مانگ رہی تھی، اس کے لیے تو ایک پیالی بھی بہت بڑی دولت تھی لیکن مجھے اللہ نے ڈھیروں کے حساب سے دے رکھا تھا، میں نے اپنی حیثیت کے مطابق دے دیا۔ مجھے اللہ کریم سے حیا آئی کہ اس نے مجھے اتنا دے رکھا ہے تو میں اتنا سا دوں، میں نے اسے مشکیزہ دے دیا۔ اگر اللہ کے بندوں کا یہ عالم ہے تو خود اللہ کی عطا کا حساب کیا ہو گا!

فرمایا، کوئی ہے جو اللہ کو قرض حسنہ دے پھر اللہ اپنی شان کے مطابق اسے کئی گنا زیادہ کرے، جو اُسے زیب دیتا ہے۔ بندے نے جو کرنا ہے، اپنی حیثیت کے مطابق کرنا ہے۔ فرمایا، میں جب لوٹاؤں گا تو میں اپنی شان کے مطابق لوٹاؤں گا۔ وَاللّٰهُ يَقْبِضُ وَيَبْصُۜطُ ۔۔۔۔ یہ اللہ ہی ہے جو بندے پہ تنگی بھی بھیج دیتا ہے، فراخی بھی بھیج دیتا ہے۔ کبھی صحت خراب ہو جاتی ہے، کبھی معاشی تنگی آ جاتی ہے، اعضاء و جوارح ساتھ چھوڑ جاتے ہیں۔ یہ اللہ ہی ہے جو تنگی بھیج کر بھی آزماتا ہے کہ اگر اس پر تنگی آ گئی تو بھی میری بارگاہ، میری چوکھٹ پر ہی رہے گا یا میرا دروازہ چھوڑ کر کسی اور کی طرف بھاگ نکلے گا؟ فراخی بھی وہی دیتا ہے۔ دولت، عزت اور حکومت و اختیارات بھی وہی دیتا ہے کہ اس کے پاس یہ چیزیں ہوں گی تو کیا میرا شکر ادا کرے گا یا مجھ سے بغاوت کر بیٹھے گا۔ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ۝ نتیجہ یہ ہے کہ تم سب کو آخر پلٹ کر اپنے اعمال، اپنے کردار، اپنے ایمان و یقین کے ساتھ، وہ جس طرح کا ہے اور اس میں کوئی اینچ پینچ، کوئی غلطی، کسی کو تاہی کا کوئی امکان نہیں، اس کی بارگاہ میں حاضر ہونا ہے۔ ہر عمل، ہر عمل کی نیت، ارادہ اور خلوص، ہر چیز وہ دیکھ بھی رہا ہے، سن بھی رہا ہے اور وہ جانتا ہے۔ تم جتنی اس کی اطاعت کرو گے، اس کے حبیب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی کرو گے، تم اپنی حیثیت کے مطابق کرو گے، وہ انعامات سے اپنی شان کے مطابق نوازے گا۔

ارشاد ہوتا ہے کہ اے مخاطب! آپ نے موسیٰ علیہ السلام کے بعد بنی اسرائیل کا وہ قصہ نہیں دیکھا، اپنے نبی علیہ السلام سے کہنے لگے: لَهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۔۔۔۔ ہم میں سے ایک کو حاکم بنا دیجئے تاکہ ہم اللہ کی راہ میں جہاد کر سکیں۔ قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوْا ۔۔۔۔ اللہ کے نبی علیہ السلام نے فرمایا، اب تو تم دعویٰ کر رہے ہو کہ ہماری حکومت کا نظام بنائیں۔ ایک بادشاہ بنا دیجیے تاکہ ہم مل کر اللہ کی راہ میں جہاد کریں، ظلم کا خاتمہ ہو اور زمین پر عدل قائم ہو لیکن خطرہ اس بات کا ہے کہ جب تم کو جہاد کے لیے کہا جائے تو اب جو دعویٰ کر رہے ہو، جہاد کا وقت آنے پر تم بھاگ نکلو۔ قَالُوْا وَمَا لَنَآ اَلَّا نُقَاتِلَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۔۔۔۔ وہ کہنے لگے ہمیں کیا ہے کہ جب ہم اللہ پر ایمان رکھتے ہیں تو پھر اللہ کی راہ میں جہاد کیوں نہیں کریں گے؟ اور اس کی دوسری وجہ یہ بھی تھی۔ وَقَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَاَبْنَآئِنَا ۔۔۔۔ کہ ہمارے

ملک کو تباہ کر دیا گیا، ہمیں اولادوں سے جدا کر دیا گیا۔

واقعہ یہ تھا کہ یہ لوگ بڑے شاداں و فرحاں آباد تھے۔ ان پر ایک بادشاہ نے حملہ کر دیا۔ ایک ایسی مصیبت من جانب اللہ ان پر آئی کہ ان کے شہروں کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی، ان کے عبادت خانے تباہ کر دیے اور لاکھوں مردوں، عورتوں اور بچوں کو قیدی اور غلام بنا لیا گیا۔ ان کے اعمال کے سبب ان پر یہ مصیبت پڑی۔ جب کچھ سنبھلے تو پھر انہیں خیال آیا اور اللہ کے نبی علیہ السلام جو اس وقت ان میں موجود تھے، ان سے عرض گزار ہوئے کہ آپ علیہ السلام اللہ کے نبی ہیں، آپ ہمیں اللہ کی باتیں بتاتے ہیں، ہماری اصلاح کے لیے مبعوث ہوئے ہیں تو ہماری سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ ہماری پھر سے ایک حکومت بنے، کوئی حکمران ہو اور ہم پھر سے ایک طاقت بنیں، اپنا کھویا ہوا ملک واپس لیں، اپنا اجڑا ہوا شہر آباد کریں، اپنے تباہ شدہ عبادت خانے پھر سے بنائیں اور ایسے ظالموں کے خلاف ہم جہاد کریں۔ اللہ کے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ تم لوگوں کی وعدہ خلافیوں اور کمزوریوں کے باعث تم پر یہ تباہی آئی۔ خطرہ ہے کہ اب بھی اگر تم پر کوئی حکمران بنا دیا جائے اور تمہیں حکم دیا جائے کہ جہاد کرو تو تم جہاد نہیں کرو گے۔ پھر اس سارے نظام کو بنانے کا کیا فائدہ ہوگا؟ کہنے لگے! ہم جہاد کیوں نہیں کریں گے پہلی وجہ تو یہ ہے کہ جب اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور اللہ کی راہ میں جہاد کرنا ہے تو کیوں نہیں کریں گے، اللہ کے حکم کی اطاعت کیوں نہیں کریں گے اور دوسری بات یہ ہے کہ ہمارے ساتھ بہت ظلم ہوا ہے، ہمارا شہر تباہ ہو گیا اور ہمارے لاکھوں لوگ قیدی ہو گئے، ہماری اولاد چھن گئی، بیویاں چھن گئیں، عبادت خانے تباہ ہو گئے اور ہمیں بھاگ کر جان بچانا پڑی۔

أُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَأَبْنَآئِنَا۔۔۔۔ ہم اولادوں سے الگ ہو گئے، گھروں سے بے گھر ہو گئے، شہر سے نکالے گئے تو پھر ہم کیوں جہاد نہیں کریں گے لیکن اس سب کے باوجود فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا إِلَّا قَلِيلًا مِّنْهُمْ جب ان پر جہاد فرض کیا گیا تو سوائے تھوڑے لوگوں کے اپنے اس وعدے سے پھر گئے۔ سوائے چند لوگوں کے إِلَّا قَلِيلًا مِّنْهُمْ۔۔۔۔ ان میں سے بہت تھوڑے لوگ اپنے وعدے پر قائم رہے، اکثریت جان بچانے کے لیے بھاگ گئی۔ وَاللّٰهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ ﴿۲۴۶﴾ اللہ کریم ظالموں کو خوب اچھی طرح جانتا ہے۔

قصص قرآنی حالاتِ حاضرہ کو سمجھنے کا ذریعہ ہیں:

آج ہمیں یہ شکایت ہے کہ سارا ہی عالمِ اسلام بے بس اور بے کسی کی زندگی گزار رہا ہے۔ ہمیں یہ شکایت بھی ہے کہ غیر مسلم طاقتیں ہم پر مسلط ہیں، جو چاہتی ہیں وہ کرتی ہیں اور ہم مجبور و بے بس ان کے زیر سایہ زندگی گزارنے پر مجبور ہیں لیکن یہ کیوں ہوتا ہے؟ قرآن حکیم کوئی تاریخ کی کتاب نہیں ہے کہ وہ قصے بیان کرتا رہے۔ اگر کوئی تاریخی قصہ بھی بیان کیا جاتا ہے تو وہ حالاتِ حاضرہ کو دیکھنے اور سمجھنے کا ذریعہ بنتا ہے اور وہ آئینہ دکھاتا ہے کہ پہلی قوموں میں سے فلاں لوگوں کا کردار کیا تھا اور ان سے کیا سلوک کیا گیا۔ آج اگر تمہارا کردار ویسا ہوگا تو وہی سلوک تم سے بھی ہوگا۔

یہ قصہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد بنی اسرائیل کے اس دور کا ہے جب عمالقہ کے بادشاہ بخت نصر نے انہیں تاخت وتاراج کر دیا۔ ہیکل سلیمانی، جہاں بیت المقدس ہے، اسے تباہ کر دیا اور صحائف جلا دیے۔ ان کے پاس موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام کے کچھ تبرکات تھے، وہ بھی وہ اٹھا کر لے گیا۔ لاکھوں مردوں، عورتوں اور بچوں کو قیدی اور غلام بنا کر لے گیا اور ایک دفعہ شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ صرف وہ لوگ بچ گئے جنہوں نے ادھر ادھر بھاگ کر جانیں بچائیں۔ پھر اللہ نے ان میں نبی علیہ السلام مبعوث فرمایا۔ اللہ اتنا کریم ہے کہ اس نے نوعِ انسانی پر کبھی اپنے کرم کا دروازہ بند نہیں کیا۔ یہ اس کا بہت بڑا احسان تھا کہ اس طرح کے لوگوں میں پھر نبیؑ مبعوث فرما دیا کہ واپس آجاؤ اور اللہ سے اپنا عہد درست کر لو۔ گزشتہ جو گناہ ہوئے ہیں یا جو جرائم ہوئے ہیں ان سے توبہ کرو، اللہ سے معافی مانگو اور اللہ کی اطاعت اختیار کرو۔

اس وقت انہوں نے اپنے نبی علیہ السلام سے عرض کیا، اللہ کا احسان ہے کہ اس نے آپ علیہ السلام کو ہماری طرف بحیثیت نبی علیہ السلام مبعوث فرمایا ہے تو جہاں آپ ہمیں دین سکھا رہے ہیں وہاں آپ ہماری دنیا میں بھی راہنمائی کیجئے۔ آپ پھر سے ہمارا ایک نظام بنا دیجیے۔ کسی ایک کو ہم میں حکمران نامزد کر دیجیے تاکہ وہ انتظام و اہتمام کرے، پھر سے ایک قوم بنیں، اللہ کی راہ میں قتال کریں، ظالموں کو ظلم سے روکیں اور زمین پر عدل قائم کریں۔ دین و دنیا انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام ہی سکھاتے ہیں اور مومن کی دنیا بھی دین ہی ہوتی ہے بلکہ اگر دنیا کو درمیان سے نکال دیا جائے تو دین بھی باقی نہیں بچتا۔ دین نام ہے دنیا کے کام اللہ کے حکم اور اس کی رضا کے مطابق کرنے کا، تو اگر دنیا کے کام کرنا ہی چھوڑ دیے جائیں تو اس میں اطاعت یا عدم اطاعت کہاں آئے گی؟ اس میں دین کا نفاذ کہاں ہوگا، دین پر عمل کیسے ہوگا!

قتال فی سبیل اللہ اور جنگ میں بنیادی فرق:

قتال یا جہاد مظلوموں کی مدد کے لیے، ظلم اور زیادتی روکنے کے لیے اور اللہ کی مخلوق کو امن دینے کے لیے، تحفظ دینے کے لیے ہوتا ہے۔ جنگ اور جہاد یا قتال میں یہ ایک بنیادی فرق ہے۔ دنیا کی تاریخ میں ایک فلسفہ جنگ کا ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ تاریخ نام ہی جنگ کے فسانوں کا اور جنگ کے قصوں کا ہے تو یہ درست ہوگا۔ یعنی ساری تاریخ صرف جنگوں کے قصے ہیں کہ فلاں نے فلاں پر فتح پائی، فلاں نے فلاں کو مارا اور فلاں نے فلاں سے ملک چھینا۔ جنگ میں یہ ہوتا ہے کہ جو بھی مخالف ہے اسے تباہ کر دیا جائے، اس کے وسائل تباہ کر دیے جائیں، اس کے رزق کے اسباب، معاشی حالات تباہ کر دیے جائیں، اس کے اخلاق و کردار مسخ کر دیے جائیں، اس قوم کی آنے والی نسلوں کو باکردار نہ بننے دیا جائے اور ان میں جرأت پیدا نہ ہونے دی جائے۔

آپ لوگوں نے برطانوی راج کی Colonies دیکھی ہیں اور جنہوں نے دیکھی نہیں، ان کے متعلق پڑھا ضرور ہوگا۔ ہر کالونی بنانے کے پیچھے یہی مقصد تھا کہ جو قوم قابو آجائے، اسے اپنے ماضی سے ناآشنا کر دو۔ اسے اپنے کردار، اپنے عقیدے اور اپنے مذہب سے جدا کر دو۔ اسے محض ایک غلام بنا دو کہ وہ آپ کی اطاعت کرتی رہے اور اس کی اپنی پسند نہ رہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ Colonialism یا غلامی کا نظام ختم ہو گیا لیکن میری ذاتی رائے یہ ہے کہ یہ ختم نہیں ہوا، اس کی صورت بدل گئی ہے۔ پہلے یہ ہوتا تھا کہ ممالک چھن جاتے، لوگوں کو مارا جاتا، قتلِ عام کیا جاتا اور جو بچ جاتے انہیں غلام بنا لیا جاتا۔ پھر ان کو اپنی مرضی سے جینے کے راستے دیے جاتے اور ان کے اپنے راستے، زندگی گزارنے کے طریقے ان سے چھن جاتے۔ اب یہ ہوتا ہے کہ بڑی طاقتیں بغیر لڑائی کے بھی اسی طرح کے حالات پیدا کر دیتی ہیں کہ لوگ اپنے ملکوں میں بیٹھے ہوئے کماتے اپنا ہیں، کھاتے اپنا ہیں لیکن غلامی ان کی کرتے ہیں۔ یعنی غلام بنانے کا طریقہ بھی Modernize ہو گیا ہے، جدید ہو گیا ہے۔ اب بھی دنیا میں دو ہی قسم کے لوگ، مالک یا مملوک، حاکم یا محکوم، آقا یا غلام بستے ہیں۔

اسلام نے جنگ کے مقابل جہاد کا تصور دیا ہے۔ جہاد کسی کو تباہ کرنے کے لیے نہیں کیا جاتا۔ جہاد صرف ظلم کو روکنے اور ظالم کو ظلم سے باز رکھنے کے لیے کیا جاتا ہے۔ اگر کسی دوسری قوم کے افراد یا غیر مسلم افراد یا ایسے لوگ جو اللہ کو نہیں مانتے وہ بھی اس معاشرے کا حصہ ہوں تو ان پر سے بھی ظلم کو روکا جاتا ہے اور انہیں بھی انسانی حقوق دیے جاتے ہیں۔ جہاد میں کسی قوم کے وسائل، اخلاقیات و کردار تباہ نہیں کیے جاتے، کسی کی فصلیں نہیں اجاڑی جاتیں اور کسی کے رزق کے وسائل تباہ نہیں کیے جاتے۔ کسی قوم کو بحیثیت قوم تباہ نہیں کیا جاتا بلکہ وہ لوگ مارے جاتے ہیں جو

ظلم کا سبب بن رہے ہیں اور اس سے باز نہیں آ رہے۔ جو باز آ جاتے ہیں، توبہ کر لیتے ہیں تو ان کو بھی کچھ نہیں کہا جاتا۔ جنگ اور جہاد میں یہ بہت بڑا فاصلہ ہے کہ جہاد نہ صرف مسلمانوں کے لیے بلکہ انسانی نسل کے لیے، اولادِ آدم کے لیے قیامِ امن کا سبب ہے۔

فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيۡهِمُ الۡقِتَالُ تَوَلَّوۡا اِلَّا قَلِيۡلًا مِّنۡهُمۡ جب ان پر جہاد فرض کیا گیا تو واقعی وہ اپنے عہد سے پھر گئے سوائے تھوڑے لوگوں کے۔ اپنی بات سے سارے ہی پھر گئے سوائے مٹھی بھر لوگوں کے اور اللہ ظالموں کو جانتا ہے۔ وَاللّٰهُ عَلِيۡمٌۢ بِالظّٰلِمِيۡنَ ﴿۲۴۶﴾ اللہ ایسے ظالموں کو خوب جانتا ہے اور اس نے اپنے نبی علیہ السلام کو بھی آگاہ فرما دیا تھا کہ یہ پھر جانے والے ہیں۔

اصحابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی ایک کرامت:

یوں تو حضور رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلّم ہیں، تمام عالم آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی رحمت کا ممنون ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کے بارِ احسان تلے دبا ہوا ہے۔ فرش و عرش سب کو اللہ کی طرف سے حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کے طفیل اللہ کی رحمتیں پہنچتی ہیں لیکن مسلمانوں کو جو بے پناہ نعمتیں ملی ہیں ان میں ایک نعمت بہت عجیب ہے۔ اس ایک نعمت کا ذکر کرتے ہیں جس کا تعلق ہمارے آج کے عہد کے ساتھ ہے۔ اللہ کریم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کے غلاموں اور خادموں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کے جاں نثاروں میں ایک عجیب کرامت رکھی ہے اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی یہ کرامت آج بھی روزِ روشن کی طرح واضح ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کے حکم کے مطابق اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہوئے اور زمین پر امن قائم کرتے ہوئے جہاں تک ان لوگوں کے قدم مبارک پہنچے جو صحبتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلّم کے امین تھے، وہاں ابھی تک مسلمانوں کی حکومتیں قائم ہیں۔ یہ بہت عجیب بات ہے، جس کی طرف کبھی کسی نے توجہ نہیں کی۔ آپ جزیرہ نما عرب سے لے کر دنیا کے نقشے پر دیکھ لیں۔ جہاں جہاں صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین پہنچے ہیں، وہ خطہ ہائے زمین ابھی تک مسلمانوں سے چھینے نہیں گئے۔ مسلمان بٹ گئے اور چھپن ستاون ریاستیں بن گئیں۔ ان سب ریاستوں کا نقشہ یکجا کر کے اسے آپ تاریخ کے حوالے سے دیکھیں گے تو یہ زمین کے وہ حصے ہیں جن پر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے فتح کے جھنڈے گاڑے اور مزے کی بات یہ ہے کہ یہ جتنے علاقے ہیں، انسانی زندگی کے وسائل کے اعتبار سے روئے زمین کے بہترین خطے ہیں۔

سب سے اچھی بندرگاہیں مسلمانوں کے پاس ہیں، بہترین زرخیز زمینیں مسلمانوں کے پاس ہیں، بہترین

پھل دار درخت مسلمانوں کے پاس ہیں، بہترین زیرِ زمین ذخائر خواہ وہ تیل کے ہوں، سونے کے ہوں، جواہرات کے ہوں، معدنیات کے ہوں، مسلمانوں کے پاس ہیں۔ یعنی جتنے علاقے آج مسلمانوں کے پاس ہیں، یہ دنیا میں انسانی زندگی کے وسائل کا اسی (80) فیصد پیدا کررہے ہیں اور باقی ساری دنیا کے پاس بیس فیصد وسائل رہ جاتے ہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ جن کے پاس بیس فیصد ہے وہ مالک بنے ہوئے ہیں اور جن کے پاس اسی (80) فیصد ہے وہ ان کے غلام بنے ہوئے ہیں۔ اس کا سبب کیا ہے؟ بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ ہم جدید تحقیق اور Modern Technology میں پیچھے رہ گئے ہیں۔ ایسی بات بھی نہیں ہے۔ آپ باقی مسلم دنیا کو چھوڑ بھی دیں اور صرف پاکستان کو لیں تو امریکہ، برطانیہ اور جاپان جو اس وقت Modern Technology میں سرفہرست ہیں، ان ممالک میں چوٹی کے سائنسدان اور چوٹی کے محقق پاکستانی ہیں۔ کسی بھی شعبہء زندگی میں آپ دیکھ لیں اور یہ میں ویسے بات نہیں کررہا، میرا مشاہدہ ہے اور میں نے ان ملکوں میں جاکر دیکھا ہے تو پھر ہم محکوم کیوں ہیں؟

آج کا مسلمان محکوم کیوں ہے؟

وہی ایک بات رہ جاتی ہے کہ ہم اللہ سے جو عہد کرتے ہیں، وفا نہیں کرتے۔ ہمارے پاس علم بھی ہے، جدید تحقیق اور ٹیکنالوجی بھی ہے۔ ہمارے پاس ایسے افراد بھی ہیں جن کی نظیر دنیا میں نہیں ملتی لیکن جب بات اللہ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی آتی ہے، دین کی آتی ہے تو ہم بھاگ جاتے ہیں۔ یہ وہی بات ہے جس کے سبب بنی اسرائیل رسوا ہوئے تھے، وہی بات ہماری رسوائی کا سبب بھی ہے۔ یہ جو ہماری ریاستیں قائم ہیں اور ایک نظام چل رہا ہے، کمزور سہی لیکن کلمہ پڑھ رہے ہیں، نمازیں پڑھ رہے ہیں، روزے رکھتے ہیں، مساجد ہیں اور آباد بھی ہیں۔ اس کا سبب کیا ہے؟ اِلَّا قَلِیۡلًا مِّنۡہُمۡ ۔۔۔۔ بہت تھوڑے لوگ ہیں جو اس عہد پر قائم ہیں، جو اللہ کے حکم کی اطاعت کرتے ہیں، جو اللہ کے کی اطاعت کرتے ہیں اور جو ہر حال میں اُس کے اطاعت گزار ہیں۔ یہ اللہ کے ان بندوں کے دم قدم سے ہے۔

مولانا احمد علی لاہوری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اپنے وقت کے بہت بڑے عالم، مفسر اور بہت پائے کے ولی اللہ بھی تھے۔ وہ ایک تقریر میں اہلِ لاہور کو خطاب کرکے فرمانے لگے، لاہور والو! جن لوگوں کو تم بھک منگا اور گداگر سمجھتے ہو، ہوسکتا ہے کہ انہی لوگوں کے سبب سے تمہاری رونقیں قائم ہوں۔ تمہاری اس رونق بھری زندگی کے قیام کا سبب شاید وہی چند لوگ ہوں جنہیں تم ایک شریف شہری سمجھنے کے لیے بھی تیار نہیں۔

حکومت صرف امراء کا حق نہیں:

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ اللَّهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوتَ مَلِكًا۔۔۔۔اور جب ان کے نبی علیہ السلام نے ان سے کہا کہ تم نے یہ گزارش کی تھی کہ ہمارے لیے کوئی بادشاہ مقرر کر دیا جائے تو میں اپنی طرف سے مقرر نہیں کر رہا، اللہ کے حکم سے طالوت کو تم پر حکمران مقرر کرتا ہوں۔ جب یہ حکم ملا تو بھڑ گئے۔ قَالُوا أَنَّى يَكُونُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ أَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ طَالُوتَ۔۔۔۔طالوت ہم پر کس طرح سے حکمران ہو سکتا ہے؟ حکومت کے حقدار تو ہم ہیں۔ آپ کو کیا استحقاق ہے کہ آپ حکومت کے حقدار ہیں؟ کہنے لگے وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ۔۔۔۔اس کے پاس تو مال ہی نہیں، وہ تو ایک غریب آدمی ہے، دولت تو ہمارے پاس ہے۔ آپ ذرا بنی اسرائیل کی صدیوں قبل زمانے کی بات اور اپنی آج کی حالت کا موازنہ کرتے جائیے۔ وہ اُس وقت کہنے لگے کہ حکومت اور اختیارات تو مالدار لوگوں کا حق ہے، جن کے پاس دولت ہے، ان کا حق ہے۔ یہ تو عام آدمی ہے، اس کے پاس تو پیسے بھی نہیں، یہ کیسے ہم پر حکمران ہو گیا ہے؟ حالانکہ انہوں نے اپنے نبی علیہ السلام سے خود گزارش کی تھی اور اللہ کے حکم سے حضرت طالوت علیہ السلام حکمران بنے۔ أَنَّى يَكُونُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا۔۔۔۔وہ کس طرح ہم پر حکمران بن سکتا ہے جبکہ ہماری پوزیشن یہ ہے کہ وَنَحْنُ أَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ۔۔۔۔حکومت کے ہم زیادہ مستحق ہیں۔ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ۔۔۔۔اس کے پاس تو دولت بھی نہیں ہے۔

ہمارا معیارِ انتخاب یہود سے مختلف نہیں:

آج ہماری حکومتیں بنتی ہیں تو معیار کیا ہوتا ہے؟ ایم این اے، ایم پی اے، یا اسمبلی کا رکن یا سینیٹر بننے کے لیے کیا معیار ہے؟ اچھا نیک ہو، پارسا ہو، عالم ہو، شریف آدمی ہو یا صرف ایک معیار ہے کہ اس کے پاس دولت ہو اور وہ پیسے صَرف کرے اور اسمبلی میں پہنچ جائے! یہی معیار اُن کا بھی تھا۔ یعنی قرآن کریم جو تاریخی حکایات بیان فرماتا ہے، ایک تو وہ حق ہوتی ہیں اور دوسرا درسِ عبرت اور باعثِ ہدایت ہوتی ہیں۔ آج ہم بھی وہیں پہنچے ہوئے ہیں۔ ان کے نبی علیہ السلام نے فرمایا، بات یہ ہے کہ إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَاهُ۔۔۔۔اللہ نے انہیں منتخب فرما لیا ہے، قصہ ختم ہو گیا مزید کسی دلیل کی ضرورت ہی نہیں۔ میں اللہ کا نبی علیہ السلام ہوں اور میں تمہیں بتا رہا ہوں کہ اللہ نے اس بندے کو حکمرانی کے لیے چن لیا ہے، یہ تو ہو گئی فیصلہ کُن بات! لیکن جو دلیل تم دیتے ہو تمہارے پاس دولت زیادہ ہے، حکومت کے لیے زیادہ دولت چاہیے تو سن لو! وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ

وَالْجِسْمِ اللہ نے تم سب میں سے علم میں بھی اور جسمانی صحت میں بھی انہیں بہترین جوان بنایا ہے۔ علم کے اعتبار سے تم سب سے وہ افضل ہیں اور سب سے زیادہ جاننے والے ہیں۔ دنیا و آخرت کی باتوں کو جانتے ہیں، دین و دنیا کے طریقوں سے آگاہ ہیں اور تم سب سے طاقت ور اور صحت مند ہیں۔ حکمران کے لیے قرآن نے دو اوصاف بتائے کہ ایک تو اس کا علم ایسا ہو کہ قوم کی رہنمائی کر سکے، امورِ دنیا میں بھی اور امورِ آخرت میں بھی، بین الاقوامی حالات کا مطالعہ بھی اس کا وسیع ہو، دنیا کے معاملات کو بھی سمجھتا ہو، خرید و فروخت کو بھی جانتا ہو اور صلح اور جنگ کے اصولوں سے بھی واقف ہو۔ اس کا جسم بھی صحت مند ہو کہ صحت مند دماغ صحت مند جسم ہی میں ملتا ہے۔

ہمارے ہاں دیکھ لیجیے، نہ تو کوئی علم کا معیار ہے اور نہ صحت کا بلکہ صحت کا معیار تو اتنا گرا ہوا ہے کہ بیشتر ارکانِ اسمبلی کو علاج کے لیے سرکاری خرچ پر بیرون ملک بھیجا جاتا ہے۔ جو بندہ کام سے گیا، اس کی صحت بھی ٹھیک نہیں ہے، وہ سوچے گا کیا، سمجھے گا کیا، اور قوم کی راہنمائی کیا کرے گا؟ ہمیں اللہ کریم سے یہ شکایت تو ہے کہ ہم مسلمان ہیں اور ہم پر کافروں کو چڑھا رکھا ہے اور اللہ ہماری مدد نہیں کرتا لیکن ہم یہ نہیں دیکھتے کہ ہمارا کردار کیا ہے اور نتیجہ تو عمل پر، کردار پر مرتب ہوگا۔ اُس عہد کے بنی اسرائیل کے لوگوں کو لے لیجیے اور آج اپنے آپ کو لے لیجیے۔ قرآن حکیم واقعہ بنی اسرائیل کا سنا رہا ہے، بات ہم سے کر رہا ہے۔

قرآن کی روشنی میں حکمرانی کا معیار:

حکومت کے لیے دو شرائط ہیں ایک تو یہ ہے کہ الْعِلْمِ The Knowledge۔ الْعِلْمِ جسے کہیں گے اس کے دو حصے ہیں۔ علم الادیان و علم الابدان دین کا علم جسے آپ Normative Sciences کہہ سکتے ہیں۔ عقیدہ و ایمان اخلاق، کردار اور علم الابدان Physical Sciences جسمانی علوم جن میں معیشت، معاشرت، حکومت، سیاست سب آجاتا ہے۔ تو علم یہ ہے کہ بندہ دنیا و آخرت کو بھی سمجھتا ہو اور مادی علوم اور بین الاقوامی طریقے، دنیا پر حکمرانی کے انداز، لوگوں کی ضرورتیں اور ان کو پورا کرنے کے طریقے سے بھی آشنا ہو۔ یعنی پہلے تو عالم ہو اور پھر جسمانی لحاظ سے بھی مضبوط ہو، صحت مند بھی ہو۔

اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰهُ عَلَيْكُمْ ۔۔۔۔ اللہ نے طالوت علیہ السلام کو تم پر منتخب کر لیا ہے۔ جس کے بعد کسی دلیل کی ضرورت نہ رہی۔ اللہ نے انہیں چن لیا ہے لیکن جو کام اللہ کرتا ہے وہ سب سے زیادہ صحیح ہوتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ حکومت کی جو دو شرائط ہیں وہ تم میں سے زیادہ بدرجہ اتم ان میں پائی جاتی ہیں وَ زَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَ الْجِسْمِ ۔۔۔۔ اور وہ یہ ہیں، علم ہو، دنیا و آخرت کو سمجھتا ہو۔ جسمانی لحاظ سے صحت مند ہو اور اس کی سوچ

بھی صحت مند ہو۔

وَاللّٰهُ يُؤْتِي مُلْكَهُ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۴۷﴾ اور اللہ جسے چاہے ملک عطا کر دیتا ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ وسعت دینے والے ہیں، واسع ہیں اور علیم ہیں۔ سب سے زیادہ جاننے والے ہیں۔ اعمال و کردار پر نتائج مرتب فرماتے ہیں اور جو کچھ اللہ کرتا ہے وہ درست ہوتا ہے، وہاں کبھی کسی غلطی کا امکان اور شائبہ نہیں ہوتا۔

پھر انہوں نے ایک دلیل اور بھی دی وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اٰيَةَ مُلْكِهٖٓ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ التَّابُوْتُ فِيْهِ سَكِيْنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى وَاٰلُ هٰرُوْنَ تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓئِكَةُ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۲۴۸﴾ کہ طالوت کی حکومت اور اس کے حکمران اور بادشاہ بننے کی ایک نشانی یہ بھی ہے کہ تمہارے جو تبرکات عمالقہ تم سے چھین کر لے گئے تھے۔ وہ تمہیں بغیر کسی تکلیف کے واپس مل جائیں گے۔ اللہ کے فرشتے وہ چیزیں لے آئیں گے اور تم تک پہنچا دیں گے۔ مفسرین کرام لکھتے ہیں کہ اس تابوت میں موسیٰ علیہ السلام کا عصا تھا اور کچھ تبرکات تھے۔ کچھ ان کے پرانے کپڑے یا جوتے یا اس طرح کی ان کے استعمال کی چیزیں تھیں اور غالباً کچھ ان تختیوں کے ٹکڑے تھے جو موسیٰ علیہ السلام کو کوہ طور پر من جانب اللہ عطا ہوئی تھیں۔ ان کے ٹوٹ جانے پر ان کے کچھ ٹکڑے بچے تھے، وہ بھی تبرکات کے طور پر تابوت میں تھے جو بخت نصر اُن سے چھین کر لے گیا تھا۔

اللہ کریم ایسا قادر ہے کہ عمالقہ میں تابوت جہاں رکھا ہوا تھا، اس مکان پر تباہی آگئی، مکان گر گیا۔ انہوں نے اٹھا کر کسی دوسری جگہ رکھا تو جس گھر میں بھی رکھتے وہ گھر تباہ ہو جاتا۔ انہوں نے پریشان ہو کر وہ ساری چیزیں ایک گدھے پر لاد کر اس گدھے کو جنگل کی طرف ہنکا دیا کہ یہ تو ہمارے لیے باعثِ تکلیف بن رہا ہے۔

تبرکات باعثِ نزولِ رحمت ہیں:

اللہ کریم کے فرشتوں نے اس کو ہنکاتے ہوئے بنی اسرائیل کے پاس پہنچا دیا۔ قرآن حکیم فرماتا ہے اَنْ يَّاْتِيَكُمُ التَّابُوْتُ فِيْهِ سَكِيْنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۔۔۔۔ تمہارے پاس وہ تابوت پہنچ جائے گا جس میں اللہ کی طرف سے تمہارے لیے تسکین کے اسباب ہیں اور وہ تسکین کے اسباب کیا ہیں؟ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى وَاٰلُ هٰرُوْنَ ۔۔۔۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کی چھوڑی ہوئی چیزیں ہیں۔ تو گویا بزرگانِ دین کے تبرکات باعثِ نزولِ رحمت ہوا کرتے ہیں۔ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے وجودِ عالی کے ساتھ جو چیز مس کر جاتی ہے، اس میں بھی وہ برکات آجاتی ہیں کہ وہ دوسروں کے لیے باعث رحمتِ الٰہی ہو جاتی ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم نے جس جانور پر سواری فرمائی وہ جانور باقی جانوروں سے ممتاز ہوگیا۔ جس شخص کو آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کے وجودِ عالی سے مَس ہونا نصیب ہوا، کسی کو دست اقدس ہاتھ میں لینا نصیب ہوا، اس کی برکات سے وہ لوگ آگاہ تھے جنہیں یہ نعمت نصیب ہوئی۔ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جب سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم سے ہاتھ ملایا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی بیعت کی، تب سے تاوقت وفات اپنے اُس ہاتھ کو ناپاک نہیں ہونے دیا۔ اتنی احتیاط فرماتے تھے کہ کبھی کوئی ناپاک شے دائیں ہاتھ سے لگ نہ جائے کہ اس ہاتھ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کو مس کیا۔ ایک سفر میں رسول صلی اللہ علیہ وسلّم ایک اونٹ پر سوار تھے اور پیچھے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سوار تھے۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ عظیم الجثہ آدمی تھے تو پیچھے سمٹ کر اور پیٹ کھینچ کر بیٹھے تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم نے پکڑ کر اپنے ساتھ لگایا اور فرمایا، پیچھے ہٹ کر نہیں بیٹھو، میرے ساتھ لگ کر بیٹھو، جو جسم میرے جسم سے مَس ہوجاتا ہے اس پر جہنم حرام ہوجاتی ہے۔

تو وہ چیزیں جو انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے وجودِ عالی سے مَس ہوجاتی ہیں، وہ چیزیں بھی باعثِ نزولِ رحمتِ باری بن جاتی ہیں۔ اسی طرح اللہ کے نیک بندوں اور بزرگانِ دین کے استعمال کی چیزیں بھی باعثِ برکت بن جاتی ہیں اور نزولِ رحمت کا ایک سبب بن جاتی ہیں۔

جب وہ تبرکات بنی اسرائیل کے پاس پہنچے تو انہیں ایک گونہ اطمینان نصیب ہوا۔ یہ تو ان تبرکات کی خصوصیت بھی تھی کہ فِيهِ سَكِينَةٌ۔۔۔ ان میں سکون ہے، تسکینِ قلب ہے، ان میں اطمینان ہے، انہیں تم پاؤ گے تو اللہ کی طرف سے تم پر تسکین نازل ہوگی۔ اس بات پر وہ قائل ہو گئے اور طالوت علیہ السلام کے ساتھ جہاد پر جانے کے لیے تیار ہو گئے۔

سورۃ البقرہ رکوع 33 آیات 249 تا 252

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوْتُ بِالْجُنُوْدِ ۙ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِيْكُمْ بِنَهَرٍ ۚ فَمَنْ
شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّيْ ۚ وَمَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ فَاِنَّهٗ مِنِّيْٓ اِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ
غُرْفَةًۢ بِيَدِهٖ ۚ فَشَرِبُوْا مِنْهُ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ ۭ فَلَمَّا جَاوَزَهٗ هُوَ وَالَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۙ قَالُوْا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ ۭ قَالَ
الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ ۙ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً
كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۲۴۹﴾ وَلَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ
قَالُوْا رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ
الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۵۰﴾ فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۣ وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ وَاٰتٰىهُ اللّٰهُ
الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَاۗءُ ۭ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ
بِبَعْضٍ ۙ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۵۱﴾
تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ۭ وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۲۵۲﴾

پھر جب طالوت لشکروں کو لے کر چلے تو فرمایا بے شک اللہ تم کو نہر سے آزمائیں گے پھر جو اس میں پی لے گا تو وہ میرے ساتھیوں میں نہیں اور جو کوئی اسے نہیں چکھے گا تو وہ میرا ساتھی ہوگا سوائے اس کے کوئی اپنے ہاتھ سے چلّو بھر لے پھر ان میں سے سوائے تھوڑے لوگوں کے (سب نے) اس سے پی لیا پھر جب وہ (طالوت) اور ایمان والے لوگ جو ان کے ساتھ تھے اس کے پار اترے تو وہ کہنے لگے کہ آج ہم

میں جالوت اور اس کے لشکر کے ساتھ لڑنے کی طاقت نہیں۔ جو اللہ سے ملاقات پر یقین رکھتے تھے انہوں نے کہا کتنی ہی تھوڑی جماعتوں نے اللہ کے حکم سے بڑی جماعتوں پر غلبہ پایا اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہیں ﴿۲۴۹﴾ اور جب وہ جالوت اور اس کے لشکروں کے مقابل آئے تو انہوں نے کہا اے ہمارے پروردگار! ہم پر صبر نازل فرمایے اور ہمارے قدم جمائے رکھیے اور کافروں کی قوم پر ہماری مدد فرمایے۔ ﴿۲۵۰﴾ پس اللہ کے حکم سے انہوں نے ان کو شکست دی اور داؤد (علیہ السلام) نے جالوت کو قتل کر دیا اور اللہ نے ان کو بادشاہی عطا کی اور دانائی اور جو چاہا ان کو سکھایا اور اگر اللہ بعض لوگوں کا دفاع بعض لوگوں سے نہ کرتے تو رُوئے زمین پر تباہی پھیل جاتی اور لیکن اللہ جہانوں پر بہت مہربان ہیں ﴿۲۵۱﴾ یہ اللہ کی نشانیاں ہیں جو ہم آپ پر حق کے ساتھ پڑھتے ہیں اور آپ بلاشبہ پیغمبروں میں سے ہیں ﴿۲۵۲﴾

تفسیر ومعارف

فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوْتُ بِالْجُنُوْدِ۔۔۔۔جب جہاد کے لیے لشکر تیار کیا گیا اور طالوت علیہ السلام اس کی رہنمائی کے لیے ساتھ ہوئے تو انہوں نے بتایا قَالَ اِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِيْكُمْ بِنَهَرٍ۔۔۔۔کہ راستے میں ایک آزمائش ہے۔ اللہ کریم کے امتحانات بھی عجیب ہوتے ہیں۔ راستے میں ایک نہر پڑتی ہے جس سے گزر کر ہم نے جانا ہے۔ اب فاصلہ تھا، صحرائی ملک تھا، گرمی تھی، پیاس لگنے لگی لیکن فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّيْ۔۔۔۔جو اس نہر سے پانی پی لے گا وہ ہم میں سے نہیں۔ وَمَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ فَاِنَّهٗ مِنِّيْٓ۔۔۔۔اور جس نے وہ پانی نہ پیا وہ ہم میں سے ہے اِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةًۢ بِيَدِهٖ۔۔۔۔اگر کسی نے اپنے ہاتھ سے چلّو بھر پانی پی لیا تو وہ خیر ہے لیکن جس نے سیر ہو کر پیا وہ ہمارے ساتھ نہیں جا سکتا۔ جب وہاں پہنچے فَشَرِبُوْا مِنْهُ۔۔۔۔تو اکثریت اس پر ٹوٹ پڑی اور پانی پینے لگ گئی۔ اب یہ ابتلائے الٰہی تھی۔ وہ جتنا پانی پیتے جاتے تھے پیاس بڑھتی جاتی تھی۔ جتنا زیادہ پیتے تھے پیاس بڑھتی تھی، ان کے پیٹ پھول گئے، اٹھنے کے قابل نہ رہے لیکن پیاس ختم نہیں ہوئی۔ صرف وہ لوگ رہ گئے جنہوں نے چلّو بھر پانی پیا۔

ایمان کی دلیل عمل ہے:۔

فَلَمَّا جَاوَزَهٗ هُوَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ۔۔۔جب آپ علیہ السلام اس نہر سے آگے بڑھے تو وہ تھوڑے لوگ جن کے ایمان مستحکم تھے، جنہوں نے اپنے نبی علیہ السلام کی بات مانی۔ یہاں دیکھیے ایمان کی دلیل کے طور پر کتاب اللہ نے اس چیز کو پیش فرمایا ہے کہ جن لوگوں نے اپنے نبی علیہ السلام کے ارشاد پر عمل کیا وہ مومن تھے۔

فَلَمَّا جَاوَزَهٗ هُوَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ۔۔۔کے مدعی تو سارے تھے، جتنے لوگ جہاد کے لیے نکلے سارے مسلمان تھے، لیکن یہاں ایمان کی شرط یہ قرار دی کہ جنہوں نے نافرمانی کی وہ تو رہ گئے، یہاں جو ایمان پر ثابت قدم رہے اور جو واقعی ایمان والے تھے ان کو ساتھ لے کر آپ علیہ السلام آگے بڑھے۔

قَالُوْا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ۔۔۔جالوت اس وقت عمالقہ کا سردار تھا۔ بہت سخت گیر حکمران تھا اور بہت رعب اور دبدبہ تھا۔ اس کی دہشت بڑی تھی اور اس کے پاس لشکر بھی بہت بڑا تھا۔ جب سامنے لشکر آتا ہوا دکھائی دیا تو وہ لوگ بھی جو ابتلا سے گزر کر ساتھ آئے تھے، ان میں سے بھی بہت سے لوگ پریشان ہو گئے اور کہنے لگے کہ حضرت! ہم تو پہلے ہی کمزور تھے۔ پھر ہم میں سے بہت سے لوگ پیچھے رہ گئے، اب ہم بالکل تھوڑے سے ہیں اور اس کے ساتھ تو بہت بڑا لشکر ہے۔ ہم میں تو یہ تاب نہیں ہے کہ اس کے ساتھ لڑ سکیں۔

قَالَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ۔۔۔اب ان لوگوں کی باری آئی جو اللہ کے بندے تھے، خاص الخاص تھے اور جنہیں اس بات کا یقین تھا کہ ہمیں اللہ کے روبرو حاضر ہونا ہے۔ آج مارے گئے تو آج ہی اللہ کے روبرو ہوں گے۔ آج بچ گئے تو کل مریں گے، جانا اللہ کے پاس ہے۔ لہٰذا ہمیں زندگی اور موت سے تعلق نہیں ہے، ہمیں تعلق اللہ اور اللہ کے نبی علیہ السلام کی اطاعت سے ہے۔ مارے جائیں گے تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ دوسری بات یہ ہے کہ جب اللہ حکم دے رہا ہے، اللہ کا نبی علیہ السلام ہمارے ساتھ ہے تو اس کا مطلب ہے کہ اللہ کی مدد ہمارے ساتھ ہے، یہ ہمیں شکست نہیں دے سکتا، شکست کفر کا مقدر ہے۔

دعویٰ ایمان کرنے والوں کی تین اقسام:

گویا لوگوں کی تین قسمیں ہیں۔ ایک عام لوگ جو دعویٰ ایمان تو رکھتے ہیں لیکن انہیں خود اپنے دعوے پر اعتماد نہیں ہے۔ اس لیے کہ دعویٰ ایمان کے باوجود انہیں اطاعت کی توفیق نہیں ہوتی۔ ایسے لوگوں کو اللہ کی طرف سے مومنین میں شمار نہیں کیا جاتا۔ ایمان ایک دعویٰ ہے اور دعوے کو اس کے دلائل ثابت کرتے ہیں۔ کوئی دعویٰ بھی ہو اس کے ثبوت کے لیے دلائل کی ضرورت پڑتی ہے۔ ایمان ایک دعویٰ ہے اور جو عمل ہم کرتے ہیں یہ اس دعوے کی دلیل

ہے۔ہم حضور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کو اللہ کا سچا اور آخری نبی علیہ السلام مانتے ہیں۔ جب ہم اپنی عمومی زندگی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی اطاعت کرتے ہیں تو ہماری یہ اطاعت اس دعویٰ کی دلیل ہے کہ ہم واقعی حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کو اللہ کا سچا نبی علیہ السلام مانتے ہیں۔ خدانخواستہ اگر ہم سنت کو چھوڑ کر رسومات اور بدعات میں کھوجاتے ہیں تو پیچھے دعویٰ رہ جاتا ہے جس کی ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں ہوتی۔ ہم اپنی زندگیوں پر غور کریں، آج کے اپنے حالات کو دیکھیں۔ کہنے کو تو ہم یہ کہتے ہیں کہ کافروں کو غلبہ ہے اور مومن پس رہے ہیں، لیکن حال وہی بنی اسرائیل والا ہے۔ جیسے وہ اللہ کے محبوب بھی تھے، مومنین بھی تھے، ان میں نبی علیہ السلام بھی مبعوث ہوئے لیکن جب انہوں نے اطاعت چھوڑ دی تو عیاشیوں میں پڑ گئے۔

دین چند نظریات یا عقائد کا مجموعہ نہیں ہوتا۔ عقیدہ عمل کی بنیاد ہوتا ہے۔ دین پوری زندگی کا ایک ضابطہ حیات ہوتا ہے۔ کیا کرنا ہے، کیا نہیں کرنا ہے، جو کرنا ہے وہ کیسے کرنا ہے، اس کا طریقہ کیا ہوگا۔ دین کسی بات سے روکتا نہیں ہے۔ کھانے پینے سے، شادی سے، گھر بار سے، بال بچوں سے، کاروبار تجارت سے، صلح و جنگ سے، زندگی کے کسی شعبے میں دیوار کھڑی نہیں کرتا۔ اس کا سلیقہ بتاتا ہے کہ کون سا کام کس طریقے سے کرنا ہے اور کون سا کام ہے جو کرنے کا نہیں ہے، جو اللہ کی اطاعت کے دائرے سے باہر ہے۔ زندگی میں اپنے کردار کو اس سانچے میں ڈھالنا ایمان کی دلیل ہے۔

اب ان سب کا دعویٰ تو ایمان کا تھا لیکن جب نہر پر پہنچے تو باوجود اس کے کہ اللہ کے نبی علیہ السلام نے منع فرمایا تھا کہ بھئی! جو اس میں سے پانی پیئے گا وہ ہم میں سے نہیں ہوگا، الگ ہو جائے گا تو وہ ٹوٹ پڑے اور انہوں نے پانی پیا اور وہیں رہ گئے۔ یہ عام لوگ تھے۔ دوسرے خاص لوگ تھے جنہوں نے چلّو بھر پانی پیا، نبی علیہ السلام کی اطاعت کے ساتھ رفاقت کی توفیق نصیب ہوئی۔ میدانِ کارزار میں پہنچے تو کفر کی طاقت اور وسائل کو دیکھ کر پریشان ہو گئے۔ یہ دوسری قسم تھی، صاحب ایمان تو تھے لیکن کمزور۔ کچھ خاص الخاص ہوتے ہیں، اللہ کے بہت ہی مقرب بندے، انہوں نے کہا، بھئی! اگر لشکر زیادہ ہے تو پریشانی کی کیا بات ہے۔ وسائل زیادہ ہیں، یا فوج زیادہ ہے لیکن ہیں تو کافر، اللہ کے نافرمان! اور ہمارے ساتھ تو اللہ کا نبی علیہ السلام ہے۔ تاریخ کو دیکھو!

كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً بِإِذْنِ اللّٰهِ ۔۔۔۔ تاریخِ انسانی میں پہلے بھی کئی معرکے ہوئے ہیں جن میں کتنی قلیل فوجوں کو اللہ نے کثیر تعداد فوجوں پر غلبہ دیا۔ وہ قادر ہے، جو چاہے کر سکتا ہے اور یہ بھی یاد رکھو! وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝ اللہ صبر کرنے والوں کا ساتھ دیتا ہے۔

صبر کا مفہوم:

ہم سمجھتے ہیں کہ جب کوئی نقصان ہو جائے اور اس پر جزع فزع نہ کی جائے، شور شرابانہ کیا جائے، تو یہ صبر ہے۔ عربی لغت میں صبر کا لفظی معنی ہے روک لینا، جیسے سوار گھوڑے کی باگ کھینچ کر اسے روک لیتا ہے۔ گھوڑا ایک رفتار سے جارہا ہے، اچانک سوار اس کی باگ کھینچتا ہے اور ایک جگہ پر روک لیتا ہے۔ جس طرح گھوڑا زبردستی روکا جاتا ہے، اپنے آپ کو اللہ کی نافرمانی سے اس طرح روک لینا صبر ہے۔ بندہ اپنے آپ کو اللہ کی نافرمانی سے روک لے اور اللہ کی اطاعت پر کاربند ہو جائے۔ تو انہوں نے یہی بات انہیں بتائی کہ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے، آپ اللہ کے حکم پر ڈٹ جائیں، اللہ پر اعتماد کریں۔ فتح وشکست اس کے اپنے دستِ قدرت میں ہے اور ان شاء اللہ! اللہ ہمیں فتح دے گا۔ کفر کو غلبہ نہیں دے گا چونکہ اللہ ہمارے ساتھ ہے۔

وَلَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ ۔۔۔۔ اور جب مقابلہ شروع ہوا، میدان میں آمنا سامنا ہوا۔۔۔۔ تو انہوں نے دعا کی۔ رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا ۔۔۔۔ اے اللہ! ہمارے قلوب پر صبر انڈیل دے۔ بھر دے ہمارے دلوں کو صبر سے، اپنی اطاعت پہ ہمیں جم جانے کی توفیق عطا فرما۔ وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا اور ہمارے قدموں کو اثبات عطا فرما، ہمیں ڈٹ جانے کی توفیق عطا فرما وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ۝ اور اے الہ العالمین ہمیں کفار پر غلبہ اور فتح دے۔

فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۔۔۔۔ اور جالوت کی ساری جاہ وحشمت اور عظیم لشکر کے باوجود انہوں نے اسے شکست دی۔ وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ ۔۔۔۔ اور حضرت داؤد علیہ السلام نے جو اُن کے بعد نبی علیہ السلام بھی ہوئے اور حکمران بھی ہوئے، جالوت کو قتل کر دیا۔ اس وقت آپ علیہ السلام نوخیز نوجوان تھے اور کمزور تھے۔ مفسرین کرام لکھتے ہیں کہ زرد رُو تھے جس طرح کوئی مریض ہوتا ہے اور چہرہ پیلا پڑ جاتا ہے، اس طرح کے تھے لیکن اللہ کریم نے انہیں وہ قوت بخشی کہ انہوں نے جالوت کو قتل کر دیا۔ بعض تفاسیر میں ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے ایسا پتھر کھینچ کر مارا کہ جالوت کو لگتے ہی وہ ہلاک ہو گیا اور اس کے لشکر کو شکست ہو گئی۔ حضرت طالوت علیہ السلام نے اپنی بیٹی کا رشتہ حضرت داؤد علیہ السلام کو دے دیا اور ان کے بعد حکومت وسلطنت بھی حضرت داؤد علیہ السلام کو منتقل ہو گئی۔

وَاٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ ۔۔۔۔ اللہ نے حضرت داؤد علیہ السلام کو ملک بھی عطا کر دیا، نبوت بھی عطا کی، حکمت عطا کر دی، اور بھی جو چاہا انہیں عطا کیا۔

حضرت داؤدعلیہ السلام کے ذکراللہ کے احوال:

قرآن کریم میں آگے تذکرہ ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کے ساتھ چرند، پرند، درخت، پتھر اور پہاڑ ذکر کیا کرتے تھے۔ جب وہ ذکرِ الٰہی کرتے تو جس زمین پر ہوتے اس زمین کے طیور وحیوان، درخت پتے ہر چیز ان کے ساتھ ذکر کیا کرتی تھی۔ اب یہ کہہ دینا کہ زبانِ حال سے ذکر کرتے ہوں گے، درست نہیں۔ زبان حال سے تو دنیا کی ہر چیز ذکر ویسے بھی کر رہی ہے۔ وَإِنْ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهِ (بنی اسرائیل:44) کائنات میں جس چیز کا وجود باقی ہے، وہ اللہ کا ذکر کرتی ہے اور جس سے ذکر چھوٹ جاتا ہے، وہ چیز باقی نہیں رہتی۔ کائنات میں جتنے وجود ہیں، خواہ وہ ذی روح ہے، خواہ وہ بے جان ہیں، وَإِنْ مِنْ شَيْءٍ کوئی چیز ایسی نہیں ہے۔ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهِ جو اپنے رب کی تسبیح اور اس کی تعریف بیان نہ کرتی ہو۔ تو زبانِ حال سے یا اُس زبان میں جسے اللہ سمجھتا ہے، ہر چیز، ہر وقت ذکر کرتی ہے۔ جو ذکر چھوڑ دیتی ہے وہ مٹ جاتی ہے۔ داؤد علیہ السلام کے ساتھ بھی یہ سب اگر ویسا ہی ذکر کرتے تھے تو قرآن میں خصوصی طور پر بیان کرنے کا کوئی مقصد نہیں ہے۔ قرآن کریم نے اگر خصوصی طور پر بیان کیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ زبانِ قال سے ذکر کرتے تھے جس طرح بندہ اللہ اللہ کرتا ہے۔ جس طرح اللہ کے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا قلبِ اطہر اللہ اللہ کر رہا ہوتا تھا، اسی طرح اُن کی برکت اور اُن کی توجہ سے شجر و حجر بھی، درخت پہاڑ بھی، طیور اور وحوش بھی اُن کے ساتھ اللہ اللہ کرتے تھے۔ اللہ نے انہیں بہت سی چیزیں سکھائیں۔ انسانیت کو لوہے کا استعمال حضرت داؤد علیہ السلام نے سکھایا اور لوہے کی زرہیں بنانا اور لوہے کا اسلحہ بنانا سب سے پہلے حضرت داؤد علیہ السلام نے شروع کیا۔

بقائے کائنات اور نیکی اور بدی میں توازن:

رب العالمین کا یہ ایک نظام ہے۔ کائنات میں ہمیشہ ہر چیز کو بیلنس (Balance) رکھتا ہے۔ جب تک دنیا کو اس نے قائم رکھنا ہے وہ چیزوں کو برابر رکھتا ہے۔ گرمی آتی ہے، تو سردی بھی آجاتی ہے۔ بہار آتی ہے، تو خزاں بھی آجاتی ہے۔ دن آتا ہے، تو رات بھی آجاتی ہے۔ اچھے لوگ ہوتے ہیں تو برے بھی پیدا ہوتے ہیں۔ برائی بڑھتی ہے تو نیکی کو بھی بڑھا دیتا ہے۔ ہر چیز میں بیلنس رکھتا ہے۔ اگر لاکھوں بدکار کسی جگہ جمع ہو جائیں تو وہاں وہ اپنا ایک بندہ ایسا پیدا کر دیتا ہے جس ایک کی اللہ اللہ ان لاکھوں کی برائیوں پر سبقت لے جاتی ہے، خوش نصیبوں کو ہدایت نصیب ہونا شروع ہو جاتی ہے اور وہ اللہ کا نام لینا شروع کر دیتے ہیں۔ ہر چیز میں وہ بیلنس رکھتا ہے اور جب بیلنس بگڑتا ہے تو کوئی چیز باقی نہیں بچتی۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم سے عرض کیا گیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم ! قیامت کب قائم ہوگی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا حتیٰ لا یقال اللہ اللہ۔ جب کوئی اللہ اللہ کرنے والا باقی نہ رہے گا قیامت قائم ہوجائے گی۔ جب صرف برائی رہ جائے گی، اللہ کا ذکر ختم ہوجائے گا تو ساری کائنات مٹ جائے گی، زمین وآسمان تباہ ہو جائیں گے۔ ستارے اور سیارے تباہ ہوجائیں گے۔ اس لیے اللہ کریم چیزوں کو بیلنس رکھتا ہے۔

فرمایا، اگر اللہ بعض لوگوں کی وجہ سے بعض لوگوں کو ہٹاتے نہ رہتے، کوئی فاتح ہوتا ہے تو کسی کو مغلوب کر دیتے ہیں، کوئی میدانِ جنگ میں مقتول ہوجاتا ہے، اللہ اگر نظام کو اس طرح برابر نہ رکھتا تو اس کا نتیجہ یہ نکلتا کہ لَفَسَدَتِ الْاَرْضُ۔۔۔ تو دنیا کب کی تباہ ہوچکی ہوتی۔ سارے لوگ شیطان کے پیچھے چل کر برائی پہ لگ جاتے اور دنیا تباہ ہوجاتی، زمین کب کی اجڑ چکی ہوتی۔ اللہ نے اسے آباد رکھنے کے لیے چیزوں میں بیلنس رکھا ہوا ہے اور اس کی رحمت سے کبھی ناامید نہیں ہونا چاہیے کہ برائی غالب آگئی تو اب برائی ہی غالب رہے گی۔ نہیں، برائی کو مغلوب ہونا پڑے گا، شکست سے دوچار ہونا پڑے گا۔ اللہ اپنا کوئی ایسا بندہ پیدا کرے گا، کسی کے دل میں وہ درد پیدا کردے گا جو برائی کے مقابلے میں نیکی کا علَم لے کر کھڑا ہوجائے گا اور برائی کو ختم ہونا ہوگا۔

وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ۝ اللہ کائنات پر مہربان ہے۔ وہ اسے تباہیوں سے بربادیوں سے بچانے کے اسباب بھی پیدا کرتا رہتا ہے۔ جہاں برائی بڑھتی ہے وہاں وہ نیکی کی بنیاد بھی مضبوط کردیتا ہے اور جہاں لوگ غافل ہوتے ہیں وہاں اللہ اللہ کرنے والے بھی پیدا کردیتا ہے۔ جہاں رات کی ظلمت ہوتی ہے وہاں سورج بھی طلوع کر دیتا ہے۔ ہر چیز اپنے اپنے وقت پہ، اپنی اپنی رفتار پہ چلتی رہتی ہے۔ اس لیے کہ اللہ کائنات پر بہت مہربان ہے، بہت مہلت دیتا ہے، بہت فرصت دیتا ہے۔ توبہ کی ہر وقت دعوت ملتی رہتی ہے اور بعثت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے ساری انسانیت کے لیے حجت تمام کردی۔ یہ بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کا معجزہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی بعثتِ عالی سے لے کر ہر عہد، ہر زمانے اور ہر جگہ کسی نہ کسی طریقے سے دعوتِ الٰہی پہنچ رہی ہے۔

اب اگر حالات بدل گئے ہیں، چیزیں جدید ہوگئی ہیں جیسے ٹیلی ویژن آگیا ہے، انٹرنیٹ آگیا ہے اور لوگوں کو شکایت ہے کہ اس پر بہت بے حیائی ہوتی ہے لیکن جو نیکی کی بات ہوتی ہے کبھی آپ نے وہ بھی سنی؟ اگر ٹیلی ویژن پہ گانے آتے ہیں تو ٹیلی ویژن پہ قرآن کا درس بھی ہوتا ہے، تفسیر قرآن بھی بیان ہوتی ہے، تبلیغِ دین بھی ہوتی ہے۔ آپ اپنے آپ کو سمجھائیں کہ جو پروگرام خراب ہے اس کو نہ دیکھیں، جو ٹھیک ہے وہ دیکھ لیا کریں۔ جب آپ کی اکثریت صحیح پروگرام دیکھے گی تو ٹی وی والوں نے بھی ٹی وی چلانا ہے، جو عوام کی پسند ہوگی وہ چلائیں گے۔ جو پروگرام عمومی طور پر دیکھے نہیں جائیں گے، وہ از خود بند ہو

جائیں گے۔ اگر آپ بھی شکایت کرتے رہیں گے کہ اس پہ بے حیائی ہے اور دیکھتے بھی بے حیائی ہی رہیں گے۔ اگر انٹرنیٹ پہ بے حیائی آتی ہے تو انٹرنیٹ پہ اللہ کا ذکر بھی ہوتا ہے، سلسلہ عالیہ کے متوسلین روئے زمین پر 24 گھنٹوں میں دو مرتبہ مل کر اللہ اللہ کرتے ہیں۔ انٹرنیٹ پہ تقریریں بھی آتی ہیں، انٹرنیٹ پہ تبلیغِ دین بھی ہوتی ہے، انٹرنیٹ پہ دینی مضامین بھی آتے ہیں۔ اگر ہم برائی چھوڑ کر نیکی دیکھنا شروع کر دیں تو ہمیں انٹرنیٹ سے یا ٹی وی سے شکایت نہ رہے۔ ہماری مصیبت یہ ہے کہ دعویٰ ایمان بھی ہے، برائی پہ تنقید بھی کرتے ہیں لیکن ساتھ برائی کا ہی دیتے ہیں۔ برائی پھلتی پھولتی ہے جس کا سبب یہ ہے کہ عام آدمی اس کا ساتھ دیتا ہے۔ ہم لوگ عمومی طور پر کردار میں برائی کو پالتے رہتے ہیں اور زبانی اسے بھلا برا کہتے رہتے ہیں، لیکن زبانی کہنے سے تو نتائج پیدا نہیں ہوتے۔ نتائج تو عمل پر ہوتے ہیں۔ اللہ کا ایک نظام ہے۔ اگر وہ بعض لوگوں کو، بعض کرداروں کو بعض دوسرے کرداروں سے تبدیل نہ کرتا رہتا تو دنیا کب کی تباہ ہو چکی ہوتی لیکن وہ بہت بڑا مہربان ہے، بڑے فضل والا ہے۔

تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ اے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم! یہ اللہ کی آیات ہیں جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر حق کے ساتھ پڑھی جاتی ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام باتوں کی خبر اللہ کریم دیتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی مدرسے، کسی استاد، کسی انسان سے نہیں سیکھا بلکہ براہ راست ربّ العالمین آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان سب چیزوں کی خبر دیتے ہیں اور یہ اس بات پر دلیل ہے کہ وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ۝ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بلا شک و شبہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اس میں کوئی شک و شبہ کی بات نہیں۔ اب یہ ہم پر ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کتنی اطاعت کرتے ہیں۔

عبادت سے توفیقِ عمل ملتی ہے:

یہ سارے بیان، تقریریں، نمازیں، عبادت، ذکر، تسبیحات، تلاوت اس سب کا حاصل کیا ہے؟ عبادت کا حاصل اصلاحِ احوال ہے لیکن یہ ایک بات ہم میں پھیل گئی ہے کہ جو عبادت ہم کر رہے ہیں، اس کا اجر آخرت میں ملے گا۔ یہ جس طرح سے ہم نے سمجھ لیا ہے اس طرح درست نہیں ہے کہ یہاں اس کا کوئی اثر ہی نہیں، اس کا اجر صرف آخرت میں ملے گا۔ آخرت میں اعمال پہ اجر ملے گا اور یہاں ہم جو عبادت کرتے ہیں، یہ توفیقِ عمل کی بنیاد ہے۔ عبادت سے قربِ الٰہی نصیب ہوتا ہے، اللہ سے تعلق نصیب ہوتا

ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلق نصیب ہوتا ہے۔ وہ تعلق ہمیں اطاعتِ الٰہی کی توفیق عطا کرتا ہے اور اللہ کی نافرمانی سے روکتا ہے۔ اب اللہ آخرت میں جو دیں گے وہ سب اُن کا کرم ہے اور جتنا عمل بھی کریں کسی ایک نعمت کا شکر ادا نہیں کر سکتے چونکہ اجر تو ہم نے پہلے لے لیا ہے۔

اپنے پروردگار کی عبادت کرو جس نے تمہیں اور تمہارے پہلوں کو پیدا فرمایا تاکہ تم متقی بن جاوٗ، اس عبادت سے توفیقِ عمل نصیب ہوگی جس کا حاصل تقویٰ ہے۔ تو اسلام عملی زندگی کا نام ہے، اسلام میدانِ حیات میں، میدانِ کارزار میں سرگرم ہونے کا نام ہے۔ بھرپور طریقے سے زندگی گزارنے کا نام ہے۔ سارے کام کرے، کاروبار کرے، محنت کرے، ملازمت کرے، گھر بنائے، دنیا کے سارے مشاغل اختیار کرے اور یہ ثابت کرے کہ میں سارے کام اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلّم کے حکم کے مطابق کر رہا ہوں، یہ اسلام ہے۔

اللہ کریم ہماری خطاؤں سے درگزر فرمائے۔ ہمیں نیکی کی توفیق عطا فرمائے، اپنی اور اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلّم کی اطاعت نصیب فرمائے اور اسے قبول فرمائے، آمین!

OUR CONTACT
Phone: +92543-562200
Fax: +92543-562198
Email: darulirfan@gmail.com
Web Site: www.oursheikh.com

بسم الله الرحمن الرحيم

OUR CONTACT:

Phone: +92543-562200
Fax: +92543-562198

Email: darulirfan@gmail.com

Web Site: www.oursheikh.com

مفسرِ قرآن

الشیخ مولانا **امیر محمد اکرم اعوان** مدظلہ العالی

کے قلم سے چھ جلدوں پر مشتمل منفرد تفسیر

اسرار التنزیل

اسرار المعارف کے حوالے سے

فہم القرآن میں ہر قاری کے لیے مددگار

علما اور تفسیر کے طلبا کے لیے علم و حکمت کا انمول خزانہ

اور سالکین طریقت کے لیے راہِ سلوک میں راہنما ہے۔

ادارہ نقشبندیہ اویسیہ

دار العرفان منارہ ضلع چکوال

اویسیہ کتب خانہ، اویسیہ سوسائٹی

کالج روڈ، لاہور

بے شمار لوگوں کی اصلاح کا سبب بننے والی قرآن تفسیر

حضرت مولانا اکرم اعوان مدظلہ العالی کی

اردو تفسیر آڈیو، وڈیو اور لکھی ہوئی تینوں طرح کی دیکھیں، سنیں یا ڈاؤن لوڈ کریں۔

پنجابی تفسیر وڈیوز دیکھیں ڈاؤن لوڈ کریں۔ قرآن کا اردو ترجمہ اور کتابیں ڈاؤن لوڈ کریں۔

قرآنِ کریم کی تلاوت اور حضرت صاحب کا اردو ترجمہ آڈیو۔ کمپیوٹر اور موبائل پر سننے کے لیے ڈاؤن لوڈ کریں۔ حضرت جی کا کلام حمد اور نعتیں آڈیو وڈیو سنیں اور ڈاؤن لوڈ کریں۔

دلچسپ سوال جواب پر مشتمل ٹی وی پروگرام اَلمرشد کی تمام 125 اقساط کی وڈیوز دیکھیں

www.QuranTafseer.net

حضور نبی پاکؐ کے حضور آج بھی روحانی طور پر حاضری ممکن ہے اور ہزاروں مرد و خواتین یہ سعادت رکھتے ہیں۔ لیکن کیسے؟

تصوف تزکیہ روحانیت ، ذکر، روحانی سلسلہ، روح، کشف، بیعت ان تمام موضوعات کو سمجھنے کے لیے حضرت مولانا اکرم اعوان مدظلہ العالی کے وڈیو بیانات اور کتابیں موجود۔

طریقۂ ذکر جس سے دل سے لے کر جسم کا ہر باڈی سیل اللہ اللہ ذکر کرنے لگ جائے۔

حضور نبی پاک ﷺ کے حضور روحانی طور پر حاضری کی سعادت۔

یہ سب کچھ سمجھنے کے لیے اور مکمل رہنمائی کے لیے ویب سائیٹ وزٹ کریں۔

اس پوسٹ کو زیادہ سے زیادہ شیئر کر کے آپ بھی اس نیک کام کا حصہ بنیں۔